دُنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

ماہ نامہ

سب رنگ ڈائجسٹ

نومبر 2009ء

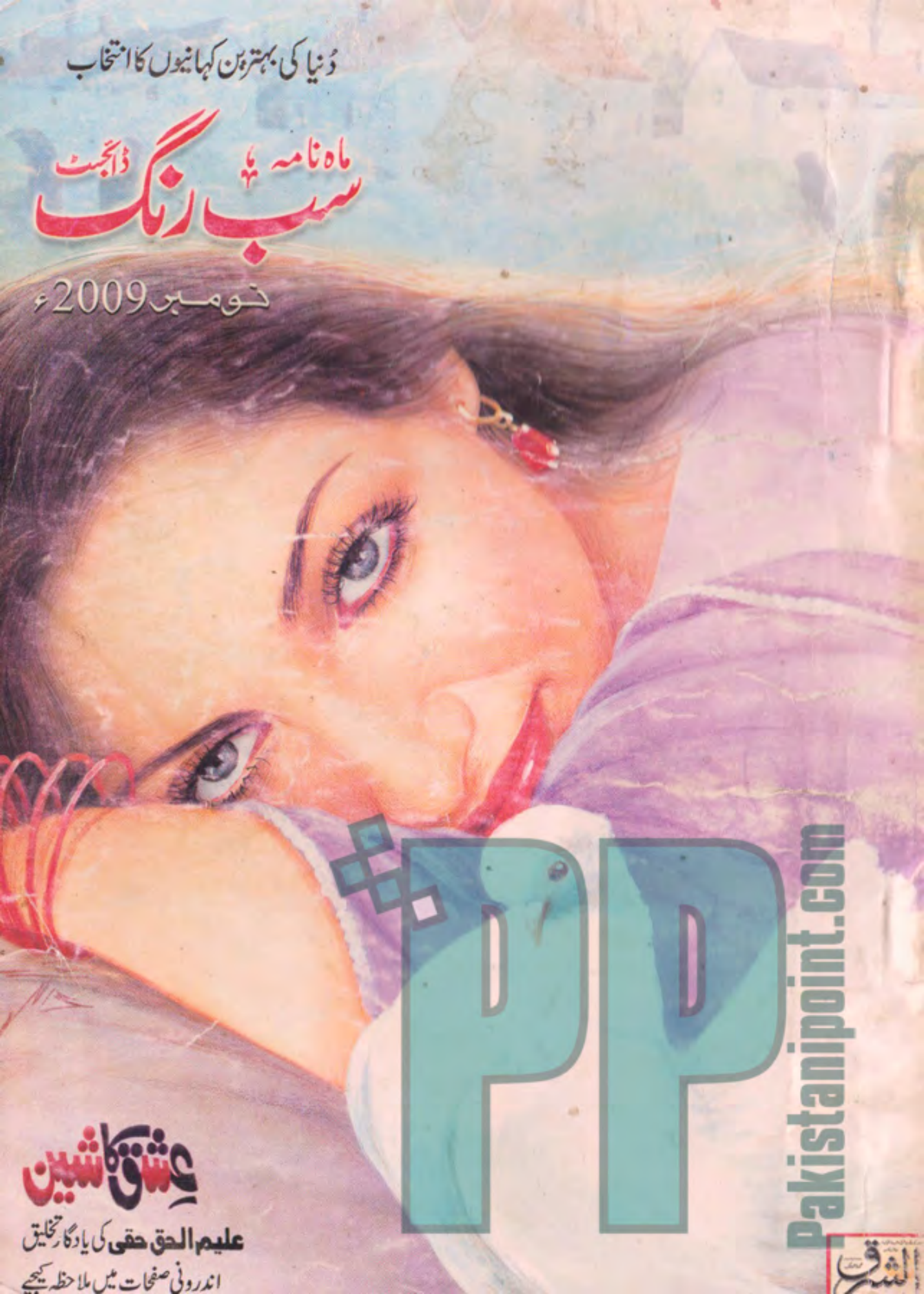

عشق کا شین

علیم الحق حقی کی یادگار تخلیق

اندرونی صفحات میں ملاحظہ کیجیے

PP
Pakistanipoint.com

الشرق

مدیر اعلیٰ: محمد راشد شفیق
مدیر: شکیب عدنان

14 مدیر اعلیٰ
اپنا اپنا رنگ
مشہور اور نئے مصنفین کی دلچسپ، انوکھی اور سبق آموز کہانیوں پر مشتمل ایک ایسا رنگا رنگ شمارہ جس کے ہر صفحے پر آپ کو کچھ نیا پڑھنے کو ملے گا۔

18 میر ولد وحید اسلیم شام
ساتواں پتھر
ایک ایسی کہانی جو آپ کو ہر صفحے پر حیرت کے نئے در وا کرتی ہوئی محسوس ہوگی۔ ایک ایسی کہانی جو آپ کو ہر صفحے پر سوچنے پر مجبور کرے گی۔

62 کیول کومھاری / زاہد مستحسن
پہلی ملاقات
ایک معذور کے گھر والے نے اشتہار کا تکیہ معذور سے اپنے پاس بلوا لیا۔ اور پھر کوئی ضروری بات کرنے لگا۔

64 یادگار
جہاں گیر کی بیٹی
ماضی کا خوبصورت، گم شدہ اور اوجھل کردہ حکایات اور ان کے کرداروں سے دلچسپی لیتی ہوئی ایک منفرد تحریر۔

74 بابر زمان خان
بازی گر
سب رنگ ڈائجسٹ کا منفرد اور پسندیدہ مسلسل سلسلہ۔ دلچسپی، آنسو اور آہوں کی داستان

115 ذیشان گلزار عباس ثاقب
فصد
معاشرے کے ایک ایسے جرائم کا المناک داستان جو ہر گھر میں ہوتے ہوئے بھی ہر گھر سے چھپا ہوا ہے۔

121 ڈاکٹر صاحب شاہد فہیم مشتاق
سفید دوپٹا
ایک ایسی کہانی جو آپ کو سوچنے پر مجبور کر دے گی۔ ایک ایسی کہانی جو آپ کو ہر صفحے پر حیرت کے نئے در وا کرتی ہوئی محسوس ہوگی۔

124 سے یاسمین / ڈی انور
پاک باطن
روشن خیالوں کے درمیان چھپی ایک دقیانوسی لڑکی کی داستان۔ خوابِ غفلت سے دوسرا رنگ میں کہانی

133 انیت کور
جنگلی گھوڑے
ایک ایسی گھوڑے کی کہانی جو اپنی سرکش عادتوں کی وجہ سے ہر ایک کی نظروں میں ناپسندیدہ تھا۔ اس کا وہ شوق جو اس کی ان عادتوں کی وجہ سے ہر ایک کی نظروں میں ناپسندیدہ تھا۔

139 کرشنا کرپلانی / یعقوب اسمٰعیل
لڑائی
ایک غریب کے لیے پریشان دور کے تریسے کے احساسات۔ خوابِ غفلت سے جاگنے کی کہانی

143 بابا ارشد علی / طاہر اصغر
مور کھی
کہانی کی ایسی ہیں ایک ایسی آدمی کی کہانی ہیں جو اپنی زندگی کے ہر لمحے کو بھرپور طریقے سے گزارنا چاہتا ہے۔

154 سرمد زروبی / انجیل اصرباں
تو...!
ایک گم شدہ کہانی اور ہماری کے بارے معصوم لڑکے کی کہانی۔ خوابِ غفلت سے جاگنے کی کہانی

157 دیبا ناز مہاجر / مظفر ضحیٰ
تشنہ ساحل
ایک ایسی لڑکی کی کہانی جو اپنی زندگی کے ہر لمحے کو بھرپور طریقے سے گزارنا چاہتی ہے۔

164 سحر ساحر
عشق کا شین
ایک ایسی کہانی جو ہر ایک کے دل کو چھو جاتی ہے۔ ایک ایسی کہانی جو ہر ایک کے دل کو چھو جاتی ہے۔

205 ابرار سلیم / اعظم الدین شاہ
ٹیلی فون
ایک ایسی کہانی جو ہر ایک کے دل کو چھو جاتی ہے۔

211 مامون الحق
تربیت نامہ
تربیت کے لیے اصولوں کی پختگی سے کام لینا، ضروری ہوتا ہے۔ یہ معمولی تحریریں کے لیے غیر معمولی کہانی

221 میکسم گورکی / ایلیزویدی
بھائی بہن
بے مقصد زندگی۔ اپنی ذات سے شروع کرنے والی کہانی کی کہانی۔ خوابِ غفلت سے جاگنے کی کہانی

229 انوار صدیقی
تعاقب
اسرار و غریب کہانی ایک داستان جسے پڑھ کر آپ چونکے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ تحریر کی کہانی کی کہانی

244 کرشن چندر
داد ر پل کے بچے
معصومیت کے حصار کی بھولی بھالی سی لڑکی کا کہانی کی کہانی۔ خوابِ غفلت سے جاگنے کی کہانی

000 ادارہ و قارئین
کتارے
لطائف اور خاکے اقتباسات اور اقوال
یاران سب رنگ کے لطیفوں کا گلدستہ

ڈائجسٹ کے قوانین: ہر ماہ کی 10 تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ ہر ایک ڈائجسٹ میں 10 کہانیاں ہوتی ہیں۔ ہر کہانی کے ساتھ ایک تصویر ہوتی ہے۔ ہر کہانی کے ساتھ ایک تبصرہ ہوتا ہے۔ ہر کہانی کے ساتھ ایک تجزیہ ہوتا ہے۔ ہر کہانی کے ساتھ ایک تنقید ہوتی ہے۔ ہر کہانی کے ساتھ ایک تعریف ہوتی

اپنا اپنا رنگ

مُدیرِ اعلیٰ

عزیز قارئین!

السلام علیکم۔

کہیے، کیسے ہیں؟ موسم کی سرد مہری اور ماحول میں دھماکوں کی گونج بڑھتی جارہی ہے۔ اس پر مستزاد، نوع بہ نوع بحران ہیں جنھوں نے قوم کو ادھ موا کر رکھا ہے۔ بجلی کی قلت، آٹے کی نایابی، چینی کی عدم دستیابی، پانی کی کم یابی اور امن وامان کا فقدان! ان تمام عوامل نے مل کر ایک عجب افراتفری کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے۔ پھر پشاور کے اندوہ ناک واقعے نے تو پوری قوم کو دہلا کر رکھ دیا۔ انسانی جان کی حرمت لایعنی ہو کر رہ گئی! آدمی کا خون کتنا ارزاں ہو گیا ہے۔ اپنے ہوں پرائے... جب، جہاں اور جتنا چاہا، بہا دیا۔ یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ کبھی رُکے گا بھی یا نہیں؟ ان سوالوں کا جواب دینا شاید کسی کے بس میں بھی نہیں، حالانکہ پیہم مخلصانہ اقدامات سے اِسے روکنے کی سعی کی جاسکتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے مطابق، اگر اُس کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لیا جائے، اپنے فرائض یاد رکھے جائیں اور دوسروں کے حقوق غصب نہ کیے جائیں تو معاملات کو بہتری کی طرف لے جایا جاسکتا ہے۔ بات آئی بہتری کی تو ہمیں یاد آیا کہ سب رنگ کے عشاق نے بھی اپنے محبت ناموں میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ سب رنگ میں انھیں ہر سطح پر، بہتری اور تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔ آیئے، ان کی آرا، انھی کی زبانی سنتے ہیں... ہمارا مطلب ہے، انھی کے الفاظ میں پڑھتے ہیں، یعنی رنگا رنگ بزم کا رُخ کرتے ہیں۔

سیّد خبیب عارف کا اپنی فیملی سیما عارف، اکیرم عارف، حانیہ عارف، علیزا عارف کے ساتھ مشترکہ مکتوب، کراچی سے "قابلِ احترام جناب راشد ملک السلام علیکم۔ اللہ سے امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ نئے دور کا تیسرا شمارہ 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق دیکھ کر بے اختیار ذاکر صاحب کے لیے دل سے تعریفی کلمات نکلے۔ بڑی بات ہے کہ ڈھیروں تصاویر بنا چکے ہیں، مگر ہر دفعہ نیا پن۔ (بھئی خُبیب صاحب! بات یہ ہے کہ ذاکر صاحب صنفِ نازک کو ہر مرتبہ ایک نئی نظر سے دیکھتے ہیں، یہ زاویۂ نظر ان کی بنائی ہوئی تصویروں میں بھی عیاں ہوتا ہے) سرورق کے ساتھ ہی حقی صاحب کی یادگار تخلیق "عشق کا شین" کا اعلان پڑھا۔ آپ کے اور حقی صاحب کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی کہ اللہ آپ کو اور حقی صاحب کو صحت، تن درستی اور طویل عمر عطا کرے اور آپ یونہی ہمارے لیے شاہ کار پیش کرتے رہیں۔ (آمین) پھر فہرست کے صفحے پر پہنچے۔ اس کا انداز پسند آیا۔ کاش کہ یہ کالم فل ہوتا۔ خطوط کی محفل میں اپنا خط دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ بے اختیار آپ کو دعا دی۔ ناظم بخاری صاحب کا تبصرہ پڑھا۔ حیرت ہے، جناب کو تہلکہ خیز ناول پسند نہیں ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ حقی صاحب کی معرکہ آرا تحریریں پڑھیے۔ ان شاء اللہ آپ بھی ان کہانیوں، ناولوں کے شیدائی ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد خاں صاحب آپ نے دیومالائی اور ماورائی کہانیوں کی فرمائش کی ہے۔ معذرت کے ساتھ، ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ ماورائی کہانیاں ڈائجسٹوں کے ابتدائی دور کی روایت تھی۔ آج کوئی بھی مشہور ومعروف ڈائجسٹ اس قسم کی کہانیاں پیش نہیں کرتا ہے۔ جناب، اب دور معاشرتی کہانیوں ہی کی بنا پر آج نو... صاحب، حقی صاحب اور دیگر مصنفین ملک گیر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ کہانیوں میں "ساتواں پتھر"، علیم بھائی کی یادگار تخلیق ثابت ہوئی جس میں خوشی، ... اور آلام کو بڑی خوب صورتی سے بیان کیا گیا۔ امید ہے ایسے ناول پڑھنے کو ملتے رہیں گے۔ آپ نے ہماری فرمائش پر تاریخی کہانی "دوسرا سکندر" پیش کی۔ ... یہ تحریر بہت اچھی لگی۔ یاور صاحب نے صرف ایک واقعے کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا۔ کیا یہ نئے لکھنے والے ہیں؟ کہانی کے ساتھ مصنف کا سوانحی خاکہ پیش کیا جائے تاکہ ہم مصنف کے بارے میں جان کاری حاصل کر سکیں۔ (اتنی پرانی کہانیاں لکھنے والا نیا کیسے ہو سکتا ہے!) شمارے کی خاص کہانی "نیل گوں دیوار" صحیح معنوں میں خاص کہانی تھی جو تادیر یاد رہے گی۔ غیر معمولی کہانی دستِ نارا اس میں بین کی قربانی پر دل اش اش کر اٹھا۔ اردو ادب سے "چراغِ آخر شب" بہترین کہانی ثابت ہوئی۔ ویسے یہ فرشتہ نما انسان تھا کہ کس خوبی سے زندگی سے مایوس سیٹھ کو صحت اور زندگی کی طرف لوٹا گیا۔ دیگر کہانیوں میں بالترتیب ملال، آزمائش اور پُر کار شمارے کی بہترین اور یاد رہنے والی کہانیاں تھیں۔ ہندی آمیز اردو سے مزین، محترم نواب صاحب کے معرکہ آرا ناول "رفتار" کی کیا تعریف کریں۔ وہ تو ہمارے دل میں اتر گیا۔ محترم کو ہم عرصہ 30 سال سے پڑھ رہے ہیں اور ان کی صحت اور طویل عمری کے لیے دعا کر رہے ہیں اور گزارش کرتے ہیں کہ وہ سب رنگ کے لیے ایسے ہی شاہ کار تخلیق کرتے رہیں۔ ذوالفقار آذین کے لیے دعائے خیر و برکت کہ جناب کے فن کے ہم عرصے سے قدر داں ہیں۔ جناب، آپ کے جوڑی دار فرہنگ قمر آج کل کہاں ہیں؟ (آذین صاحب! جواب دیں۔) اب اجازت، آخر میں آپ سمیت ادارے کے تمام لوگوں، مصنفین اور قارئین کو ڈھیر ساری دعائیں۔ والسلام۔"

محمد اشفاق کا نامہ، راول پنڈی سے "محترم راشد ملک صاحب! السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ "سب رنگ" کا اکتوبر کا شمارہ ملا۔ "اپنا اپنا رنگ" میں خوب رونق تھی۔ اللہ کرے اس رونق میں مزید اضافہ ہو (آمین)۔ "بازی گر" میں نجمل نے ایک بار پھر اپنا رنگ جمایا۔ "عشق کا شین" شروع کر کے آپ نے بڑی ذمے داری اٹھالی ہے۔ ہم تو کب سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ حقی صاحب سے گزارش ہے کہ "دجال" کے تیسرے حصے پر بھی توجہ دیں۔ ایک بات کی وضاحت کر دوں۔ "سب رنگ" وہ رسالہ ہے جو بندہ لے لیتا ہے لیکن پڑھتا اپنی مرضی سے ہے۔ کہانیوں پر تبصرہ کرنے کے لیے "سب رنگ" کبھی نہیں لیا۔ معلوم ہے کہ ہر کہانی خاص ہی ہوگی۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔"

محمد اسحاق انجم کا مکتوب، لنگن پور، قصور سے "محترم مدیر اعلیٰ صاحب! السلام علیکم۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ "سب رنگ" کا شمارہ اکتوبر اس بار کچھ تاخیر سے ملا۔ سرورق خوب صورت تھا۔ سب سے پہلے "اپنا اپنا رنگ" میں "سب رنگ" ڈائجسٹ کے چاہنے والوں کے خطوط اس بات کا ثبوت فراہم کر رہے تھے کہ وہ کتنے بے چین تھے کہ اپنا اظہار خیال کر سکیں۔ آپ نے موقع دیا ہے تو اب دیکھ لیجیے گا' یہ سلسلہ ہزاروں خطوط تک جا پہنچے گا۔ جیسا کہ ناظم بخاری صاحب نے ضلع لودھراں سے اپنے خط میں ذکر کیا ہے۔ ابھی بہت سے قارئین کو پتا نہیں چل سکا۔ بک اسٹالوں پر "سب رنگ" ڈائجسٹ آگیا ہے کے اشتہار لگنے شروع ہو گئے ہیں اور پڑھنے

والے بڑھ رہے ہیں۔ اس بار "عشق کا شین" اچھا کیا آپ نے شاملِ اشاعت کی۔ نواب صاحب کی سلسلہ وار کہانی "رفتار" انجام کو پہنچی۔ ان سے گزارش ہے کہ ... ہمیں انتظار رہے گا۔ "بازی گر" ٹھیک جارہی ہے۔ بہت دوست پسند کر رہے ہیں۔ دیگر کہانیوں میں ساتواں پتھر، دوسرا سکندر، جاگی پالی کی عرضی (البیاہ)، آزمائش، تجربہ اچھی تحریریں ہیں۔ کچھ ابھی پڑھی نہیں۔ مطالعہ جاری ہے۔ "سب رنگ" کے دیگر لکھنے والوں کو بھی لے آئیں یا پھر ان کی تحریریں ضرور شاملِ اشاعت کریں۔ انوار صدیقی، اسد محمد خاں، ستار طاہر، رابعہ سلطان، محمد یونس حسرت، مصطفیٰ ارباب۔ ان کی کہانیاں "سب رنگ" کی زینت رہیں ہیں۔ والسلام۔"

سرفراز خان آفریدی، ٹنڈو الٰہ یار سے "مکرمی آداب! کاغذ کو آگ فوراً لگتی ہے۔ یہ قاعدہ ہے مگر دیا سلائی کے انجمن اس کا جلنا ہمارے عہد کے گراں فروش ساہوکاروں کا "پیشہ" ہے۔ آگ کے اس آزار پر برف کے پھاہے شگفتہ پھولوں کی صورت میں ایک مسیحا نے بکھیرے، جس کا نام "سب رنگ" ہے۔ سرورق کے بعد سرپوش الگ کیا تو مشامِ جاں، گلوں کی خوش بو سے توس قزح کے مانند مہک اٹھا۔ بہ ہر حال، تاخیر کی تحریر کے پیشِ نظر مرحبّے کی طرح پیڑ پیڑ اردو ادب کا عطیہ نوش جاں کیا۔ پہلی کہانی اشفاق احمد صاحب کی "اشرف اسٹیل مارٹ" پڑھی۔ قاری کی انگلی کو طفلِ نوزائیدہ کی طرح تھام کر چشم زدن میں "قبولیت سے رجولیت" اور "رجولیت سے قبولیت" کا سفر کرانا ان کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ اور صرف انھی کا ہے۔ کچھ چٹانیں چلتا کہ لب لفظوں کے مقہر سے تشنے سے "مَر مَر" کو مُر اور مُر سے کو مَر بنا دیں۔ یہ ظاہر سادہ سی بات، یہ باطن کس قدر مہذب ہے۔ اس کا اندازہ ہر کس و ناکس کا روگ نہیں۔ یہ جملے ملاحظہ کیجیے۔ "اشرف تو گھلنے ملنے سے واقف نہ تھا، سانتھا اس فعل سے بہ خوبی واقف تھی۔ اشرف اس وقت سانتھا کی معیت میں ایک ناپاک [illegible] ہاتھ کالی کالی پی رہا تھا۔" پہلے جملے میں "گھلنے ملے"، "فعل" اور "واقف" اور دوسرے جملے میں "معیت"، "ناپاک سینڈوچ" اور "کالی کالی" کے علاوہ گرگٹ جوڑی اور [illegible] اہلِ ذوق سے ڈھکی چھپی نہیں۔ جانگی بائی کی عرضی اور چراغِ آخر شب بھی اچھی لگیں۔ دوسری کہانیوں پر تبصرہ فی الوقت ممکن نہیں۔ امید ہے کہ واقعتاً اچھی ہوں گی۔ میں نے یہ کھا عموی طور پر اس [illegible] لکھا ہے جو برف کے پھاہوں کی صورت میں شاہ کار کہانیاں، پھولوں کی شکل میں کاغذ کی آگ پر بکھیر رہا ہے۔ اور خصوصی طور پر ناظم بخاری صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس قدر انتہائیت سے اپنے حلقۂ یاراں میں خوش آمدید کہا۔ اور یہ شکریہ ادا کرنا بہ ہر حال واجب تھا۔"

رانا شبیر احمد کا محبت نامہ، فیصل آباد سے "ساتھ نام اللہ کے جو رحمٰن و رحیم ہے اور دلوں کے بھید خوب جانتا ہے۔ واجب الاحترام، محترمی و مکرمی جناب مدیر اعلیٰ صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ! امید ہے آپ بفضلہٖ تعالیٰ بخیر و عافیت اور خوش و خرم ہوں گے۔ سب سے پہلے تو "اپنا اپنا رنگ" میں میرا تحریر کردہ خط شائع کرنے کا شکریہ قبول فرمایئے۔ ماہ اکتوبر کا شمارہ دیکھا اور چند کہانیوں کا مطالعہ بھی کیا۔ ہمیشہ کی طرح سرورق انتہائی دیدہ زیب ہے۔ ایک دوشیزہ بنی سنوری بیٹھی مغموم انداز میں شاید کوئی [illegible] یاد کر رہی ہے یا اپنے ماضی کو یاد کر رہی ہے۔ بہ ہر حال، ذاکر صاحب کی فن کارانہ صلاحیتوں کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ ربِّ ذوالجلال انھیں مزید جوش و جذبہ اور [illegible] عطا فرمائے اور وہ اسی طرح کے انمول اور لازوال شاہ کار تخلیق کرتے رہیں۔ "ساتواں پتھر، عشق کا شین اور رفتار" پڑھ کر حقیقی معنوں میں لطف اندوز ہوا۔ "ساتواں پتھر" اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک خوب صورت تحریر ہے اور اس کا اختتام پڑھنے کا شدت سے انتظار ہے۔ "عشق کا شین" تاریک دلوں میں اجالا کرنے والی [illegible] ہے۔ ایسی تحریر صرف علیم الحق حقی کے قلم سے ہی ممکن تھی۔ مجی الدین نواب کی "رفتار" واقعی ایک خصوصی سوغات ثابت ہوئی۔ اس جان دار اور طلسمی تحریر [illegible] کا انجام چونکا دینے والا اور عبرت انگیز ہے۔ "بازی گر" نئی سنسنی کروٹ لے رہی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ آپ "سب رنگ" کے صفحات کم کرتے جارہے ہیں۔ [illegible] جانگی بائی کی عرضی، تجربہ، نیل گوں دیوار اور چراغِ آخر شب" خوب صورت اور دل چسپ کہانیاں ہیں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ آپ نے "اپنا اپنا رنگ" شروع کر کے قارئین کا ایک دیرینہ خواہش پوری کر دی ہے۔ بازی گر "سب رنگ" کا ایک طویل ترین سلسلہ ہے۔ بابر زمان خاں کی اس امنگوں، حوصلوں، آنسوؤں اور آہوں سے لبریز داستان میں بعض مقامات پر واقعات کے تسلسل کو توڑ کر نئے واقعات کی گرہ لگا دی گئی ہے جو قارئین کو بُری طرح کھٹکتی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ جہاں جہاں بھی واقعات ادھورے رہ گئے ہیں انھیں وہیں سے شروع کر کے مختلف کرداروں کو منطقی انجام تک پہنچایا جائے۔ (بھئی رانا صاحب! پڑھنے والا اگر اس قسم کی باریکیوں سے واقف ہو تو لکھنے اور شائع کرنے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔) میں یہاں یہ عرض کرنے کی جسارت بھی کروں گا کہ "سب رنگ" کی تقریباً تمام کہانیوں اور تحریروں میں مختلف الفاظ کو توڑ مروڑ کر نئے سے نئے بیچ استعمال کیے جارہے ہیں۔ بہت سے قارئین اس "ناپسندیدہ تجربے" سے انجانی نالاں ہیں اور انھیں ایسی تحریر پڑھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف الفاظ کے جو انداز اور بیچ آپ استعمال کر رہے ہیں اگر کوئی طالب علم وہ بیچ امتحانات کے دوران جوابی پرچوں پر تحریر کریں تو پرچہ ہی جانچ کرنے والے اساتذہ ایسے تمام الفاظ کو کاٹ دیں۔ میری تنقید کو آپ ازراہِ نوازش "تنقید برائے تنقید" نہ سمجھیں اور میری آپ سے درخواست ہے کہ "سب رنگ" میں شائع ہونے والے تمام تر مواد کا بہ غور جائزہ لے کر اس جانب خصوصی توجہ دی جائے۔ ذرا سی بے پروائی کے نتیجے میں لفظ کچھ سے کچھ ہو کر صورتِ حال کو [illegible] بنا دیتا ہے۔ (حضرت اس بات پر پہلے ہی توجہ دے کر تبدیلی کا عمل شروع کرا دیا گیا ہے۔ یقیناً آپ یہ تبدیلی بھی محسوس کیے بغیر نہ رہیں گے۔) یقین واثق ہے کہ آپ تبصرۂ کتب پر [illegible] کی [illegible] بہت زیادہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمارا اپنا "سب رنگ" جو کر رہا ہے سب کو دنگ کر دیا ہے۔ پہلے نمبر پر ہے اور ہمیشہ پہلے نمبر پر رہے گا۔ والسلام۔ آپ کا نیاز مند۔"

سیّد شاہد علی شاہد، لاہور سے رقم طراز ہیں "مدیرِ محترم "سب رنگ" ڈائجسٹ! آداب عرض۔ اکتوبر کا شمارہ ہاتھوں میں آیا اور ایک گونا گوں طمانیت کسی ٹھنڈک کی طرح وجود میں اتر گئی کہ [illegible] "سب رنگ" واقعی رسم و وفا نبھا رہا ہے۔ بے شمار اس کے چاہنے والے تو پہلے ہی ایک ایثار پیشہ چلے آتے ہیں کہ ہمہ وقت اسی کو مقدم جانتے، اس کے نازنخرے [illegible] رہتے ہیں۔ گراں سے گراں کے لیے اپنی جاہت میں کمی نہیں کی، جرف نہیں آنے دیا۔ اشاعت کی یہ باقاعدگی "سب رنگ" کے شان دار ماضی کی طرح، اس کے حال اور مستقبل کو بھی [illegible] ہے۔ ان شاء اللہ۔ رسالے کے آغاز میں خطوط کی صورت، جس طرح قارئین کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے وہ لائقِ ستائش و تشکر ہے۔ اس ماہ بھی مختصر نامے پسند آئے۔ ناظم بخاری صاحب! اداکاری اور گھنا پیڑ کی قدر افزائی کے لیے شکریہ! آپ کا خط طویل مگر پُر لطف تھا۔ دیگر قارئین کے خطوط بھی اپنا اپنا رنگ ملا کر قوسِ قزح سی بنا گئے۔ [illegible] کہانیاں دشوار کام ہے کہ ہم سے اب یکسو ہو کر پورا پرچا پڑھا نہیں جاتا، بوجہ خرابیِ صحت۔ چند کہانیاں البتہ نظر نواز ہوئی ہیں۔ علیم الحق حقی "عشق کا شین" کے ساتھ

تشریف لائے ہیں۔ سنتے آئے ہیں وہ ایک معتبر قلم کار ہیں اور دیگر رسائل و جرائد میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ اِدھر اپنا یہ حال کہ "سب رنگ" کے علاوہ کچھ سوجھتا نہیں تھا، اسی کے عشق میں سر بہ سر ڈوبے رہے، اسی کو حرزِ جاں بنائے رکھا۔ لیکن اس کی اشاعت میں طویل ہوتے وقفوں سے گھبرا کر بسا اوقات دیگر رسائل کی جانب بھی مائل بہ مطالعہ ہوئے اور یہیں کہیں علیم صاحب کی "عشق کا عین" زیرِ نظر آئی تھی۔ غالباً دو یا تین اقساط پر پھیلی ہوئی ایک قابلِ قدر تحریر۔ بہ ہر حال، انھیں زیادہ نہیں پڑھا۔ "عشق کا شین" کی اٹھان متاثر کن ہے۔ نارسائی کا کرب ماتا کے آزار کو ڈگنا کر دیتا ہے تو پھر ٹھاکر کا دبدبہ اور راجپوتوں کی شان و آن ڈوبنے ڈوبنے لگتی ہے۔ اللہ جل شانہٗ قادرِ مطلق ہے، اس کی قدرت کے کھیل بھی نیارے ہیں۔ فرعون کے محل میں موسیٰؑ پلے اور ٹھاکروں کی حویلی میں شاید وقت کے کسی ولی، کسی برگزیدہ ہستی نے قدم اتارے ہوں، آئندہ اقساط بتائیں گی۔ تاریخی کہانی "دوسرا اسکندر" تشنہ کام رہی۔ یوں لگا جیسے ایک عورت کے چلتروں اور ایک مرد کی ہوس عالم گیری پر مبنی کسی داستان کا ابتدائیہ لکھا گیا ہو۔ اگر ممکن ہو تو شہاب الدین غوری، محمود غزنوی اور دیگر مسلمان فاتحین کی ہندوستان آمد اور معرکہ آرائیوں کے حقائق بھی "سب رنگ" کا پھر سے خاصہ بنائیں۔ جناب محی الدین نواب کی "رفاز" ہمیں خوش گمانی سے کہ طوفانی ہی رہی ہوگی۔ ابھی خود کو اس سے ہم آہنگ کرنے کی ہمت نہیں پاتے۔ لیکن اس کا مطالعہ کرنا ہم پر واجب، بلکہ قرض ہے۔ نواب صاحب بہت زیادہ لکھتے ہیں اور حیرت کی بات یہ کہ پھر بھی بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ان کی طبع زاد کہانیوں کے علاوہ بعض تراجم بھی ہمارے ذوقِ مطالعہ کو تسکین فراہم کرتے رہے۔ بائیس پچیس سال اُدھار شائع شدہ ان کی ایک کہانی "شکستہ صلیب" ابھی تک یاد ہے۔ اگرچہ انگریزی سے ماخوذ تھی۔ لیکن نواب صاحب سے ایک گلہ بھی ہے کہ "دیوتا" لکھتے ہیں! اور اب وہ کہانی جو عرصۂ دراز سے ہم پہ طاری ہے۔ ہم جسے حاصلِ مطالعہ کہیں۔ کیا انداز دلبری ہے اور کیا دل رُبائی، ایک صنم کدۂ ویراں میں کسی بہار کی کونپلیں پھوٹنے کی امید مسلسل کہ طویل آبلہ پائی اور جاں گسل جدوجہد ہی اس کے حصول کی شرط ٹھہری۔ جی ہاں، وہی "بازی گر" وہی دربہ دری، وہی دشت نوردی.. حالیہ قسط میں استاد ٹھل کا راج ٹیپل کے ساتھ رمز و کنائے سے بھرپور انداز گفتگو دل میں اُتر گیا۔ بار و دادا کے ساتھ چاتو چاتو کھیلنا، پھر بابر اور رگھوداوا کا آمنا سامنا.. کون سا کشمور دل ہوگا جو سکانہ ہو۔ اب آخر میں یہ کہ ہمیں بہت سارے حقائق کا علم نہ ہو گا لیکن "امبر بیل" کے آخری باب کے لیے ہماری فریاد جاری رہے گی۔ یہ مدیرِ محترم، آپ کا کام ہے کہ کسی بھی طرح ان سے یہ حصہ اگلوائیں۔ ہم آپ کے اور ان کے بھی شکر گزار، بلکہ قرض دار ہو جائیں گے۔ (پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ! ان شاللہ یہ بھی ہو جائے گا۔ اور اُن سے اُگلوائیں گے نہیں، بلکہ لکھوائیں گے! ہم کوششیں کر رہے ہیں آپ دعائیں کریں۔)

پیرزادہ ساجد شکیل کا مکتوبہ نظر، ملتان سے "محترم راشد ملک صاحب! السلام علیکم۔ میں کافی عرصے سے "سب رنگ" پڑھ رہا ہوں۔ اکتوبر کا "سب رنگ" پڑھا۔ بلاشبہ آپ اسے اکیس ویں صدی میں لے گئے ہیں۔ "اشرف اسٹیل مارٹ، جانگی بائی کی عرضی، ملال، چراغِ آخرِ شب" جیسی کہانیاں شائع کر کے "سب رنگ" کا ہی کام ہے۔ محی الدین نواب، علیم الحق حقی جیسے قلم کاروں کو "سب رنگ" میں لا کر آپ نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا جس کے لیے آپ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اب طاہر جاوید مغل سے بھی "سب رنگ" کے لیے لکھوایئے۔ براہِ مہربانی "بازی گر" کے اوپر یہ لکھنا چھوڑ دیجیے کہ وہ تحریریں جن کا انتظار کیا جاتا ہے، اس کہانی میں کسی قسم کی کوئی کشش اور دل چسپی باقی نہیں رہی ہے۔ ٹھل دادا کو بدمعاش سے ایک دم بھاٹ بنا دیا گیا ہے۔ "بازی گر" کا انجام یہ خوبی جانتے ہیں۔ پہلے مصنف نے "انکا" میں کلدیپ کو مروا کر مالا جمیل احمد خان کے حوالے کی تھی "اقابلا" میں اقابلا کو مروا کر ریتا جا بن یوسف کے ساتھ ختم کی تھی... اور اب کورا کو مار کر زرّیں بابر زماں خاں کو سونپی جائے گی۔ آخر میں ایک تجویز ہے کہ رسالہ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے لہٰذا اس کی قیمت میں 10 روپے کا اضافہ کر کے صفحات بڑھا دیے جائیں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔"

ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی، راول پنڈی کینٹ سے مدح سرا ہیں "بے حد محترم و مکرم راشد ملک صاحب! السلام علیکم۔ خوب صورت نازک سا ناسٹل ذاکر صاحب کی مُنہ بولتی تعریف تھا اور مجھے تو ایسا لگا کہ عرصۂ دراز کے بعد سب رنگ "اپنا اپنا رنگ" لے کر آیا تو چہیتہ مد جیتہ بھی سکھ اور چین کا سانس لے کر کچھ ستانے لگی ہے۔ واہ! پھر زیشان حیدر اور عمر صدیقی کی کاوشوں کو اشتہارات کی خوب صورتی کے جلو سے انھیں سراہتے ہوئے 'سادہ خوب صورت ترین فہرست اصول پر جا کر رُک گئے۔ یہ پڑھ کر ہی دل کو تقویت ہوئی کہ شان دار انتخاب کیا گیا ہے اور "اپنا اپنا رنگ" میں تو قدر دانوں نے ایسے ایسے تبصرے کیے اور بھرپور جذبات کا اظہار کیا کہ دل باغ باغ ہو گیا۔ ایک بات تو تسلیم شدہ ہے کہ قارئینِ سب رنگ خاردار راہوں پر چلتے چلتے "سب رنگ" کے سنگ ہی رہے! روح کی گہرائیوں میں یہ رنگ بسا رہا، وقفہ آتا رہا اور ہماری حالت تو بقول شاعر یہ تھی۔

اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے
اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

اور جب آنا جانا شروع ہُوا تو پروانوں کی جان میں جان آئی۔ نیا خون تو مدیر اعلا اور میرے "جان دار" مدیر نے دے ہی دیا جس سے قارئین کے چہروں پر رونق آتی گئی! کیوں کہ نئے چاند کے ساتھ ساتھ ہمارا دل رُبا چاند "سب رنگ" بھی ہر ماہ آسمانِ ڈائجسٹ پر پوری شان و شوکت سے جلوہ گر ہُوا کرے گا۔ آپ لوگ صحیح معنوں میں نئی زندگی کی طرف گامزن ہیں اور جب کوئی دوسروں کی خوشیوں کی خاطر جینے کا سلیقہ سیکھ جائے تو سارے رنگ، سب رنگ بن کر سامنے آتے ہیں۔ اکتوبر میں کس کس کی تعریف کی جائے! ہاں انوکھا انداز، دل کو موہ لینے اور اتر جانے والا خیال، نئے طرز پر تاریخی کہانی "دوسرا اسکندر" واہ وا! آج تک اتنی دل چسپی اور پورے ذوق شوق سے تاریخی کہانی کبھی نہیں پڑھی۔ اور نعرہ یہ ہے کہ "سب رنگ" پھر ایک بار سب کو مات دے گیا۔ انفرادیت کی انتہا تھی۔ ڈھیروں مبارک بادیں۔ محی الدین نواب جی، آپ نے تو تہلکہ مچا دیا۔ اور ہر ماہ آیا کریں، وگرنہ یہ آنگن سونا سونا سا لگے گا۔ اور یہ حقی جی کا 'دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اترنے والی تحریر کے ساتھ ساتھ دماغ کو آکسیجن بڑھانے والے "عشق کا شین" ایک انمول تحفہ ثابت ہُوا۔ اور جناب اردو کا عطر، کبھی کبھی لکھی جانے والی شاہ کار، حساس قارئین کے لیے غیر معمولی کہانی، عالمی ادب کا شاہ کار ہو یا پھر آزمائش کی کہانی اور کس کس کہانی کو یاد کر کے تعریف لکھوں! اور ہاں یہ دو نام علیم شام اور شگفتہ شام میں کوئی رشتہ ہے؟ (جی ہاں، بہت ہی خوب صورت اور مضبوط رشتہ ہے) ہاں آپ کو چلتے چلتے بتاؤں کہ میں نے خیر خیریت کے لیے لاہور اپنے بہت ہی پیارے محترم دوست اور ہم زلف جناب ضیاء الحق (ریٹائرڈ سینئر آڈیٹر) کو فون کیا۔ انھوں نے سلام دعا کے بعد یکدم "سب رنگ" کی باتیں شروع کر دیں۔ پرانے

ترین قارئین میں سے ہیں۔ مجھے کہنے لگے کہ بھئی، خط لکھیں تو آپ سب کو بے حد سلام اور دعائیں۔ پھر کہنے لگے "یار بس اگلا ماہ بھی آیا کہ آیا اور "سب رنگ" بھی! صحت اور اپنائیت کی انتہا ہے! بہ ہر حال، محترم راشد ملک اور جناب شکیل عدنان و تمام احباب مجلس! آپ لوگوں نے نہ صرف زمانہ بدلا، بلکہ وقت کو بدل دیا اور بہت سے قارئین کو بھی بدل دیا ہے! اور "سب رنگ" کے رنگ ہر گھر میں خوب صورت رنگوں کی بارش کرتے رہیں! یہ نہ صرف ایک ڈائجسٹ ہے، بلکہ ایسی دستاویز ہے جسے اگلی نسلیں بھی اسی ذوق شوق سے زیرِ مطالعہ لائیں گی جس سے اس وقت ہم! اللہ ذوالجلال والاکرام سے خاص دعا ہے کہ آپ لوگوں کو عمرِ خضر عطا فرمائے اور صحتِ جاوداں سے ہم کنار رکھے، آمین ثم آمین۔ دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھیے گا۔ گوشۂ گم شدہ پر بھی توجہ دیتے رہیں! بے حد دعاؤں کے ساتھ۔"

محمد سلیم بیکانیری کا نامۂ شوق، لیاقت آباد نمبر 10، کراچی سے "محترم جناب مدیر اعلا راشد ملک صاحب! آداب۔ بزم میں شرکت کا اذن چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے مبارک باد پوری جماعت کو اور جو صاحبان اس سفر میں بچھڑ گئے، انھیں خراجِ عقیدت! سب رنگ کے لیے کیا کہوں۔ بچپن سے اردو سے لگاؤ تھا، "سب رنگ" نے اسے جلا بخشی، اس طرح شعر و ادب سے عشق سا ہو چلا ہے۔ عمر کی 50 منزلیں طے کر چکا ہوں حاضری میں تاخیر کا باعث علالت ہے۔ دل آمادۂ غضب ہے۔ اس شوریدہ سر کی طنابیں کھینچنے میں وقت لگ رہا ہے لیکن یہ تو عمر بھر کا روگ ہے۔ امید ہے آپ اور عاشقانِ "سب رنگ" دعا کریں گے۔ انکا، اقابلا، جیسے طلسماتِ ہوش رُبا... امبر بیل، بازی گر، جانگلوس، ناخدا جیسے سلسلے زندگی کے ہزار ہا رنگ، اردو ادب سے شاہ کار کہانیاں، مغربی ادب سمیت دنیا جہاں کے ادب کا ترجمہ، کیا کہانہ پڑھوایا۔ زندگی کے اتنے رنگ، اتنے رُخ، حاصلِ زندگی گر" نے کمال کر دیا۔ تعریف کے لیے لکھوں تو خط بہت طویل ہو جائے گا، اس کا مطالعہ میرا سرمایۂ افتخار ہے۔ لگتا ہے، کسی بڑی خواہش کی تکمیل ہو گئی ہے۔ "سب رنگ" محض ڈائجسٹ نہیں ہے یہ تو کوئی پیاس ہے، کوئی آرزو ہے، کوئی تمنا ہے، کوئی دوسرا قدم ہے دشتِ امکاں میں۔ اس کا مطالعہ محض تسکینِ دل و وقت گزاری نہیں ہے، یہ تو علم ہے، محبت ہے، کچھ سے کوئی اکتساب ہے، آگہی ہے۔ اس سے تو زندگیوں میں سنوار لایا جا سکتا ہے۔ میں تو اسے اردو نثر کا اسکول آف تھاٹ کہوں گا۔ بزم "اپنا اپنا رنگ" میں شریک محترم عاشقانِ "سب رنگ" کو میری طرف سے نیک تمنائیں اور صفِ مژگاں پہ چمکتے موتیوں کا سلام۔ خصوصاً جناب سید شاہد علی شاد صاحب کی پہلی اور دوسری حاضری نے دل موہ لیا۔ ان کے خط کے مندرجات میرے دل کی ترجمانی ہے اور یہ درد مشترک ہے۔ نئی تزئین و آرائش بہت اچھی ہے اور گذشتہ سے پیوستہ ہے۔ "بازی گر" کے صفحات میں اضافہ کریں۔ گو کہ اب ہم ہمراہ سیر ہو رہے ہیں مگر بقول فراق

معلوم ہے سیرابی سرِ چشمۂ حیواں؟
بس تشنہ لبی، تشنہ لبی، تشنہ لبی ہے

ایک تجویز ہے کہ طنز و مزاح سے متعلق بڑے لکھاریوں کی تحریریں خال خال نظر آتی ہیں، اسے مستقل کرنے کی کوشش کریں۔ خاص طور پر جناب شفیق الرحمان، کرنل محمد خان، پطرس بخاری، ابنِ انشا اور جناب مشتاق احمد یوسفی صاحب، انور مقصود صاحب سے بھی استفادہ کریں۔ آخر میں "سب رنگ" کے لیے

مدتیں قید میں گزریں مگر اب تک صیاد
ہم اسیران قفس، تازہ گرفتار سے ہیں"

حاجی لیاقت علی خٹک کا خیال، پھلروان ضلع سرگودھا سے "محترم جناب محمد راشد ملک! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ "سب رنگ" میں اردو، ہندی اور دوسری زبانوں کے ادب کی کہانیاں اور تخلیقات سب رنگ کی زینت بنیں۔ اور سب رنگ کے عظیم سلسلے جنھیں یادگار سلسلے کہوں گا، "سب رنگ" میں پڑھنے کو ملے۔ "اقابلا، انکا، سونا گھاٹ کا پجاری، غلام روحیں، امبر بیل، بازی گر" جنھوں نے ہمیں "سب رنگ" کا عاشق بنا دیا۔ سب رنگ جب بھی ملتا ہے تو سب سے پہلے "بازی گر" پڑھتا ہوں۔ اس سلسلے نے دل و دماغ کو اپنا اسیر بنا لیا ہے، بلکہ اس کہانی نے ہمیں اپنا حصہ بنا لیا ہے۔ براہِ کرم اسے انجام تک پہنچائیں۔ امبر بیل کا بقیہ حصہ بھی پڑھوائیں! استدعا ہے۔ یہ قارئین کی طرف سے آپ پر قرض ہے۔ محترم سید شاہد علی شاد صاحب نے ہمارے جذبات و احساسات کی تعبیر کے شمارے میں بہت اچھی ترجمانی کی ہے۔ میں 1970ء سے "سب رنگ" پڑھنا شروع کیا۔ وہ کوئی سال نامہ یا پُراسرار کہانی نمبر تھا۔ اس کے بعد تو "سب رنگ" دل میں جاگزیں ہو گیا۔ 39 سال کا عرصہ ہونے کو آیا ہے اور اس سے وہی عشق و محبت، بے قراری، اضطراب روز اوّل کی طرح اب بھی دل و دماغ میں ہے۔ جناب محمد اشفاق صاحب نے پنڈوڑہ راول پنڈی سے بھی ہمارے دل کی بات کہہ دی ہے۔ میری طرح اور بھی بے شمار لوگ اس کے عاشق ہوں گے اور ان کے دلوں کا بھی یہی عالم ہوگا، جو ہمارا ہے۔ دل میں بہت کچھ کہنے کے لیے ہے۔ پھر کبھی آئندہ سہی۔ آپ کے لیے "سب رنگ" کے پورے عملے کے لیے جو بھی "سب رنگ" کو قارئین کے ہاتھوں تک پہنچانے میں حصہ لیتا ہے، دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور پورے عملے کو امن و امان، صحت، تن درستی اور عافیت عطا فرمائے۔ "سب رنگ" کا معیار واقعی بہتر ہو رہا ہے۔ "عشق کا شین" کے لیے علیم الحق حقی صاحب کو مبارک باد۔ اکتوبر کے شمارے سے واقعی محسوس ہو رہا ہے کہ آپ لوگوں نے بہت معیاری کہانیاں اور ادب کا گوشہ پیش کیا۔ "دوسرا سکندر، اشرف اسٹیل مارٹ، جانگی بائی کی عرضی اور فرار" بہت اعلا معیار کی کہانیاں تھیں۔ "سب رنگ" کی جان آپ بیتیاں، پُراسرار اور دیومالائی کہانیاں اور سلسلے ہی ہیں۔ انھیں کبھی بند نہ کیجیے گا۔ "سب رنگ" کے لیے پھر دعا گو ہوں کہ یہ اس کے عشاق کو ہمراہ ہا قاعدگی سے ملتا رہے اور اللہ تعالیٰ اسے دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ والسلام۔"

فاروق احمد کا مختصر نامہ، لاہور سے "محترم مدیر اعلا! السلام علیکم۔ شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ کی محفل میں شامل ہو رہا ہوں۔ آپ نے میری خواہش کی تکمیل کرتے ہوئے تاریخی کہانی "سب رنگ" میں دی۔ اس کہانی کے بارے میں، اپنا شعر آپ کی نذر کرتا ہوں۔

صحرا صحرا چلتا رہا، پیاسا نہ رہا میں
ڈوب کر دریا میں بھی کیوں بجھی نہ میری پیاس

مہربانی کر کے تاریخی کہانی کے صفحات بڑھائیں۔ "سب رنگ" کے مصور ذوالفقار آذین اب اس معیار کی تصاویر نہیں دے رہے ہیں جو کہ اس رسالے کے مطابق ہونی چاہئیں۔ سرورق کے رنگ بھی بدل دیا کریں، اکثر لال رنگ کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ آخری صفحات پر خاص کہانی دیں اور آخری صفحے پر کارٹون دیں۔"

ساتواں پتھر

ہیرلڈ روبنز/عَلیم شام

زندگی کے بارے میں بہشت کچھ سوچا، بہشت کچھ لکھا گیا اور لکھا جاتا رہے گا۔ سوچیں تو زندگی ایک جام بھی ہے اور مشروب بھی۔ جیسے انسانوں کی شکلیں مختلف ہیں ویسے ہی کسی کو چھوٹا جام ملا، کسی کو بڑا۔ اور یہ مشروب بھی عجیب ہے۔ جس کے ہر گھونٹ کا رنگ بھی مختلف اور ذائقہ بھی جدا۔ ایک گھونٹ میں شہد کی شیرینی ہے تو دوسرے میں زہر کی تلخی۔ اور پسند آئے نہ آئے، ہر گھونٹ پینا پڑتا ہے۔ اور مشروب ختم ہو جائے تو جام ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔

یہ گھونٹ گھونٹ زندگی کی کہانی ہے جسے پڑھتے ہوئے کبھی آپ کے منہ میں حلاوت گھل جائے اور کبھی حلق تک کڑواہٹ کی لکیر سی کھنچ جائے گی۔ یہ کہانی کبھی آپ کو مسکرانے پر مجبور کرے گی اور کبھی آپ کو اُداس کر دے گی۔ یہ عالمی ادب کے بہشت قد آور ناول نگار ہیرلڈ روبنز کی تحریر ہے۔ ۵۵ء میں لکھے جانے والے اس ناول کا اسلوب آپ کو حیران کر دے گا کہ یہ آج بھی اتنا ہی تازہ، اتنا ہی منفرد اور اتنا ہی جدید ہے۔ یہ اس کہانی کی خوش قسمتی ہے کہ ترجمے کے لیے اسے ایک بے حد معتبر قلم کار میسر آگیا ہے۔ اس کا ترجمہ آپ کو اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دے گا بلکہ آپ خود کو کہانی میں شامل محسوس کریں گے۔ آیئے... ڈیفی فشر کے ساتھ رحم، مادہ پرست دُنیا میں گھوم پھر کر دیکھیں زندگی دو گھونٹ تو لے کر دیکھیے اور بتایئے کہ کیسا لگا۔

زندگی گزارنے والوں کے لیے ایک زندہ انسان کی رُوداد

یادداشت میں، تبدیلی لانے والا دن

یکم دسمبر 1932ء

غلط تھا... سب کچھ غلط تھا۔ کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ جیسے ہی میں پیدل اپنے گھر جانے کے بجائے چرچ ایونیو پر پی ایم ٹی سب وے میں داخل ہُوا، مجھے اس لمحے اس کا احساس ہو گیا تھا۔ اس صبح جب میں اٹھا تو مجھے احساس ہُوا کہ میرے حلق میں کوئی گولا سا پھنسا ہُوا ہے۔ میں نے گلے کو حرکت دی مگر میری کیفیت نہیں بدلی۔ بلکہ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اور خراب ہو گئی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہاں سے درد کی لہریں نیچے اتر کر میرے پورے جسم میں پھیل رہی ہیں۔ میں اسکول سے گھر واپس جا رہا تھا۔ لیکن نہیں... میں گھر واپس نہیں جا رہا تھا۔

اسٹیشن پر ایکسپریس کھڑی تھی۔ میں اس کی طرف لپکا۔ دروازے بند ہو رہے تھے کہ میں اندر گھسا۔ کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ میں سامنے والے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ دروازہ صرف اٹلانٹک ایونیو کے اسٹیشن پر کھلتا تھا۔ تو میں یہاں قدرے الگ تھلگ، کمپارٹمنٹ کے ہنگامے سے دُور کھڑا رہ سکتا تھا۔

ٹرین میں ٹھنڈ تھی۔ میں نے اپنی جیکٹ کا کالر کھڑا کر لیا۔ چند روز پہلے برف باری ہوئی تھی۔ مگر اب سڑکوں کی صفائی ہو چکی تھی۔ البتہ ٹرین کی پٹڑی پر کہیں کہیں برف موجود تھی۔

ٹرین سرنگ میں داخل ہوئی تو جیسے اس نے دن کو نگل لیا۔ میں نے گہری سانس لی اور اپنی اندر کی اذیت کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ اذیت کا احساس اور بڑھ گیا۔

صبح میں نے بندھے ہوئے سامان کو، اور اجنبی اور نامانوس لگنے والے خالی خالی کمروں کو، جو کبھی میرے اپنے تھے بڑی حسرت سے دیکھا تھا۔ وہ سب دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ آج ہم وہ گھر چھوڑ رہے ہیں۔ میں نے اپنے کمرے پر پلٹ کر الوداعی نگاہ بھی نہیں ڈالی۔ ریلسی میرے پیچھے پیچھے تھی۔ میں سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ یہ بھی کہ میں کبھی بچہ تھا، جس نے یقین کر لیا کہ یہ گھر اس کا ہے۔ اب تو میں بڑا ہو چکا ہوں۔ جانتا ہوں کہ وہ بھی اسی طرح کی ایک کہانی تھی جیسی کہانیاں بچوں کو سنائی جاتی ہیں۔

ٹرین میں اچانک دن کی روشنی پھر در آئی۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا۔ ٹرین اب مین ہٹن برج پر سے گزر رہی تھی۔ اگلے اسٹاپ پر مجھے اترنا تھا، وہاں سے مجھے براڈوے۔ بروک لین کی ٹرین پکڑنا تھی۔

ٹرین پھر سرنگ میں داخل ہوئی، اور ایک منٹ بعد دروازے کھلنے لگے۔

چند منٹ بعد میں دوسری ٹرین میں بیٹھ گیا۔ پونے چار بجے میں ایسیکس اور ڈیلانسی کے کارنر والی سڑک پر تھا۔

وہ ایک بالکل مختلف دنیا تھی۔ سڑکیں پُر ہجوم تھیں۔ فٹ پاتھ پر کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی جارہی تھیں۔ سڑکوں پر ٹھیلے والے بھی تھے۔ اخبار فروش اپنے اپنے اسٹینڈ پر کھڑے چٹ پٹی خبریں نشر کر کے راہ گیروں کو اخبار خریدنے پر اکسا رہے تھے۔ خوانچہ فروش چوکنے تھے کہ پولیس والا آتا نظر آئے تو فوراً آگے بڑھ لیں۔ سردی ہورہی تھی لیکن بہت لوگ ایسے تھے جنھوں نے اوور کوٹ نہیں پہنے تھے۔ عورتوں نے کندھوں پر شالیں ڈالی ہوئی تھیں۔ مجھے تو وہاں ہر طرف غربت نظر آرہی تھی۔ بچوں کے علاوہ کسی کے ہونٹوں پر ہنسی نہیں تھی، اور بچوں کی ہنسی بھی گھٹی گھٹی تھی۔

میں ڈیلانسی اسٹریٹ پر چل دیا۔ وہاں سستے اسٹورز تھے جن پر 'سیل' کی تشہیر ہورہی تھی۔ آگے کچھ سینما ہاؤس تھے۔ میں کلنٹن اسٹریٹ پر بائیں جانب مڑا۔ میں سر جھکائے چل رہا تھا۔ دو بلاک آگے اسٹان ٹن تھا۔ میں گردوپیش کو دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ حلق کی تکلیف اب پیٹ کی اینٹھن میں تبدیل ہوچکی تھی۔

پھر اچانک میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور وہ مجھے نظر آئی۔ وہ گرے کلر کی پرانی عمارت تھی... پانچ منزلہ، اس کی رنگ وروغن سے محروم کھڑکیاں چھوٹی اور تنگ تھیں۔ داخلی دروازے کے سامنے چبوترا تھا۔ چبوترے کے ایک طرف ایک اسٹور تھا اور دوسری طرف درزی کی دکان۔ اس کی ایک کھڑکی اندھیری اور گرد آلود تھی اور دوسری بالکل خالی۔

ہچکچاتے ہوئے میں اندر داخل ہُوا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ لینڈنگ پر پہنچ کر میں نے نیچے سڑک کو دیکھا۔ تو یہ وہ جگہ ہے جہاں اب ہم رہیں گے! ایک فلیٹ سے ایک عورت نکلی اور سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس کی سانسوں سے مجھے لہسن کی بُو آئی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سڑک پار کی، وہاں وہ ایک ریڑھے کے پاس رکی اور بھاؤ تاؤ کرنے لگی۔ اس کا انداز خاصا جارحانہ تھا۔

میں پلٹ کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر اندھیرا تھا۔ ایک دروازے پر کسی چیز سے مجھے ٹھوکر لگی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ وہ ایک پیپر بیگ تھا جس میں کچرا بھرا تھا۔ میں نے اسے جلدی سے وہیں چھوڑا اور زینے پر چڑھنے لگا۔

کچرے کا ویسا ہی بیگ ہر لینڈنگ پر موجود تھا۔ وہ دروازے پر چھوڑ دیے جاتے تھے۔ صبح خاکروب انھیں اٹھا کر لے جاتا تھا۔ ہر گھر کے ہال وے میں کھانوں کی خوش بو رچی ہوئی تھی۔

تین منزل اور اوپر چڑھ کر مجھے جس دروازے پر سامان کے کارٹن رکھے نظر آئے، میں نے سمجھ لیا کہ وہی ہمارا فلیٹ ہے۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ ماما نے دروازہ کھولا۔ ہم چند لمحے کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوگیا۔ میرے پاپا میز پر بیٹھے تھے۔ اندر کہیں سے میسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں کچن میں کھڑا تھا۔ دیواروں پر عجیب ہی طرح کا سفید پینٹ تھا جو نیچے موجود گندے دھبّوں کو چھپانے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔ میز کے ساتھ چھوٹی کھڑکیوں پر ماما نے زرد پردے لٹکا دیے تھے جو ایک زبردستی کی خوش گواریت کا تاثر ابھار کررہے تھے۔

ماما پُرتشویش نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں، اسی وقت دوسرے کمرے سے ریکسی نکل کر بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی۔ وہ دُم ہلا رہی تھی۔ میں نے جھک کر اُس کی کمر تھپکی دی۔

''اچھا ہے۔'' میں نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

ایک لمحہ خاموشی رہی۔ میں کن انکھیوں سے ماما اور پاپا کو دیکھ رہا تھا۔ ماما اور پاپا ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر ماما نے کہا۔ ''یہ اتنا برا بھی نہیں ہے ڈینی۔ تھوڑا عرصہ ہی تو یہاں گزارنا ہے... تمھارے پاپا کے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے تک۔ آؤ، میں تمھیں باقی کمرے دکھاؤں۔''

میں ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہاں دیکھنے کو کچھ ایسا تھا بھی نہیں۔ چار کمروں کے چھوٹے اپارٹمنٹ میں ہو بھی کیا سکتا ہے۔ میرا کمرا پرانے والے میرے گھر کے کمرے کا آدھا بھی نہیں تھا۔ ماما پاپا کا کمرا بھی بہت چھوٹا تھا۔ بیچ کی بالکل کاؤچ پر سونا تھا۔

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کمروں میں بھی وہی پینٹ تھا جو میں کچن میں دیکھ چکا تھا۔ ایسے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔ کرایہ اس کا کم تھا اور یہی سب سے اہم بات تھی۔ 28 ڈالر ماہانہ، تمام بلوں سمیت۔

ہم کچن میں واپس آئے۔ ریکسی اس تمام عرصے میں میرے پیچھے لگی رہی تھی۔ پاپا نے اب تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ خاموشی سے سگریٹ پیتے رہے تھے۔ ان کی نظریں

الوئہ مجھ پر جمی تھیں۔

میں نے ریکسی کے کان میں گدگدی کرتے ہوئے ان سے پوچھا۔ ''اس نے پریشان تو نہیں کیا؟''

انھوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، ذرا بھی نہیں۔'' ان کا لہجہ رسمی تھا اور آواز اجنبی۔ وہ ان کی آواز لگ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ خود بھی تو پہلے جیسے نہیں لگ رہے تھے۔

''بہتر ہے، تم اسے باہر لے جاؤ ڈینی...'' ماما نے کہا۔ ''یہ پورے دن باہر نہیں نکلی ہے۔ شاید اسے حاجت ستا رہی ہوگی۔''

میں خوش ہُوا کہ کچھ کرنے کو تو ملا۔ میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے ریکسی کو پکارا۔

''اسے زنجیر سے باندھ کر لے جانا۔ اجنبی جگہ ہے۔ کہیں یہ کھو نہ جائے۔'' پاپا اٹھ کر میری طرف آئے۔ ان کے ہاتھ میں زنجیر تھی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں زنجیر کو ریکسی کے پٹے سے منسلک کر کے باہر نکل آیا۔

آدھی سیڑھیاں اتری تھیں کہ مجھے جھٹکا لگا۔ ریکسی اوپر ہی رک گئی تھی۔ میں نے اسے پکارا۔ ''آؤ نا بے بی۔'' لیکن وہ نہیں ہلی۔ میں نے اسے چمکارا، پکارا۔ وہ پیٹ کے بل فرش سے چپک کر دُم ہلانے لگی۔ وہ بہت نروس تھی۔

میں پلٹ کر اوپر گیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''اب بالکل خفی نہ بنو۔ چلو میرے ساتھ۔''

بالآخر وہ نیچے اتری۔ وہ ڈری ڈری میرے پیچھے آرہی تھی۔ ہر لینڈنگ پر مجھے اسے چمکارنا پڑ رہا تھا۔ چبوترے پر وہ رش اور سڑک کا جائزہ لینے لگی۔ پھر اس نے گھبرا کر واپس بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن زنجیر نے ایک جھٹکے سے اسے روک دیا اور وہ گر پڑی۔ میں اس کے پاس گیا اور اس کے پاس بیٹھ کر اس کی کمر کو سہلانے لگا۔ اس کے پورے جسم میں لرزش تھی۔ میں اسے گود میں اٹھا کر چبوترے تک لے آیا۔

باہر سڑک پر وہ اتنی خوف زدہ نہیں تھی۔ لیکن جب ہم کلنٹن اسٹریٹ پر آگے بڑھے تو وہ سہم کر اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ ٹریفک کا شور اسے خوف زدہ اور نروس کررہا تھا۔

اگلے بلاک پر ٹریفک قدرے کم تھا اس لیے میں اس طرف چلنے لگا۔ ایک کینڈی اسٹور کے سامنے میں رک کر ٹریفک کی بتی کا رنگ بدلنے کا انتظار کرنے لگا۔ ہمارے قریب سے ایک بڑا ٹرک کھڑکھڑاتا ہُوا گزرا تو ریکسی نے بھڑک کر خود کو چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ مجھے اس کے سینے کی خرخر صاف سنائی دی، اور حلق سے نکلنے والی گھٹی گھٹی آوازیں تو تھیں ہی واضح۔ اس کی دُم دونوں ٹانگوں کے درمیان دبی تھی جو اس کے حد درجہ خوف زدہ ہونے کی علامت تھی۔ اب وہ صحیح معنوں میں دہشت زدہ تھی۔ میں نے جھک کر اس کا سر سہلایا۔ اس وقت عقب سے ایک سفاک ہنسی سنائی دی۔

میں نے مڑے بغیر سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ تقریباً میرے ہم عمر تین لڑکے کینڈی اسٹور کے سامنے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک ریکسی کی کیفیت پر ہنس رہا تھا۔ انھوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھا تو ہنسنے والے لڑکے نے کہا۔ ''کیا بات ہے پال، تمھاری کتیا ڈرپوک ہے۔''

یہ اس علاقے کا خاص لفظ تھا... پال! وہاں کی بولی کا حصّہ۔

''تم سے زیادہ نہیں ہے پال۔'' میں نے جل کر کہا۔ میں اب بھی ریکسی کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کررہا تھا۔

دوسرے دونوں لڑکے میرا جواب سن کر سناٹے میں آگئے۔ وہ متوقع نظروں سے اپنے ساتھی کو دیکھنے لگے۔ اس نے ایک پل ان دونوں کو معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر وہ بدمست سانڈ کی طرح لہراتا ہُوا میری طرف بڑھا۔

میں اس سیٹ اپ کو خوب پہچانتا تھا۔ اب یہ اس کی عزت کا سوال تھا۔ میں آپ ہی آپ مسکرایا۔ وہ خود ہی اپنی شامت بلا رہا تھا۔ اسے تو حیران ہونے کا موقع بھی بہت تاخیر سے ملنا تھا۔

میں کچھ بہتر محسوس کرنے لگا۔ اس ممکنہ لڑائی کے تصوّر نے میرے پیٹ کی اینٹھن خاصی کم کردی تھی۔

وہ میرے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا لیکن ریکسی کو بہ دستور تھپتھپاتا رہا۔ ''تم نے کیا کہا پال؟'' اس نے دھیرے سے کہا۔

میں مسکرایا۔ ''تم بہرے نہیں ہو پال۔ جو میں نے کہا، وہ تم نے صاف اور واضح سنا تھا۔'' میں نے اس کی آواز اور لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ پھر میں اٹھ کر کھڑا ہونے لگا۔

میں نے اس کے پاؤں کو حرکت میں آتے دیکھا۔ لیکن جواباً میں اتنی تیزی سے حرکت نہیں کرسکا۔ اس کا جوتا میرے مُنہ پر لگا اور میں پیچھے کی طرف الٹ کر گرا۔ ریکسی کی زنجیر میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں نے خود کو سنبھالنے اور زنجیر کو دوبارہ پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن میں پیچھے کی طرف گر رہا تھا۔ زنجیر دُور ہوتی گئی۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ میں نے سر کو جھٹکا۔ اسی لمحے مجھے چیخ سنائی دی۔

میں گھبرا کر تیزی سے اٹھا۔ اپنی تکلیف اور وہ لڑائی میں دونوں کو ہی بھول گیا۔ ریکسی بیچ سڑک پر ٹریفک کے درمیان

اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کبھی وہ آگے لپکتی کبھی پیچھے آتی۔

''ریکسی!'' میں نے چیخ کر اسے آواز دی۔

میری آواز سن کر وہ پلٹی اور میری طرف آنے لگی۔ پھر میں نے اس کی لرزہ خیز چیخ سنی اور اسے ایک ڈیلیوری ٹرک کے پہیوں کی اوٹ میں غائب ہوتے دیکھا...

وہ ٹرک کارنر سے تیزی سے مڑا تھا۔ ڈرائیور سگنل کی روشنی سرخ ہونے سے پہلے ٹرک کو اس طرف موڑنا چاہتا تھا اور اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہا تھا۔

ریکسی ایک بار پھر چیخی۔ مگر وہ بے حد کم زور آواز تھی۔ میں اس کی طرف بھاگا۔ وہ فٹ پاتھ کے قریب پڑی تھی۔ اس کا سینہ پھول پچک رہا تھا۔ اس کی خوب صورت، چمک دار براؤن کھال اس کے اپنے خون اور سڑک کی گرد میں لپٹی ہوئی تھی۔

میں گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''ریکسی۔'' میں نے اسے پکارا۔ میری آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھایا تو ایک ہلکی سی سسکی سنائی دی جیسے کوئی آہ! اس کی آنکھوں میں اذیت تھی۔ اس نے زبان باہر نکالی اور بڑی نقاہت سے اس نے میرے ہاتھ کو نرمی سے چاٹا۔ میرے ہاتھ پر اس کے خون کا دھبا نقش ہو گیا۔

میں نے اسے سینے سے لگایا ہُوا تھا۔ اس کا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ جھٹکے لے رہا تھا۔ پھر اس کے مُنہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔ جیسے سانس رک رہی ہو اور کوئی سانس لینے کی کوشش کرے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ اس کے نچلے ڈھیلے ہو کر لٹک گئے۔ اس کی آنکھوں کی روشنی ایسے بجھ گئی جیسے ان پر موجود بلب فیوز ہو گئے ہوں۔

مجھے احساس بھی نہیں تھا کہ وہاں لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ ایک آدمی انھیں ہٹاتا ہُوا میری طرف بڑھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ ''سوری بیٹے۔ میں تو اسے دیکھ بھی نہیں سکا۔ وہ بالکل اچانک آئی تھی۔''

میں ایک لمحہ اسے دیکھتا رہا۔ لیکن مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے بس اس کے چہرے پر کھنڈی ہوئی زردی یاد ہے۔ پھر میں ریکسی کو گود میں لے کر اٹھا اور گھر کی طرف چل دیا۔ لوگوں نے خاموشی سے اِدھر اُدھر ہٹ کر مجھے راستہ دیا۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ لیکن رونا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں چبوترے سے گزرا اور اس اجنبی زینے پر چڑھنے لگا۔

میں نے لات مار کر اپنا دروازہ کھولا۔

ماما کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ گھبرا کر اٹھیں۔ ''ڈینی... کیا ہُوا ڈینی؟''

میں گنگ سا انھیں دیکھتا رہا۔ میں بولنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ پاپا اور میمی دوڑتے ہوئے آئے۔ وہ ماما کی چیخ سن کر لپکے تھے۔ اب وہ سب خاموش کھڑے مجھے گھور رہے تھے۔

''یہ مر چکی ہے...!'' بالآخر میں نے کہا۔ اپنی آواز خود مجھ سے بھی نہیں پہچانی گئی۔ ''اسے ٹرک نے روند ڈالا۔''

سامنے فرش پر گتے کا ایک خالی کارٹن رکھا تھا۔ میں جھکا اور میں نے بڑی نرمی سے ریکسی کو اس میں لٹا دیا۔ پھر آہستہ سے میں نے اس کے فلیپ بند کیے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میمی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''یہ... یہ... کک... کیسے ہوا؟'' اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

مجھے اس کے آنسوؤں پر حسد ہونے لگا۔ کاش... میں بھی رو سکتا۔ شاید آنسوؤں سے مجھے سہارا ملتا۔ میرے اندر میں کڑواہٹ سی بھر گئی۔ ''بس یہ ہو گیا۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کیسے ہُوا؟''

میں نے سنک میں اپنے خون آلود ہاتھ رگڑ رگڑ کر دھوئے، انھیں تولیے سے خشک کیا۔ پھر میں نے کارٹن اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھا جو اب بھی کھلا ہُوا تھا۔

''کہاں جا رہے ہو تم؟'' پاپا کی آواز نے مجھے روک دیا۔

''اس کو دفن کرنے۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں اسے یہاں تو نہیں رکھ سکتا۔''

انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے میری آنکھوں میں دیکھا۔ ''مجھے افسوس ہے ڈینی!'' ان کا لہجہ ہم دردی سے چھلک رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں میرے دکھ کی تفہیم تھی۔ لیکن مجھے اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اب کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

میں نے کندھے پر رکھا ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''آپ کو افسوس ہونا بھی چاہیے...'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہ سب کچھ آپ ہی کی وجہ سے تو ہُوا ہے۔ نہ ہم اپنا گھر کھوتے، نہ یہاں آتے اور نہ یہ سب ہوتا۔ آپ نے میرا گھر ہار دیا۔''

ان کی آنکھوں میں ایک درد سا لہرایا، ایک اذیت سی کپکپائی اور ان کا ہاتھ بے جان سا ہو کر ان کے پہلو سے جا لگا۔

برج کے پیچھے ہوا زاپ میں ٹرالی پر سوار ہُوا اور کارٹن اپنی گود میں رکھے بیٹھا رہا۔ سفر طویل تھا۔ ٹرالی فلیٹ بش کے

ملاتے میں پہنچی۔ میں کلیرنڈن روڈ پر ٹرالی سے اترا۔ اب کارٹن مجھے بھاری لگ رہا تھا۔ میں جانی پہچانی سڑکوں سے گزر رہا تھا۔ میں تصور میں اسے اپنے پیچھے بھاگتے دیکھ رہا تھا... خوشی سے دُم ہلاتے ہوئے۔ مجھے اس کا وہ خاص انداز یاد آ رہا تھا جب وہ مجھے دیکھ کر بھونکتی تھی۔ وہ آواز میری سماعت میں گونج رہی تھی۔ میں اس کی سرخی مائل براؤن کھال کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اس کی خوشی یاد آ رہی تھی جب میں اس کا سر اور کمر سہلاتا یا کان کے پیچھے گدگدی کرتا۔ مجھے اس کی زبان کا لمس اپنے ہاتھ پر، اپنے کان پر محسوس ہو رہا تھا جب میں جھک کر اسے پیار کرتا تو وہ مجھے چاٹتی تھی۔

میں گھر پہنچا تو اندھیرا چھایا ہُوا تھا۔ میں گلی میں کھڑا ہو کر گھر کو دیکھتا رہا۔ اس کی بڑی بڑی کھڑکیاں جیسے مُنہ کھولے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ابھی صبح ہی تو ہم یہاں سے رخصت ہوئے تھے، مگر اتنی سی دیر میں وہ متروک اور ویران لگنے لگا تھا۔

میں نے گلی کے دونوں طرف دیکھا کہ کسی نے مجھے دیکھا تو نہیں ہے۔ لیکن گلی سنسان تھی۔

مسٹر کونان کے گھر میں چند کمروں میں روشنی تھی، چناں چہ میں دبے قدموں ڈرائیوے میں داخل ہُوا۔ میں عقبی صحن میں آیا اور میں نے کارٹن وہاں رکھ دیا۔ 'ہاں، یہ جگہ ٹھیک ہے۔' میں نے سوچا۔ 'یہیں وہ آئی تھی، یہیں وہ خوش رہی تھی اور یہیں اسے ابدی نیند سونا چاہیے۔ پتا نہیں، وہ کہاں سے آئی تھی، اس گڑھے میں گری تھی، اور پھر میرے ساتھ اس گھر میں آئی تھی۔ میں نہیں رہ سکتا تو کیا، وہ تو ہمیشہ یہاں رہ سکے گی۔'

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ قبر کھودنے کے لیے پھاوڑا تو چاہیے۔ ممکن ہے، بیس منٹ میں اب بھی پھاوڑا موجود ہو۔ اس کی مدد سے ہم نیچے جمع ہونے والی، آتش دان کی راکھ سمیٹا کرتے تھے۔

یہ سوچ کر میں اندر جانے کے لیے چلا۔ لیکن پھر میں رک گیا۔ ریکسی کو اکیلے رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں اسے یہاں اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔

چابی اب بھی میری جیب میں تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ پھر میں کارٹن لے کر اندر گیا اور اسے کچن کی سیڑھیوں پر رکھ دیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ لیکن مجھے روشنی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں اس گھر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے کہیں بھی جا سکتا تھا۔

میں بیس منٹ میں چلا گیا۔ پھاوڑا وہاں موجود تھا۔ میں

مشرق ومغرب

سورج سے کسی نے پوچھا۔ ''تم مشرق میں بڑی آب و تاب میں ہوتے ہو۔ تمھاری کرنیں یوں لگتی ہیں جیسے خوشی میں مسکرا رہے ہو۔ لیکن مغرب میں پہنچتے ہی تمھیں کیا ہو جاتا ہے؟ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح لگتے ہو یا پریشان مسافر کی طرح؟''

سورج بولا۔ ''مجھے مشرق کی عادات بڑی اچھی لگتی ہیں۔ ماں باپ کا احترام، بڑوں کا ادب، شرم و حیا پر میں بہت خوش ہوتا ہوں مگر مغرب میں پہنچ کر، مغرب کی بے حیائی دیکھ کر ڈوب جاتا ہوں۔ پژمردہ ہو جاتا ہوں۔''

پھر پوچھا۔ ''تم مغرب کے ممالک میں بھی نکلتے ہو؟'' کہنے لگا۔ ''غور سے دیکھنا۔ کئی کئی دنوں تک میرے چہرے پر دُھند کا نقاب ہوتا ہے۔''

ابن حسن عثمان آبادی کے قلم سے

اسے لے کر اوپر آیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ ریکسی کو بھی ساتھ لے لوں۔ لیکن پھر میں نے خیال بدل دیا اور اسے وہیں کچن کی سیڑھیوں پر چھوڑ دیا۔ پھاوڑے سے وہ ہمیشہ ڈرتی تھی۔

میں نے کوشش کی تھی کہ آواز نہ ہو۔ رات کی سرد ہَوا میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ لیکن مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ قبر تیار کرنے کے بعد میں گیا اور کارٹن اٹھا لایا۔ پھر میں نے بڑی آہستگی اور نزاکت سے اسے قبر میں اتار دیا۔

قبر کو مٹی سے ڈھانپتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کتوں کے لیے دعا کی جاتی ہے یا نہیں۔ لیکن میں نے بہ ہر حال ہاتھ اٹھا کر اس کے لیے دعا کی... خدایا، میری ریکسی کو اچھی جگہ پر رکھنا... پھر میں نے اس کے لیے ہر وہ دعا پڑھ ڈالی جو مجھے یاد تھی۔

قبر کو بھر کر پیروں سے میں نے اسے ہموار کر دیا۔ چاند نکل آیا تھا اور عقبی صحن میں ڈراؤنے ہیولے متحرک نظر آ رہے تھے۔ میں نے سوچا، یہ موسمِ سرما ہے۔ ریکسی کو بھی یہ موسم اچھا لگتا تھا۔ اس موسم میں وہ خوب دوڑتی تھی، اچھل کود کرتی تھی۔ میری دعا تھی کہ اب وہ جہاں بھی جائے، وہاں اس کے لیے ہمیشہ موسمِ سرما رہے۔

میں جانے کتنی دیر وہاں پھاوڑا ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ پھر

مجھے احساس ہُوا کہ بہت دیر سے سردی میرے جسم میں سرایت کرتی رہی ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔

میں پھر گھر کے اندر چلا گیا۔ میرے قدم خود کار انداز میں اٹھ رہے تھے۔ یہ تو مجھے وہاں پہنچ کر احساس ہُوا کہ سوچے سمجھے بغیر میں اپنے کمرے میں آ گیا ہوں۔ پھاؤڑا اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اسے دیوار سے ٹکا کر کھڑا کر دیا۔ پھر میں وہاں گیا، جہاں صبح تک میرا بیڈ موجود تھا۔ کھڑکی سے چاندنی اندر آ رہی تھی۔ فرش پر جہاں ریکسی میرے بیڈ کے نیچے سویا کرتی تھی، وہاں نشان موجود تھا۔ میں وہاں فرش پر لیٹ کر روتا رہا۔ میرے آنسوؤں کا نمک میرے مُنہ میں ذائقہ بن کر اندر کے گہرے دکھ سے گھل مل گیا۔

پھر آنسو بھی ختم ہو گئے، اور رونے کی طاقت بھی۔ تب میں اٹھا اور پلٹ کر دیکھے بغیر کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحے بعد میں اپنے مکان سے باہر آ گیا جو اَب میرا نہیں رہا تھا۔ لیکن میری ریکسی کا تھا۔

میں ڈرائیووے سے نکلا تو مسٹر کونان اپنے گھر کی طرف آ رہے تھے۔ انھوں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ ”ارے ڈینی! تم یہاں کیا کر رہے ہو...؟“ انھوں نے پوچھا۔ ”کوئی چیز یہاں رہ گئی تھی تمھاری؟“

میں نے ان کی طرف دیکھے بغیر ان کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔ یہاں کی کوئی چیز میرے ساتھ چلی گئی تھی۔ میں وہ واپس کرنے آیا تھا۔“

وہ اپنے دروازے پر کھڑے مجھے جاتے دیکھتے رہے۔ میں انھیں کیا بتاتا تاکہ یہاں میرا کیا رہ گیا ہے... اور وہ ایسا ہے کہ میں اسے واپس بھی نہیں لے جا سکتا۔

کانٹن اور ڈیلانسی اسٹریٹ کے کارنر پر جیولری شاپ کی وِنڈو میں موجود کلاک بتا رہا تھا کہ نو بج چکے ہیں۔ میں اپنے بلاک کی طرف مڑا۔ میں جیسے نیند میں چل رہا تھا۔ لوگوں کی دھُلم پیل اور شور و غل سے بے خبر۔ میرا جسم ٹوٹ رہا تھا، اور اس لڑکے کی ٹھوکر جہاں لگی تھی، وہاں میرا چہرہ سوجا ہُوا تھا اور دُکھ بھی رہا تھا۔

میں سیڑھیوں پر تھا کہ اچانک جیسے میں نیند سے بیدار ہو گیا۔ اب ٹریفک کا شور، لوگوں کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں کہاں ہوں۔ کینڈی اسٹور کی روشنی جیسے اشارے کر کے مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اسٹور کے سامنے اب بھی کئی لڑکے کھڑے تھے۔

میں سیڑھیوں سے اترا اور کارنر کی طرف بڑھا۔

اسٹور کے سامنے پہنچ کر میں رُکا اور میں نے وہاں کھڑے لڑکوں کو دیکھا۔ وہ ان میں موجود نہیں تھا۔ چند منٹ انھیں دیکھنے کے بعد میں مڑ ہی رہا تھا کہ میری نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ کاؤنٹر پر بیٹھا آئس کریم سوڈا پی رہا تھا۔

میں آہستہ سے اندر گیا۔ دروازے کی طرف اس کی پشت تھی، اس لیے وہ مجھے دیکھ نہیں سکا۔ میں نے نرمی سے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر شناسائی کا تاثر اُبھرا۔

”باہر آؤ۔“ میں نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے مجھے اور پھر اسٹور میں موجود دوسرے لڑکوں کو دیکھا۔

میں نے اسے سوچنے کی مہلت نہیں دی۔ اس بار میں نے اس کے کندھے کو سختی سے جھنجھوڑا۔ ”میں نے کہا، باہر چلو۔“ میرا لہجہ بھی سخت تھا۔

اس نے اپنا ڈرنک آگے کی طرف دھکیلا اور اٹھ کھڑا ہُوا۔

”یہ میرے لیے بچا کر رکھو موشے...“ اس نے کاؤنٹر مین سے کہا۔

”میں ابھی ایک منٹ میں آتا ہوں۔ پھر یہ پیوں گا، سکون سے۔“

میں نے اس کا گلاس اٹھایا اور کاؤنٹر کے عقب میں لے جا کر سنک میں الٹ دیا۔ ”اسے بھول جاؤ موشے۔ اب یہ اسے نہیں پی سکے گا۔“ پھر میں پلٹا اور باہر نکل آیا۔ قدموں کی چاپ بتا رہی تھی کہ وہ میرے پیچھے آ رہا ہے۔

فٹ پاتھ پر میں رُکا اور پلٹ کر اسے دیکھا۔ ”اپنے دونوں ہاتھ اٹھاؤ۔“

اس نے ایک پل مجھے دیکھا اور پھر میری طرف بڑھا۔ اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ ”اوہ... تو تم کوئی ٹوپ چیز ہو؟“ اس نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

دن بھر جو کچھ میرے اندر پکتا رہا تھا، ایک دم جیسے پھٹ پڑا۔ ”ابھی دیکھ...“ اسے جواب دیتے دیتے مجھے اچانک یاد آیا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ اس کا گھٹنا میری ناف سے نیچے پتھر کی طرح لگا اور گھونسے میرے چہرے سے ٹکرائے۔ میں آگے کی طرف گرا... اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل۔ اس کی ٹھوکر میرے چہرے کی طرف جھپٹ رہی تھی۔ میں نے لڑھک کر خود کو بچانے کی کوشش کی۔ اس کے جوتے کی نوک میرے کان کے پیچھے لگی اور میں ڈھیر ہو گیا۔

اب ٹریفک کی آواز بہت دُور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے سر میں عجیب سی گھیریاں ناچ رہی تھیں۔ میں نے

کہنیوں اور گھٹنوں کے بل اٹھا۔

وہ تمسخرانہ انداز میں ہنس رہا تھا۔ ”ہُنہہ... تو تم کوئی ٹوپ ہو!“

میں نے قریب موجود ہائیڈرینٹ کا سہارا لیا اور اٹھ کر کھڑا ہوا۔ میں نے پھر سر جھٹکا۔ دماغ پر چھائی ہوئی دُھند تیزی سے چھٹ رہی تھی۔ اپنے مُنہ سے نکلتا ہُوا خون مجھے نظر آ رہا تھا۔

وہ اب بھی ہنس رہا تھا، مجھ پر طنز کر رہا تھا۔ ”تو اب بھی تمھارا یہی خیال ہے کہ تم کوئی ٹوپ چیز ہو۔“

میں ہائیڈرینٹ کو تھامے محتاط نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ ہولے ہولے سر ہلا رہا تھا، درحقیقت وہ مجھ پر اس کا احسان تھا۔ وہ مجھے بک بک کرتا رہے، میرے لیے اچھا تھا۔ مجھے مہلت ہی تو درکار تھی۔ میری ٹانگوں میں اب جان واپس آ رہی تھی۔

وہ دانستہ، بہت آہستہ آہستہ چلتا ہُوا میری طرف بڑھا۔ وہ ہر ہر پل سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ خود اعتمادی سے چھلک رہا تھا۔

میں وقت گزاری کے لیے ہائیڈرینٹ کے گرد گھوما۔ مجھے اب بس چند سیکنڈ اور درکار تھے۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ مسلسل مشق نے مجھے اپنی توانائی اور مضبوطی کو ناپنا بھی سکھایا تھا اور اندازہ لگانا بھی۔

مجھے ہائیڈرینٹ کے اس طرف جاتا دیکھ کر وہ ٹھیر گیا اور زہریلے لہجے میں بولا۔ ”تو ڈرپوک بھی ہو... اپنے کتے کی طرح؟“

میں نے ہائیڈرینٹ کو چھوڑ دیا۔ اب میں بالکل ٹھیک تھا۔ میں آگے بڑھا۔

وہ دونوں ہاتھ جھلاتے ہوئے مجھے پر جھپٹا، اور اس کا داہنا ہاتھ آگے تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ اس کی دوسری غلطی ہے، اور ممکنہ طور پر آخری بھی۔ پہلی غلطی اس نے مجھے سنبھلنے کی مہلت دے کر کی تھی۔

میرے لیفٹ نے اس کے رائٹ کو ایک طرف ہٹایا اور ساتھ ہی میں نے رائٹ اس کی ناف کے عین نیچے جمایا۔ وہ آگے کی طرف جھکا۔ اس کے دونوں ہاتھ نیچے ہوئے اور میں نے لیفٹ سے اس کے جبڑے پر ’اپر کٹ‘ رسید کر دیا۔ وہ تقریباً نیم دائرے میں گھوما اور چکرا کر گرنے لگا۔ اس کے فٹ پاتھ پر گرنے سے پہلے میں بجلی کی سی تیزی سے اس کے چہرے اور جبڑے پر آٹھ پنچ رسید کر چکا تھا۔

اب وہ میرے قدموں میں بکھرا ہُوا تھا۔ میں اس پر جھکا۔ یقیناً وہ کسی بھینسے کی طرح طاقت ور ہو گا، کیوں کہ اتنی مار کھانے کے بعد بھی وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کے سر پر لات رسید کی اور وہ ڈھیر ہو گیا۔

چند لمحے میں اسے دیکھتا رہا پھر میں پلٹ کر چل دیا۔ اس وقت مجھے احساس ہُوا کہ وہاں کافی تعداد میں لوگ یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

میں نے کوئی آہٹ، کوئی چاپ نہیں سنی۔ لیکن کسی اَن جانی حس نے مجھے اپنے عقب میں تحرک کا احساس دلا دیا تھا۔ میں بہت تیزی سے گھوما۔ اس کے جھپٹتے ہوئے ہاتھ میں کوئی چمک دار چیز تھی۔ میں اُچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ مجھے اپنی آستین کی طرف سے چرچراہٹ سنائی دی۔ وہ چاقو تھا۔ وہ اپنے وار کی جھونک میں آگے نکلا اور میں نے پوری قوت سے اس کی گدی پر دوہتڑ رسید کر دیا۔

لوگ تیزی سے اِدھر اُدھر چھٹ گئے۔ وہ لڑکھڑاتا ہُوا عمارت کی دیوار سے ٹکرایا۔ میں تیزی سے اس پر جھپٹا۔ اسے پلٹنے کا موقع دینا میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے اس کا چاقو والا ہاتھ گرفت میں لے کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ اذیت سے چلّایا۔ میں نے اس کا ہاتھ آگے لے جا کر دوسرا جھٹکا دیا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ میں نے اسے لات مار کر دُور کیا اور دوبارہ اس کی طرف مڑا۔ خوف اور اذیت نے اس کا چہرہ مسخ کر دیا تھا۔ میرے اندر اب وحشت اُمڈ رہی تھی۔ وہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا کہ لڑنے سے مجھے خوشی حاصل ہو رہی تھی۔ میرے پہلے پنچ نے اس کی ناک پچکا دی۔ وہ کٹتے ہوئے جانور کی طرح چلّایا۔

میں وحشیانہ انداز میں ہنسا اور اس کے مُنہ پر گھونسا مارا۔ اس نے سانس لینے کے لیے مُنہ کھولا تو وہ خلا صاف نظر آ رہا تھا جہاں کبھی اس کے دانت رہے ہوں گے۔ میں خوش تھا... بہت خوش۔ اتنا خوش میں پہلے کبھی نہیں ہُوا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے سرخ دُھند کی چادر سی چھا گئی تھی۔ میں ہنستا، اسے مارتا اور پھر خوشی سے چلّاتا۔

پھر کچھ ہاتھوں نے مجھے گرفت میں لے لیا۔ میں خود کو ان سے چھڑانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر میرے سر پر کچھ لگا اور اچانک مجھے کم زوری کا احساس ہونے لگا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ مُنہ کے بل میرے پیروں پر گرا۔ میرے ہاتھ پکڑ لیے گئے۔ میں نے سر گھما کر پکڑنے والوں کو دیکھا۔ وہ باوردی پولیس والے تھے۔

وہ مجھے ولیمز برگ برج کے پولیس اسٹیشن لے گئے اور حوالات میں بند کر دیا۔ وہاں ایک ڈاکٹر آیا۔ میرے بازو پر چاقو

سے جو خراش آئی تھی، اُس نے اس کی ڈریسنگ کر دی۔

میں وہاں تقریباً چار گھنٹے بیٹھا رہا۔ میں تھک گیا تھا لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ سوائے سوچنے کے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں جیسے سات سال پیچھے اس گڑھے میں پہنچ گیا تھا جہاں سرخی مائل بھورے رنگ کا ایک پلا میرے پیچھے گڑھے کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ ”تمھارے والد تمھیں لینے آئے ہیں بیٹے۔“ اس نے نرم اور مہربان لہجے میں کہا۔

میں اٹھا اور باہر نکلا۔ اس کے پیچھے چلتا میں راہ داری سے گزرا، سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ پولیس مین نے ایک دروازہ کھولا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں پاپا ایک شخص کے ساتھ بیٹھے تھے۔

پاپا مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ”میں تمھیں گھر لے جانے کے لیے آیا ہوں ڈینی۔“

میں نے خالی خالی نظروں سے انھیں دیکھا... گھر؟ وہ اپارٹمنٹ! وہ بھی میرا گھر نہیں بن سکتا۔

پاپا کے ساتھ بیٹھا ہُوا شخص بھی اٹھا، اور اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”تم خوش قسمت ہو لڑکے۔ ہمیں معلوم ہو گیا کہ وہاں کیا ہُوا تھا۔ جس لڑکے کو تم نے مارا ہے، وہ کئی ہفتے اسپتال میں پڑا رہے گا۔ وہ کوئی اچھا لڑکا نہیں ہے۔ ایک طرح سے تم نے ہم پر مہربانی کی ہے۔ اب تم جاؤ۔ لیکن آئندہ ہمیں زحمت نہ دینا۔“

میں اسے کوئی جواب دیے بغیر دروازے کی طرف بڑھا۔ پاپا اس شخص کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ میں پولیس اسٹیشن سے نکل کر باہر سڑک پر آیا۔ پاپا تیز قدموں سے چلتے میرے برابر آ گئے۔

”تمھاری ماما اور میں بہت ڈر گئے تھے ڈینی۔“ ان کی آواز میں بھاری پن تھا۔ ان کا سرخ چہرہ اس وقت زرد لگ رہا تھا۔

مجھے لگا کہ یہ الفاظ میں پہلے بھی کہیں، کسی اور موقع پر سُن چکا ہوں۔ میں نے جواب نہیں دیا۔

ہم نے سڑک پار کی تو انھوں نے پھر کوشش کی۔ ”تم نے ایسا کیوں کیا ڈینی؟“ ان کے چہرے پر تشویش تھی جیسے کوئی تبدیلی... ناخوش گوار تبدیلی رونما ہوئی ہے جسے وہ سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ ”تم تو ایسے نہیں تھے میرے بیٹے!“

میں ایسا نہیں تھا لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔ میں ایک اور ہی دنیا میں آ گیا تھا، اور اب میں ایک مختلف ڈینی فشر تھا۔ یہ بات پوری طرح تو میں بھی نہیں سمجھ سکا، انھیں کیسے سمجھاتا۔ میں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

انھوں نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن خاموش رہ گئے۔ دو بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم اپنی سڑک پر مڑے۔ وہاں ایک ہچکچاتے ہوئے لمحے میں ہماری نظریں ملیں، اور اگلے ہی لمحے دونوں نے نظریں چُرا لیں۔

سڑک سنسان تھی۔ جا بہ جا کچرے کے تھیلے اور گندگی بکھری ہوئی تھی۔ فٹ پاتھ پر ہمارے قدموں کی دھمک کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔

پھر برف گرنے لگی۔ میں نے اپنی جیکٹ کا کالر اوپر چڑھا لیا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ پاپا میرے ساتھ چل رہے تھے۔ تب پہلی بار مجھے احساس ہُوا کہ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔

ہم خاموشی سے گھر کی طرف بڑھتے رہے!

دن زندگی کے

کتاب دوم

ہم باہر سڑک پر آئے تو پاپا نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر گھڑی کو دوبارہ جیب میں ڈالتے ہوئے انھوں نے مجھے عجیب سے انداز میں دیکھا۔ ”پونے تین بجے ہیں...“ وہ منمنائے۔ ”مجھے تیزی دکھانی ہوگی ورنہ میں لیٹ ہو جاؤں گا۔“

میں نے انھیں دیکھا۔ لیکن میرے انداز میں بے زاری تھی۔ یہاں رہتے ہمیں صرف پانچ ماہ ہوئے تھے لیکن یہاں کے پہلے ہی دن سے ہمارے درمیان جو خلیج پیدا ہوئی تھی، اب وہ برسوں پر محیط لگتی تھی۔ اس پہلے دن سے آج تک اچھا کچھ بھی نہیں ہُوا تھا۔ سب کچھ غلط ہی ہوتا رہا تھا۔ اب پاپا کو ڈیلانسی اسٹریٹ کے ایک ڈرگ اسٹور میں جاب مل گئی تھی... تنخواہ 23 ڈالر فی ہفتہ۔

”اس طرف جا رہے ہو تم؟“ پاپا نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔ پاپا بہت تیز چل رہے تھے۔ میں نے بھی قدم تیز کر دیے۔

ان گزرے ہوئے پانچ مہینوں کی یاد ہم دونوں ہی کے ذہنوں میں تازہ تھی۔ میں اسکول سے واپس آتا تو وہ مجھے اس سڑے ہوئے اپارٹمنٹ کے کچن میں بیٹھے ملتے۔ وہ دیوار پر کسی غیر مرئی شے کو گھور رہے ہوتے تھے۔ ان کے چہرے پر بے بسی اور مایوسی کا تاثر منجمد ہوتا تھا۔ میں نے بارہا کوشش کی کہ مجھے ان پر ترس آئے، ان سے ہم دردی ہو لیکن میری کوشش ناکام رہی۔ میں یہ سوچتا کہ سب انھی کا تو کیا دھرا ہے۔ اگر پاپا عقل مند ہوتے، اگر

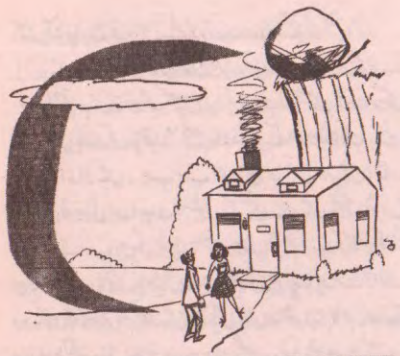

انھوں نے کچھ بوجھ سے کام لیا ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔

لیکن مجھے ان کے چہرے کے اُس رات کے تاثرات کبھی بھول نہیں سکتے، جب وہ گھر آئے اور انھوں نے ہمیں اس جاب کے بارے میں بتایا۔ یہ ابھی چند روز پہلے ہی کی بات تھی۔ 25 سال کا تجربہ رکھنے والے رجسٹرڈ فارماسسٹ کے لیے 23 ڈالر فی ہفتہ کی جاب! یہ تو ظلم تھا۔ یہ تنخواہ تو گزارے کے لائق بھی نہیں تھی۔ دیکھا جائے تو وہ ان کی توہین تھی۔ لیکن وہ توہین کو نگل چکے تھے۔

پاپا کی ہم کارنر پر مڑے۔ وہاں وہ اسٹور تھا جہاں پاپا کام کرتے تھے۔ وہ رُکے، انھوں نے مجھے دیکھا۔ ان کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ میں سمجھ گیا، وہ مجھ سے پوچھنا چاہتے تھے کہ میں کہاں کے لیے نکلا ہوں، کہاں وقت گزاروں گا اور کتنا وقت گزاروں گا؟ لیکن ان کی خودداری، ان کی انا انھیں روک رہی تھی، اور میں از خود انھیں کچھ بتانے والا نہیں تھا۔

”ماما سے کہنا کہ میں ڈھائی بجے تک واپس آؤں گا۔“

پاپا نے انھوں نے کیا کہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔

میں نے سر کو تھوڑی سی جنبش دی۔

ان کا چہرہ ایسے وہ کچھ اور کہنا چاہتے ہوں لیکن اگلے ہی لمحے ارادہ بدل لیا۔ انھوں نے دھیرے سے سر جھٹکا، [illegible] اور اسٹور میں داخل ہو گئے۔ اس وقت [illegible]

مجھے ابھی کچھ دیر وقت گزاری کرنا تھی۔ میں اسٹور کی کھڑکی سے ٹک کر کھڑا ہو گیا اور آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا۔ اندر سے ہو آواز سنائی دی، اس نے مجھے اسٹور میں دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

”تم آ گئے فشر!“ وہ بڑی پاٹ دار آواز تھی۔ ”شکر ہے، تمھاری جان تو چھوٹی۔ باس کا پارہ چڑھا ہُوا ہے۔ پورے دن مجھے لتاڑتا رہا ہے وہ۔“

پاپا نے خاموشی سے اس سے جیکٹ لی اور دیواری گھڑی میں وقت دیکھا۔ ان کے چہرے پر طمانیت سی پھیل گئی۔

پاپا نے قد کا موٹا سا شخص اسٹور کے عقبی کمرے سے نکلا۔ اس کی آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ تھا۔ اس نے اسٹور کا طائرانہ جائزہ لیا۔ ”آ گئے تم؟“ اس نے پاپا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز باریک اور کانوں میں خراش ڈالنے والی تھی۔ ”اب جلدی کرو۔ کئی گاہک تمھارے منتظر ہیں۔ کام شروع کرو فٹافٹ۔“

پاپا کی آواز میں ایسا خوف اور ایسی عاجزی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ ”جی بہتر مسٹر گولڈ۔“ انھوں نے کہا اور اسٹور کے عقب کی طرف لپکے۔ ”میں آپ کو انتظار نہیں کرانا چاہتا تھا، مسٹر گولڈ۔“

موٹے نے انھیں بڑی حقارت سے گھورا۔ ”تو کچھ جلدی آ جاتے۔ جلدی آنے میں کوئی تکلیف ہو جاتی تمھیں؟“

”آئی ایم سوری مسٹر گولڈ!“

”اچھا اب احمقوں کی طرح کھڑے ہو کر معذرت ہی نہ کرتے رہو۔ کچھ کام بھی کرو۔“ موٹے نے پاپا کی طرف چند کاغذ بڑھائے پھر پلٹ کر اندر چلا گیا۔

پاپا چند لمحے بے تاثر چہرے کے ساتھ اس جگہ کو گھورتے رہے جہاں چند لمحے پہلے موٹا کھڑا تھا۔ پھر انھوں نے ہاتھوں میں موجود نسخوں کا جائزہ لیا اور کاؤنٹر کی طرف چلے گئے۔ اپنی جیکٹ اور ہیٹ انھوں نے ایک کرسی پر ڈالا، اسٹور کی جیکٹ پہنی اور کام میں لگ گئے۔

انھوں نے ہاتھ پھیر کر نسخوں کی شکنوں کو دُور کیا پھر اوپر والے نسخے کو غور سے پڑھا۔ شیلف سے پیمانہ اٹھا کر انھوں نے دوا کی بوتل لی اور اس سے پیمانے میں دوا انڈیلی۔ لیکن ان کے ہاتھ کی لرزش مجھے صاف دکھائی دی۔

اچانک انھوں نے سر اٹھایا اور ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ ان کے چہرے پر شرمندگی کا تاثر ابھرا۔ شرمندگی ان کی نگاہوں میں بھی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں میں خالی پن اُجاگر کرنے کی کوشش کی جیسے میں درحقیقت کسی سوچ میں ہوں اور میں نے دیکھا کچھ بھی نہیں ہے۔

پھر میں پلٹا اور آگے بڑھ گیا!

میں پہنچا تو میرا گینگ منتظر تھا۔ ہم لوگوں کی نظروں میں

نہیں آنا چاہتے تھا، اس لیے کارنر سے ہٹ گئے۔

میں نے وقت ضائع نہیں کیا۔ تمہید باندھے بغیر میں نے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ تمھیں کیا کرنا ہے...'' میں بہت دھیمی آواز میں بات کررہا تھا۔ ''ہمیں دو دو کر کے اندر جانا ہے... غیر محسوس انداز میں۔ جب سب اندر پہنچ جائیں اور میں اشارہ کروں تو سولی اور اسپٹ اسٹور کے عقبی حصے میں جھگڑا شروع کردیں۔ سب ان کی طرف متوجہ ہوں تو تم سب کو کام دکھانا ہوگا۔ اور ان باتوں کا خیال رکھنا۔ فضول چیز پر ہاتھ مت ڈالنا۔ وہ کچھ اٹھانا، جو ہم بعد میں بیچ بھی سکیں۔ اور اپنا کام دکھاتے جاؤ اور نکلتے جاؤ۔ بلاضرورت وہاں ٹھیرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاتھ دکھاتے ہی نکلو اور بجلی کی سی تیزی سے نکلو۔ یہ سب کو معلوم ہے نا کہ بعد میں ہمیں کہاں ملنا ہے۔ ایک گھنٹے تک اِدھر اُدھر وقت گزاری کرنا۔'' میں نے توقف کیا اور انھیں غور سے دیکھا۔

ان سب کے چہروں پر سنگینی اور گھمبیرتا تھی۔

''سمجھ گئے نا؟''

کسی نے بھی جواب نہیں دیا۔

میں مسکرایا۔ ''تو ٹھیک ہے۔ میں اندر جارہا ہوں۔ مجھ پر نظر رکھنا اور جب تک میرا اشارہ نہ ہو، کچھ نہ کرنا۔''

وہ سب منتشر ہوگئے۔ میں تیز قدموں سے چلتا ہُوا کارنر کی طرف بڑھا اور فائیو اینڈ ڈائم میں داخل ہوگیا۔ وہاں گاہکوں کا ہجوم تھا۔ یہ پہلو خوش آئند تھا۔ اس سے ہمارا کام آسان ہوجاتا۔

میں لوگوں کے درمیان سے گزرتا کاؤنٹر کے آخری سرے پر سوڈا فاؤنٹین کی طرف بڑھا۔ وہاں میں ایک سیٹ پر بیٹھ گیا اور سرو کرنے والی لڑکی کا انتظار کرنے لگا۔ کاؤنٹر کے عقب میں لگے آئینے میں مجھے سولی اور اسپٹ، اسٹور میں داخل ہوتے نظر آئے۔ کاؤنٹر گرل میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ''کیا لو گے تم؟'' اس نے پوچھا۔

''تمھارے پاس کیا کیا ہے...؟'' میں نے وقت گزاری کے لیے جوابی سوال کیا۔ کیوں کہ ابھی معاملہ تیار نہیں تھا۔

''کیوں بے بی؟''

اس نے تھکی تھکی نظروں سے مجھے دیکھا اور اپنے ماتھے پر آئے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے سمیٹا۔ ''سب کچھ تو لکھا ہُوا ہے بورڈ پر...'' اس نے بے زاری سے کہا۔ ''خود ہی پڑھ لو۔''

میں نے کاؤنٹر کے عقب میں آئینے کے برابر لگی سائن پر پڑھنے کی اداکاری کی۔ ''ایک ڈبل چاکلیٹ آئس کریم سوڈا... دی ڈائم اسپیشل۔'' میں نے آرڈر دیا۔

وہ گئی اور میرا آرڈر تیار کرنے لگی۔ اس کا انداز ماہرانہ تھا۔ پہلے شربت، پھر آئس کریم کے دو چمچے تاکہ گاہک کو پتا نہ چلے کہ آدھا گلاس خالی ہے، اور پھر کاربونیٹڈ پانی!

میں نے سر گھما کر اسٹور کا جائزہ لیا۔

سب لڑکے پہنچ چکے تھے اور اپنی اپنی جگہ تیار تھے۔

اب میں اپنے آرڈر کا منتظر تھا، اور چاہتا تھا کہ لڑکی جلد از جلد میرا آرڈر سرو کردے۔ جب میں نے اسکیم بنائی تھی تو وہ بہت شان دار لگی تھی لیکن اب میں نروس ہورہا تھا۔

لڑکی آئی اور اس نے سوڈے کا گلاس میرے سامنے رکھ دیا۔

میں نے اس کی طرف سکّہ بڑھایا۔ اس نے مشین میں انٹری کی۔ لڑکے میری طرف متوقع نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے پینے کی نلکی سے گلاس کے مشروب کو ہلایا۔ پھر نلکی مُنہ میں لگا کر ایک گھونٹ لیا۔ میرے مُنہ میں مٹھاس سی گھل گئی۔

اسی لمحے اسٹور کے عقبی حصے میں جھگڑا شروع ہوگیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے سر گھما کر دیکھا۔ سولی نے خود کو ٹن فوڈ کے ڈسپلے پر گرادیا تھا۔ پیک اغذیہ کے ڈبے گرے بکھر گئے۔ اسٹور میں موجود لوگ سولی اور اسپٹ کی طرف لپکے کہ بیچ بچاؤ کرائیں۔ دوسرے لڑکوں نے ہاتھ کی صفائی دکھانی شروع کردی۔ وہ ٹھیک ٹھاک انداز میں کام کررہے تھے۔ کاؤنٹر گرل نے بھی گردن گھما کر اُدھر دیکھا تو میں چونک کر اُچھل پڑا۔ وہ مجھے متجسّس نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہورہا ہے؟'' وہ بولی۔

''پتا نہیں۔ میرا خیال ہے، جھگڑا ہورہا ہے کسی کا۔''

''مجھے تو یہ سب کچھ سوچا سمجھا لگ رہا ہے...'' لڑکی نے کہا۔ ''جیسے کسی منصوبے کے تحت کارروائی ہو۔''

میری نبض کی رفتار بڑھ گئی۔ میں نروس ہوگیا۔ ''میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔''

''یہ لڑنے والے لڑکے ایک دوسرے کو مارنے کی اداکاری کررہے ہیں، مار نہیں رہے ہیں...'' لڑکی نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ ''میں شرط لگا سکتی ہوں کہ ان کے ساتھی اس وقت اسٹور کا صفایا کررہے ہوں گے۔ یہ بہت پرانی چال ہے...'' یہ کہتے ہوئے اس نے اسٹور کا جائزہ لیا اور اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ دیکھو... میں نے کہا تھا نا!''

اس نے دو لڑکوں کو کاسمیٹکس کے کاؤنٹر سے مال اُڑا کر جیبوں میں بھرتے دیکھ لیا تھا۔ اس وقت ان میں سے ایک نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور بے ساختہ مسکرانے لگا۔ میں نے سر

کی جنبش سے اسے تنبیہ کی۔ وہ جلدی سے پلٹا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں دوبارہ اپنے گلاس کی طرف متوجہ ہُوا تو وہ مجھے گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ''تم اس میں شامل ہو؟''

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو تھام لیا اور سفّاکی سے مسکرایا۔ ''تو تم اس سلسلے میں کیا کروگی؟''

وہ چند لمحے میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر مسکرادی۔ ''کچھ بھی نہیں...'' اس نے کہا۔ ''میرا اس سے کیا لینا دینا، اور ہار برائن کے لیے کوئی بڑا نقصان بھی نہیں ہے۔''

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور دوبارہ اسٹور کا جائزہ لیا۔ تمام لڑکے اپنا کام دکھا کر اسٹور سے نکل چکے تھے۔ دو تین گاہک سولی کو دھکے دے کر اسٹور سے نکال رہے تھے۔ میں نے سکون کی سانس لی۔ میں مسکرایا اور میں نے چمچے کی مدد سے اپنے گلاس سے آئس کریم نکال کر مُنہ میں ڈالی اور پگھلتی ہوئی چاکلیٹ کے ذائقے سے لطف اندوز ہونے لگا۔

''تم اچھا سوڈا نہیں بناتی ہو۔'' میں نے لڑکی سے کہا۔

وہ پھر مسکرائی۔ اس کے بال سیاہ تھے اور آنکھیں ڈارک براؤن۔ ہونٹ اس کے بہت گورے رنگ کی وجہ سے بہت گہرے لگ رہے تھے۔ ''تم کافی چالاک ہو۔ یہ بات ماننے والی ہے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

مجھے اپنے وجود میں روشنی سی پھیلتی محسوس ہوئی۔ وہ مجھے بھا گئی تھی۔ ''تمھارا نام کیا ہے بے بی؟''

''نیلی۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور میں ڈینی ہوں...'' میں نے کہا۔ ''تم اسی علاقے میں رہتی ہو؟''

''ایلڈرج اسٹریٹ پر۔''

''چھٹی کب ہوتی ہے تمھاری؟''

''نو بجے، جب اسٹور بند ہوتا ہے۔''

میں پُرغرور انداز میں اٹھا۔ میں اس وقت خود اعتمادی سے لبالب بھرا ہُوا تھا۔ ''تو ٹھیک ہے۔ میں نو بجے تمھیں کارنر پر ملوں گا۔'' یہ کہہ کر میں اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر دروازے کی طرف بڑھا۔ راستے میں اسٹور کے دو ملازم سولی کے گرائے ہوئے ڈبے اٹھا کر ڈسپلے پر رکھ رہے تھے۔ میں چند لمحے انھیں دیکھتا رہا پھر پلٹ کر کاؤنٹر کی طرف گیا۔

لڑکی مجھے ہی دیکھے جارہی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تو نیلی، نو بجے ملاقات ہوگی۔''

وہ بھی مسکرائی۔ ''ٹھیک ہے ڈینی۔ میں تمھیں کارنر پر ملوں گی۔''

میں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے گڈ بائی کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی نگاہیں اب بھی میرا تعاقب کررہی تھیں۔ میں بغیر دیکھے انھیں محسوس کرسکتا تھا۔ پھر میں اسٹور سے نکل آیا۔

ٹھیلے والے نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''تمھیں کہاں سے مل گیا یہ مال؟'' اس نے پوچھا۔

''تم خریدنا چاہتے ہو یا نہیں...؟'' میں نے چڑچڑے پن سے کہا۔ ''اب میں تمھیں مال تیار کرنے والی کمپنی کا نام تو بتانے سے رہا۔''

اس نے لم کا ایک جار کارٹن سے اٹھایا اور نروس انداز میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا جیسے اسے تول رہا ہو۔ ''میں پولیس کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔''

میں نے بھی معنی خیز انداز میں کارٹن اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''کوئی بات نہیں۔ خریداروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔''

اس نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''ایک منٹ۔ میں نے یہ کب کہا کہ میں نہیں خریدنا چاہتا۔''

میں نے کارٹن پر سے ہاتھ ہٹالیا۔ ''تو پھر تفتیش مت کرو۔ پندرہ ڈالر نکالو اور یہ سب تمھارا۔''

اس نے مسکراتے ہوئے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کی۔ ''میں دس ڈالر دے سکتا ہوں۔''

''14 ڈالر۔'' میں نے کہا۔ یہ اس علاقے کا دستور تھا۔ بھاؤ تاؤ کے بغیر سودا ممکن ہی نہیں تھا۔

''11 ڈالر۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''چلو، 12 لے لو۔'' وہ غور سے میرے چہرے کا تاثر دیکھ رہا تھا۔

''نہیں... ہرگز نہیں۔''

اس نے گہری سانس لی اور سرگوشی میں بولا۔ ''ساڑھے بارہ ڈالر۔ اور اس سے اوپر میں نہیں جاؤں گا۔''

میں نے بھی اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ ''ٹھیک ہے، رقم نکالو۔''

اس نے جیب سے مُڑے تُڑے نوٹ نکالے اور گن کر مجھے تھمادیے۔ میں نے بھی رقم گنی پھر اسے جیب میں رکھ کر مڑا۔

''سنو!'' اس نے مجھے پکارا۔

میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"اور مال ہاتھ لگے تو میرے پاس ہی لانا۔ میں تمہیں اچھے دام دوں گا۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن درحقیقت میں اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سات لڑکوں میں ساڑھے بارہ ڈالر۔ یہ تو فی کس دو ڈالر بھی نہیں ہُوا۔ اتنی محنت اور اتنا خطرہ مول لینے کا یہ کوئی معقول صلہ تو نہیں۔ تاہم میں نے ٹھیلے والے سے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔" لیکن میں نے دل میں کہا کہ اب کبھی اس کے پاس نہیں آؤں گا۔

ریونگٹن اسٹریٹ پر سڑک پار کرتے ہوئے میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ چھ بجے تھے۔ اور کینڈی اسٹور پر گینگ سے ملاقات سات بجے ہونا تھی۔ میں نے سوچا، گھر سے پاپا کے لیے کھانا ہی لے لوں۔ ماما روز یہ کام کرتی تھیں۔ آج وہ اس زحمت سے بچ جائیں گی۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے بدبو سے بچنے کے لیے ناک سکیڑی۔ دروازوں پر رکھے ہوئے کچرے کے تھیلوں کو نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے میں سیڑھیاں چڑھتا رہا۔ بلڈنگ کا نگران رات پھر زیادہ پی گیا ہوگا۔ اس نے صبح کو یہ تھیلے سمیٹے ہی نہیں تھے۔ ان کی وجہ سے بدبو اور بڑھ گئی تھی۔ یہ سب کچھ میں پانچ ماہ سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کا عادی نہیں ہوسکا تھا۔ شاید کبھی بھی نہیں ہوسکوں گا۔

ایک ڈھیلے قدمچے پر پاؤں پڑا تو لڑکھڑایا۔ میں نے زیر لب بلڈنگ کو کوسا۔ میں ہر وقت یہاں سے جان چھڑانے کی فکر میں رہتا تھا مگر اس کے لیے رقم چاہیے تھی۔ میں نے سوچا، کبھی میرے پاس اتنی رقم ہوگی کہ میں اپنا مکان دوبارہ خریدوں گا، اور اس منحوس علاقے سے نجات حاصل کرلوں گا۔

میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ ماما اسٹوو پر جھکی ہوئی تھیں۔ انھوں نے سر اٹھا کر تھکی تھکی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"پاپا نے کہا ہے کہ وہ ڈھائی بجے تک واپس آئیں گے۔" میں نے انھیں بتایا۔

انھوں نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ مُنہ سے کچھ نہیں کہا۔

"میں نے سوچا، میں پاپا کو کھانا پہنچادوں۔"

انھوں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ایسی کوئی پیش کش کی تھی۔ "تو پہلے تمہیں کھانا دے دوں؟" انھوں نے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے..." میں نے جھوٹ بولا۔ "ایک دوست نے مجھے برگر کھلا دیا تھا۔"

"تو سوپ لے لو تھوڑا سا۔"

"نہیں ماما۔ میرا پیٹ بھرا ہُوا ہے۔" میں نے کہا۔ میں نے دیگچی میں دیکھ لیا تھا کہ سوپ ہم سب کے لیے ناکافی ہے۔

وہ تھکی ہوئی نہ ہوتیں تو ضرور اصرار کرتیں۔ وہ خاموشی سے پاپا کے لیے کھانا نکالنے لگیں۔ پھر انھوں نے کھانے کے برتن کاغذ کے ایک تھیلے میں رکھ کر میری طرف بڑھائے۔ میں دروازے کی طرف چل دیا۔

"رات جلدی آجانا ڈینی۔" ماما نے پکارا۔

"جی ماما۔" میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔

اسٹور کے سامنے میں رکا اور اندر دیکھا۔ اندر چند گاہک تھے جنھیں ایک کلرک نمٹا رہا تھا۔ پاپا شاید عقبی کمرے میں ہوں گے۔ میں اسٹور میں داخل ہُوا اور کاؤنٹر پر کھڑے ہوکر انتظار کرنے لگا۔

عقبی کمرے کی طرف سے کسی کے چلّانے کی آواز آئی دی۔ میں غیر ارادی طور پر سننے لگا۔ یہ آواز میں نے پہلے بھی سنی تھی۔ "تم... احمق گدھے! پتا نہیں، میں نے تمہیں ملازم کیوں دی۔ تم جیسے سب لوگوں کے ساتھ یہی مسئلہ ہے جو اچھا کاروبار کرتے رہے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ تم سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہو۔ دوسرے کی بات سنتے ہی نہیں۔"

وہ آواز زرکی تو پاپا کی دھیمی دھیمی منمناہٹ سنائی دی۔ ان کے الفاظ میں نہیں سن سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسٹور اور عقبی حصے کے درمیان شیشے کے پارٹیشن کی طرف دیکھا۔ پاپا وہاں کھڑے مسٹر گولڈ سے بات کررہے تھے۔ مسٹر گولڈ پر غصے سے تڑخ رہا تھا۔ پھر پاپا کی بات جاری تھی کہ وہ دوبارہ چلّانے لگا۔

"میں کوئی عذر، کوئی مجبوری نہیں سننا چاہتا۔ جب تم یہاں روتے ہوئے آئے تھے کہ تمہیں ملازمت کی ضرورت ہے تو مجھے تم پر ترس آیا تھا۔ اب یا تو تمہیں میری مرضی کے مطابق کام کرنا ہے فشر یا پھر یہاں سے نو دو گیارہ ہوجاؤ۔ سمجھ گئے میری بات!"

اس بار پاپا کی آواز واضح طور پر سنائی دی۔ "آئی ایم سوری مسٹر گولڈ..." وہ کہہ رہے تھے۔ ان کے لہجے میں ایسی شکستگی تھی کہ مجھے اپنے پیٹ میں اینٹھن محسوس ہونے لگی۔ "میں وعدہ کرتا ہوں، اب ایسا نہیں ہوگا۔"

میرے اندر عجیب سی وحشت اور دیوانگی امڈ رہی تھی۔ وہ سؤر کا بچہ جس انداز میں میرے پاپا سے بات کررہا تھا اس پر میں محض اپنے ہاتھوں سے اسے ختم کرسکتا تھا۔ میرے خیال میں کسی انسان کو کسی دوسرے انسان سے اس انداز میں بات

کرنے کا حق حاصل نہیں۔

کلرک نے مجھے پوچھا دیا۔ "میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں ینگ مین؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میں وہاں کسی کام سے آیا تھا۔ پاپا کا کھانا میرے ہاتھ میں تھا۔ میں پاپا، میں نے کھانا کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ "یہ ڈاکٹر فشر کا کھانا ہے۔" میں نے کہا اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔

مسٹر گولڈ کی کھردری، نکیلی اور منحوس آواز سڑک تک میرا تعاقب کرتی رہی۔

"صرف ایک ڈالر فی کس۔" اسپٹ نے بُنڈ لہجے میں کہا۔

میں نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "اگر تم اس سے زیادہ کمانا چاہتے ہو تو کمالو۔ یہ میں رکھ لیتا ہوں۔"

اسپٹ کی رال بہتی ہوئی باچھوں تک آگئی۔ وہ جوش میں آگیا تھا اور اس کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ "او کے ڈینی۔ میں بحث نہیں کررہا ہوں۔"

میں رقم تقسیم کی اور ان کے چہروں کو دیکھا۔ بچے ڈالر میرے تھے۔ وہ میرا حق تھا۔ منصوبہ تو میں

"اب کیا کرنا ہے ڈینی؟" اسپٹ نے پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں..." میں نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "لیکن اب اس طرح کا کام بہ ہر حال نہیں کریں گے۔ اس میں کچھ نہیں رکھا..." میں نے سگریٹ سلگالی۔ "لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں کچھ اچھا ہی سوچوں گا..." میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے سات بجے تھے۔ "میں گیراج میں کچھ کام نمٹانے جارہا ہوں۔ کوئی آئے گا میرے ساتھ؟"

"میں نے تو ایک لڑکی کو وقت دے رکھا ہے۔" اسپٹ نے لاپروائی سے کہا۔ "اچھا ہے نا۔ اپنی محنت کے کچھ مزے تو لوٹ لو۔"

میں گیراج کی طرف چل دیا۔ اسپٹ کی بات سمجھ میں آگئی تھی۔ میں نے کار زر کی طرف چل دیا۔ اسپٹ کی بات یاد آئی تھی کہ میں نے بھی سوڈا فاؤنٹین پر کام کرنے والی لڑکی سے وعدہ کیا ہے۔ وہ مجھے اچھی لگی تھی۔ ذہین بھی تھی۔ مجھے ان لڑکیاں اچھی لگتی تھیں۔

ان کے پاس ساڑھے تین ڈالر تھے اور میں کافی بہتر

گیراج کے دروازے پر ایک لمبوترے چہرے والا اطالوی لڑکا کھڑا تھا۔ وہ شاید چوکی داری پر مامور کیا گیا تھا۔ میں اس کے پاس سے گزر کر اندر جانے لگا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے روک لیا۔ "کہاں جارہے ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میں وہاں کسی کام سے آیا تھا۔ پاپا کا کھانا میرے ہاتھ میں تھا۔ میں پاپا، میں نے کھانا کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ "یہ ڈاکٹر فشر کا کھانا ہے۔" میں نے کہا اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔

مسٹر گولڈ کی کھردری، نکیلی اور منحوس آواز سڑک تک میرا تعاقب کرتی رہی۔

"صرف ایک ڈالر فی کس۔" اسپٹ نے بُنڈ لہجے میں کہا۔

میں نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "اگر تم اس سے زیادہ کمانا چاہتے ہو تو کمالو۔ یہ میں رکھ لیتا ہوں۔"

اسپٹ کی رال بہتی ہوئی باچھوں تک آگئی۔ وہ جوش میں آگیا تھا اور اس کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ "او کے ڈینی۔ میں بحث نہیں کررہا ہوں۔"

میں رقم تقسیم کی اور ان کے چہروں کو دیکھا۔ بچے ڈالر میرے تھے۔ وہ میرا حق تھا۔ منصوبہ تو میں

"اب کیا کرنا ہے ڈینی؟" اسپٹ نے پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں..." میں نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "لیکن اب اس طرح کا کام بہ ہر حال نہیں کریں گے۔ اس میں کچھ نہیں رکھا..." میں نے سگریٹ سلگالی۔ "لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں کچھ اچھا ہی سوچوں گا..." میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے سات بجے تھے۔ "میں گیراج میں کچھ کام نمٹانے جارہا ہوں۔ کوئی آئے گا میرے ساتھ؟"

"میں نے تو ایک لڑکی کو وقت دے رکھا ہے۔" اسپٹ نے لاپروائی سے کہا۔ "اچھا ہے نا۔ اپنی محنت کے کچھ مزے تو لوٹ لو۔"

میں گیراج کی طرف چل دیا۔ اسپٹ کی بات سمجھ میں آگئی تھی۔ میں نے کار زر کی طرف چل دیا۔ اسپٹ کی بات یاد آئی تھی کہ میں نے بھی سوڈا فاؤنٹین پر کام کرنے والی لڑکی سے وعدہ کیا ہے۔ وہ مجھے اچھی لگی تھی۔ ذہین بھی تھی۔ مجھے ان لڑکیاں اچھی لگتی تھیں۔

ان کے پاس ساڑھے تین ڈالر تھے اور میں کافی بہتر

میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ میرے برابر کھڑی تھی۔ میں نے اسے دروازے سے باہر آتے دیکھا تھا۔ لیکن اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ کیوں کہ اسٹور کے یونیفارم کے بجائے وہ اب عام لباس میں تھی اور اپنے پہلے تاثر کے برعکس بہت کم عمر لگ رہی تھی۔

"ہائی نیلی۔" میں نے کہا۔ واقعی... وہ بہت کم عمر تھی۔ مجھ سے ایک سال چھوٹی ہی ہوگی۔ "بھوک لگی ہے تمھیں؟" ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد میں نے پوچھا۔ میں ابھی تک اس کی کم عمری کے شاک سے نہیں سنبھلا تھا۔

اس نے جھجکتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے انداز میں شرمندگی تھی۔ اس وقت وہ اس خود اعتمادی سے محروم تھی جو میں نے اسٹور میں اس کے انداز میں دیکھی تھی۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے کار نر کی طرف لے چلا۔ کن اکھیوں سے میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت بڑی بڑی تھیں۔ میرے ساتھ چلتے ہوئے وہ سامنے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "تم تو بہت کم عمر لگتی ہو۔" مجھ سے رہا نہیں گیا۔

اس نے سر گھما کر مجھے دیکھا۔ "اسٹور میں کام کرنے والی لڑکیاں کوشش کرتی ہیں کہ اپنی عمر سے بڑی نظر آئیں۔ ورنہ وہ جاب سے محروم ہو سکتی ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں گرم جوشی سی چمکی۔ "اور تم اپنی عمر سے بڑے لگتے ہو۔"

میں مسکرایا۔ یہ بات مجھے اچھی لگی۔ میں نے اس کے لیے ریسٹورنٹ کا دروازہ کھولا۔ "چلو، کچھ کھالیں۔"

ایک بوڑھا چینی ہمیں ایک میز تک لے گیا اور اس نے دو مینو ہمارے سامنے رکھ دیے۔ ریسٹورنٹ تقریباً خالی تھا۔ صرف دو میزیں اور ایسی تھیں جو خالی نہیں تھیں۔

میں نے مینو کا جائزہ لیا۔ اپنے لیے میں نے کچھ منتخب کرلیا پھر اس کی طرف دیکھا۔

"جو تم چاہو، وہی میرے لیے منگالو۔"

میں نے نوجوان چینی ویٹر کو آرڈر دیا۔ پھر میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ لیکن مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے نظریں جھکالیں۔ اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر گلابی رنگ پھیلتا گیا۔

مجھے لگا کہ ہمارے درمیان اچانک کوئی دیوار سی حائل ہوگئی ہے۔ "کیا بات ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا..." اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تو تمھیں جانتی بھی نہیں۔ میرے پاپا..."

"انھیں یہ بات اچھی نہیں لگے گی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میرا اعتماد اور بڑھ گیا۔ "یہ بتاؤ، تمھاری عمر کتنی ہے؟"

"ست..... نن..... نہیں سولہ سال سمجھ لو۔" وہ بری طرح نروس ہو رہی تھی۔

"اسٹور میں کب سے کام کر رہی ہو؟"

"تقریباً ایک سال ہوگیا۔ اسٹور والے سمجھتے ہیں کہ میں بڑی ہوں۔" اس کے لہجے میں حیا تھی۔

"تمھارے پاپا بہت سخت گیر ہیں؟"

"ایسا بھی نہیں۔ دراصل وہ پرانے خیالات کے اطالوی ہیں۔ پرانے زمانے کو روتے رہتے ہیں، اٹلی میں یہ ایسے ہوتا تھا، یہ نہیں ہوتا تھا۔ سمجھ رہے ہو نا...؟" اس نے پھر میری آنکھوں میں دیکھا۔ اب کے وہ بولی تو اس کے لہجے میں شبنمی تھی۔ "مجھے کام سے چھٹی کے بعد سیدھا گھر جانا ہوتا ہے۔ جھوٹ بول کر، عمر زیادہ بتا کر ملازمت حاصل کرنے اور پیسے کما کر گھر لے جانے میں تو کوئی بُرائی نہیں۔ اس کے لیے تو میں بڑی ہوں۔ لیکن اتنی بڑی نہیں ہوں کہ کسی لڑکے کے ساتھ باہر جاسکوں۔ اگر انھیں پتا چل گیا کہ میں تمھارے ساتھ تھی تو وہ طوفان اٹھادیں گے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس طویل تمہید کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ "پھر تم کیوں آئیں میرے ساتھ؟"

وہ مسکرائی۔ "شاید میں امریکا کو اٹلی سمجھتے سمجھتے اکتا چکی ہوں۔ شاید میرا خیال ہے کہ پاپا کو بھی اب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اٹلی میں نہیں، امریکا میں رہتے ہیں۔ انھیں سمجھنا چاہیے کہ یہاں کے طور طریقے مختلف ہیں، زمانہ بدل گیا ہے۔"

میں بہ دستور اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ "کیا یہی ایک وجہ تھی یہاں آنے کی؟"

میری نگاہوں کی گرمی سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ "نہیں..." اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "اصل وجہ یہ تھی کہ میں تم سے اسٹور کے باہر ملنا چاہتی تھی، دیکھنا چاہتی تھی کہ تم کیسے لگتے ہو۔"

"تو میں تمھیں کیسا لگا؟"

"بہت اچھے۔" اس کے رخسار دہک رہے تھے۔ "اور میں تمھیں کیسی لگی ڈینی؟" اس نے شرمیلے لہجے میں پوچھا۔

"اتنی اچھی کہ میں تمھیں بتا نہیں سکتا۔" میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ میری خود اعتمادی اور بڑھ گئی تھی۔

برائے توجہ

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

وہ اسٹریٹ کارنر پر ٹھیر گئی۔ "بس ڈینی، تم مجھے یہیں چھوڑ دو..." اس نے میرے چہرے کو تکتے ہوئے کہا۔ "میرے پاپا دروازے پر میرے منتظر ہوں گے۔"

"یہ مجھے اچھا بہانہ ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

اس کی آنکھوں میں سایہ سا لہرا گیا۔ "یہ بات نہیں ہے ڈینی۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ دراصل میرے پاپا کو جانتے ہی نہیں ہو۔"

"میں جانتا ہوں کہ یہ بہت عام سا جملہ ہے۔ پھر بھی مجھے آدھا یقین آگیا ہے تم پر۔"

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "میرا یقین کرو ڈینی...!" اس کے لہجے میں خلوص اور سچائی تھی۔ "میں کبھی تمھیں بے وقوف نہیں بناؤں گی۔ سچ کہہ رہی ہوں، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"

میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ "تو تم انھیں دیر سے آنے کی وجہ بتاؤ گی؟"

"کبھی کبھی اسٹور میں کام زیادہ ہوتا ہے تو مجھے دیر تک رُکنا ہوتا ہے۔"

"یہ سن کر انھیں بہت غصہ آئے گا؟"

"نہیں۔ اس پر انھیں کبھی غصہ نہیں آتا۔ کام میں کتنی ہی دیر تک کروں، اس میں ان کے نزدیک کوئی حرج نہیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور ایک بند اسٹور کے ڈور وے کی طرف چلا گیا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ "یہاں آؤ۔"

وہ ایک لمحہ مجھے دیکھتی رہی پھر ہچکچاتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ وہ نروس ہو رہی تھی۔ "کیوں بلا رہے ہو مجھے تم؟" اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"کیا تم نہیں جانتیں کہ کیوں بلا رہا ہوں!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

وہ ایک قدم اور بڑھی پھر رُک گئی۔ اس کے چہرے پر عجیب سا دکھ مچلا۔ "نہیں ڈینی، میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔"

"تو میں ٹھیک ہی سمجھا تھا..." میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ "تم مجھے جھٹک رہی ہو۔" میں نے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا۔ "ٹھیک ہے بے بی، اب تم کھسک لو۔ تم اپنے حصے کے مزے لے چکیں۔" میں نے ہاتھوں کے حلقے میں جلتی ہوئی دیا سلائی لے کر سگریٹ سلگائی۔ دیا سلائی بجھاتے ہوئے میری نظر اٹھی تو وہ وہیں کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ ہمارے درمیان کھنچاؤ تھا۔ وہ اس خوف زدہ ہرنی کی طرح کھڑی تھی جو کسی بھی لمحے بھاگنے کے لیے تیار ہو۔

میں نے دھوئیں کا مرغولا اس کی طرف اچھالا۔ "اب کھڑی کیوں ہو؟ گھر جاؤ۔ تمھارے پاپا تمھارے منتظر ہوں گے۔"

وہ ایک قدم اور آگے بڑھ آئی۔ "ڈینی، میں یہ سب کچھ نہیں چاہتی۔ یہ وہ انداز نہیں جو مجھے پسند ہے۔ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم مجھ سے ناراض ہو جاؤ۔"

میرے اندر اب تلخی امڈ رہی تھی۔ وہ اتنی معمولی بات کا اس طرح بتنگڑ کیوں بنا رہی ہے؟ مجھے اس پر غصہ آرہا تھا۔ "تو تمھیں کون سا انداز پسند ہے؟" میں نے زہریلے انداز میں کہا اور بے رحمی سے ہنسنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "میرا خیال تھا کہ تم مجھے پسند کرتے ہو..." اس نے کم زور سی آواز میں کہا۔ "اور میں تمھیں پسند کرتی ہوں ڈینی۔"

میں نے ہاتھ بڑھایا اور اسے اپنی بانہوں میں کھینچ لیا۔ سگریٹ کو میں نے نیچے گرایا اور اسے لپٹا لیا۔ اس کا جسم اکڑا ہوا تھا۔

وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ لیکن اس نے خود کو مجھ سے چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے سوچا، شاید میں نے اس کے لبوں سے کچھ سرخی چرالی ہے۔ لیکن جب وہ پیچھے ہٹی تو میں نے دیکھا کہ وہ میرا وہم تھا۔ اس کے ہونٹ تو پہلے سے زیادہ سرخ تھے۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا اور رونے لگی۔

"تم مجھے اچھا نہیں سمجھتے ہو... ہے نا؟" اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

میری الجھن کی کوئی حد نہیں تھی۔ یہ سب کچھ میری توقع کے برعکس تھا۔ پھر میں بولا تو وہ الجھن میرے لہجے اور میری آواز میں بھی تھی۔ "تم میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ یہ کیا کھیل کھیل رہی ہو تم میرے ساتھ؟"

"تم مجھے اچھے لگے تھے ڈینی...!" اس نے کہا۔ "اسی لیے میں نے تمہاری بات مان لی اور گھر جانے کے بجائے تمہارے ساتھ چلی آئی۔ تم مجھے اچھے لگے تھے ڈینی!"

میں نے اسے محبت سے لپٹا لیا۔ "لیکن تم تو اسٹور میں بڑی چالاک اور تیز و طرار بن رہی تھیں..." میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "تم نے اسٹور میں ہمارا سیٹ اپ بھی سمجھ لیا تھا۔ کیسے؟ جب کہ تم اتنی معصوم ہو۔"

"یہ ترکیبیں تو میرا بھائی جوزف مجھے بتاتا رہتا ہے۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"تم مجھے بہت پسند ہو۔" میں نے خوش دلی سے ہنستے ہوئے کہا۔ "عجیب سی ہو لیکن بہت اچھی لگتی ہو۔"

وہ بھی مسکرائی۔ "تم مجھے بُری لڑکی تو نہیں سمجھ رہے ہونا...؟" اس نے پوچھا۔ "اور مجھ سے ناراض بھی نہیں ہونا؟"

"نہیں بے بی۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے پھر اسے لپٹا لیا۔ اس بار اس کے انداز میں سپردگی تھی۔ وہ عجیب کیفیت تھی۔ ہم جیسے دھند میں لپٹے کھڑے تھے۔ نہ وہ کار نرتھا، نہ دکان کا ڈوروے، نہ اسٹریٹ لیمپ۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا، سوائے ہم دونوں کے۔

پھر وہ ایک دم سے گھبرائی اور اس نے میرے متحرک ہاتھوں کو تھام لیا۔ "نہیں ڈینی... بس رک جاؤ... پلیز۔"

"تم مجھ سے کبھی نہ ڈرنا نیلی..." میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے دلاسا دیا۔ "مجھ سے تمہیں کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

وہ عجیب لڑکی تھی۔ پل میں کچھ اور پل میں کچھ۔ ابھی وہ خوف زدہ تھی اور ابھی میری بات سن کر وہ طمانیت سے مسکرائی۔ وہ بے حد شرمیلی مسکراہٹ تھی۔ "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا ڈینی کہ یہ مجھے اچھا بھی لگ سکتا ہے۔"

میں نے اس کی ٹھوڑی تھام کر اُس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "میں بھی سچ کہہ رہا ہوں کہ مجھے اتنا خوب صورت تجربہ پہلی بار ہُوا ہے۔" اور یہ بات میں نے اپنی روح کی گہرائیوں سے محسوس کر کے کہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں خوب صورت حیرانی تھی۔ "ڈینی، کیا تم..." وہ کہتے کہتے ہچکچائی۔ "تمھارا کیا خیال ہے، کیا ہم محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں؟ کیا یہ محبت ہے؟"

میں نے الجھن سے اسے دیکھا۔ اس کی بات کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں محبت کو جانتا پہچانتا ہی نہیں تھا۔ میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ "ممکن ہے نیلی... ہاں نیلی، یہ ممکن ہے۔"

پھر اچانک میرے بولتے بولتے ہم دونوں پر شرمندگی سی طاری ہوئی اور بے ساختہ ہم دُور ہو گئے۔ میں نے پھر ایک سگریٹ سلگائی۔ اس کا ہاتھ جھجکتا ہُوا میری طرف بڑھا اور میں نے اسے تھام لیا۔

دیر تک ہم یونہی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑے رہے۔ میری سگریٹ بغیر کش لیے ہی ختم ہو گئی۔ میری انگلی جلی۔ میں نے سگریٹ کو گھبرا کر دُور اچھال دیا۔ پھر میں اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"کیسا لگ رہا ہے نیلی؟"

"یہ تو کوئی خوب صورت خواب ہے ڈینی۔" اس نے شرماتے ہوئے کہا۔

ہم چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر ہنسنے لگے۔ وہ دلی خوشی تھی جس نے ہماری باہمی شرمندگی کو دھو ڈالا۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ "مجھے ڈر ہے کہ تمھارے پاپا تم پر غصہ نہ کریں۔" میں نے کہا۔

"میں نے کہا نا، میں کہہ دوں گی کہ اسٹور میں کام زیادہ تھا۔ یہ سن کر تو وہ خوش ہوتے ہیں۔"

ہم اسٹور کے بند دروازے سے ہٹ کر اسٹریٹ لائٹ کے نیچے آ گئے۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہُوا تھا، دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے اور آنکھوں میں ستاروں کی سی چمک تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

"میں نے شاید تمھیں بتایا نہیں کہ تم بہت خوب صورت ہو۔"

"نہیں۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"تمھاری خوب صورتی نے مجھے بہت ہی نہیں دی..." میں نے کہا۔ "چلو، اب بتا دیتا ہوں۔ تم بہت حسین ہو۔"

"کاش... میں تمھیں ہمیشہ ایسی ہی لگوں۔"

"ایسا ہی ہو گا..." میں نے کہا۔ "اب تمھیں گھر جانا ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا لیکن میرا ہاتھ اور مضبوطی سے تھام لیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ شب بخیر۔"

"تم پھر ملو گے نا ڈینی؟" اس کے لہجے میں خوف اور التجا کی ملی جلی کیفیت تھی۔

"ہاں، ہر روز۔ اسی جگہ، اسی وقت۔"

"اور تم اسٹور میں آؤ گے تو میں تمھیں بہت اسپیشل سوڈا بنا کر دوں گی۔ اس میں تین چمچے آئس کریم ڈالوں گی۔" وہ

بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔

"تین چمچے آئس کریم! تب تو میں آئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔" وہ مسکرائی۔ "شب بخیر ڈینی۔"

"شب بخیر بے بی۔"

وہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کا سایہ سا لہرایا۔ "تم اپنے دوستوں کو تو ساتھ نہیں لاؤ گے نا؟ وہ کسی دن پکڑے جائیں گے۔" اس نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"ارے... تم اُن کے لیے پریشان ہو رہی ہو۔" مجھے ہنسی آ گئی۔

"مجھے ان کی کیا پروا ہو سکتی ہے..." اس نے شُد لہجے میں کہا۔ "میں تو تمھارے لیے پریشان ہو رہی ہوں۔"

میرے وجود میں طمانیت میں لپٹی ہوئی ایک سچی خوشی لہرا گئی۔ وہ سچ مچ بہت اچھی لڑکی تھی۔ اچھی لڑکیاں تو قسمت سے ہی ملتی ہیں۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں انھیں اپنے ساتھ نہیں لاؤں گا۔"

اس کے چہرے پر اب بھی گمبھیرتا تھی۔ "کیا ضروری ہے کہ تم ایسے لڑکوں کے ساتھ رہو اور یہ سب کچھ کرو۔ دیکھو نا، تم پکڑے بھی جا سکتے ہو۔ تم کوئی جاب کیوں نہیں تلاش کرتے؟"

"میرے گھر والے مجھے اسکول نہیں چھوڑنے دیں گے۔"

اس کے لہجے میں محبت بھری گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا جیسے میرا کرب بانٹ رہی ہو، بانٹ رہی ہو۔ لیکن اس کی آنکھوں میں اب بھی فکرمندی تھی۔ "بہت محتاط رہنا ڈینی!" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ اب تو میں تمھاری خاطر زیادہ ہی محتاط رہوں گا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر میرا رخسار چوم لیا اور شرمیلے لہجے میں بولی۔ "شب بخیر ڈینی۔"

"شب بخیر بے بی۔"

میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا، ہاتھ ہلایا اور پھر عمارت میں داخل ہو گئی۔ اب میں اکیلا تھا۔ میں اس احساس کو سمجھنے کی کوشش کر سکتا تھا، جو اس کی جھجک اور ہچکچاہٹ نے مجھے دلایا تھا۔ لیکن اس کی قربت میں میں اسے کچھ نہیں پا رہا تھا۔ اور پھر وہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔

وہ میری طرح تھی! میرے لیے تھی! وقت نے مجھے بدل دیا تھا۔ لیکن بنیادی طور پر کبھی میں ویسا ہی تھا جیسی وہ اب ہے۔ بار ہو ری این کے معاملے میں میں بھی تو اسی طرح پتا، جھجکتا اور اس سے بھاگتا تھا۔ مجھے وقت گزاری پسند نہیں تھی۔ میں زندگی بھر ساتھ دینے والی محبت کا متلاشی تھا۔

نیلی تو میرا ہی عکس تھی!

میں پلٹا اور واپس چل دیا۔ میں بہت خوش تھا... اتنا خوش کہ کچھ دیر کے لیے یہ بھی بھول گیا کہ اس علاقے میں رہنا مجھے کس قدر ناپسند ہے۔ لیکن ڈیلانسی اسٹریٹ پار کر کے مسٹر گولڈ کے اسٹور کے سامنے سے گزرتے ہوئے جہاں میرے پاپا کام کرتے تھے اور بے عزت ہوتے تھے، میں نے مسٹر گولڈ کو دیکھا تو ناپسندیدگی کا وہ احساس پوری شدت سے ابھر آیا۔

وہ اسٹور کے سامنے کھڑا کینوس اور چمڑے کی بنی ایک پاؤچ کو اپنی جیب میں ٹھونس رہا تھا۔ مجھے اس چرمی تھیلی کی اہمیت کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ اس تھیلی میں بینک میں نائٹ ڈیپازٹ میں جمع کرائی جانے والی رقم تھی۔

میں جلدی سے ایک ڈوروے میں دب گیا اور اسے دیکھتا رہا۔ بارہ بجنے والے تھے۔ اس نے اسٹور میں نگاہ ڈالی پھر ڈیلانسی اسٹریٹ پر ایسیکس کی طرف چل دیا۔ وہ تیز قدموں سے چل رہا تھا۔

میں آدھے بلاک کا فاصلہ درمیان میں رکھ کر اُس کا تعاقب کرنے لگا۔

پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں یہ کیوں کر رہا ہوں۔ لیکن اس کے پیچھے چلتے چلتے اپنا محرک اچانک ہی میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ ایسیکس کی طرف مڑا اور اس کی رفتار بڑھ گئی۔

میں نے سڑک پار کی اور اپنی رفتار بھی بڑھا دی۔ سڑک کے دوسری طرف ہوتے ہوئے فاصلہ رکھنے کی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیے کے خدوخال ابھر رہے تھے۔

وہ ایونیو اے اور فرسٹ اسٹریٹ کے کارنر پر واقع بینک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے جیب سے پاؤچ نکالی اور اسے نائٹ ڈیپازٹری میں گرا دیا۔ پھر وہ پلٹا اور واپس چل دیا۔

میں کارنر پر کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اب وہ کہاں جاتا ہے، کیا کرتا ہے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں نے ایک سگریٹ جلائی اور اپنے آئیڈیے کے بارے میں سوچنے لگا۔

ابتدا میں جب ہم یہاں آئے تھے تو میرے لیے یہ ایک اور ہی دنیا تھی... بالکل مختلف اور اجنبی دنیا! یہاں ایک ہی قانون چلتا تھا۔ لڑو یا بھوکے سو جاؤ۔ اور کوئی قانون یہاں نہیں چلتا تھا۔

یہ بات عاقل و بالغ مردوں سے زیادہ علاقے کے لڑکے جانتے اور سمجھتے تھے۔ بڑے ہوتے ہوتے ان پر اپنی ذمے داری عائد ہو جاتی تھی۔ وہ اندر سے اتنے تلخ اور باہر سے اتنے

سخت جان اور خودسر تھے کہ میں تصوّر بھی نہیں کرسکتا تھا۔ صرف ایک چیز نے مجھے ان کے ہاتھوں مرنے سے بچا رکھا تھا، وہ یہ کہ میں ان سے بہتر لڑاکا اور جنگ جُو تھا۔ اور میں ان سے زیادہ ذہین بھی تھا۔

اس میں بہ ہرحال وقت لگا تھا۔ پہلے تو وہ مجھے سمجھ ہی نہیں پائے تھے۔ ریکسی کی موت والی رات جو میری لڑائی ہوئی تھی، اس نے انھیں میرا احترام کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ کینڈی اسٹور کے کاؤنٹر پر اور اسٹور کے سامنے کافی وقت گزارنے کے بعد میں کہیں ان کی نفسیات سمجھنے کے قابل ہُوا تھا۔

پھر اس کے بعد تو میں ان پر چھا گیا۔ جس لڑکے کی میں نے مرمّت کی تھی وہ اس گینگ کا سرغنہ تھا۔ اس کے اسپتال پہنچنے کے بعد وہ سب بے سمت ہوگئے تھے۔ اسپٹ اور سولی نے سردار بننے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہے۔ وہ لوگ تو صرف جسمانی برتری اور طاقت کی زبان سمجھتے تھے۔

پھر ایک دن میں ایگ کریم کھا رہا تھا کہ اسپٹ میرے پاس آیا۔ ہیجانی کیفیت میں رال اپنی باچھوں پر پھیلاتے ہوئے اس نے مجھے گینگ کی سرداری آفر کی۔ میں نے بڑے محتاط انداز میں اس کی بات سنی پھر میں نے وہ پیش کش قبول کرلی۔ میں یہاں اکیلا تھا۔ اپنی شناخت کے لیے آدمی کو خود کو دوسروں کے ساتھ جوڑنا تو پڑتا ہے۔

یہاں سب سے بڑی چیز پیسا تھا۔ پیسے کی طلب ایسٹ سائیڈ کے علاقے میں طاعون کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس طرف بھی نگاہ ڈالی جائے، وہ گندی سڑکیں اور گلیاں ہوں، دکانوں کی کھڑکیاں ہوں یا گھٹیا اپارٹمنٹ ہاؤس، ہر جگہ وہ طلب مُنہ کھولے نظر آتی تھی، وہ فٹ پاتھ پر چلنے والوں کے شور میں گونجتی سنائی دیتی تھی۔

ایسٹ سائیڈ کے علاقے میں آپ کی جیب میں ایک ڈالر ہے تو آپ بادشاہ ہیں۔ اور اگر آپ کی جیب خالی ہے تو آپ کو کسی ایسے شخص کی تلاش کرنا ہوگی جس کی جیب میں رقم بھی ہو اور وہ اسے آپ کے ساتھ شیئر کرنے پر بھی آمادہ ہو۔ لیکن ایسٹ اینڈ میں بادشاہوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جو دوسرے کی جیب سے ڈالر گھسیٹ لے، وہ بادشاہ ہے۔ اور ایسے بادشاہ کم نہیں تھے... شرطیں لگانے والے نکی، سود خور اور گھٹیا مجرم... یہ وہ لوگ تھے جنھیں جینے کا ہنر آتا تھا۔ ان کا شمار داناؤں میں ہوتا تھا۔ وہ سب ہیرو تھے۔ انھیں رشک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہم لڑکوں کے لیے وہ روشن مثال تھے۔ وہی تو قابلِ تقلید تھے۔

ہم سب لڑکے ان مجرموں جیسے بننا چاہتے تھے۔ یہاں کسی لڑکے کے لیے اس کا باپ آئیڈیل نہیں تھا۔ وہ لوگ کیسے مثال بن سکتے تھے جو بدلتے وقت کے ساتھ ہم آہنگی حاصل نہ کرنے کے نتیجے میں یوں گرے تھے کہ لوگ انھیں روندتے ہوئے گزر رہے تھے... جن کے پاس سنبھلنے اور اٹھنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ایسٹ سائیڈ میں ایسے باپوں کی کمی نہیں تھی۔ اس پس ماندہ علاقے میں بھی انھیں پس ماندہ سمجھا جاتا تھا۔ کوئی حد تھی ان کی پس ماندگی کی! کون بیٹا ان کی طرح بننا چاہے گا؟

تو کوئی لڑکا اپنے باپ جیسا نہیں بننا چاہتا تھا۔ ہم سب تو بادشاہ بننا چاہتے تھے۔ میں بھی اب اس آبادی کا حصّہ تھا، اور بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ بادشاہ بنتے ہی میں اپنا گھر دوبارہ حاصل کروں گا۔

میں نے سر جھٹکا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ اسپٹ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اب آگے کیا کرنا ہے۔ اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا۔ اس وقت تو میں بس اتنا سمجھ پایا تھا کہ فل ہاؤ اینڈ ڈائم میں جو محنت ہم نے کی تھی، اس کا صلہ بہت... بہت زیادہ حقیر تھا۔ لیکن اب میں جان گیا تھا کہ آگے کیا کرنا ہے۔ میں ایک تیر سے دو شکار کرسکتا تھا۔ میں نے سوچا، گھر جانے سے پہلے اسپٹ اور سولی سے اس سلسلے میں بات کرلی جائے۔

میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ وہ ایسی ہیجانی کیفیت تھی کہ جس میں نیند آ ہی نہیں سکتی تھی۔

باہر سڑک کی طرف سے کسی ہارن کی آواز سنائی دی۔ میں آہستگی سے اپنے بستر سے اٹھا اور کھڑکی کے قریب کرسی رکھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک سگریٹ جلائی اور باہر دیکھنے لگا۔

نیچے ایک ٹرک کھڑا تھا۔ کچھ لوگ کچرے کے ڈبے ٹرک میں خالی کررہے تھے۔

مجھے اسپٹ کے چہرے کا تاثر یاد آیا جو میری بات سننے کے بعد اس کے چہرے پر ابھرا تھا۔ وہ خوف زدہ ہوگیا تھا لیکن سولی نے جھٹ سے اسے قبول کرلیا تھا۔ اس بات نے اسپٹ کو بھی مجبور کردیا۔

اس کام کے لیے ہم تین ہی کافی تھے۔ لیکن پہلے ہمیں کئی دن تک گولڈ کے معمولات کو چیک کرنا تھا۔ یہ بات بہت اہم تھی۔ ہم میں سے کسی ایک کو، یا باری باری ہر ایک کو کئی راتوں تک اس کا پیچھا کرنا تھا۔ دیکھنا تھا کہ کب وہ اسٹور سے نکلتا ہے، کہاں کہاں رکتا ہے، اس کی عادات کیا ہیں اور معمولات کیا

ہیں۔ پھر کسی مناسب رات کو ہم کام دکھا سکتے تھے۔

میں نے انھیں بتایا تھا کہ اس بار دو تین سو ڈالر تو ہاتھ آئیں گے ہی۔ اور ہمیں کرنا ہی کیا ہے... اسے بے ہوش کرکے حویلی پہنچانی ہے اور بس۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں، کوئی دشواری نہیں۔ میں نے انھیں یہ نہیں بتایا کہ میرے پاپا اسی اسٹور میں کام کرتے ہیں۔ اس سے ان کا کوئی تعلق تھا بھی نہیں۔

کھلی کھڑکی سے مجھے کسی لڑکی کی آواز سنائی دی اور مجھے حویلی کا خیال آگیا۔ اس علاقے میں وہ ویسے ہی عجیب لڑکی تھی۔ اس پر یہ کہ وہ اطالوی تھی۔ عام طور پر اطالوی لڑکیاں اکھڑ اور بدزبان ہوتی ہیں۔ مُنہ کھولتی ہیں تو پتا چل جاتا ہے کہ وہ اطالوی ہیں۔ لیکن نیلی مختلف تھی۔ وہ بہت اچھی، نرم خو اور نرم گفتار تھی اور وہ مجھے پسند بھی کرتی تھی۔ یہ بات میں جانتا تھا۔

کیسی عجیب بات ہے۔ آپ کسی لڑکی کو وقت گزاری کے لیے منتخب کرتے ہیں، اور پھر آپ کو پتا چلتا ہے کہ نہیں، یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اور آپ کو احساس ہوتا ہے کہ آپ اسے کچھ کچھ پسند کرنے لگے ہیں۔ اب آپ کو ایسا کچھ نہیں کرنا کہ جس سے اس کی دل آزاری ہو اور وہ آپ کو ناپسند کرنے لگے۔

عجیب بات تھی۔ میں نے پہلے کبھی کسی کے لیے اس طرح محسوس نہیں کیا تھا۔ پھر مجھے اس کی بات یاد آئی... کہیں یہ محبت تو نہیں؟ اب میں سوچ رہا تھا کہ یہ عین ممکن ہے۔ کیوں کہ جو کچھ ہُوا، اس کی کوئی اور وضاحت میرے پاس نہیں تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہُوا تھا کہ میں کسی لڑکی کا ہاتھ تھام کر، محض اس سے بات کرنے پر اکتفا کرلوں، جس کی محض قربت ہی میرے لیے خوشی بن جائے۔ ممکن ہے، بالکل ممکن ہے کہ یہ محبت ہو۔

کھڑکی سے لڑکی کی تیرتی ہوئی آواز پھر اندر آئی۔ میں نے گردن آگے بڑھائی تاکہ اسے دیکھ سکوں۔ لیکن سڑک سنسان تھی، وہاں کوئی نہیں تھا اور آواز پھر بھی سنائی دی۔ اس بار وہ آواز مجھے جانی پہچانی سی لگی۔ لیکن میں اسے شناخت نہیں کرسکا۔

لڑکی پھر باتیں کررہی تھی۔ اس بار میری سمجھ میں آگیا کہ وہ چھت پر ہے۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو جلتی ہوئی سگریٹ کا سرا نظر آیا پھر میں نے وہ آواز پہچان لی۔ ارے، یہ تو اسی کی آواز ہے۔ یہ اس وقت چھت پر کیا کررہی ہے۔ رات کا ایک بجا ہے۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ اس نے اپنی ڈیٹ کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ کوئی لڑکا تھا جو اس کے ساتھ آفس میں کام کرتا تھا۔ جارج نام تھا اس کا۔ میں نے نیمی کا مذاق اُڑایا تھا کہ وہ آفس میں کام کرنے والے کسی معمولی کلرک پر وقت ضائع کررہی ہے۔ اس پر اُس نے غصّے سے کہا تھا۔ ”وہ ان لفنگوں سے بہت بہتر ہے جن کے ساتھ تم کینڈی اسٹور کے باہر اٹھتے بیٹھتے ہو۔“

میں نے سوچا کہ مجھے اوپر جا کر دیکھنا چاہیے کہ مس اعلاو ارفع کیا کررہی ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس علاقے میں کوئی بھی چھت پر صرف ستاروں کا نظارہ کرنے کے لیے نہیں جاتا۔

میں خاموشی سے کمرے سے نکل آیا۔

چھت کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے خود کو اس کی اوٹ میں رکھتے ہوئے چھت کا جائزہ لیا۔ نیمی وہاں موجود تھی اور اس کا دوست جارج بھی۔ میں انھیں دیکھتا رہا۔

چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ نیمی کے چہرے کو دیکھ کر مجھے شاک لگا۔ اس وقت وہ محض ایک لڑکی لگ رہی تھی... ایک عام لڑکی۔ اور لڑکا دھیمی آواز میں باتیں کررہا تھا۔ اس کے الفاظ میں نہیں سُن پایا۔ لیکن یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ گھگیا رہا ہے۔

نیمی نے نفی میں سر ہلایا۔ اور لڑکا دوبارہ گھگیانے لگا۔

نیمی نے دوبارہ نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں جارج، شادی کو تو بھول ہی جاؤ۔ میں تمھیں بہت پسند کرتی ہوں۔ لیکن پیسے کی فکر کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ تمھارے ساتھ رہ کر بھی یہی دیکھنا ہوگا۔ یہ میں نہیں چاہتی۔“

میں مسکرایا۔ نیمی بھی ایسٹ کا مزاج سمجھ چکی تھی۔ وہ ڈالر کی اہمیت سمجھتی تھی۔ لیکن اس کی شادی کا تصوّر میرے لیے کچھ مضحکہ خیز سا تھا۔ پھر اچانک مجھے احساس ہُوا کہ وہ بڑی ہوچکی ہے، بچی نہیں رہی۔

جارج نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ نیمی نے کوئی مزاحمت بھی نہیں کی۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ چھت پر وہ پہلے بھی آتی رہی ہے۔

میں پلٹا اور نیچے اتر کر فلیٹ میں داخل ہُوا۔ دبے پاؤں چلتا میں اپنے کمرے میں آگیا۔

کوئی پندرہ منٹ بعد میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو اٹھ کر ہال کی طرف بڑھا۔ وہ بہت احتیاط سے، آواز پیدا کیے بغیر دروازہ بند کررہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اچھل پڑی۔ ”تم ابھی تک جاگ رہے ہو ڈینی...؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”سوئے نہیں؟“

میں نے جواب نہیں دیا۔ بس اسے دیکھ کر چھیڑنے، چڑانے والے انداز میں مسکراتا رہا۔

اس نے غصّے سے مجھے گھورا۔ ”یہ دانت کیوں نکل رہے ہیں تمھارے؟“

"آئینے میں اپنے ہونٹ دیکھ لو تو خود سمجھ جاؤ گی۔"

اس کا ہاتھ اضطراری طور پر اپنے ہونٹوں کی طرف لپکا۔

"تو تم اوپر میری جاسوسی کر رہے تھے؟"

"جی نہیں۔ تم اور تمھارا بوائے فرینڈ میرے سر پر بیٹھ کر شور مچا رہے تھے۔ میں سو ہی نہیں سکا۔"

"تمھارے دماغ میں گندگی بھری ہوئی ہے۔" وہ غرائی۔

"اپنے چھوٹے، پیارے بھائی کی نصیحت گرہ میں باندھ لو بے بی...!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "چھت پر جاتے وقت لپ اسٹک نہ لگایا کرو۔"

وہ غصّے سے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی۔ شاید غصہ اتنا شدید تھا کہ وہ جوابی حملہ کرنا بھی بھول گئی۔

ہم ناشتا شروع کر ہی رہے تھے کہ پاپا آ گئے۔ ان کے چہرے پر لکیروں کا جال بہت نمایاں ہو گیا تھا۔ وہ لکیریں صرف تھکن کا نتیجہ نہیں تھیں۔ ان میں اس اذیت، بے بسی اور مایوسی کا بھی بڑا دخل تھا جو اپنی اور اپنے ہنر کی توہین و تذلیل کا نتیجہ تھا۔ وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتے تھے کہ ان پر کیا گزر رہی ہے۔

میرے وجود میں ہم دردی کی ایک موج سی اٹھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "پاپا، آپ یہاں کھڑکی کے پاس بیٹھیں۔" وہ کچن میں سب سے آرام دہ اور ہوادار جگہ تھی۔

پاپا میری چھوڑی ہوئی کرسی میں ڈھیر ہو گئے۔ انھوں نے تشکّر سے مجھے دیکھا۔ "ڈینی، رات تم میرا کھانا لائے، شکریہ...!" انھوں نے کہا۔ "میں کام میں مصروف تھا۔ تمھیں آتے ہوئے نہیں دیکھ سکا تھا۔"

"کلرک نے مجھے بتا دیا تھا پاپا۔" میں نے جھوٹ بولا۔ وہ بھی جانتے تھے کہ میں ان کی مصروفیت سے واقف تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میں نے مسٹر گولڈ کو انھیں ہنکارتے سنا تھا۔ لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اس راز میں کسی کو شریک کروں۔

ماما نے دلیے کی قاب لا کر پاپا کے سامنے رکھی۔ "بیری، تم ناشتے کے بعد اپنی نیند پوری کیوں نہیں کرتے ہو؟"

انھوں نے سر اٹھا کر ماما کو دیکھا اور بے بسی سے بولے۔ "دن کی روشنی میں کون سو سکتا ہے؟ کم از کم میں تو اس کا عادی نہیں ہو سکا ہوں۔"

"بہ ہر حال، اتنی محنت کے بعد تمھیں آرام تو کرنا چاہیے۔"

پاپا جواب دیے بغیر دلیا کھانے لگے۔ لیکن ان سے کھایا نہیں گیا۔ انھوں نے چند چمچوں کے بعد پلیٹ دُور ہٹا دی۔ "تم بس مجھے کافی دے دو، میری۔" انھوں نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

ماما نے کافی بنا کر اُن کے سامنے رکھ دی۔ "کل بہت مصروفیت تھی؟" انھوں نے پوچھا۔

"مسٹر گولڈ نے مجھے سانس لینے کی بھی فرصت نہیں دی۔" پاپا نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ پھر انھیں خیال آیا کہ وہ کیا کہہ گئے ہیں۔ انھوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں خاموش التجا تھی۔

میں نے اپنا چہرہ بے تاثر رکھا جیسے مجھے کچھ معلوم ہی نہ ہو۔ کم از کم اس طرح میں ان کی اذیّت میں اضافے کو تو روک سکتا تھا۔ "یہ مسٹر گولڈ کیسے آدمی ہیں پاپا؟" میں نے اپنی پلیٹ پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

پاپا مجھے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ "کیوں پوچھ رہے ہو تم؟"

"یونہی... تجسّس تو ہوتا ہے نا پاپا۔" میں نے کہا۔ میں انھیں اصل وجہ تو نہیں بتا سکتا تھا۔

پاپا چند لمحے سوچتے رہے پھر نپے تلے انداز میں بولے۔ "ٹھیک ٹھاک آدمی ہے وہ۔ بس اعصابی دباؤ کا شکار رہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس پر کام کا بوجھ بہت ہے۔ اس میں دماغ اچھا رہتا ہے اس کا۔"

"آپ کو ان کے ساتھ کام کرنا اچھا لگتا ہے؟"

ایک لمحے کو ہماری آنکھیں ملیں مگر انھوں نے فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ "اچھا کیا اور بُرا کیا۔ کام کرنا ہے تو کرنا ہے۔"

"وہ مینیجر کیسے بن گیا؟"

"جو مینیجر تھا، اسے بیماری کی وجہ سے جاب چھوڑنی پڑی۔ گولڈ میری جگہ کام کرتا تھا۔ وہ واحد رجسٹرڈ ملازم تھا، اس لیے اسے مینیجر بنا دیا گیا۔"

میں نے دل چسپی سے انھیں دیکھا۔ یہ ایک نیا زاویہ تھا۔

"اور اگر مسٹر گولڈ جاب چھوڑ دیں تو آپ مینیجر بن جائیں گے؟"

پاپا ہنسنے لگے۔ "کیا کہہ سکتا ہوں میں؟ ہاں، یہ ممکن تو ہے۔ سپروائزر مجھے پسند کرتا ہے۔"

"وہ کون ہے؟"

"یہ اسٹورز کی ایک چین ہے، وہ اس کا باس ہے۔ اس کا تعلق مرکزی دفتر سے ہے۔"

"وہ مسٹر گولڈ کا بھی باس ہے؟"

"ہاں، وہ سب کا باس ہے..." پاپا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر انھوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ "کیا بات ہے ڈینی؟

سنے سوال۔ کیا موسمِ گرما کی چھٹیوں میں کسی ڈرگ اسٹور میں کام کرنے کا ارادہ ہے؟"

"ممکن ہے۔" میں نے پہلو بچایا۔

"تم مسٹر واٹکن کے ساتھ کام نہیں کرو گے؟"

میں نے کندھے جھٹک دیے۔ "اُن کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔" میں نے کہا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے سام سے امید تھی کہ وہ اس صورتِ حال میں میرے لیے کوئی راہ نکالیں گے۔ لیکن اب میں مایوس ہو رہا تھا۔ شاید پچھلے سال جو بھرس شنڈلر کے معاملے میں ہُوا، اس کے نتیجے میں وہ مجھ سے ناراض ہو گئے تھے۔

"تم انھیں خط کیوں نہیں لکھتے؟" ماما نے کہا۔

"وہ تو تمام وقت سفر میں رہتے ہیں۔ پتا بھی مجھے نہیں معلوم ان کا۔ اور کچھ عجب نہیں کہ اُنھوں نے کاروبار ہی ختم کر دیا ہو۔" میں انھیں اپنے سام کو خط نہ لکھنے کی اصل وجہ تو نہیں بتا سکتا تھا۔

اس وقت میسی لپکتی ہوئی کچن میں آئی۔ "میرے پاس بس دس منٹ کی مہلت ہے ماما..." اس نے کہا۔ "ورنہ میں لیٹ ہو جاؤں گی۔"

"کس کو کہا ہے تمھارے ساتھ۔" ماما نے جھنجلا کر کہا۔ "جلدی کرو تاکہ وقت پر اٹھ سکو۔ رات کو دیر تک کیوں جاگی ہو۔"

"میں بتاؤں...؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میسی کو بوائے فرینڈ مل گیا ہے۔"

پاپا نے بھی میسی کو دل چسپی سے دیکھا۔ "کوئی اچھا لڑکا ہے میسی؟"

میں نے میسی کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ "اس کے دفتر میں کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے والا ہے۔"

میسی غصّے سے میری طرف گھومی۔ "تم اپنا مُنہ بند رکھو..." اس نے بلند لہجے میں کہا۔ "کم از کم وہ تمھاری طرح دن رات بیڈ اسٹور کے باہر نہیں کھڑا رہتا ہے۔ وہ تمھاری طرح بے کار اور لفنگا نہیں۔ کچھ بن کر دکھائے گا۔"

ماما نے تیزی سے مداخلت کی۔ "اپنے چھوٹے بھائی کو ایسی باتیں نہیں کہتے۔ بُری بات!"

میسی نے غصّے سے انھیں دیکھا۔ "کیوں نہیں...!" وہ بڑبڑائی۔ "اس میں ایسا کیا ہے کہ سب اس سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ اب یہاں شفٹ ہوئے ہیں، یہی ہو رہا ہے۔ ہم یہاں سے وہ... اس کا اسکول تبدیل ہُوا تو جیسے قیامت آ گئی۔

بیلا

بنارس میں ایک ایرانی سوداگر کے یہاں مرزا دبیر کے پڑھنے کی مجلس ہوئی۔ اس زمانے میں انیسیوں دبیریوں کی کشیدگی اتنی بڑھ چکی تھی کہ ایک کے مداح دوسرے کی مجلس میں شریک نہ ہوتے تھے، یا شریک ہوتے تو چپکے بیٹھے رہتے تھے۔ اس مجلس میں اتفاق سے انیسیوں کا جمع تھا۔ مرزا صاحب مطلع سے لے کر جنگ تک پڑھ گئے لیکن مجلس گم صم رہی:

اب بین کے موقع پر جب وہ پہنچے تو فرمایا، "اس کا سبب میں سمجھ گیا کہ آپ لوگ کیوں متاثر نہیں ہوئے۔ خیر اب آپ چند بند بین کے بھی سن لیجیے اور آپ کو قسم ہے اگر آپ روئے اور مجھے یہ قسم ہے کہ میں آپ کو رلاؤں۔" یہ کہہ کر جو بین پڑھنا شروع کیا تو ایک کہرام برپا تھا۔ سولہ سترہ آدمیوں کو روتے روتے پیٹتے پیٹتے غش آ گیا۔

مرثیہ خوانی کا فن از نیر مسعود/ مطالعہ ● مصطفیٰ ارباب

اور مجھے جو آخری ٹرم میں اسکول تبدیل کرنا پڑا تو کسی کو دکھ نہیں ہُوا۔ یہ اسکول کے بعد کے وقت کے لیے کوئی کام کیوں نہیں ڈھونڈتا۔ یہ جانتا ہے کہ گھر میں تنگی ہے۔ لیکن اسے ہاتھ بٹانے کا، کچھ کمانے کا خیال نہیں آتا۔ اور کوئی اسے کچھ کہتا بھی نہیں۔ سب ڈرتے ہیں کہ اس کا دل نہ دکھ جائے، اس کے نازک احساسات کو ٹھیس نہ پہنچ جائے۔ یہ دن رات لفنگے لڑکوں کے ساتھ کینڈی اسٹور کے باہر وقت برباد کرتا ہے۔ گھر صرف کھانے اور سونے کے لیے آتا ہے اور وہ بھی بادشاہوں کے سے انداز میں۔ یہ محض ایک لچّا ہے، لفنگا ہے، بدمعاش ہے۔ کسی نہ کسی کو تو اسے یہ بتانا ہوگا۔"

"میسی، شٹ اپ!" پاپا اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ انھوں نے کسی مجرم کی طرح شرمندگی سے میری طرف دیکھا۔

میسی آنسو بھری آنکھوں سے انھیں دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے گھوم کر مجھے دیکھا۔ میں بے اعتنائی سے اسے گھورتا رہا۔ پھر وہ پلٹی اور روتی ہوئی کچن سے نکل گئی۔ وہ کافی بھی نہیں پی سکی تھی۔

پاپا اپنی جگہ بیٹھے مجھے دیکھتے رہے۔ ماما بھی مجھے دیکھ رہی تھیں۔ وہ منتظر تھے کہ میں کچھ کہوں۔ لیکن میرے پاس کہنے کو

کچھ تھا ہی نہیں۔

بالآخر پاپا نے خاموشی توڑی۔ ”ویسے ڈینی، میمی نے جو کچھ کہا، وہ اتنا غلط بھی نہیں ہے۔“ ان کی آواز بھاری تھی۔

میں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

”یہ کینڈی اسٹور کے باہر مجمع لگانے والے لڑکے اچھے ہرگز نہیں ہیں۔“

میں نے اپنی پلیٹ آگے سے ہٹادی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اپنے رہنے کے لیے یہ علاقہ میں نے منتخب نہیں کیا ہے۔ ہم یہاں منتقل ہوئے تو اس میں بھی میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ میں تارک الدّنیا ہو کر گھر میں بیٹھ جاؤں، صرف اس لیے کہ میمی میرے دوستوں کو پسند نہیں کرتی۔“

پاپا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، میں یہ نہیں کہتا۔ لیکن تم اچھے دوست بھی تو بنا سکتے ہو۔“

میں انھیں گھورنے لگا۔ کچھ کہنا بیکار تھا۔ پاپا سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ کچھ بھی کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس فلیٹ میں پہلے ہی دن سے جو پاپا سے میری دُوری ہوئی تھی، وہ اور بڑھ گئی۔ اب میں پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتا تھا۔ ”اس علاقے میں اور کسی طرح کے دوست مل ہی نہیں سکتے...“ میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ ”آپ شاید نہیں جانتے۔ یہاں ایسے ہی لڑکے رہتے ہیں۔ اچھے دوست کہاں سے لاؤں میں۔“

”تو تم کچھ اور بھی سوچ سکتے ہو... کچھ اور بھی کر سکتے ہو۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں کچھ بھی نہیں کر سکتا پاپا...!“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”صرف آپ ہی ہیں جو کچھ کر سکتے ہیں۔“

”تو وہ بتاؤ مجھے۔“

ماما جلدی سے میری طرف لپکیں۔ ”ہاں ڈینی، بتاؤ۔ پاپا جو کچھ کر سکتے ہیں، ضرور کریں گے۔“

”مجھے میرا گھر واپس دلا دیں...“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”وہ آپ نے ہی گنوایا ہے۔ آپ ہی اسے دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر ہم نئے سرے سے زندگی شروع کر سکیں گے۔“

پاپا کی آنکھوں سے اذیت چھلکی، اور بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اسے برداشت کرنا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ میں اٹھا اور اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔

جیسے ہی میں اندر داخل ہُوا، اس کی نگاہوں نے مجھے تلاش کر لیا۔ میں اس کاؤنٹر کی طرف بڑھا جہاں وہ کھڑی تھی۔ میرا ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے میری طرف مڑی۔

”ہیلو ڈینی!“ اس نے شرمیلے لہجے میں سرگوشی کی۔ اس کے چہرے پر رنگ دوڑنے لگا تھا۔

میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”ہائی نیلی۔ رات تمھارے پاپا خفا تو نہیں ہوئے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرا بہانہ کام یاب ثابت ہُوا۔“ اس نے کہا۔ پھر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ میں نے آئینے میں دیکھا۔ اسٹور کا منیجر اس طرف آ رہا تھا۔ ”ایک چاکلیٹ سوڈا؟“ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”میں ابھی لائی جناب۔“ اس نے پلٹ کر شیلف سے گلاس اٹھالیا۔ لیکن منیجر ہماری طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔

نیلی واپس آئی اور اس نے گلاس میرے سامنے رکھ دیا۔ ”میں نے رات تمھیں خواب میں دیکھا۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

میں نے الجھن سے اسے دیکھا۔ شاید وہ پرخلوص سی لڑکی پر مرمٹی تھی۔ مجھے بہ ہر حال، اس کی وارفتگی اچھی لگی۔ ”میں نے خواب تھا نا؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”بہت اچھا۔ مجھے نہیں پتا کہ ایسے خواب بھی ہوتے ہیں۔ میرے اندر جیسے سکون اور خوشی بھر گئی۔“ وہ کہتے کہتے رکی، پھر مجھے غور سے دیکھا۔ ”تم نے بھی میرے بارے میں سوچا ہوگا؟“

”تھوڑا تھوڑا۔“

”میں چاہتی ہوں کہ تم میرے بارے میں بہت سوچا کرو۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے پُرکشش چہرے پر گرم جوشی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ آج اس نے میک اپ نہیں کیا ہے۔ اور آج وہ کل کے مقابلے میں کم عمر بھی لگ رہی تھی۔

میری نگاہ کی گرمی سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ ”آج رات ملو گے مجھے؟“

”ہاں، اُسی جگہ۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

منیجر پھر ہماری طرف آ رہا تھا۔ ”دس سینٹ جناب!“ نیلی نے مجھ سے خالص کاروباری انداز میں کہا۔

میں نے دس سینٹ کا سکّہ اسے دیا۔ اس نے اسے حساب کتاب کی مشین میں ڈال دیا۔ منیجر پھر رُکے بغیر چلا گیا۔

وہ دوبارہ میرے پاس آ گئی۔ ”تو نو بجے؟“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ نئے آنے والے گاہک کی طرف متوجہ ہو گئی۔ میں نے اپنا سوڈا ختم کیا اور اسٹور سے نکل آیا۔

ہم تینوں ڈیلانسی اسٹریٹ پر ٹہل رہے تھے۔ سولی میری اسپٹ کی گفتگو توجہ سے سن رہا تھا۔

میں نے انھیں ڈرگ اسٹور دکھایا۔ ”یہ ہے وہ اسٹور۔“ اس نے کہا۔

”یہاں تو تمھارا باپ کام کرتا ہے۔“ اسپٹ نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

حیرت مجھے بھی ہوئی تھی۔ کیوں کہ میرے خیال میں اسے بات معلوم نہیں تھی۔ لیکن وہ میری بے وقوفی تھی۔ اس علاقے میں کوئی بات کسی سے بھی چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ تو؟ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ میں نے جارحانہ انداز اختیار کیا۔

”اور انھیں شک ہو گیا تو؟“ اسپٹ پر ہیجان طاری ہونے لگا۔ اس کی رال باچھوں پر پھیلنے لگی۔

”کیسے شک ہوگا؟ میرے بارے میں تو وہ سوچ ہی نہیں سکتے۔“

”لیکن یہ میک کوائے ہے...“ اسپٹ نے کہا۔ ”پکڑے جانے کا امکان بھی نہیں ہونے دیں گے۔“

”تمھارے لیے پچھلے کام جیسے چھوٹے موٹے کام ہی مناسب ہیں...“ میں نے حقارت سے کہا۔ ”پھر رونا کہ صرف دو ڈالر ہی ملے ہیں۔ سوچ لو، زیادہ رقم کے لیے خطرہ بھی مول لینا پڑے گا۔“

بالآخر سولی نے بھی چپ توڑی۔ ”ڈینی ٹھیک کہتا ہے۔ کام اٹھنگ کا ہو... کچھ ملے تو۔ مجھے تو یہ کام اچھا لگا ہے۔“

میں نے تشکر سے اسے دیکھا۔ کار پر پہنچ کر ہم رُک گئے۔ میں اسپٹ کی طرف مڑا۔ ”مجھے اِدھر اُدھر لڑھکنے والے لوگ اچھے نہیں لگتے۔ تم سوچ کر جواب دو۔ ہاں یا نہیں۔“

اسپٹ کبھی مجھے دیکھتا، کبھی سولی کو۔ اس کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ چاروں طرف سے گھر گیا ہو۔ پھر اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ”سولو، میں کوئی ڈرتا تو نہیں ہوں۔ محتاط ہونا اور بات ہے۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔“

میں نے سکون کی سانس لی اور دوستانہ انداز میں اسپٹ کے کندھے کو تھپتھپایا۔ ”گڈ بوائے۔ میں جانتا تھا کہ تم پیچھے ہٹنے والے نہیں ہو۔ اچھا، اب دھیان سے سنو کہ کرنا کیا ہے۔“

ہم بھوکے ننگے ایسٹ سائیڈ کے شور وغل میں کھڑے جزئیات طے کرتے رہے۔ دو گز کے فاصلے پر ایک پولیس والا کھڑا تھا۔ مگر وہ ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ توجہ دینے کی کوئی بات تھی بھی نہیں۔ یہاں کار نز پر ہمیشہ لڑکے کھڑے رہتے تھے اور ہمیشہ کھڑے رہا کریں گے۔ اب وہ کیا ان پر ہی نظر رکھے گا... اور اگر رکھے گا تو تمام وقت کچھ اور نہیں کر سکے گا!

ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ہم نیلی کے گھر کے سامنے سڑک کے پار اسی ڈوروے میں دبکے کھڑے تھے۔ تھوڑے ہی دن گزرے تھے لیکن ہمیں وہ جگہ اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی۔ کوئی قریب آتا تو ہمیں ناگوار گزرتا جیسے اسے یہاں سے گزرنے کا حق بھی نہیں ہو... جیسے وہ کوئی مداخلت کار ہو۔

”اگلے ہفتے جون شروع ہو جائے گا ڈینی۔“ نیلی نے کہا۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے اسے دیکھا۔ ”ہاں۔“

اس نے شرمیلی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ”تم سے ملے صرف تین ہفتے ہوئے ہیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ برسوں سے تمھیں جانتی ہوں۔“

میں مسکرایا۔ میرا اپنا بھی یہی حال تھا۔ اس کی موجودگی میں مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنے گھر میں ہوں... اپنے بروک لین والے گھر میں۔ ”میری طرح نیلی؟“

”ہاں، تمھاری طرح...“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”تم نے مجھے پاگل بنا دیا ہے ڈینی۔ میں دیوانہ وار محبت کرتی ہوں تم سے۔ اتنی محبت... اتنی کہ کبھی کبھی مجھے اس سے خوف آنے لگتا ہے۔“

”میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔“ میں نے جوابی سرگوشی میں کہا۔

وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ ”کاش ڈینی... کاش ہم اتنے بڑے ہوتے کہ ہماری شادی ہو سکتی۔“

میں ہونٹ کیٹ کر رہ گیا۔ اتنی جلدی شادی کی بات مجھے مضحکہ خیز ہی لگ سکتی تھی۔

”تم ہنس رہے ہو مجھ پر۔“ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، ہرگز نہیں۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ تمھارے پاپا یہ بات سنتے تو ان کا کیا ردِعمل ہوتا۔“

”شادی ہو جائے تو مجھے ان کے ردِعمل کی کیا پروا...“ اس کے لہجے میں جوش تھا۔ وہ پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ ”تم مجھے یونہی لپٹائے رہو ڈینی۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میں یہ بھی بھول جاتی ہوں کہ یہ گناہ ہے۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”گناہ؟ یہ کس نے کہا

تم سے؟''

وہ میرا ہاتھ تھام کر میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ ''فادر کیلی کہتے ہیں۔ مگر مجھے کوئی پروا نہیں۔ یہ محبت اتنی خوب صورت ہے۔ کیا گناہ ایسا خوب صورت ہوسکتا ہے۔ اور اگر ہو تو بھی میں اس کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ بہ شرطے کہ تم زندگی بھر مجھ سے محبت کرتے رہو۔''

میرا ذہن الجھنے لگا۔ ''یہ فادر کیلی کہاں سے آ ٹپکے؟'' میں نے کہا۔ پہلی بار مجھے احساس ہُوا کہ میرے اور اس کے درمیان مذہب کی دیوار کھڑی ہے۔

''تم سے کہنے کی ممانعت ہے۔ لیکن میں تمھیں بتا رہی ہوں...'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''ہر ہفتے اعتراف کے بعد فادر کیلی تمھارے بارے میں مجھے لیکچر دیتے ہیں۔''

''تو تم نے انھیں ہمارے بارے میں بتا دیا...؟'' میں نے پُرتجسس لہجے میں کہا۔ ''اچھا، یہ بتاؤ، کہ کہتے کیا ہیں؟''

اس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ ''وہ کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے اور مجھے خود کو روکنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں، اول تو اس طرح ملنا ہی غلط ہے۔ لیکن تمھارے ساتھ ملنا تو اور بڑا گناہ ہے۔''

یہ سن کر مجھے غصہ آنے لگے۔ ''مجھ میں ایسی کیا برائی ہے؟''

''تم کیتھولک نہیں ہونا، اس لیے...'' اس کے لہجے میں معذرت تھی۔ ''وہ کہتے ہیں کہ ہماری شادی نہیں ہوسکتی۔ دنیا کا کوئی چرچ اسے قبول نہیں کرے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں تمھیں چھوڑ کر کوئی اچھا سا کیتھولک لڑکا تلاش کرلوں۔''

''حرامی کہیں کا...!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ پھر اس کے گھر کی طرف دیکھا۔ ''اور اگر اُس مردود نے تمھارے پاپا کو بتا دیا تو؟''

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ پادری کبھی کسی کو کچھ نہیں بتاتے۔ جو اعتراف وہ سنتے ہیں، وہ تو بس خدا کی امانت ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا، تم یہ بات جانتے ہوگے۔''

''مجھے نہیں معلوم تھی یہ بات۔'' میں نے اعتراف کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کسی کی نجی زندگی سے کسی پادری کو کیا سروکار ہوسکتا ہے۔ ''اچھا، جب تم نے اسے اپنے اور میرے بارے میں بتایا تو اس نے کیا کہا تم سے؟''

''اس نے توبہ کی کچھ دعائیں پڑھنے کو کہا اور مقدس مریم کے سامنے کفارے کو کہا۔''

''اس نے تمھیں کوئی سزا تو نہیں دی؟''

وہ ہکا بکا سی ہوگئی۔ ''تم سمجھ ہی نہیں رہے ہو ڈینی۔ فا... کام تو آپ کو غلطی کا احساس دلانا ہوتا ہے تاکہ آپ ا... شرمندہ ہوں۔ اور خدا آپ کو معاف کردے۔ شرمندگی تو... ہی سزا ہوتی ہے۔''

میں مسکرایا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ ''تو تم شر... ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

وہ مجھ سے نظریں چُرانے لگی۔ اس کی نگاہوں شرمندگی تھی۔ ''نہیں... میں شرمندہ نہیں ہوں۔ شاید یہی تو... سے بُری بات ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے لگتا ہے کہ مجھے معافی نہیں ملے گی۔''

میں نے ہنستے ہوئے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ''تم اس... نہ کرو بے بی۔ جب تک ہم دونوں ایک دوسرے سے سچی... کررہے ہیں، اس وقت تک اس میں کوئی خرابی، کوئی بُرائی نہیں... کوئی سامنے سے گزرا تو ہم الگ ہوگئے۔ لیکن گزر... والے نے ہمیں نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ''اُفوہ... گیارہ... اب تم گھر جاؤ۔ ورنہ تمھارے پاپا گھر کی چھت اُڑا دیں گے۔''

وہ مسکرائی۔ ''میرا دل نہیں چاہتا جانے کو۔ میں... زندگی تمھارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، ڈینی۔''

میرا بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ جائے۔ لیکن آج رات... کوئی اور مصروفیت تھی۔ آج ہم نے واردات کرنے کا... کیا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے مجھے اسٹور کے سامنے سولی... اسپٹ سے ملنا تھا۔ ''اب جاؤ۔ مجھے بھی آج گھر جانا...'' میں نے نیلی سے کہا۔

''تو ٹھیک ہے۔ کل پھر ملیں گے۔''

''ہاں، اِسی وقت، اِسی جگہ۔''

وہ سڑک پار کر کے اپنے گھر کی طرف چل دی۔ ڈور... میں وہ رُکی، پلٹ کر مجھے دیکھا اور ہاتھ لہرایا۔ میں نے... ہاتھ لہرایا۔ پھر وہ اندر چلی گئی۔

میں نے پھر گھڑی میں وقت دیکھا۔ وقت پر پہنچنے... لیے مجھے تیز قدموں سے چلنا ہوگا۔ میں تقریباً دوڑ رہا تھا... رات کو کوئی بھاگتا نظر آئے تو وہ لوگوں کی نگاہوں میں آجا... یاد رہ جاتا ہے۔ میں نے اپنی رفتار کم کردی۔

سولی سڑک کے پار، کارنر پر کھڑا ملا۔ ''اسپٹ... ہے؟'' میں نے ہانپتے ہوئے اس سے پوچھا۔

سولی نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اسپٹ دوسرے... کھڑا تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے پایا تو اس نے... نکال دیے۔

سڑک کے پار مسٹر گولڈ اسٹور میں کھڑے پاپا سے بات... تھے۔ پاپا سر جھکائے ان کی بات سن رہے تھے۔ میں... کی طرف مڑا۔ ''کاش، پاپا اس کے ساتھ نہ ہوں۔ ورنہ... پھر معاملہ ملتوی کرنا ہوگا۔''

اتنے دن اسی چکر میں لگے تھے۔ کبھی کبھی پاپا بھی اس... ساتھ ڈینک تک چلے تھے۔ دوبار ہمیں اپنا پروگرام... کرنا پڑا تھا۔

''دیکھتے ہیں۔'' سولی نے بے پروائی سے کہا۔

میں نے سولی کو دیکھا۔ وہ بہت کم بولتا تھا۔ لیکن اس پر... کیا جاسکتا تھا۔ میں پلٹ کر اسٹور کی طرف دیکھنے لگا۔ ہم... نے اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی تھی۔

مسٹر گولڈ اب بھی پاپا سے بات کررہے تھے۔ بات کیا... تھے، انھیں ڈانٹ رہے تھے۔ پاپا کندھے اور سر... ان کی زبان کے تیر سہہ رہے تھے۔ میرے ہونٹ بھنچ... سکتا تھا کہ ایک اہل لیکن مجبور شخص کو بلاوجہ کی توہین...

آج رات کے بعد مسٹر گولڈ کبھی اس طرح بات نہیں... گے، یہ فیصلہ میں کرچکا تھا۔

سولی نے میرے بازو کو ہلکے سے چُھوا۔ ''دیکھو، وہ نکلنے...''

میں نے سر گھما کر اسٹور کی طرف دیکھا۔ مسٹر گولڈ کیش... پر جھکے ہوئے تھے۔ میں سولی کی طرف مڑا۔ ''تمھیں میری ہر بات یاد ہے نا؟'' میری آواز میں ہلکا سا... کا امکان تھا۔

سولی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ میں کچھ... لوں گا۔''

''لاؤ مجھے دو۔'' میں نے سولی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

سولی نے ڈنڈا مجھے دیا۔ میں نے اسے جیب میں رکھا اور... سڑک پار کرنے لگا۔ ''اب چل دو۔'' اسپٹ کے پاس... ہوئے میں نے سرگوشی میں کہا۔ ہم دونوں گولڈ کی... چلنے لگے۔ سولی گولڈ کے پیچھے چل رہا تھا۔

فلم دیکھ کر نکلا ہو اور گھر جارہا ہو۔

اب اسٹیکس اسٹریٹ پر مڑے تھے۔ میں اور اسپٹ لڈلو اسٹریٹ پر تھے جو اسٹیکس کے متوازی تھی۔ ہم تیز تیز چل رہے تھے کیوں کہ ہمیں زیادہ فاصلہ طے کرنا تھا۔ لیکن ہماری سانسوں کی ناہمواری کا سبب صرف تیز چلنا نہیں تھا۔ وہ کچھ اندر کے ہیجان کی وجہ سے بھی تھا۔

''تمھیں سب یاد ہے نا؟'' میں نے اسپٹ سے پوچھا۔

''مجھے سب یاد ہے ڈینی۔'' اس نے آستین سے اپنی باچھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

تین بلاک کا فاصلہ طے کر کے ہم ہیوسٹن اسٹریٹ سے پہلے والے کھلے میدان میں پہنچ گئے۔ میں نے اسپٹ کی طرف دیکھا۔ اچانک مجھے احساس ہُوا کہ میں خوف زدہ ہوں۔ میرے اندر... کہیں بہت اندر ایک پچھتاوا سر ابھار رہا تھا کہ کاش میں نے یہ سب نہ شروع کیا ہوتا۔ لیکن پھر مجھے اپنے پاپا کے ساتھ مسٹر گولڈ کا سلوک یاد آگیا۔

''مجھے یہیں رکنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''گڈ لک!'' اسپٹ نے دانت نکال دیے۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ کارنر کی طرف بڑھ گیا۔

میں اندھیرے میں ایک بلڈنگ کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ میرا دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ اس کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنی سانس کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ فائدہ نہیں ہُوا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چھوٹا ڈنڈا نکالا اور اسے اپنی ہتھیلی پر مار کر دیکھا۔ میرے ہاتھ بھیگے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں پینٹ سے صاف کیا۔

اب میں پریشان ہو رہا تھا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوگئی تو کیا ہوگا؟ آخر یہ لوگ اب تک کیوں نہیں پہنچے۔ میرا جی چاہا کہ بلڈنگ کی اوٹ سے سر نکال کر دیکھوں کہ وہ آرہے ہیں یا نہیں۔ لیکن یہ بلاوجہ کا خطرہ مول لینے والی بات تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور زیرِ لب خود کو سمجھایا کہ بلاوجہ پریشان ہونا بے سود ہے۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ میں خوامخواہ اعصاب زدہ ہو رہا تھا۔ کوئی گڑبڑ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے بہت اچھا منصوبہ بنایا تھا۔

منصوبہ بالکل سادہ تھا... اور آسان، ایسا کہ کسی غلطی کا امکان نہیں تھا۔ سولی مسٹر گولڈ کے پیچھے پیچھے آرہا ہوگا۔ اسی پوزیشن میں وہ سامنے سے آنے والوں کو دیکھ سکتا تھا۔ اسپٹ مخالف سمت سے آئے گا۔ وہ مسٹر گولڈ اور سولی کے عقب پر نظر

رکھ سکتا تھا۔ ان دونوں کو اگر کوئی راہ گیر نظر آیا تو وہ سیٹی پر کوئی دھن چھیڑ دیں گے تاکہ میں اپنی کارروائی مؤخر کردوں اور مسٹر گولڈ کو جانے دوں۔ سیدھی سی بات تھی۔ اب اس میں کسی غلطی کی کہاں گنجائش تھی۔

میں سامنے والی بلڈنگ کی دیوار کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے اسپٹ کو مجھے پہلا سگنل دینا تھا... کہ وہ آرہے ہیں۔

وقت بہت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ میں پھر نروس ہونے لگا۔ مشکل یہ تھی کہ میں سگریٹ بھی نہیں جلا سکتا تھا۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ پھر مجھے اپنی طرف آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔

وہ اسپٹ تھا جو اپنے مخصوص بے ڈھنگے پن سے چل رہا تھا۔ اچانک میرے اعصاب پُرسکون ہوگئے۔ ہر خوف دُور ہوگیا۔ اب پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے ڈنڈے کو سنبھالا اور ایڑیوں کے بل کھڑا ہوگیا... سگنل کے ساتھ ہی مجھے حرکت میں آنا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں گنتی شروع کردی جیسے پنچنگ بیگ پر وار کرنے کے لیے تیار ہونا ہوتا ہے تاکہ ردِعمل قائم رہے۔ ایک، دو، تین، چار... ایک، دو...

اسپٹ نے ہاتھ اٹھا کر اپنے رخسار کو کھجایا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چپکا آگے بڑھنے لگا۔ اسی وقت مسٹر گولڈ بلڈنگ کی لائن میں آئے اور میں بے حد آہستگی سے ان کے عقب میں نکلا۔

اندھیرے میں ڈنڈے کا وہ متحرک محض ایک لکیر سا تھا۔ دھپ کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ سولی نے گرتے ہوئے مسٹر گولڈ کو سنبھالا اور انھیں اندھیرے میدان میں کھینچ لایا۔

مسٹر گولڈ زمین پر ساکت پڑے تھے اور ہم انھیں دیکھ رہے تھے۔ اسپٹ خوف زدہ انداز میں بولا تو میرے چہرے پر اس کی رال کی بوچھار آئی۔ ”ارے... تم نے کہیں انھیں لُڑھکا تو نہیں دیا!“

میرا دل خوف سے اُچھلا اور جیسے حلق میں آگیا۔ میں نے ایک گھٹنے پر بیٹھ کر مسٹر گولڈ کی واسکٹ کو ٹٹولا۔ ان کے دل کی دھڑکن سن کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ پھر میں نے ان کے سر کو ٹٹولا۔ نہ وہاں کوئی گومڑ تھا، نہ ہی خون نکلا تھا۔

”اس کی فکر چھوڑو اور مال پکڑو...“ سولی نے کہا۔ ”زیادہ دیر لگانا ٹھیک نہیں۔“

اس کی بات معقول تھی۔ میں نے گولڈ کی جیب ٹٹولی اور رقم کی تھیلی نکال لی۔ اسی وقت اسپٹ بھی گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ وہ مسٹر گولڈ کی کلائی پر نہ جانے کیا ٹٹول رہا تھا۔ ”کیا کر رہے تم؟“ میں نے سرگوشی میں اسے ڈپٹا۔

”اس کی گھڑی بہت خوب صورت ہے۔“

میں نے اس کے ہاتھ کو پوری قوت سے جھٹک دیا۔ میں خوف زدہ نہیں تھا۔ میرا اعتماد لوٹ آیا تھا۔ ”گدھے چھوڑ دو اسے۔ اپنی انگلیوں کے نشانات فراہم کرنا چاہتے پولیس کو۔“

اسپٹ بڑبڑاتا ہُوا اٹھ کھڑا ہُوا۔

میں نے پھر مسٹر گولڈ کے سینے کو ٹٹولا۔ اس کی دھڑکن ہوگئی تھی۔ میں نے ہاتھ ہٹایا اور اٹھنے لگا۔ ”چلو... اب کھ لو۔“ میں نے سرگوشی میں کہا۔ لیکن اچانک کسی نے میرا پا پکڑ لیا۔ پھر اندھیرے میدان میں مسٹر گولڈ کی آواز نقار طرح گونجی۔ ”مدد کرو... پولیس... پولیس...“

اسپٹ اور سولی بھاگ کھڑے ہو نے گ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ مسٹر گولڈ دونوں ہاتھوں سے تھامے، حلق کے بل مدد کے لیے چلّا رہے تھے آنکھیں سختی سے بند تھیں۔

میں نے گھبرا کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ سولی اور اس نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ میرا دل اب میرے قابو نہیں تھا۔ میں نے اپنا پاؤں چھڑانا چاہا۔ لیکن نہیں چھڑا خوف نے مجھے مفلوج کردیا تھا۔ سامنے والے ریسٹورنٹ کوئی نکل کر سنسان میدان کی طرف آتا دکھائی دیا۔

میں نے گولڈ کے ہاتھ پر ٹھوکر رسید کی۔ پھر جوتے نوک سے اس کے بازو پر ضرب لگائی۔ مجھے کچھ ٹوٹنے احساس ہُوا۔ بہ ہر حال میرا پاؤں آزاد ہوگیا۔ گولڈ کی چیخ کریہہ تھی۔

عقب کی سمت سے اب بہت سی آوازیں سنائی د رہی تھیں۔ میں پوری رفتار سے سامنے کی طرف بھا اسٹانٹن اسٹریٹ کے کارنر تک تو میں سرپٹ دوڑتا گیا۔ پھر جبلت نے مجھے احساس دلایا کہ اب بھاگنا مخدوش میں کارنر پر رُکا اور چند لمحے ہچکچاتا رہا۔ پھر میں نے تیزی ایک فیصلہ کیا۔ یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ مسٹر گولڈ نے دیکھا ہے یا نہیں۔

میں پلٹ کر واپس چل دیا۔ وہاں اب لوگوں کی بھیڑ میں جگہ بناتا ہُوا آگے بڑھا۔ پولیس والے پہنچ چکے تھے اور لوگوں کو ڈور رہنے کی ہدایت کر رہے تھے۔ مسٹر گولڈ زمین پر بیٹھے، کراہتے ہوئے اپنے بازو کو اِدھر اُدھر جھلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”کیا ہُوا؟“ میں نے بھیڑ میں ایک شخص سے پوچھا۔

اس نے سر گھما کر مجھے دیکھے بغیر کہا۔ ”لوٹ مار کی واردات ہے۔“

میں مسٹر گولڈ کے اور قریب ہوگیا۔ ایک پولیس والا ان پر جھکا ہُوا تھا۔ میں نے مسٹر گولڈ کے ہونٹ ہلتے دیکھے۔ لیکن سن نہیں سکا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

میں اور قریب ہوگیا۔ ان کی آواز سن کر میرا خوف دُور ہوگیا۔ ”میں کیسے دیکھ سکتا تھا اسے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون تھا۔“ وہ چلّائے۔ ”میں نے بتایا نا کہ میں بے ہوش ہوگیا تھا۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر چلو۔ کتے کے بچے نے میرا بازو توڑ دیا ہے۔“

بھیڑ چھٹنے لگی۔ میں بھی لوگوں کے ساتھ نکل آیا اور گھر کی طرف چل دیا۔ خاموشی سے گھر میں داخل ہوکر میں کپڑے بدلنے لگا۔ اُس وقت مجھے یاد آیا کہ رقم کی تھیلی اب میرے پاس ہے۔

میں نے اسے باتھ روم میں گھس گیا اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ وہاں میں نے تھیلی کھول کر رقم نکالی اور گنی۔ 135 پاؤنڈ! میرا دل خوشی سے ہوگیا۔

رقم میں نے جیب میں ٹھونسی اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ اب مجھے اس تھیلی سے پیچھا چھڑانا تھا۔ ٹوائلٹ کے اوپر ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ میں نے ٹوائلٹ کے اوپر چڑھ کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ بہت مناسب جگہ تھی۔ میں نے تھیلی کو اس کھڑکی میں آگے دھکیل دیا۔ اب اس پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

اس کام سے نمٹ کر میں اپنے کمرے میں آیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کی۔ ہزار وسوسے میرے دماغ میں کلبلانے لگے۔ کیا پتا، ملنے پر مسٹر گولڈ کی یادداشت کام کرنے لگے۔ انھیں اتنا وقت ملا تھا کہ وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ کتنی دیر انھوں نے میرا پاؤں پکڑے رکھا تھا۔ کیا اس دوران انھوں نے کچھ نہیں دیکھا ہوگا؟

سونے کی ہر کوشش ناکام ہوئی۔ میں اعصاب زدہ ہوگیا۔ دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ ایک دروازے کے بند ہونے کی آواز سنائی دی تو میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ مجھے گرفتار کرنے کے لیے آگئے!

میں جلدی سے اٹھا اور دروازے سے کان لگا دیے۔ پھر میں نے سکون کی سانس لی۔ ماما اور پاپا باتیں کر رہے تھے۔ پاپا ابھی کام سے واپس آئے تھے۔

میں پھر بستر پر جا لیٹا۔ تکیے پر سر رکھتے ہوئے میں نے سکون کی سانس لی۔ کیا حماقت ہے؟ میں نے سوچا، مجھ پر کوئی شک نہیں کرسکتا۔ کوئی وجہ ہی نہیں ہے اس کی۔ دھیرے دھیرے میرے اعصاب پُرسکون ہونے لگے۔ لیکن نیند پھر بھی نہیں آئی۔

وہ رات بہت طویل تھی۔ میں نے پہلو کے بل لیٹ کر تکیے کا کونا مُنہ میں رکھ لیا کہ میری چیخ نہ نکل جائے۔ پھر میں دعا کرتا رہا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی دعا نہیں کی تھی۔ میں نے خدا سے مدد مانگی کہ وہ مجھے گرفتاری سے بچالے۔ میں نے خدا سے وعدہ کیا کہ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔

صبح کی روشنی کمرے میں در آئی۔ میری تھکی ہوئی آنکھیں خود بہ خود مُندنے لگیں۔ لیکن وہ بھی صحیح معنوں میں نیند نہیں تھی۔ میرے دماغ میں مسٹر گولڈ کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز گونج رہی تھی...

کوئی مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میں نے ان ہاتھوں کو ہٹانے کی کوشش کی۔ میں تھکن اور نیند کی کمی سے نڈھال تھا۔ جھنجھوڑنے والا مجھے پکار بھی رہا تھا۔ ”اٹھو ڈینی... اٹھ جاؤ۔“

میں نے کروٹ بدلی اور بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”میں بہت تھکا ہُوا ہوں۔ مجھے سونے دو۔“

مجھے جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں پھر اپنی ہذیانی نیند میں چلا گیا۔ واردات کا ہر منظر فلم کی طرح میری

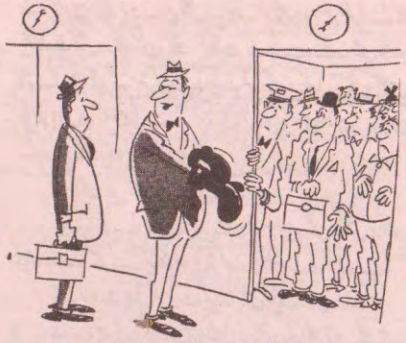

”اب تم دیکھو، میں راستہ کس طرح بناتا ہوں۔“

بند آنکھوں کے پردے پر چل رہا تھا۔ مگر پھر وہ منظر نظر آئے جو حقیقت نہیں تھے لیکن مجھے حقیقت لگ رہے تھے۔ میں ڈنڈا مارنے والا تھا کہ مسٹر گولڈ نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ ''میں تمھیں جانتا ہوں۔'' وہ چلائے۔ ''تم ڈینی فشر ہو۔'' اسی وقت ڈنڈا ان کے سر پر لگا اور وہ گرنے لگے۔

''نہیں... نہیں...'' میں چلایا۔

ایک ہاتھ نے میرے کندھے کو تھام لیا۔ میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ وہ ماما تھیں۔ ''کیا ہُوا ڈینی! تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

میں کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ ''میں ٹھیک ہوں ماما۔''

ماما نے میری جلتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھا پھر نرم لہجے میں بولیں۔ ''سو جاؤ ڈینی، تم پوری رات خواب میں چیختے رہے ہو۔''

میری آنکھ کھلی تو سورج چڑھ چکا تھا۔ میں نے اٹھ کر انگڑائی لی اور پاؤں فرش پر لٹکا دیے۔

''اب کچھ بہتر محسوس کر رہے ہو بلونڈی؟'' ماما نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ میرے بیڈ پر ہی بیٹھی تھیں۔ ''جی ماما...'' میں نے شرمندگی سے کہا۔ ''پتا نہیں، مجھے کیا ہو گیا تھا۔''

ماما نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی۔ ''لو، یہ پی لو۔''

چائے پی کر میں باتھ روم میں گیا، تیار ہو کر باہر نکلا۔ کچن کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ دو بج رہے تھے۔ ''پاپا کہاں ہیں؟'' میں نے ماما سے پوچھا۔

''انہیں آج جلدی اسٹور جانا پڑ گیا۔ مسٹر گولڈ کو کچھ ہو گیا ہے۔''

''اچھا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز سن کر ماما نے پلٹ کر پُرتشویش نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نہیں تمھاری۔''

''مجھے ضروری کام سے جانا ہے ماما۔ کچھ لڑکوں سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''یہ اتنا اہم نہیں ہے۔ تم اُن سے بعد میں بھی مل سکتے ہو۔''

''نہیں ماما، یہ ضروری ہے۔ اور تازہ ہَوا سے بھی مجھے فرق پڑے گا۔'' میں دروازہ بند کر کے سیڑھیوں کی طرف لپکا۔

کینڈی اسٹور کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے سولی کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ پھر میں آگے بڑھتا گیا۔ دروازے پار کر کے میں بلڈنگ میں گھس گیا اور ہال وے انتظار کرنے لگا۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ آئے تو رقم میرے ہا میں تھی۔ ''یہ لو۔'' میں نے رقم ان کی طرف بڑھا دی۔

سولی نے رقم گنے بغیر جیب میں رکھ لی۔ لیکن اسپٹ نوٹ گنے اور پھر شک آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''صرف ڈالر؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ''جس رفتار سے تم وقت پڑنے پر بھاگے، اس کے بعد جو کچھ بھی ملے، وہ تمھاری خوش قسمتی ہی ہے۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

اس کی نظریں جھک گئیں۔ ''مجھے زیادہ کی امید تھی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ''جیسے ابھی تم گئے، ویسے رات کو بھی گن لیتے۔ مگر اس کے لیے تمھیں میرے پاس آنا پڑتا۔ بھاگتے وقت تو تمھیں نہ رقم یاد رہی تھی، نہ میں۔''

اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ان میں بے یقینی لیکن وہ اس کا اظہار کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ میں اس آنکھوں میں گھورتا رہا۔ ''او کے ڈینی...!'' اس نے مجھ پر کی بوچھار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کوئی شکایت تو نہیں کر ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹا اور باہر چلا گیا۔

میں سولی کی طرف مڑا۔ دونوں کو غور سے دیکھ تھا۔ ''تمھارے ذہن پر کوئی بوجھ ہے؟'' میں نے سخت میں پوچھا۔

سولی دھیرے سے مسکرایا۔ ''نہیں ڈینی، مجھے کوئی شکا نہیں ہے۔''

میں نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ ''بس، تو اب یہاں سے کھسک لو۔'' میں نے نرم لہجے میں ''ہمیں ساتھ نظر نہیں آنا چاہیے۔''

ہم ٹرالی کار سے اترے۔ نیلی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے، پُرتجسس لہجے میں پو ''ہم کہاں جا رہے ہیں ڈینی؟''

''خود ہی دیکھ لینا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نے اسٹور بند ہونے کے بعد اسے پک کیا تھا۔ ''بس

دکھانا چاہتا ہوں۔''

وہ خوشی خوشی میرے ساتھ چلتی رہی۔ مگر اب اچانک مجھے ڈر لگنے لگا کہ وہ مجھ پر ہنسے گی، میرا مذاق اُڑائے گی۔ اب ہم وہاں پہنچنے ہی والے تھے۔ میں نے سوچا، اب بتانے میں کیا حرج ہے۔ ہم تاریک سنسان کارنر پر کھڑے تھے۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ وہ بروک لین کے اس علاقے میں پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر سڑک کے پار اشارہ کیا۔

''وہ دیکھ رہی ہو؟''

اس نے اشارے کی سمت دیکھا، اور پھر مجھے۔ ''کیا دیکھوں؟ وہاں تو بس خالی مکان ہے۔''

''ہم اسی کو دیکھنے تو آئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ پھر میں نے اپنے گھر کو دیکھا اور چند لمحوں کے لیے میں یہ بھی بھول گیا کہ نیلی میرے ساتھ ہے۔ میں نے کہا۔ ''کتنا خوب صورت ہے... ہے نا؟''

''لیکن یہ تو خالی ہے۔'' اس نے الجھی سے کہا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اب مسٹر گولڈ راستے سے ہٹ گئے پاپا کو منیجر بنا دیا جائے گا اور ہمیں یہ مکان واپس مل جائے

''آج رات کو یہ مکان دیکھنے کے لیے آئے ہو...'' نیلی نے مجھے پکارا دیا۔ ''ایک خالی مکان!''

''یہ کوئی عام مکان نہیں ہے۔ یہ میرا گھر ہے... میرا... بھی میں یہاں رہتا تھا۔ اب شاید جلد ہی ہم دوبارہ یہاں آ جائیں گے۔''

اس کی آنکھوں میں چمک سی اُبھری۔ اس نے ایک نظر مکان کو اور پھر مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر نرمی سی بکھر گئی۔ ''یہ بہت خوب صورت مکان ہے ڈینی۔'' اس کے لہجے نے میرے دل کو نرمی سے سہلایا۔

''پاپا نے یہ میری آٹھویں سال گرہ پر مجھے تحفے میں دیا تھا۔'' میں نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ''اس روز ہم یہاں شفٹ ہوئے، اس دن میں یہاں ایک گہرے گڑھے میں گر گیا تھا۔ اس گڑھے میں مجھے ایک چھوٹا سا کتا ملا تھا۔ میں نے اسے پال لیا۔ لیکن جس روز ہم ایسٹ سائیڈ منتقل ہوئے وہ اسٹائن اسٹریٹ پر ٹرک کے نیچے آ کر مر گئی۔ میں نے اسے یہاں لا کر دفن کیا تھا۔ مجھے ریکسی سے بہت پیار تھا۔ اس کی ہر چیز سے زیادہ۔''

نیلی کی آنکھوں میں محبت جگمگا رہی تھی۔ ''تم دوبارہ یہاں آؤ گے۔ خوش رہو گے۔ میں تمھارے لیے دعا کروں گی ڈینی۔''

میں نے فخر سے اسے دیکھا۔ مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ وہ میرے جذبات کو سمجھے گی، ان کا احترام کرے گی۔ اور اس نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اٹھایا اور اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ''آؤ نیلی، اب واپس چلیں۔''

اس بار واپس جانا مجھے بُرا نہیں لگا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بہت جلد میں اپنے گھر میں واپس آؤں گا۔

میں گھر میں داخل ہُوا تو کچن کی تیز روشنی نے مجھے پلکیں جھپکانے پر مجبور کر دیا۔ گھپ اندھیرے سے روشنی میں آنے پر ایسا ہی لگتا ہے۔ میں اندر داخل ہُوا تو ماما اور پاپا مجھے گھورنے لگے۔

''آپ آج جلدی گھر آ گئے؟'' میں نے پاپا سے کہا۔ شاید انھیں خوش خبری مل گئی تھی۔

لیکن پاپا غصّے میں تھے۔ ان کے چہرے پر کھنچاؤ تھا۔ ''لیکن تم بہت دیر سے آئے ہو...'' انھوں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''کہاں تھے تم؟''

میں نے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا اور پاپا کو دیکھا۔ ان کا ردِعمل میری توقع کے مطابق نہیں تھا۔ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی؟ کہیں گولڈ نے مجھے پہچان تو نہیں لیا۔ لیکن میں مطمئن تھا کہ خدا سے معافی مانگ چکا ہوں۔

''کہاں تھے تم؟'' پاپا نے اپنا سوال دہرایا۔

''یہیں... اسی علاقے میں۔''

پاپا کا غصّہ اَور بڑھ گیا۔ ''یہ کیسا جواب ہے؟'' وہ چلائے۔ ''تمھاری ماں پریشان رہی پورے دن کہ رات تمھاری طبیعت خراب تھی اور تم اتنی دیر سے گھر آ کر یہ جواب دے رہے ہو؟ جواب دو۔ مجھے جواب چاہیے۔''

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ''میں نے ماما کو بتا دیا تھا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اس کے بعد انھیں پریشان ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

''تم کھانے کے وقت گھر کیوں نہیں آئے؟ تمھاری ماں ہولتی رہی تمھارے لیے کہ تمھیں کچھ ہو نہ گیا ہو۔ اس کی اپنی طبیعت خراب ہو گئی۔''

''مجھے افسوس ہے...'' میں نے آزردگی سے کہا۔ ''مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ یہ پریشان ہوں گی۔''

"افسوس کی بات مت کرو۔ میری بات کا جواب دو۔" پاپا پھر چلائے۔

میں نے ایک پل انھیں دیکھا۔ ان کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہوگیا تھا۔ ایسے میں ان سے بات کرنا لاحاصل تھا۔ میں اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے پلٹا لیکن پاپا نے مجھے کندھے سے تھام کر اپنی طرف گھما دیا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ان کے ہاتھ میں بیلٹ تھی اور وہ اُسے لہرا رہے تھے۔ "ابھی تک تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا ہے..." انھوں نے گرج کر کہا۔ "میں نے تمھیں سر پر چڑھایا، بگاڑ دیا تمھیں۔ جب سے تم یہاں آئے ہو خود کو نہ جانے کیا کیا سمجھنے لگے ہو... جیسے تم کسی کو جواب دہ ہی نہیں۔ جب چاہو آؤ، جب چاہو جاؤ۔ لیکن مجھے سدھارنا بھی آتا ہے۔ آج میں تمھاری ساری اکڑفوں نکال دوں گا۔ تمھیں جواب دینا ہے میری بات کا۔"

میں نے اپنے ہونٹ اور سختی سے بھینچ لیے۔ پاپا نے کبھی غصے میں مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ مجھے اس بات پر بڑا مان تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ آج بھی ایسا نہیں ہوگا۔ جب کہ اب تو میں ان سے بھی لمبا ہوگیا ہوں۔ میں خاموش کھڑا انھیں دیکھتا رہا۔

انھوں نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ "کہاں تھے تم؟"

میں نے جواب نہیں دیا۔

بیلٹ ہَوا میں لہراتی ہوئی آئی اور میرے چہرے کی سائیڈ سے ٹکرائی۔ میری آنکھوں کے آگے رنگ برنگے دائرے ناچنے لگے۔ پھر مجھے ماما کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے سر جھٹکا اور آنکھیں کھولیں۔ ماما پاپا کا ہاتھ تھام کر ان سے التجا کر رہی تھیں کہ وہ مجھے نہ ماریں۔

پاپا نے انھیں ایک طرف دھکیل دیا۔ "برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے" وہ دہاڑے۔ "اپنے بیٹے سے تو آدمی کو عزت ملنی چاہیے۔"

بیلٹ پھر لہرائی۔ میں نے ہاتھ آگے کی طرف پھیلا کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا ہدف پھر میرا چہرہ ہی تھا۔ میں نے خود کو فرش پر گرتا محسوس کیا۔ میں جیسے کسی اذیت کے سمندر میں تھا۔ میں نے دُھندلائی ہوئی نظروں سے پاپا کو دیکھا۔ میں انھیں روک سکتا تھا۔ میں ان سے جب چاہتا بیلٹ چھین سکتا تھا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ ان کے اگلے وار سے تو میں نے بچنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ بیلٹ لہراتی ہوئی آئی۔ میں نے اذیت برداشت کرنے کے لیے سختی سے دانت پر دانت جما دیے۔

ماما نے پھر پاپا کو پکڑنے کی کوشش کی۔ "کیا کر رہے ہیں؟ کیا مار ڈالو گے اسے؟"

انھوں نے ماما کو جھٹک دیا۔ وہ بے بسی سے کرسی پر جا گریں۔ اب پاپا سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے وہ روتے رہے ہوں۔

بیلٹ اٹھتی، گرتی رہی۔ میں نے سختی سے آنکھیں بند کرلیں۔ پھر مجھے پاپا کی آواز سنائی دی۔ "اب تم جواب دو گے مجھے؟"

میں نے آنکھیں کھول کر انھیں دیکھا۔ وہاں تین پاپا تھے اور تین بیلٹس۔ اور وہ تینوں مسلسل گھوم رہے تھے۔ میں نے جھٹک کر ذہن کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ پاپا نے اپنے تینوں ہاتھ اٹھائے۔ تین بیلٹس لہرائیں...

"میں... میں گھر گیا تھا۔"

بیلٹ میرے جسم سے نہیں ٹکرائی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ تینوں بیلٹس میرے سر کے قریب رکی ہوئی تھیں۔ پاپا کی آواز مجھے بہت دُور سے آتی محسوس ہوئی۔

"گھر؟ کیسا گھر!"

اس لمحے مجھے احساس ہُوا کہ میں نے یہ کہا۔ ہوئے بھی، غیر ارادی طور پر ان کے سوال کا جواب دیا ہے۔ میں نے ایک سسکی لی۔ پھر بولا تو اپنی آواز خود بھی نہیں پہچان سکا۔ "اپنے گھر۔ میں یہ دیکھنے گیا کہ وہاں کوئی رہ رہا ہے یا نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ پاپا کو مسٹر گولڈ کی جگہ مل جائے گی۔ وہ مینیجر بن جائیں اور ہم اپنا گھر واپس لے سکیں گے۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی... طویل خاموشی۔ میری سانسوں کی کھڑکھڑاہٹ کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ میرے پاس فرش پر بیٹھ گئیں اور میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

میں نے پھر آنکھیں کھولیں اور پاپا کو دیکھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے تھے اور خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان کا جسم جیسے سکڑنے لگا اور وہ ایک بوڑھے لگنے لگے۔ پھر ان کے ہونٹ ہلے۔ "یہ خیال کیسے آیا...؟" وہ دھیمی آواز میں بولے۔ "رات گولڈ نے بتا دیا تھا کہ اسٹور مسلسل خسارے میں جا رہا ہے اس لیے مکمل ہوتے ہی اسے بند کر دیا جائے گا۔ مطلب یہ کہ پہلے سے میں بے روزگار ہو جاؤں گا۔"

مجھے یقین نہیں آیا... کیسے آتا۔ آنکھوں سے

ہوئے آنسو میرے رخساروں سے پھسلنے لگے۔ پھر میری سمجھ میں آیا کہ رات گولڈ پاپا سے یہ بات کر رہا تھا۔ اس لیے تو پاپا کے کندھے جھک گئے تھے اور وہ اتنے شکست خوردہ نظر آنے لگے تھے۔

سب کچھ واضح ہوگیا۔ پاپا کا غصہ، صبح ماما کے چہرے پر پریشانی... سب واضح تھا۔ ایک لمحے کو میں پھر سے چھوٹا سا بچہ بن گیا۔ میں نے ماما کے سینے میں مُنہ چھپا لیا۔

تو میں نے جو کچھ کیا، وہ بے سود تھا... لاحاصل! میں کب تک بچہ بنا رہوں گا؟ کب تک خوابوں کی دنیا میں جیتا رہوں گا؟ اب مجھے بڑا ہو جانا چاہیے۔ مجھے حقائق کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ مجھے اپنا مکان کبھی واپس نہیں مل سکے گا۔ اس دنیا میں پیسا سب سے بڑی چیز ہے... پیسا!

میں نے جھکائی دے کر اُس کے گلے ہوئے رائٹ کو غیر کیا اور اپنا لیفٹ اس کی طرف اُچھالا۔ اس کا دفاعی حصار ٹوٹ گیا۔ وہ پنچ اس کے لیے ہتھوڑا تھا۔ میں رائٹ استعمال کرنے والا تھا کہ راؤنڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی۔

میں اپنے کارنر میں اسٹول پر جا بیٹھا۔ میں مسکرا رہا تھا۔ وہ میرے کو اسفنج سے صاف کرنے لگا۔ "کیسا محسوس کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"فرسٹ کلاس جوزف...!" میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ "اس راؤنڈ میں اسے گرا دوں گا میں۔ وہ اب محض ایک خالی ڈبا ہے۔"

جوزف پوٹیٹو نے نرم لہجے میں کہا۔ "اپنی سانس بچا کر رکھو..." وہ اب میرے کندھوں پر اسفنج پھیر رہا تھا۔ "محتاط رہو۔ یہ بھی ہو، اس کا رائٹ بہت پاور فل ہے۔ کوئی خطرہ مول نہ لینا۔ میں نے نیلی سے وعدہ کیا ہے کہ میں تمھیں پٹنے نہیں دوں گا۔"

میں نے جوزف کے سر کو اپنے دستانے سے چھوا۔ اس کے انداز میں محبت تھی۔ "میرا خیال ہے، اس بار تمھیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

جوزف بھی مسکرایا۔ "بس، میری عزت رکھ لو۔ نیلی تمھاری سالی سہی لیکن میری بہن ہے۔ میں اسے جتنا جانتا ہوں، تم نہیں جانتے۔ وہ تو اب بھی مجھ پر برستی رہتی ہے کہ میں نے تمھیں اس دھندے میں پھنسایا ہے۔"

میں جواب دینے ہی والا تھا کہ نئے راؤنڈ کی گھنٹی بج گئی۔ میں اُچھل کر اٹھا، جوزف رنگ سے باہر نکل گیا۔ میں تیز قدموں سے چلتا رنگ کے وسط میں پہنچا۔ میں نے جھکائی دیتے ہوئے خود کو اپنے حریف کے لیفٹ جیب سے بچایا۔ پھر میں نے دونوں ہاتھ نیچے کیے، اس کے گرد چکرانے لگا۔ میرا ترکش پنچ کے تیروں سے بھرا ہُوا تھا۔ مجھے بس ایک موقع کی تلاش تھی۔

لیکن میرا حریف بہت محتاط تھا۔ لوگ ہوٹنگ کر رہے تھے، پاؤں پٹخ پٹخ کر بے زاری کا اظہار کر رہے تھے۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ صرف دس ڈالر کی سونے کی گھڑی کے عوض نہ جانے وہ کیا امید رکھتے ہیں فائٹروں سے۔ کیا ہم ایک دوسرے کو مار ڈالیں اس گھڑی کے لیے!

میں نے پُرتشویش نظروں سے اپنے کارنر کی طرف دیکھا۔

میری چھٹی حس نے مجھے بچا لیا۔ میں نے بلا ارادہ جھکائی دی۔ کن انکھیوں سے دیکھنے پر مجھے اپنے حریف کا رائٹ اپنی

چوں چاں

گوادر میں ایک ایسا شخص بھی رہتا ہے جو مسلسل 6 ماہ جاگتا ہے اور 6 ماہ سوتا رہتا ہے۔ اس شخص کا نام "چوں چاں" ہے۔ گوادر کی پچیس تیس ہزار آبادی کا بچہ بچہ اسے جانتا اور پہچانتا ہے۔ چوں چاں کے والد کا نام مسافر ہے۔ اور وہ گوادر کی مسجد کے پیش امام ہیں۔ بچپن سے ہی ان کا یہ لڑکا عجیب و غریب آوازیں نکالتا تھا۔ اسی بنا پر گھر میں اس کا نام چوں چاں پڑ گیا۔ اپنے جاگنے کے موسم میں وہ سارا سارا دن اور ساری ساری رات آوارہ گردی کرتا ہے۔ جب تھک جاتا ہے تو کہیں بیٹھ کر آرام کر لیتا ہے۔ لیکن سوتا بالکل نہیں، گھر صرف کھانا کھانے جاتا ہے۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی باہر نکل جاتا ہے جب سونے کا موسم آتا ہے تو مسلسل چھ ماہ سوتا رہتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر چوبیس گھنٹے کے بعد آدھے گھنٹے کے لیے جاگ اٹھتا ہے۔ اس مختصر عرصے میں کھانا کھاتا ہے اور حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر پھر فوراً سو جاتا ہے۔ اس دوران چوں چاں کوئی بات نہیں کرتا۔ والدین پہلے ہی سے کھانے پینے کی چیزیں اور پانی اس کے قریب رکھ دیتے ہیں۔

چوں چاں کے اس سونے اور جاگنے کے راز کو آج تک کوئی نہیں جان سکا۔ جب چوں چاں سے اس کے متعلق کوئی سوال کیا جاتا ہے تو وہ خاموش ہو جاتا ہے۔

تعاون ✪ محمد عاطف

ٹھوڑی کی طرف آتا دکھائی دیا۔ جھکائی کی وجہ سے وہ میرے کندھے کو تقریباً چھوتا ہُوا گزرا۔ اس کے نتیجے میں مَیں اپنے حریف کے دفاعی حصار میں داخل ہوگیا۔

میں اپنا رائٹ نیچے سے، جسم کی پوری طاقت کے ساتھ اوپر لایا۔ وہ لاجواب اپرکٹ تھا جو اس کی ٹھوڑی سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھیں ایک دم سے دُھندلائیں، وہ لڑکھڑاتا ہُوا میری طرف گرا۔ مجھ سے لپٹنے ہی میں اس کی عافیت تھی۔ مگر میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے میں نے اس کے لیفٹ ہُک رسید کیا۔ وہ مُنہ کے بل گر پڑا۔ میں پُراعتماد انداز میں اپنے کارنر کی طرف آگیا۔ میں جانتا تھا کہ فائٹ ختم ہوچکی ہے۔

لوگ اب خوشی سے چلّا رہے تھے۔

جوزف رِنگ میں آگیا اور تولیے سے میرے کندھوں کا پسینا پونچھنے لگا۔ ''کاش... تم 18 سال کے ہوتے۔'' اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

میں ہنستے ہوئے دوبارہ رِنگ میں گیا۔ ریفری نے میرا ہاتھ تھام کر اوپر اٹھایا۔ ''اس لیول پر تم کسی کے بس کے نہیں۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

میں پھر ہنس دیا۔

جوزف نے ڈریسنگ روم میں جھانکتے ہوئے پکارا۔ ''جلدی کرو ڈینی۔''

''میرے جوتوں کے تسمے باندھ دو زیپ۔''

''باس نے تمھیں دفتر میں بلایا ہے۔'' زیپ نے تسمے باندھتے ہوئے کہا۔

میں اس کے ساتھ باہر کوریڈور میں آیا۔ مجمع کا شور یہاں بہت ہلکا لگ رہا تھا۔ ''اس بلاوے کا کیا مطلب ہے زیپ؟''

زیپ نے کندھے جھٹک دیے۔ ''مجھے کیا معلوم۔ کیا پتا، وہ تمھیں کوئی میڈل دینا چاہ رہا ہو۔'' لیکن لفظوں کے برعکس اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

ہم ایک دروازے کے سامنے رک گئے، جس پر 'پرائیویٹ' کی تختی لگی تھی۔

میں نے کمرے میں داخل ہوکر متجسّس نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ میں پہلی بار یہاں آیا تھا۔ یہاں بڑے لوگ آتے تھے۔ وہ لوگ جو مال کماتے تھے۔ مجھ جیسے گھڑی کے انعام کے لیے لڑنے والے فائٹر نہیں۔

لیکن کمرے کو دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ وہ چھوٹا کمرا تھا۔ دیواروں پر فائٹرز کی تصویریں لگی تھیں۔ وہ میری توقع سے بہت کم تھا۔

کمرے میں کئی افراد بیٹھے سگار پی رہے تھے اور باتوں میں مشغول تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چپ ہوگئے اور غور سے مجھے دیکھنے لگے۔ جیسے نگاہوں میں مجھے تول رہے ہوں۔ چبھتی ہوئی نظر ان پر ڈالی پھر جنازیم کے مالک کی طرف مڑا۔ ''آپ نے مجھے بلایا ہے مسٹر اسکوپاس؟''

اس نے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بے تاثر تھیں۔ اوپر لگے بلب کی روشنی میں اس کا گنجا سر چمک رہا تھا۔ ''تم ڈینی فشر ہو؟'' آنکھوں کی طرح اس کا لہجہ بھی بے تاثر تھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ مسکرایا تو اس کے پیلے دانت نمایاں ہوگئے۔ ''میرے آدمی بتاتے ہیں کہ تم بڑی چیز ہو۔ اب تک ہمارے پاس گھڑیوں کا ڈھیر جمع ہوچکا ہے۔''

میں بھی جواباً مسکرایا۔ اس کا انداز دوستانہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ ''میں انھیں رکھ پاتا تو یقیناً اب تک ڈھیر جمع ہو چکا ہوتا۔''

جوزف نے پیچھے سے مجھے ٹہوکا دیا۔ ''اس کا مطلب ہے مسٹر اسکوپاس، کہ یہ تمھارا اپنے باپ کو دے دیتا ہے۔'' اس نے وضاحت کی اور تنبیہی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں کوئی انسپکٹر بھی ہوسکتا تھا۔

اسکوپاس جوزف کی طرف مڑا۔ ''تم کون ہو؟''

''یہ میرا منیجر ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''یہ پیپی یونائٹڈ کے نام سے فائٹ کرتا رہا ہے۔''

اسکوپاس کی آنکھیں کچھ پھیل سی گئیں۔ ''ہاں، کچھ کچھ یاد آتا ہے مجھے۔ کم زور جبڑے والا ایک لڑکا...'' پھر اچانک اس کی آواز میں بے صبری در آئی۔ ''تو اب تم کیا کرتے ہو... چمپئن گیری؟''

جوزف نے مضطربانہ انداز میں پہلو بدلا۔ ''نہیں مسٹر اسکوپاس، میں...''

اسکوپاس نے درشت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ ''تم یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے تمھارے دوست سے کاروباری بات کرنی ہے۔''

جوزف نے ایک نظر اسے اور پھر مجھے دیکھا۔ اس کے ماتھے پر پیلاہٹ آگئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی سی جھلکی، وہ جانے کے لیے پلٹا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''رُک جاؤ زیپ۔'' پھر میں اسکوپاس کی طرف مڑا۔ ''آپ غلط سمجھ رہے ہیں مسٹر اسکوپاس۔ زیپ میری گرل فرینڈ کا بھائی ہے۔ یہ تو میرے اصرار پر میری دیکھ بھال کرتا ہے۔ یہ جائے گا تو میں بھی نہیں رُکوں گا۔''

اسکوپاس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ مسکرایا۔ ''تو یہ پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا تمھیں۔ اس بات سے تو بہت فرق پڑتا ہے۔'' اس نے اپنی جیب سے سگار نکال کر جوزف کی طرف بڑھایا۔ ''یہ میری طرف سے سگار قبول کرو ڈیوٹیٹو۔ اور میری پچھلی تمام باتیں بھول جاؤ۔''

زیپ نے سگار لے کر جیب میں رکھ لیا۔ اس کی پریشانی دور ہوگئی تھی، اور اب وہ بھی مسکرا رہا تھا۔

میں نے اسکوپاس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے مجھے کیوں بلایا تھا؟''

اس کا چہرہ پھر بے تاثر ہوگیا۔ ''تم اس کلب میں بہت کام کے آدمی ہو۔ میں یہ بات تمھیں بتانا چاہتا تھا۔''

''بہت شکریہ!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن اسی کے لیے آپ نے کاروباری بات کا تذکرہ کیا تھا۔''

ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں بجلی سی چمکی لیکن اگلے ہی لمحے وہ پھر بے تاثر ہوگئیں۔ ''شہر والوں کو ٹیلنٹ کی تلاش رہتی ہے۔ میں نے انھیں تمھارے بارے میں بتایا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''انھوں نے تمھاری پچھلی کئی فائٹس دیکھیں اور تم انھیں اچھے لگے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ تمھارے شایانِ شان نہیں۔ چناں چہ ہم تمھیں اپنی گرفت میں لے رہے ہیں۔ تمھارے، انعامی گھڑی کے لیے لڑنے کے دن ختم ہوئے۔''

''تو اب مجھے کس چیز کے لیے لڑنا ہوگا؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''شہرت اور نام وری کے لیے۔ اب تمھیں اپنی ساکھ بنانی ہوگی۔''

''اور پیسوں کے لیے میں کیا کروں گا؟ گھڑی والی لڑائی تو ہوتی ہے۔''

اسکوپاس کی مسکراہٹ بھی سرد تھی۔ اس نے سگار کا دھواں میری طرف اُچھالا۔ ''یہ ہماری ذمے داری ہے۔ جب تک تم پروفیشنل نہیں بنتے، ہم تمھیں ہر ماہ سو ڈالر دیں گے۔ پھر جب تم کمانے لگو گے تو اس میں ہمارا حصّہ ہوگا۔''

''میں مہینے میں دس سے زیادہ گھڑیاں جیت لیتا ہوں...'' میں نے حقارت سے کہا۔ زیپ میرا بازو دبا رہا تھا لیکن میں نے اسے نظر انداز کردیا۔ میں اتنا سستا بکنے والا نہیں تھا۔ ''اور اگر میں تمھاری پیش کش قبول نہ کروں تو؟''

''تو کچھ نہیں...'' اسکوپاس نے بے پروائی سے کہا۔ ''لیکن تم عقل مند ہو۔ جانتے ہو کہ ان لڑکوں کو ناک آؤٹ کرکے تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔ جب کہ یہاں وہ شخص بھی موجود ہے جو تمھارے پروفیشنل بننے کے بعد تمھارے معاملات سنبھالے گا۔''

''تم بڑے یقین سے بات کررہے ہو...'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں فائٹر بننا چاہتا ہوں۔''

''تمھیں پیسے کی ضرورت ہے کڈ۔'' اسکوپاس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ''اس لیے تم فائٹر بنو گے۔ ورنہ دس ڈالر کی گھڑی کے لیے کیوں فائٹ کرتے!''

یہ بات اس کی دُرست تھی۔ پیسوں کی تو مجھے ضرورت تھی۔ پاپا اب بھی بے روزگار تھے۔ ان گھڑیوں ہی پر ہمارا گزارہ تھا۔ مسٹر گولڈ والے تجربے نے مجھے سکھا دیا تھا کہ رہ زنی اور ڈکیتی کا مجھ میں حوصلہ نہیں ہے۔ لیکن اب فائٹ سے بھی میں اُکتانے لگا تھا۔ اس میں میرے لیے کوئی مستقبل نہیں تھا۔ میں نے کتنے ہی چہرے بگڑے لوگوں کو دیکھا تھا۔ مجھے اپنا چہرہ بگڑوانا پسند نہیں تھا۔

میں جوزف کی طرف مڑا۔ ''آؤ زیپ، چلیں...'' پھر میں نے اسکوپاس کی طرف دیکھا۔ ''خدا حافظ مسٹر اسکوپاس۔ جو کچھ آپ نے سوچا، میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ سے مل کر مجھے اچھا لگا۔''

میں دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ باہر کھڑے ایک شخص نے مجھے روکنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بغیر دیکھے اس کا ہاتھ جھٹکا اور آگے بڑھنے لگا۔

''اے ڈینی فشر! کیا اپنے نئے منیجر سے ملے بغیر ہی چلے جاؤ گے؟'' ایک جانی پہچانی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو میری باچھیں کھل گئیں۔ میں اس سے لپٹ گیا۔ ''مسٹر سرسام... سام واٹکن، مجھے پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ یہ آپ ہیں۔''

عقب سے مسٹر اسکوپاس کی آواز، لہجے میں معذرت لیے ابھری۔ ''سوری مسٹر وانکن، لڑکا نہیں مان رہا ہے۔''

مسٹر سام نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے تیزی سے ذہن بنایا۔ میں نے پلٹ کر مسکراتے ہوئے اسکوپاس کو دیکھا۔ ''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو مسٹر اسکوپاس تو مجھے آپ کی پیش کش منظور ہے۔''

چند منٹ بعد مسٹر سام نے کہا۔ ''چلو ڈینی، تمھیں کچھ کھلا دوں۔ تمھیں بھوک لگ رہی ہوگی۔''

''ایک منٹ مسٹر سام، میں ابھی آیا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر میں اسکوپاس کی ڈیسک کی طرف گیا۔ کمرے کے ماحول میں اب ذرا بھی کشیدگی نہیں تھی۔ حد یہ کہ اسکوپاس بھی مسکرا رہا تھا۔ ''مسٹر اسکوپاس، میں آپ کا شکر گزار ہوں۔''

''کوئی بات نہیں کڈ۔ اب سب کچھ ٹھیک ہے۔''

میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''لیکن آج کی گھڑی تو میں آپ سے لوں گا۔''

اس نے قہقہہ لگایا اور شہر سے آنے والوں کی طرف دیکھا۔ ''یہ لڑکا بہت آگے جائے گا۔ اگر میرے پاس پانچ ہزار ڈالر ہوتے تو میں اسے کسی اور کو کبھی نہ دیتا۔''

میرے چہرے پر حیرت دیکھ کر وہ سب ہنسنے لگے۔ میں نے مسٹر سام کی طرف دیکھا تو انھوں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں پھر اسکوپاس کی طرف مڑا۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ مسٹر سام یقیناً کامیاب جا رہے ہیں۔ ورنہ وہ مجھ پر پانچ ہزار ڈالر نہیں لگا سکتا تھا۔

اسکوپاس نے جیب سے دو نوٹ نکالے اور میرے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ''سمجھ لو کہ گھڑی تم نے مجھے بیچ دی ہے۔''

میں نے رقم جیب میں رکھی، اسکوپاس کا شکریہ ادا کیا اور مسٹر سام سے کہا۔ ''آئیں چلیں۔'' میرے لہجے میں ان کے لیے احترام تھا۔

میں نے پلیٹ کو حسرت سے دیکھا اور اپنا کانٹا ایک طرف رکھ دیا۔ ''اب میں اور نہیں کھا سکتا۔'' پھر میں نے جوزف سے کہا۔ ''زیپ، تم کیسے جا رہے ہو؟'' مجھے افسوس تھا کہ اتنی کلچی ضائع ہوگی۔

جوزف کا منہ بھرا ہوا تھا۔ ''شان دار ڈینی!'' اس نے بہ مشکل جواب دیا۔

میں نے مسٹر سام کی طرف دیکھا۔ انھوں نے بھی ہاتھ روک لیا تھا۔ وہ بھی پلیٹ خالی نہیں کر سکے تھے۔ ''مجھے ان دنوں اپنے وزن کی طرف سے فکر ہے کڈ۔''

بات درست تھی۔ ان کا وزن کافی بڑھ گیا تھا۔

''پچھلے سال تم نے میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا؟'' اچانک انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے حیرت سے دیکھا۔ ''کیسا خط؟ مجھے آپ کا کوئی خط ملا ہی نہیں۔''

''میں تمھیں تلاش کرتا پھرا۔ تمھارے گھر گیا تو پتا چلا کہ تم لوگ اب وہاں نہیں ہو۔ تمھارا نیا پتا کسی کو معلوم نہیں تھا۔'' انھوں نے سگریٹ سلگائی۔ ''تمھارے لیے ایک کام تھا میرے پاس۔''

''پچھلے موسم گرما میں؟''

''ہاں۔''

میں نے میز پر رکھے مسٹر سام کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکالی۔ ''اُس وقت میں بہت ضرورت مند تھا۔ حالات بہت خراب تھے۔'' میں نے کہا۔

''تم اسکول سے فارغ ہو گئے؟''

''نہیں۔ اس دن میں ہو جاؤں گا...'' میں نے مسٹر سام کو جتنی سے دیکھا۔ ''آپ نے مجھے تلاش کیسے کیا؟''

''میں تمھیں کبھی بھولا نہیں۔ تمھیں چیمپئن بنانا میرا خواب تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی تم کسی رنگ میں ہی ملو گے۔ تم جیسا آدمی فائٹ کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ میں نے ایک دوست کو تمھارے بارے میں بتایا اور تم پر نظر رکھنے کو کہا...'' مسٹر سام نے کہا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر میرے ہونٹوں میں دبی سگریٹ کھینچ لی۔ ''اب تم میرے لیے کام کر رہے ہو، یہ نہیں چلے گی۔''

''مجھے آپ کے لیے، آپ کے ساتھ کام کرنا پسند ہے مسٹر سام۔ لیکن میں فائٹر نہیں بننا چاہتا۔''

''تو معمولی گھڑیوں کے لیے کیوں فائٹ کرتے رہے اب تک؟''

''پیسوں کے لیے۔ اور جوزف کی مہربانی سے...'' میں نے جوزف کی طرف اشارہ کیا۔ ''تین راؤنڈ کی فائٹ ہوتی ہے اور میں ہفتے میں کبھی تین، کبھی چار گھڑیاں جیت لیتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے کوئی دشواری نہیں پیش آتی۔ لیکن میں

''آج کی شام واقعی خوب صورت تھی، محکمہ موسمیات کا بہت شکریہ۔''

آواز ابھری۔ غصّے میں ان کی آواز بھاری ہو جاتی تھی۔ ''یہ کیسے کمائے تم نے؟ فائٹ کر کے؟'' انھوں نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ڈینی، یہ سچ نہیں ہے۔ ہے نا؟'' ماما نے پریشانی سے مجھے دیکھا۔

''ماما، ہمیں پیسے کی ضرورت ہے نا۔ تو میں اور کیا کروں؟''

ماما نے پاپا کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے کی جلد پر سپیدی غالب آ رہی تھی۔ انھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ صحت مند نہیں ہیں۔ پھر وہ میری طرف مڑیں۔ ''ہم نے تم سے کہا تھا نا کہ یہ ہم نہیں چاہتے...'' ان کے لہجے میں کم زور سا احتجاج تھا۔ ''تم زخمی بھی ہو سکتے ہو۔ دیکھو، ہم کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لیں گے۔''

میں نے ماما کو دیکھا۔ ''کیسے؟ کام تو کہیں ہے نہیں۔ کیا امداد سے کام چلائیں گے ہم؟'' میں نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''وہ ہمارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ فائٹ میں تو ہم تمھیں کھو بھی سکتے ہیں۔''

''لیکن ماما، میں کوئی خطرہ مول نہیں لیتا ہوں۔ اب تک میں تیس سے زیادہ فائٹس لڑ چکا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ جو نقصان مجھے پہنچا ہے وہ ایک آدھ خراش ہوتی ہے جو اگلے

نہیں بننا چاہتا۔ میں تو اسکول سے جان چھوٹنے کا منتظر ہوں۔''

''اور اسکول سے نکل کر کیا کرو گے؟ دنیا فتح کر لو گے؟ دس ڈالر فی ہفتہ کی کوئی جاب، اس کے لیے بھی خوش قسمتی ضروری ہے۔'' مسٹر سام نے حقیقت پسندانہ لہجے میں کہا۔

میرا چہرہ تمتما اٹھا۔ ''اس بارے میں تو میں نے نہیں سوچا تھا۔''

''میں جانتا تھا کہ نہیں سوچا ہوگا...'' مسٹر سام نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور اب سوچنے کی ضرورت بھی نہیں۔ تمھاری طرف سے سوچنا میری ذمّے داری ہے۔''

میں نے آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ رخسار پر ضرب کا ایک ہلکا سا نشان تھا، اور ان گذشتہ رات کی فائٹ کے بعد میرے چہرے پر اور کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی۔ میں مسکرا دیا۔

بالوں میں کنگھا کر کے میں باتھ روم سے نکلا۔ کچن کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں پاپا کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں مسکراتا ہوا وہاں پہنچا۔ ''صبح بخیر۔'' میں نے کہا۔

پاپا بات کرتے کرتے چپ ہو گئے اور انھوں نے میری طرف دیکھا۔ انھوں نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔

''ہیلو ماما، ڈینی...'' ماما نے جلدی سے کہا۔ ''اور ناشتا کر لو۔''

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ پاپا مجھے گھور رہے تھے۔ ہر روز ان کے چہرے کی لکیروں میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ وہ پریشانی اور بے بسی کے اندھے کنوئیں میں قید تھے۔ ان کی آنکھوں کی مایوسی صرف اس وقت چھپتی تھی جب وہ کسی بات پر غصّہ کرتے۔ اور میں دیکھ رہا تھا کہ غصّہ وہ بہت کم ظاہر کرنے لگے ہیں۔ شاید غصّے سے ان کی مایوسی چھپ جاتی تھی۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس ڈالر کا نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ ''رات میں نے کچھ رقم کمائی تھی۔'' میں نے عام سے انداز میں کہا۔

پاپا نے ایک نظر نوٹ کو اور پھر مجھے دیکھا۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں۔ ان کا یہ انداز میں پہچانتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ غصّہ اُبلنا شروع ہو گیا ہے۔ میں اپنی پلیٹ پر جھک کر ناشتا کرنے لگا۔ جو کچھ ہونے والا تھا، اس سے میں کسی طرح بچ نہیں سکتا تھا۔

وقت لمحوں سے گزرے۔ پھر پاپا کی کھڑکھڑاتی ہوئی

دن تک ٹھیک ہو جاتی ہے۔ میں محتاط ہوں ماما، اور رقم بھی مل جاتی ہے۔"

ماما پاپا کی طرف مڑیں۔ میری دلیل کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ پاپا کا اب پورا چہرہ سپید پڑ چکا تھا۔ انگلیاں یوں لرز رہی تھیں کہ وہ کافی کی پیالی نہیں تھام سکتے تھے۔ وہ مجھے گھور رہے تھے۔ لیکن مخاطب وہ ماما سے ہوئے۔ "یہ سب اُس لڑکی کا کیا دھرا ہے..." انھوں نے کہا۔ "وہ یہ سب کرواتی ہے اس سے۔ اُسے کوئی پروا نہیں کہ یہ مر بھی سکتا ہے۔ اسے تو بس اپنی وقت گزاری کے لیے رقم چاہیے۔"

"یہ سراسر غلط ہے...!" میں نے غصّے سے کہا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ بات اسی رُخ سے آئے گی۔ "وہ بھی آپ کی طرح اس کی مخالف ہے۔ اور میں یہ صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ کچھ کمانے کا اور کوئی طریقہ میرے پاس نہیں ہے۔"

پاپا نے مجھے نظر انداز کر دیا۔ ان کی آنکھیں اب دہک رہی تھیں۔ وہ بولے تو ان کا لہجہ سرد تھا اور اس میں نفرت اور حقارت تھی۔ "وہ منحوس اطالوی طوائف...!" وہ میرے چہرے پر نظریں گاڑ کر بول رہے تھے۔ "تم جو راتیں اس کے ساتھ کارزز پر اور اِدھر اُدھر ہال ویز میں گزارتے ہو، اس کے بدلے وہ کیا لیتی ہے تم سے؟ اپنی ہم مذہب کوئی لڑکی تمھیں نہیں ملتی۔ کیوں کہ وہ اس کی طرح بے حیا نہیں ہوگی۔ وہ اپنے لالچ کی خاطر فائٹ پر نہیں اُکسائے گی۔ وہ ماں باپ سے ان کا اکلوتا بیٹا نہیں چھینے گی۔ بولو ڈینی، اس وقت گزاری کے بدلے تم اس ادافروش لڑکی کو کیا دیتے ہو۔ وہ مفت میں تو تمھیں کچھ نہیں دے گی۔"

میرے اندر اُبلتا ہُوا غصّہ ایک پل میں سرد نفرت میں تبدیل ہو گیا۔ میں ناشتا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہُوا۔ "آپ ایسی باتیں نہ کریں پاپا...!" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس کے بارے میں آئندہ کبھی ایسی بات نہ کیجیے گا۔ کم از کم میری موجودگی میں ہرگز ایسی بات نہ کریں۔"

میرے تصوّر میں اس وقت نیلی کا خوف زدہ چہرہ لہرا رہا تھا، جب میں نے اسے بتایا تھا کہ پیسے کے حصول کے لیے میں نے فائٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ بے چاری تو پاپا سے زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔

"وہ بہت اچھی لڑکی ہے پاپا...!" فرطِ جذبات سے میرے لیے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔ "وہ ہمارے ہاں کی لڑکیوں سے بہت اچھی ہے۔ آپ اپنی ناکامیوں کا انتقام اس سے نہ لیں۔ ہم اس وقت جہاں کھڑے ہیں، اس کے ذمّے دار آپ ہیں، وہ نہیں۔" میں میز پر ہاتھ ٹکا کر ان کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ چند لمحے بعد ان کی نظریں جھک گئیں۔ انھوں نے کافی کی پیالی اٹھائی اور مُنہ سے لگالی۔

ماما نے میرے بازو کو چھوتے ہوئے محبت سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ، ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے تمھارا۔"

میں کرسی پر ڈھے گیا۔ لیکن اب میری بھوک مر چکی تھی۔ ایک عجیب سی تھکن مجھ پر مسلط ہو گئی تھی۔ میری آنکھیں جل رہی تھی۔ میں نے جلدی سے پیالی اٹھائی اور کافی پی لی۔

ماما میرے برابر بیٹھ گئیں۔ "اپنے پاپا سے خفا نہ ہو ڈینی...!" انھوں نے نرم لہجے میں کہا۔ "یہ تمھاری بھلائی کے لیے ہی کہہ رہے ہیں۔ یہ تمھاری طرف سے فکرمند رہتے ہیں۔"

میں اندر سے خود کو زخمی محسوس کر رہا تھا۔ "وہ بہت اچھی لڑکی ہے ماما..." میں نے تلخی سے کہا۔ "پاپا کو اس کے بارے میں ایسی ناروا بات نہیں کرنی چاہیے۔"

"لیکن ڈینی، وہ ہمارے مذہب کی نہیں ہے۔"

میں نے جواب نہیں دیا۔ کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ لوگ میری بات سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔

"اچھا، پاپا کو حوصلہ مل جائے تو تم فائٹنگ چھوڑ دو گے؟"

میری تھکن اور بڑھ گئی۔ یہ سب بہلاوے تھے۔ "نہیں ماما، بہت دیر ہو چکی۔ اب میں رک نہیں سکتا۔"

"کیا مطلب... کیا مطلب ہے تمھارا؟"

میں اٹھ کھڑا ہُوا۔ "اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ میں نے کسی اسپانسر سے ڈیل کر لی ہے۔ وہ مجھے سو ڈالر ماہانہ دیں گے اور جب میں 18 سال کا ہو جاؤں گا تو پروفیشنل بن جاؤں گا۔"

ماما دہل کر رہ گئیں۔ "لیکن..."

"اب لیکن ویکن کی کوئی گنجائش نہیں ماما۔ معاملات طے ہو چکے ہیں۔ پاپا کو ملازمت ملی تو بہ مشکل سو ڈالر ہی کی ہوگی۔ وہ مجھے مل رہے ہیں، اور ہم اس میں گزارہ کر سکتے ہیں۔"

ماما کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بے بسی سے پاپا کی طرف مڑیں۔ "ہیری، اب کیا ہوگا؟ یہ تو بچہ ہے۔ اسے جسمانی نقصان بھی تو پہنچ سکتا ہے۔"

پاپا مجھے گھور رہے تھے۔ ان کی آنکھ واضح طور پر پھڑک رہی تھی۔ انھوں نے ایک گہری سانس لی۔ "یہ جو کرتا ہے کرنے دو اسے۔ کاش... اسے نقصان پہنچے، یہ زخمی ہو۔ یہاں

تک متعلق ہے۔ یہی ہونا چاہیے اس کے ساتھ۔"

"ہیری!" ماما نے شاک میں انھیں دیکھا۔ "یہ ہمارا بیٹا ہے۔"

پاپا نے نفرت سے مجھے دیکھا۔ "یہ ہمارا بیٹا نہیں، یہ شیطان کا بیٹا ہے۔"

میں تاریک ہال وے سے نکل کر دھوپ میں آیا تو پلکیں جھپکانے پر مجبور ہو گیا۔ روشنی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ چند لمحے، میں چبوترے کے پاس کھڑا جیسے دھوپ کا شاور لیتا رہا۔

میں خوش تھا۔ مسٹر سام کے ساتھ جُڑے مجھے چار ماہ ہو گئے تھے۔ اس عرصے کے لیے بہت اچھا عرصہ تھا۔ گلووز ٹورنامنٹ میں ہر راؤنڈ کو پھلانگتا ہُوا میں آخری پائیدان کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ایک اور فائٹ اور میں جیت گیا تو گارڈن میں فائنل! اور مجھے اپنی کام یابی کے بارے میں کوئی شک نہیں تھا۔ میں پُریقین اور پُراعتماد تھا۔

میں نے گہری سانس لے کر پھیپھڑوں میں تازہ ہَوا بھری۔ ہلکی سی خنکی میری گردن میں چبھ رہا تھا۔ میں نے اسے کھول لیا۔ اب میری ہر فیس کا کالر ٹائٹ ہو چکا تھا۔ یہ ٹریننگ کا کمال تھا۔

کاش پاپا کی سمجھ میں یہ بات آ جاتی کہ فائٹنگ بھی ایک [illegible]... ایک ذریعۂ روزگار! لیکن وہ نہیں سمجھ پا رہے تھے۔ وہ سمجھ جاتے تو زندگی آسان اور خوب صورت ہو جاتی۔ لیکن وہ تو ہر وقت مجھ پر طنز کے تیر برساتے رہتے تھے۔ اور اس سلسلے میں وہ نیلی کو موردِ الزام ٹھیراتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ فائٹر محض بدمعاش ہوتے ہیں۔ اب میرے اور ان کے درمیان براہِ راست بات ہوتی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ عجیب ضدی طبیعت تھی ان کی۔ انھی میں اس کا وار بھگت کر آ رہا تھا۔

پاپا میز پر اخبار پھیلائے خبریں پڑھ رہے تھے۔ میں کچن میں داخل ہُوا تو انھوں نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔

"ماں... رات کو دیر سے واپسی ہوگی میری۔" میں نے ماما سے کہا۔

"فائٹ ہے تمھاری؟" ماما نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں۔ آج سیمی فائنل ہے... بروک لین کے گرووں..." میں نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "اس کے بعد گارڈن میں فائنل ہوگا۔ اس کے بعد اگلے سال تک کے لیے چھٹی۔"

"انتظار رہنا ڈینی۔"

میں پُراعتماد انداز میں مسکرایا۔ "آپ فکر نہ کریں ماں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

پاپا نے میری بات سن کر اخبار سے سر اٹھایا اور ماما سے یوں مخاطب ہوئے جیسے میں وہاں موجود ہی نہیں ہوں۔ "تم فکر نہ کرو میری۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ ذرا سنو تو، اخبار میں کیا لکھا ہے اس کے متعلق..." پھر وہ زہریلے لہجے میں اخبار کا آرٹیکل انھیں پڑھ کر سنانے لگے۔ "وہ کہتے ہیں... ایسٹ سائیڈ کی تہلکہ خیز دریافت ڈینی فشر جس کی دونوں مٹھیوں میں ڈائنامیٹ بھرا ہے، اپنے ڈویژن کی چیمپئن شپ کے اور قریب پہنچ گیا ہے۔ آج رات گروو میں اس کا مقابلہ سیمی فائنل میں جوئے پاسکو سے ہوگا۔ ڈینی فشر کو بعض لوگ اسٹائلن اسٹریٹ کا بل ڈوزر قرار دیتے ہیں۔ اس کا سبب اس کا ریکارڈ ہے۔ 14 فائٹس اور سب کی سب ناک آؤٹ کی بنیاد پر وہ فاتح قرار پایا۔ اس وقت فائٹنگ کی دنیا کی توجہ صرف اور صرف اس پر مرکوز ہے۔ خبر سرگرم ہے کہ بالغ ہوتے ہی وہ پرو بن جائے گا۔

"دُبلا پتلا، نرم گفتار بلونڈ بوائے ڈینی فشر رنگ میں سرد مزاج اور بے رحم قاتل بن جاتا ہے، ایک ایسی فائٹنگ مشین جسے اپنے حریف سے کوئی ہم دردی نہیں ہوتی۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت ڈینی فشر سب سے درخشاں مستقبل رکھنے والا امیچر باکسر ہے۔ آج جو لوگ گروو میں اس کی فائٹ دیکھنے آئیں گے، میرا دعوا ہے کہ وہ ہرگز مایوس نہیں ہوں گے۔ انھیں وہاں اُچھلتا ہُوا، جیتا جاگتا لہو اور رقص کرتی ہوئی موت کا نظارہ دیکھنے کو ملے گا۔ اہم بات یہ ہے دوستو کہ فشر کے دونوں ہاتھ یکساں طور پر مہلک ہیں۔ وہ قاتل ہاتھ ہیں۔"

پاپا نے اخبار ایک طرف اچھال دیا اور ماما کی طرف دیکھا۔ "اپنے بیٹے کے لیے کیسے کیسے تعریفی الفاظ سننے کو ملتے ہیں... قاتل، رقص کرتی ہوئی موت، تباہی کی مشین... کتنے فخر کی بات ہے ایک باپ کے لیے۔"

ماما نے پریشانی سے مجھے دیکھا۔ "ڈینی، کیا یہ جو اخبار میں لکھا ہے، سچ ہے؟"

"نہیں ماما۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "آپ تو جانتی ہیں، ٹورنامنٹ کی انتظامیہ کے کہنے پر اخبار والے ہر چیز بہت بڑھا چڑھا کر لکھتے ہیں... تاکہ زیادہ سے زیادہ ٹکٹ بک سکیں۔"

لیکن ماما مطمئن نہیں ہوئیں۔ "تم اپنا خیال رکھنا ڈینی۔"

پاپا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "کیوں پریشان ہوتی ہو میری۔

اسے کچھ نہیں ہوگا۔ شیطان خود اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ وہ اسے زخمی نہیں ہونے دے گا۔'' وہ میری طرف مڑے۔ ''جاؤ قاتل، ایک ڈالر کے لیے تو تم اپنے تمام دوستوں کو قتل کر سکتے ہو۔''

یہ گذشتہ کئی ہفتوں میں پہلا حملہ تھا جو انھوں نے مجھ پر براہِ راست کیا تھا۔ میں اب تک ہر تذلیل خاموشی سے برداشت کرتا رہا تھا۔ لیکن اب میری برداشت جواب دے گئی۔ ''ہاں پاپا، ایک ڈالر کے لیے میں تمام دوستوں کو قتل کر سکتا ہوں... تاکہ آپ بغیر کوئی زحمت کیے، یہاں آرام سے بیٹھ کر، بھرے پیٹ کے ساتھ میری توہین کر سکیں۔'' یہ کہہ کر میں فلیٹ سے باہر نکل آیا۔ دروازہ میں نے دھڑ سے بند کیا تھا۔

باہر نکل کر میں بہ ہر حال پُرسکون ہو گیا۔

میں کار نرز سے مڑا ہی تھا کہ کسی نے مجھے پکارا۔ وہ اسپٹ تھا جو ایک ڈوروے میں کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ ''ڈینی، ایک منٹ کو یہاں تو آؤ۔''

''سوری اسپٹ، میں لیٹ ہو رہا ہوں۔'' میں نے رُکے بغیر جواب دیا۔

وہ بھاگتا ہُوا میرے پیچھے آیا اور ہیجانی انداز میں میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''میرا باس تم سے ملنا چاہتا ہے۔'' اس نے رال کا فوارہ اچھالتے ہوئے کہا۔

''کون... فیلڈز کی بات کر رہے ہو؟''

''ہاں... ہاں، مسٹر فیلڈز...'' اس نے ہاتھ سے اپنا گریبان صاف کیا۔ ''میں نے اسے بتایا تھا کہ میں تمھیں جانتا ہوں۔ اس نے کہا... مجھے اس سے ملواؤ۔''

وہ ایک دکان کا ڈوروے تھا جہاں سے اسپٹ لپک کر آیا تھا۔ سائن بورڈ پر لکھا تھا... فیلڈز چیک کیشنگ سروس...

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ اس علاقے میں یہ ممکن نہیں تھا کہ میکس فیلڈز کو ناخوش کر کے کوئی خوش رہ سکے۔ سیاست، جوا، سود خوری... کوئی ایک دھندا نہیں تھا اس کا۔ وہ اس علاقے کا بڑا آدمی تھا۔

اسپٹ کا چچا فیلڈز کے لیے کام کرتا تھا۔ اس نے اسپٹ کو بھی فیلڈز کی غلامی میں دے دیا تھا۔ اس خبر پر گینگ کے لڑکے رشک سے بے حال ہو گئے تھے۔ مجھے یاد تھا، اسپٹ نے کہا تھا کہ اب اسے اسکول جانے کی ضرورت نہیں۔ اور ایک دن وہ بھی فیلڈز کی طرح بڑا آدمی بنے گا۔ جب کہ ہم سب تلاشِ روزگار میں اِدھر اُدھر ٹکریں مارتے پھریں گے۔

اس کے بعد سے اسپٹ مجھے کم ہی نظر آیا۔ لیکن جب بھی نظر آیا تو اسے دیکھ کر خوش حالی کا خیال آتا تھا۔ اب وہ مہنگے کپڑے پہنتا تھا۔

میں اسپٹ کے پیچھے اسٹور میں داخل ہُوا۔ دروازے سے گزر کر ہم عقبی حصے میں داخل ہوئے۔ وہاں کئی افراد کھڑے تھے۔ کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی۔ سیڑھیاں چڑھ کر ہم اوپر پہنچے۔ اسپٹ نے دروازے پر دستک دی۔

''آجاؤ۔'' کسی نے دہاڑ کر کہا۔

اسپٹ نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہُوا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ لیکن اندر گھستے ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔ میں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ اس کمرے کے بارے میں مَیں نے سنا ہوا تھا۔ لیکن یقین نہیں کیا تھا۔ اور اب وہ میرے سامنے تھا۔ ایسے کمرے تو فلموں میں دکھائے جاتے ہیں۔

وہ بہت جسیم آدمی تھا۔ سرخ چہرہ اور بڑی توند۔ وہ ہمارا طرف بڑھا تو میں نے دیکھا۔ اس کے جوتے غیر معمولی طور بڑے تھے۔ میں بغیر جانے کہہ سکتا تھا کہ وہ میکس فیلڈز ہیں۔

فیلڈز نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ ''میں نے کہا تھا اسپٹ کہ اب مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔'' وہ غصّے سے دہارا

''لیکن آپ نے کہا تھا مسٹر فیلڈز کہ جیسے ہی ڈینی فشر آئے، اسے آپ کے پاس لاؤں...'' اسپٹ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ پھر وہ میری طرف مڑا۔ ''یہ ڈینی فشر ہے باس۔''

فیلڈز کا غصّہ ایسے غائب ہو گیا جیسے آیا ہی نہیں تھا۔ ''ڈینی فشر ہو؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں میکس فیلڈز ہوں۔'' اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا

اس کی گرفت طاقت کا مظہر تھی اور ہاتھ گرم تھا۔ وہ اچھا نہیں لگا۔

''ٹھیک ہے، اب تم جا سکتے ہو۔'' فیلڈز نے اسپٹ سے کہا

اسپٹ کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔ ''بہتر مسٹر فیلڈز۔'' نے کہا اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

فیلڈز ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ ''میں تم سے ملنا چا تھا۔ تمھارے متعلق بہت کچھ سنا ہے میں نے...'' اس کہا۔ ''پھر بے حد سرسری انداز میں پوچھا۔ ''کچھ پینا کرو گے؟''

''نہیں شکریہ!'' میں نے کہا پھر سوچا اتنا برا آدمی بھی لگتا یہ اور اس کا میرے ساتھ رویّہ بھی تحقیر آمیز نہیں

''دراصل آج میری فائٹ ہے۔'' میں نے جلدی سے وضاحت کی۔

اس کی آنکھیں چمکیں۔ ''پچھلے ہفتے میں نے تمھاری فائٹ دیکھی تھی۔ تم اچھے فائٹر ہو۔ سام خوش قسمت ہے۔''

''آپ مسٹر سام کو جانتے ہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں ہر شخص سے اور ہر معاملے سے واقف رہتا ہوں...'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے کہ اس علاقے میں کچھ ہو اور میں اس سے بے خبر رہوں۔ مجھ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔''

یہ بات... تھی۔ اب اس پر یقین بھی آ گیا۔

اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

میں کھڑا رہا۔ ''مسٹر فیلڈز، میں جلدی میں ہوں۔ مجھے جمنازیم پہنچنا ہے۔''

''میں نے کہا، بیٹھ جاؤ۔'' اس کا لہجہ دوستانہ تھا۔ لیکن اس میں حکم بھی چھپا تھا۔

میں بیٹھ گیا۔

چند لمحے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دوسرے کمرے کی طرف آواز لگائی۔ ''رونی، میرے لیے جام لاؤ...''

پھر وہ میری طرف مڑا۔ ''تم واقعی نہیں پیو گے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا اور ساتھ ہی مسکرایا۔ تعلقات خراب کرنے کی کیا ضرورت...

اسی لمحے ایک جوان لڑکی جام لیے کمرے میں آئی۔ میں نے پلکیں جھپکائیں۔ وہ اس جگہ کے لائق تو نہیں تھی۔

''یو میکس۔'' اس نے فیلڈز کی طرف جام بڑھایا اور حسین نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

فیلڈز نے ایک سانس میں جام خالی کر دیا۔ میں ٹکٹکی لگائے لڑکی کو دیکھے جا رہا تھا۔ فیلڈز یہ دیکھ کر ہنسنے لگا۔ ''بھاگ جا یہاں سے رونی...'' اس نے لڑکی کا ہاتھ تھپکا۔ ''تمھاری وجہ سے یہ دوست کا دھیان بٹ رہا ہے، اور مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔''

وہ لڑکی اور کمرے سے چلی گئی۔ میری محویت ختم ہوئی اور میں چونکا تھا۔ اس کے باوجود جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی، میں اسے تکتا رہا۔ پھر میں فیلڈز کی طرف متوجہ ہو رہا تھا۔ ''تمھارا ذوق بہت اعلا ہے لڑکے...!''

نصیحت

ایک بزرگ نے شیطان سے کہا، مجھے کوئی ایسا کام بتاؤ جس کے کرنے سے میں تم جیسا ہو جاؤں۔ شیطان حیرت سے بولا، ایسی عجیب و غریب خواہش تو آج تک کسی نے نہیں کی، تم کیوں ایسا چاہتے ہو؟ بزرگ نے جواب دیا، بس یونہی۔ میرا جی چاہتا ہے۔ شیطان نے کہا۔ اگر تم مجھ جیسا بننا ہی چاہتے ہو تو پھر دو کام کرو۔ پہلا یہ کہ ہر بات میں جھوٹی سچی قسمیں خوب کھایا کرو اور دوسرا یہ کہ نماز پڑھنے میں سستی کیا کرو۔ جب تم یہ دونوں کام کرو گے تو پھر تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔

بزرگ نے فرمایا، میں خدا کی قسم کھا کر عہد کرتا ہوں کہ آج کے بعد یہ دونوں کام ساری زندگی نہیں کروں گا۔ شیطان بولا، تم تو میرے بھی استاد نکلے۔ میرا راز مجھ ہی سے اگلوا لیا۔ آج سے میں بھی یہ عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کسی انسان کو نصیحت نہیں کروں گا۔

تعاون ✪ عمر صدیقی

اس نے خوش دلی سے کہا۔ ''لیکن اس قابل تو بنو کہ اسے افورڈ کر سکو۔ جانتے ہو، اس ہال کی قیمت 20 ڈالر فی گھنٹا ہے۔''

میری آنکھیں پھیل گئیں۔ ''صرف ڈرنک پیش کرنے کے دوران بھی؟''

اس کا قہقہہ دیر تک کمرے میں گونجتا رہا۔ ''تم اچھے لڑکے ہو ڈینی۔ مجھے پسند آئے۔''

''شکریہ مسٹر فیلڈز۔''

''آج رات تم جیت رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا خیال تو یہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ اور میرا ہی نہیں، تقریباً سبھی لوگوں کا یہی خیال ہے۔ بلکہ بیش تر لوگ سمجھتے ہیں کہ فائنل بھی تم ہی جیتو گے۔''

میں مسکرایا۔ میرے پاپا مجھے گردانتے نہیں تھے۔ لیکن میرے چاہنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ ''مجھے امید ہے کہ میں انھیں مایوس نہیں کروں گا۔'' میں نے منکسرانہ لہجے میں کہا۔

''میں بھی یہی کہتا ہوں۔ میرے آدمی بتاتے ہیں کہ اب تک تم پر چار ہزار ڈالر کی شرطیں لگائی جا چکی ہیں۔ یہ رقم مجھ جیسے آدمی کے نزدیک بھی اہمیت رکھتی ہے۔ بہ ہر حال تم مجھے اچھے لگے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم سے ملاقات ہوئی۔''

"میں سمجھا تھا کہ آپ مجھ جیسے چھوٹے لوگوں پر شرط نہیں لگاتے ہوں گے۔"

"ہم کسی پر بھی شرط لگا سکتے ہیں۔ یہ ہمارا کاروبار ہے۔ بڑے ہوں یا چھوٹے، فیلڈز سب کو سمیٹ لیتا ہے۔" وہ پھر ہنسنے لگا۔

مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس نے مجھے بلایا تو کوئی وجہ بھی ہوگی۔ مگر اب تک تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

اس نے آگے جھکتے ہوئے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔ "تم مجھے بہت اچھے لگے ہولڑ کے۔" پھر اس نے دروازے کی طرف رُخ کر کے ہانک لگائی۔ "رونی، ایک اور جام لاؤ میرے لیے۔"

لڑکی جام ہاتھ میں لیے دوبارہ کمرے میں آئی۔ اس نے جام رکھا اور جانے کے لیے پلٹی۔

"ٹھیر جاؤ بے بی۔"

وہ کمرے کے وسط میں رک گئی اور ہمیں دیکھنے لگی۔

"تمھیں یہ اچھی لگی ہے نا لڑکے؟" فیلڈز نے مجھ سے پوچھا۔

اپنے چہرے کی تمتماہٹ روکنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

وہ مسکرایا۔ "تم مجھے بہت اچھے لگے ہو، اس لیے یہ کہہ رہا ہوں۔ آج رات جیت جاؤ تو یہاں چلے آنا۔ یہ میری طرف سے انعام ہوگا تمھارے لیے۔ کہو، کیسا لگا؟"

میرے حلق میں کچھ پھنسنے لگا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن مجھ سے بولا نہیں گیا۔ یہ پیش کش میرے لیے بہت زبردست تھی۔ لیکن نیلی سے ملنے کے بعد بہت کچھ بدل گیا تھا۔

فیلڈز مجھے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ "اب اتنے شرمیلے نہ بنو کڈ۔"

بالآخر میں بولنے کے قابل ہوگیا۔ "نہیں مسٹر فیلڈز، آپ کا شکریہ...!" میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مگر میری ایک گرل فرینڈ بھی ہے۔ اور ویسے بھی میں ٹریننگ میں مصروف ہوں۔"

"تمھیں پتا ہی نہیں ہے کڈ کہ تم کیا چیز ٹھکرا رہے ہو..." وہ مسکرایا۔ "تمھاری ٹریننگ کوئی بہت زیادہ متاثر نہیں ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ لڑکی کی طرف مڑا۔ "رونی، ذرا اسے اپنے اثاثے تو دکھاؤ۔"

"لیکن میکس!" لڑکی نے احتجاج کیا۔

"تم نے میری بات سنی نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں، مکمل اثاثے دکھاؤ اپنے۔"

لڑکی نے بے بسی سے کندھے جھٹک دیے۔ میرا شعور کسی نچلی سطح پر واقف تھا کہ کیا ہونے والا ہے لیکن درحقیقت میرے شعور کو اس کا ادراک نہیں تھا۔ میں اس ہرن کی طرح حواس باختہ تھا جس کے سامنے اچانک ہی شیر آ کھڑا ہُوا ہو۔

پھر نہ چاہتے ہوئے بھی میں ٹکٹکی باندھے لڑکی کو دیکھتا رہا۔ بلاشبہ وہ بے مثال حُسن کی مالک تھی۔

"دیکھا تم نے۔ یہ ایسی ہے کہ آدمی سانس لینا بھی بھول جائے..." فیلڈز نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "اب کیا کہتے ہو تم؟"

میں اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اس شخص میں کوئی بات تھی جو مجھے خوف زدہ کر رہی تھی۔ "نہیں مسٹر فیلڈز، آپ کا شکریہ...!" میں نے دروازے کو ٹٹولا۔ بالآخر دروازے کا لٹو مجھے مل گیا۔ "مجھے اب جانا ہے۔ میں جمنازیم کے لیے لیٹ ہو رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے لڑکے..." فیلڈز نے دانت نکالے۔ "تمھاری مرضی۔ لیکن یاد رکھنا، میری پیش کش ہمیشہ قائم رہے گی۔ جب بھی ارادہ بدلے، آجانا۔"

"شکریہ مسٹر فیلڈز!" میں نے کہا اور لڑکی کو دیکھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ بیس ڈالر فی گھنٹا بھاری معاوضہ ہے لیکن عزتِ نفس کے بدلے ہرگز نہیں۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "گڈ بائی، مس رونی۔"

لڑکی کا چہرہ اچانک انگارہ ہوگیا۔ اس نے اپنا لباس اٹھایا اور کمرے کی طرف لپکی جہاں سے وہ آئی تھی۔

"گڈ بائی، مسٹر فیلڈز۔" میں نے کہا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔

میں باہر نکلا اور اپنے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔ پھر میں نے دوڑ لگا دی۔ میں پلک جھپکتے میں وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ایسٹ اینڈ کے علاقے کی گندگی سے میں چڑتا تھا۔ لیکن اس خوب صورت کمرے میں جو گندگی میں نے دیکھی تھی، اس کے سامنے ایسٹ سائیڈ کی مجموعی گندگی بھی ہیچ تھی۔

باہر گندی سڑک بھی اب مجھے صاف ستھری لگ رہی تھی!

جمنازیم کی طرف بڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ یہ میکس فیلڈز والا معاملہ ختم نہیں ہُوا ہے، اسے ابھی آگے بڑھنا ہے۔

میں اپنے کارنر میں واپس آیا تو میری ٹانگوں میں اکڑن تھی۔ گدی اور گردن دُکھ رہی تھی۔ آہستگی سے میں اپنے اسٹول پر ڈھیر ہوگیا۔ آگے جھکتے ہوئے میں نے مُنہ کھولا اور گہری سانس لی۔

زیپ میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور گیلے تولیے سے میری پیشانی دبانے لگا۔ مسٹر اسپرٹزر میرے پہلوؤں کی مالش کر رہے تھے۔

زیپ نے مجھے غور سے دیکھا۔ "تم ٹھیک تو ہو ڈینی؟"

میں نے سر کو جنبش دی۔ وہ جنبش بھی اذیت کا سبب تھی۔ میں بولنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اپنا اسٹیمنا بچا کر رکھنا تھا۔ کہیں کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی۔ یہ فائٹ تو مجھے بہت آسانی سے جیتنی تھی۔ اور یہ بات، یہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ اخبارات میں لکھا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ دوسرے راؤنڈ میں جیت جاؤں گا۔ لیکن پہلے دو راؤنڈ میں تو میں اپنے حریف کو ایک اچھا گھونسا بھی نہیں مار سکا تھا۔

"یہ ٹھیک تو ہے نا مسٹر اسپرٹزر؟" زیپ نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

اسپرٹزر کا لہجہ خشک تھا۔ اس نے میرے دماغ میں جمع ہوتی دُھند کو چیر ڈالا۔ "ٹھیک تو ہے لیکن شاید اخبار زیادہ پڑھتا ہے۔ اخباروں میں شائع ہونے والی تعریف اس کے دماغ خراب کر رہی ہے۔"

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا، اور یہ بھی سمجھ گیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ سچ تھا کہ میرے بارے میں جو کچھ اخباروں میں چھپا تھا، میں نے اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا تھا۔ سامنے مخالف کارنر میں پاسکو پُرسکون بیٹھا تھا۔ اس کی سانسیں ہموار تھیں اور چہرے پر اعتماد تھا۔ جب کہ میری صورتِ حال برعکس تھی۔

گھنٹی بجی اور میں اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ میں تھرکتا ہُوا رنگ کے وسط کی طرف بڑھا۔ پاسکو پُراعتماد انداز میں میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں چہرے کے اس تاثر کو خوب پہچانتا ہے۔ یہ تاثر اس وقت میرے چہرے کی زینت ہوتا تھا جب مجھے یقین ہوتا تھا کہ میرا حریف ختم ہو چکا ہے۔ میں فائٹ جیت چکا ہوں۔ صرف رسمی کارروائی پوری کرنی ہے۔

میرے وجود میں غصہ ابلنے لگا۔ آج یہ تاثر میرے حریف کے چہرے پر میرا مُنہ چڑا رہا ہے۔ یہ تو میرا حق تھا، اس کا نہیں۔

میں نے پوری قوت سے اپنا رائٹ آزمایا۔ لیکن جواباً میری پسلیوں میں آگ سی بھر گئی۔ میرا وار خالی گیا تھا اور پاسکو کو میری پسلیوں پر وار کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ، جو چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھے، نیچے آگئے۔ اسی لمحے میرے چہرے پر جیسے ہتھوڑا سا لگا۔

میں نے ذہن کو صاف کرنے کے لیے سر جھٹکا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا رہا تھا جیسے سامنے دہکتا ہُوا سورج ہو۔

"پانچ... ایک آواز تیرتی ہوئی میری سماعت کی طرف آئی۔

میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ ریفری کا ہاتھ اوپر جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ایک اور عدد پکارنے کے لیے متحرک ہو رہے تھے۔

مجھے حیرت ہوئی۔ یہ میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل کیوں بیٹھا ہُوا ہوں؟ میں گرا تو نہیں تھا۔ میں نے نیچے دیکھا۔ کینوس گواہی دے رہا تھا کہ میں گرا ہوں اور یہ گنتی بھی میرے لیے ہو رہی ہے۔

"چھ..."

مجھے جھٹکا سا لگا۔ میں ناک آؤٹ ہونے والا ہوں! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔

میں کھڑا ہُوا۔ ریفری نے میرے گلووز کو اپنی شرٹ پر مل کر صاف کیا۔ مجمع دہاڑ رہا تھا لیکن وہ شور ہمیشہ سے مختلف تھا۔ آج وہ میرا نام نہیں پکار رہے تھے۔ وہ پاسکو کو بڑھاوا دے رہے تھے کہ وہ مجھے ختم کر دے۔

میں پاسکو سے لپٹ گیا۔ اس کا جسم پسینے میں نہایا ہُوا تھا۔ مجھے چند لمحوں کی مہلت درکار تھی۔ وہ لپٹنے ہی میں حاصل ہوسکتی تھی۔

ریفری نے ہمیں علاحدہ کیا۔

میری کمر پر پھر اذیت کا پٹاخا پھوٹا، پھر دوسرے پہلو میں درد ناچنے لگا۔ پاسکو کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے تھرک رہا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے گلووز میری طرف لپک رہے تھے، مجھے اُدھیڑ رہے تھے۔ مجھے کسی طرح ان سے بچنا ہوگا۔ وہ تو مجھے ربن کی طرح بکھیر رہے ہیں۔ میں نے بے بسی سے اپنے کارنر کی طرف دیکھا۔

زیپ کی پھیلی ہوئی، خوف زدہ آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔

زندگی کے چند اور گھونٹ چکھنے کے لیے
اگلے شمارے کا انتظار کیجیے

پہلی ملاقات

کیولے گوسوامی / زاہد حسن

ایک مصنف کو ملنے والے کسی شناسا کا فسانہ
مصنف اُسے پہچاننے سے قاصر تھا...
اور شناسا کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی

یہ پہلا موقع نہ تھا لیکن اس بار بس پر بیٹھتے ہی اس نے میرے کندھے پر ہاتھ دھرا۔ میں حیران رہ گیا۔ اک پل کے لیے میری آواز کھو گئی۔ لیکن اس کی طرف دیکھ کر زبردستی مسکرانا پڑا۔

وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا، جیسے اس کے قدم میری چھاتی پر پڑ رہے ہوں۔ لیکن اس کی عزت کی خاطر میں کچھ بول نہ سکا۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد وہ کہنے لگا۔

''کہیں باہر گئے ہوئے تھے؟''

''نہیں تو!'' دراصل اس غیر ضروری گفتگو کے لیے میں تیار نہ تھا۔

''اچھا لکھنے میں مصروف رہے ہوگے؟ آج کل کیا لکھ رہے ہو؟''

میں کچھ لکھنے سے معذور تھا۔ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں نے کہا۔ ''کچھ خاص تو نہیں لکھا، گھر کی کچھ مصروفیات ایسی ہیں لکھنا ہی نہیں ہوتا۔'' مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ نامعلوم وہ بھی میرا نام جانتا تھا کہ نہیں؟ لیکن اس کا برتاؤ تو ایسا تھا جیسے برسوں سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ اس سے کب اور کہاں پہلی ملاقات ہوئی تھی، سوچ سوچ کے میں پریشان ہو رہا تھا۔ پریشانی ختم کرنے کے لیے میں سگریٹ پینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کے اور اس شام اس کے ساتھ ایک طویل ہمراہی کے پیشِ نظر میں نے اس خواہش کو دبا لیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ میں کھسیانا سا ہو گیا۔ حالاں کہ میں جانتا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی جگہ جا رہے تھے۔ وہ کچھ دیر پہلے تلاشِ گم شدہ میں سے کچھ نام پڑھ رہا تھا، اس لیے میں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

''وہ سالا ہے بڑا...'' اس نے ایک اور ادیب کا نام لے کر کہا۔ ''یا تو وہ امیر ادیباؤں کے ہجر میں رہتا ہے یا پھر نقادوں کی جوتیاں چاٹتا پھرتا ہے...'' پھر اس نے بہت زیادہ بلغم تھوکتے ہوئے کہا۔ ''ہے کہ نہیں چھوٹا پن؟ پھر بھی اپنے آپ کو ادیب کہلانے کا شوق ہے۔ ان سے تو دلال ایمان دار ہوتے ہیں۔'' وہ مجھ سے میرا پتا جاننا چاہتا تھا۔ لیکن جب میں نے زیادہ لفٹ نہیں کروائی تو اس نے بات بدل دی۔

''آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا ہوں، جو سوچتے زیادہ ہیں اور لکھتے کم ہیں۔ نہیں تو ایسے شعبے میں فقرہ باز زیادہ ہوتے ہیں۔''

میرے لیے یہ سب ناقابلِ برداشت تھا۔ میں نے سوچا، اس کے ساتھ مل کر بیٹھنا کسی عذاب سے کم نہیں۔ لیکن ایسا ہُوا نہیں۔ کیوں کہ ہم دونوں دیر سے پہنچے تھے۔ اس لیے ایک نکڑ میں دو کرسیاں ہی خالی تھیں۔ اس نے بیٹھتے ہی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ساتھ والی کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ لگاتار کچھ نہ کچھ بول رہا تھا، دھیان بانٹنے کے لیے نہ تو میں تقریب میں پوری دل چسپی لے سکا اور نہ ہی اس مہاشے کی طرف پوری توجہ دے سکا۔ اتنا ضرور معلوم ہُوا کہ یہ حضرت تقریب کے اسٹیج پر بیٹھے ہر آدمی کے بارے میں گفتگو فرما رہے تھے اور ان کی آواز بھی خاصی اونچی تھی، اس لیے میری حالت قابلِ رحم تھی۔

''دیکھا آپ نے وزیرِ صحت نے اپنی تقریر میں کیا فرمایا؟ خوش راب پیتے ہیں۔ درجنوں بچے پیدا کرتے ہیں اور نس بندی عوام کے لیے ہے۔''

نظامت کرنے والے کے اعلان سے پتا چلا کہ باہر لان میں چائے کا بندوبست ہے۔ سوچا، چائے پینے کے دوران میں دوستوں سے کچھ گپ شپ کر لوں گا، کچھ ہلکا ہو جاؤں گا، سگریٹ سلگا کے ایک لمبا کش لیا۔ اچھا لگا۔ میں چائے کی میز کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں، وہ مہاشے میرے پاس کھڑے ہو کر پلیٹ میں بہت سی برفی مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔ میرے ہوش اُڑ گئے۔

ادب میں ہم چاہے پیچھے رہ جائیں لیکن ایسے موقعوں پر کھانے پینے میں کبھی پیچھے نہیں رہتے۔ اس بار میں اس کی مسکراہٹ سہار نہیں پایا اور سوچا کہ چپ چاپ مڑ جاؤں۔ آج کی شام کا اہتمام مجھے اپنے لیے کچھ اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جانے کیسے میرا ارادہ بھانپ گیا۔ اس نے ایک گرم جوش سلام کے ساتھ ایک دوست کو بلایا۔ میں نے سوچا، ''بلائی'' کہ اس تقریب میں اس کا جاننے والا کوئی دوسرا بھی موجود تھا۔ لیکن وہ دوست بھی چہرے پر سوالیہ نشان لیے آئے۔ اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ہندی کے عظیم ادیب ہیں۔'' میں ندامت سے سکڑ گیا، رسمی طور پر ہاتھ ملایا۔ اس دوست نے اس کی کروائی پہچان ٹھیک سمجھتے ہوئے مجھے جھک کر سلام کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہ تو ہندی سے واقف تھے اور نہ پہچان کرانے والے سے۔ دو ایک منٹ کی گفتگو نہیں ہوئی تو وہ ڈھیروں سلام کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

''سالا بہت بڑا فراڈ ہے...!'' اس نے میسنی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''پہلے اس نے ایمرجنسی کے حق میں کتاب لکھی، پھر اس کے [illegible] کتابیں امریکا میں چھپیں۔ بہت پیسا کمایا۔ آج کل [illegible] ہے۔''

[illegible] کے بارے میں پہلے کچھ نہیں جانتا تھا، اس لیے خاموش [illegible] اس طرح [illegible] ناٹک اس نے ایک دو اور دوستوں کے ساتھ [illegible] میں حیران تھا کہ آج کی شام وہ مجھے ہندی کا ایک عظیم ادیب [illegible] ثابت کرنا چاہتا ہے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر کی طرف کھینچ [illegible] ''اب میں پوری طرح اس کے قبضے میں تھا۔ ''ایسے ماحول [illegible] اب بہت کم اور شخیاں زیادہ بگھارتے ہیں۔'' میں کیا کہتا۔

''آپ کی وی بھی تو نوکری کرتی ہے نا؟'' اس نے [illegible] کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں کرتی ہے۔'' اس کے سوال سے میں بالکل محتاط ہو گیا۔ [illegible] ہو جاؤ گے؟''

پہلے میں نے اسے غور سے دیکھا۔ آخر کہیں یہ ہی آئی ڈی کا بندہ تو نہیں؟ انکم ٹیکس والے کتابوں کی رائلٹی کا پتا لگا رہے ہوں؟ اس سے پہلے کہ میں کسی فیصلے پر پہنچوں یا کچھ بولوں، اس نے بولا۔ ''سگریٹ نہیں پلاؤ گے؟'' میں نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ لیکن پھر ہاتھ باہر نکال لیا۔ یہ پیکٹ میری جیب میں تھا۔ جب سے سگریٹ کی قیمتیں بڑھی ہیں، میں سگریٹ کو ہاتھ لگا کر ہی اپنی طلب مٹا لیتا ہوں۔

سوچا کہ پنواڑی سے سستی سگریٹ خرید کے اسے ٹال دوں۔ پھر ایک سگریٹ جلا کے اس مہمان سے محبت کے ساتھ اجازت لوں گا۔ میرے دکان سے مڑنے سے پہلے ہی وہ پان منہ میں ٹھونس چکا تھا۔ اس کے برانڈ کے سگریٹ کا پیکٹ بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ سوچا کہ یہ سگریٹ سلگا کے ایک مجھے دے گا اور پھر پیکٹ واپس کر دے گا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، ایک سگریٹ سلگا نے کے بعد باقی پیکٹ اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں نے تو اپنا برانڈ لے لیا ہے۔ آپ کون سا پیتے ہیں؟ ضرور آپ کی پسند اونچی ہوگی؟''

اب میں پنواڑی کے سامنے شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس کے ساتھ دوستی کا ڈھونگ رچاتے ہوئے میں نے ایک پیکٹ اور خریدا۔ جیب میں پڑا اکلوتا بیس کا نوٹ نکالا اور پنواڑی کے حوالے کر دیا۔ ''دونوں کے پیسے کاٹوں؟'' پنواڑی بولا۔

''ہاں ہاں۔'' میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ بولا۔ جیسے نوٹ اسی نے دیا ہو۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ کیا پتا بیس کے نوٹ میں سے پنواڑی کچھ واپس کرے۔ لیکن جب اس نے منہ پھیر کر دوسرے گاہکوں کو نپٹانا شروع کر دیا تو میں نے سوچا، نوٹ شہید ہو گیا۔

میں بجلی کے کھمبوں کو گنتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے چلنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''یار، کبھی کبھی ملتے رہا کرو۔ تم کافی ہاؤس پر بھی کئی دنوں سے نہیں آئے۔''

میں سوچتا جا رہا تھا کہ اس کے ساتھ پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ لیکن کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

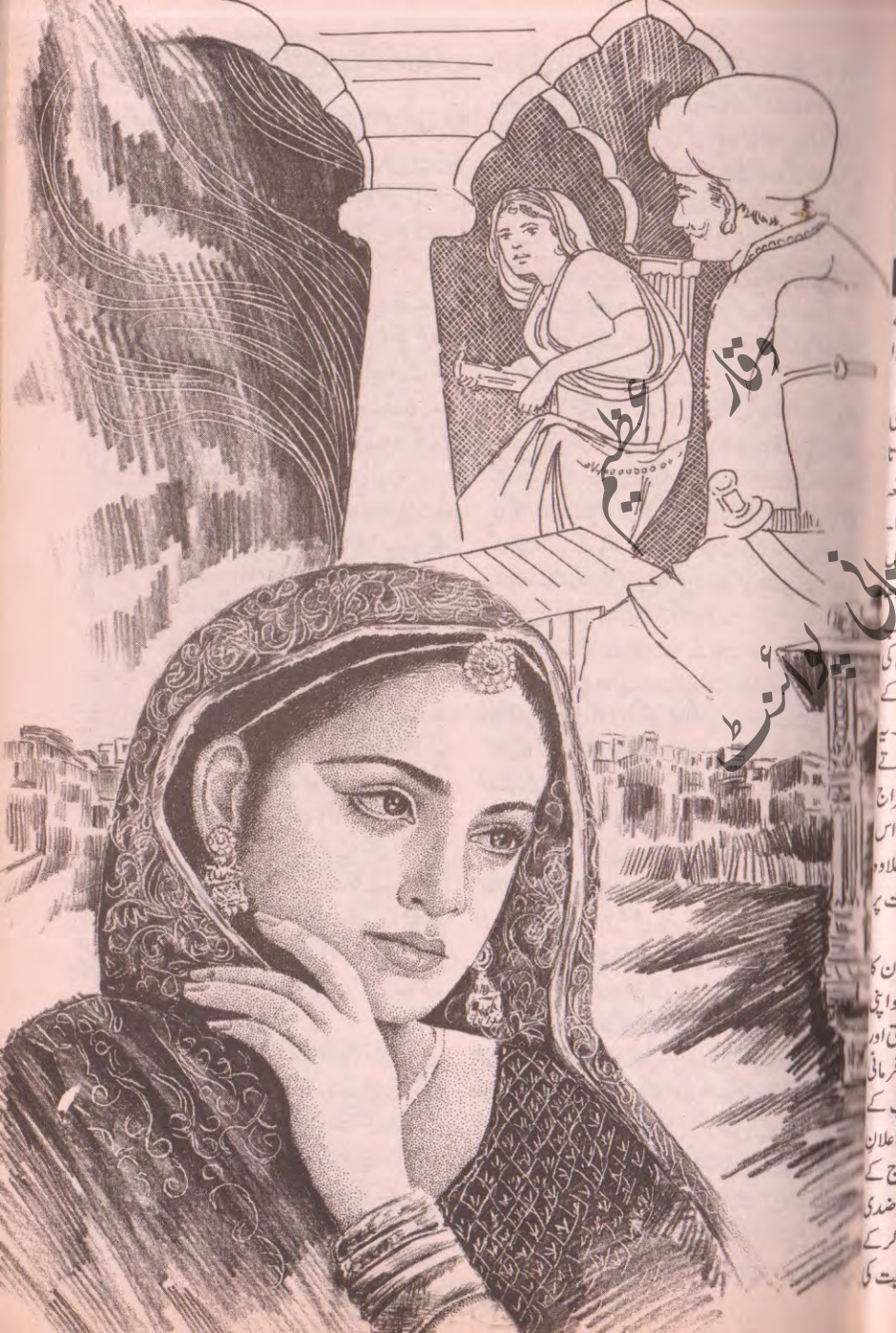

ماضی کے بیش بہا خزانے سے یادوں کا انتخاب

جہاں گیر کی بیٹی

گھنے جنگل میں راہ بھٹک جانے والے ایک شکاری کی سرگردانی
یکایک اُسے اُمید کی کرن دکھائی دی... قریب پہنچنے پر عقدہ کھلا کہ اُمید کی
اُس کرن میں ایک گوہرِ نایاب کی تابانی بھی شامل ہے

مُغل فرماں روا، جہانگیر کے عہد سے ایک ماجرا پرور قصہ

دھرتی کے سینے پر دور دور تک پھیلے سرسبز پودوں اور ہرے بھرے درختوں پر بھرپور جوانی آئی ہوئی تھی۔ سبزے کے پس منظر میں نظر آنے والے وندھیاچل کے پہاڑ دور سے یوں لگ رہے تھے جیسے بدمست ہاتھیوں کا غول قطار در قطار چلا جا رہا ہو۔ سورج اپنی رُوپہلی کرنوں کے بازو پھیلائے گویا نہایت محبت سے اس سبزہ زار اور پہاڑوں کو زندگی کا امرت پلا رہا تھا۔

اس دل فریب موسم میں شہنشاہ جہاں گیر اپنے شکاری مصاحبوں کے قافلے کے ساتھ جنگل میں شکار کے لیے ڈیرا ڈالے پڑا تھا۔ موسم کی بھی جوانی کے دن تھے اور مغلیہ سلطنت بھی اپنے جوبن پر تھی۔ جہاں گیر کی حُسن شناس آنکھوں میں ہر حسین شے کو پہچاننے، اس کو سراہنے اور اسے پرکھنے کا خمار ہلکورے لیتا رہتا۔ ساتھ ہی اس کی جوان رگوں میں شکار کا شوق بھی موجزن تھا۔

شکار کھیلنے کے ارادے سے وہ جب بھی اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوتا تو اس کے پورے وجود کی کیفیت میں ایک عجیب سی تبدیلی آجاتی تھی۔ ایسے میں وہ شہنشاہ نہ رہتا بلکہ صرف ایک شکاری نظر آتا۔ اس کے چہرے کے تاثرات، اس کی چال ڈھال سب کچھ ہی بدل جاتا تھا۔

یہ 1617ء کا سال تھا۔ شہنشاہ جہاں گیر کے شکاری قافلے میں ماہر ترین نشانے باز اور بہترین شکاری موجود تھے۔ لیکن جہاں گیر اپنا شکار اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ شکار کا تعاقب کرتے ہوئے وہ جنگل کے اندر اکیلا ہی بے خوف و خطر بہت دُور دُور تک چلا جاتا تھا اور اس کے تمام شکاری مصاحب اس کی تلاش میں پیچھے پیچھے بھاگتے رہتے تھے۔ اس لیے کہ اپنے بادشاہ کی سلامتی اور اس کی حفاظت ان کا فرض تھا۔

صبح کے سورج کی نرم نرم کرنوں نے پڑاؤ والوں کو گدگدانا شروع کیا اور خیموں میں شکار کی تیاریوں نے انگڑائی لینا شروع کر دی۔

اپنی چھولداری میں ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد جہاں گیر آج کے شکار کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے دھیرے دھیرے ٹہل رہا تھا۔ چھولداری کے باہر اس کا برق رفتار گھوڑا تیار کھڑا تھا۔

جہاں گیر ایک جذباتی اور دھونی شخص تھا۔ جب اس پر کسی چیز کی دُھن سوار ہو جاتی تھی تو وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اس کی اسی ضدّی طبیعت کی وجہ سے ایک بار ایسا واقعہ پیش آچکا تھا جس نے ہندوستان کی قسمت کو ہی ڈگمگا دیا تھا۔ اس وقت وہ اکبرِ اعظم کا اکلوتا بیٹا تھا اور بڑی منت مرادوں کے بعد ہندوستان کے تخت کے وارث کی حیثیت سے راجپوت بائی کے بطن سے پیدا ہُوا تھا۔ شاہی محل میں پرورش پا کر جب ہندوستان کے تخت کا یہ وارث، شہزادہ سلیم جوان ہُوا تو اس کی ضدّی طبیعت اور عاشق مزاج کے جوہر کھلنے لگے۔ شراب کے شوق اور حُسن کی رنگینیوں میں شہزادے کے قدم بہکنے لگے۔ یہ دیکھ کر اکبرِ اعظم کو ہندوستان کے تخت کے پائے بھی لرزتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ یوں کہ انھی دنوں عاشق مزاج شہزادہ ایک کافر ادا حسینہ کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو گیا تھا۔ اس وقت جوش جوانی پورے شباب پر تھا اور اسے اس حسینہ کے علاوہ اور کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ ضدی تھا اس لیے ہر قیمت پر اپنی محبوبہ کو حاصل کر کے محل کی زینت بنانا چاہتا تھا۔

لیکن اکبر اعظم کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ ہندوستان کا ہونے والا بادشاہ ایک معمولی اور بے نام و نشاں عورت کو اپنی ملکہ بنائے۔ شہنشاہ اکبر کے تیور بدل گئے۔ لاڈ پیار کی جگہ سختی اور غصّے نے لے لی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ضدی شہزادہ سلیم نافرمانی اور بغاوت پر اُتر آیا۔ اس نے اکبرِ اعظم یعنی اپنے باپ کے احکامات رد کر دیے اور باقاعدہ اکبرِ اعظم کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اپنی محبت کو پانے کے لیے اس نے شاہی فوج کے سامنے اپنے مورچے کھڑے کر دیے تھے۔ عاشق مزاج ضدی شہزادہ نور الدین محمد سلیم اب جہاں گیر کا لقب اختیار کر کے شہنشاہ جہاں گیر بن گیا تھا۔ اس کے دل میں پیار و محبت کی

مٹھاس آغاز جوانی سے ہی موجود تھی جو اپنا رس گھول گھول کر اُس کا مستقبل رقم کرتی رہی۔

گھوڑے کی ہنہناہٹ سُن کر جہاں گیر کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس کے ٹہلتے ہوئے قدم یکا یک ہی رُک گئے اور پھر وہ تیزی سے لپکتا ہُوا چھولداری سے باہر نکل گیا۔ اس کے مصاحبوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ شہنشاہ جہاں گیر اچانک ہی کیوں باہر نکل گیا؟

چھولداری سے باہر آکر جہاں گیر نے شکار پر جانے کے لیے تیار کھڑے گھوڑے پر ایک نظر ڈالی اور پھر وہ چوکنا نظروں سے آس پاس پھیلی ہوئی خودرو جھاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے سامنے والی جھاڑیوں کے درمیان میں ایک ہرنی کی چمک دار آنکھیں جھانکتی ہوئی نظر آئیں۔ دوسرے ہی پل وہ اُچھل کر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔

گھوڑے کی ہنہناہٹ اور اس کے سُموں کی آہٹ پا کر ہرنی اندر کی جانب بھاگی۔ اب آگے آگے ہرنی تھی اور اس کے پیچھے جہاں گیر کا گھوڑا تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ اس کی ٹاپوں کی آواز جنگل کے سکوت میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی گونج رہی تھی۔

جہاں گیر کے قافلے میں موجود شکاری اور دیگر خدمت گار بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار اس کے پیچھے دوڑ پڑے تھے۔ انھیں اپنے بادشاہ سلامت کے یوں اچانک چل دینے پر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ کیوں کہ شکار کے موقع پر ان کے ساتھ اکثر ایسا ہوجاتا تھا... جہاں گیر انھیں بتائے بغیر ہی اچانک ہی جنگل میں نکل پڑتا تھا اور انھیں اس کے پیچھے بھاگنا پڑتا تھا۔

ہرنی اپنی آڑی ترچھی چال سے اس طرح اُچھل اُچھل کر بھاگ رہی تھی جیسے اپنے پیچھے پڑی ہوئی موت کو فریب دے کر وہ اس کی پہنچ سے دُور نکل جانا چاہتی ہو۔ مگر جہاں گیر کا شکاری گھوڑا بھی کچھ کم نہیں تھا۔ ہرنی اور گھوڑے کا فاصلہ بھی کم ہوجاتا تو کبھی بڑھ جاتا۔ آگے پیچھے دوڑنے کا یہ کھیل جنگل کے اندر کافی دیر تک جاری رہا۔

جوں جوں جہاں گیر کا گھوڑا آگے بڑھتا جاتا تھا، توں توں جنگل زیادہ سے زیادہ گھنا ہوتا جارہا تھا۔ جب جہاں گیر کی نظر اپنے گھوڑے کی گردن پر پڑی جو پسینے سے بھیگی ہوئی تھی، تب اسے گرمی کا احساس ہُوا اور اسے پتا چلا کہ سورج سر پر آگیا ہے اور وہ اکیلا ہی جنگل کے اندر بہت دُور تک چلا آیا ہے۔

ہرنی نے سچ مچ ہی اسے فریب دے دیا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے میں کام یاب ہوگئی تھی۔ وہ اب دُور دُور تک بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ جہاں گیر کو اب یقین ہوگیا تھا کہ شکار اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور اس کی تلاش میں اور آگے جانا لاحاصل ہے۔ پسینے سے خود اس کا لباس بھی بھیگ گیا تھا۔ جہاں گیر ان جانے راستے پر آکر راہ بھٹک چکا تھا۔ گرمی شدید تھی اور پیاس سے اس کا حلق سوکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے؟ اسے معلوم تھا کہ اس کے خدمت گار اسے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ کھانے پینے کی چیزیں اور پانی کی مشکیں سب اُن کے ساتھ ہوں گی۔ لیکن وہ کب تک اسے ڈھونڈ پائیں گے اور کب تک اس کی اور اس کے گھوڑے کی پیاس بجھے گی، اس کا اسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

شکار کا خیال اس کے دماغ سے نکل گیا تھا اور اب وہ صرف اپنی پیاس کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ پسینے سے بھیگے ہوئے کپڑے اس کے جسم سے چپک گئے تھے۔ گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ میں تھی مگر اس کی پکڑ اس قدر ڈھیلی پڑ گئی تھی جیسے اس کے ہاتھ میں طاقت ہی نہ ہو۔ وہ کہاں جانے کے بارے میں سوچ تو رہا تھا لیکن اسے کس سمت سے نکلنا جانا چاہیے، اس کا اُسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔

اس نے دھیرے دھیرے آگے جانے کا ہی فیصلہ کرلیا۔ کیوں کہ اپنے پیچھے وہ ایک بہت لمبا راستہ طے کرکے یہاں تک پہنچا تھا۔ ہرنی کی آڑی ترچھی چھلانگوں کے تعاقب میں اسے سمتوں کا بھی پتا نہیں چلا تھا، اس لیے اس نے پیچھے کی طرف لوٹنے کے بجائے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ آگے شاید جنگل کا کوئی کنارا ہو جس سے وہ باہر نکل جائے گا۔

گھنے بے ترتیب درختوں کے جھنڈ اور پھیلی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان سے اس کا گھوڑا آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ اس دوران میں اسے کئی جنگلی جانور دکھائی دیے جن میں ہرن، جنگلی بکرے اور نیل گائے وغیرہ شامل تھے۔ لیکن اب اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ ان کے شکار کے لیے اپنا تیر اور تلوار استعمال کرسکتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان جانوروں کی طرف دیکھے بغیر ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ کافی دیر بعد اسے جنگل کا اندھیرا دُور ہوتا دکھائی دیا۔ گھنے درختوں کا سلسلہ کم ہوتا گیا تو سورج کی کرنیں نیچے تک آکر چمکنے لگی تھیں۔ درختوں کے ایک بہت بڑے جھنڈ کے پیچھے سے جب اس کا گھوڑا باہر نکلا تو جہاں گیر کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ اس کے سامنے اس وقت ایک کھلا میدان تھا اور اس میدان کے دوسرے کنارے پر ایک چھوٹا سا جھونپڑا نظر آرہا تھا۔ اس جھونپڑے کو دیکھ کر جہاں گیر کو

اگر وہ سچ مچ کوئی جھونپڑا ہے تو یقیناً اس میں کوئی رہتا بھی ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے فوراً ہی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دوسرے ہی پل وہ جھونپڑے کے سامنے پہنچ گیا۔ جھونپڑے کے باہر برآمدے میں ایک بارہ تیرہ برس کی لڑکی مٹی کے لیپے ہوئے فرش پر بیٹھی جنگلی پھولوں کی مالا بنا رہی تھی۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر لڑکی کے ہاتھ رُک گئے اور وہ گھڑسوار کی جانب دیکھنے لگی۔

جنگل کی کسی معصوم سی شہزادی جیسی اس لڑکی کو دیکھ کر شہنشاہ جہاں گیر کو بڑی حیرت ہوئی اور وہ اپنی پیاس اور تھکن بھول کر لڑکی کے معصوم چہرے کو دیکھتا رہا۔ ذرا دیر بعد وہ گھوڑے کی پیٹھ سے اترا اور آگے بڑھ کر بولا۔ ”بیٹی، میں بہت لمبا سفر طے کرکے راستہ بھٹک گیا ہوں اور اپنے ساتھیوں سے بھی بچھڑ گیا ہوں۔ مجھے اس وقت بہت سخت پیاس لگی ہوئی ہے۔ گرمی کی وجہ سے میرا گھوڑا بھی تھک گیا ہے اور وہ بھی پیاسا ہے، کیا تم ہمیں پانی پلا سکتی ہو؟“

”کیوں نہیں پلا سکتی...؟“ لڑکی نے کہا۔ یہ کہہ کر اُس نے مٹی پر رکھے ہوئے ایک تختے کو کھینچ کر آگے کردیا اور بولی۔ ”آپ یہاں بیٹھ جائیں، میں آپ کے لیے پانی لاتی ہوں اور پھر اپنی پانی پلاتی ہوں۔“

شہنشاہ جہاں گیر لکڑی کے اس چھوٹے سے تختے پر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد لڑکی ایک آب خورے میں پانی لے کر آگئی اور بولی۔ ”میری ماں نے کہا ہے کہ آپ تھوڑی دیر بیٹھیں، ذرا دیر میں روٹیاں تیار ہوجائیں گی، آپ کھانا کھا کر جائیے گا۔“

جہاں گیر نے مٹی کا پیالا مُنہ سے لگایا اور غٹا غٹ سارا پانی پی گیا۔ تب تک وہ لڑکی گھوڑے کے سامنے بھی پانی کا ڈول رکھ چکی تھی۔

بارہ تیرہ برس کی اس لڑکی کے چہرے پر فرشتوں جیسی معصومیت تھی اور آواز میں شہد جیسی مٹھاس۔ اسے دیکھ کر شہنشاہ جہاں گیر کا دل ایک عجیب سی خوشی کے احساس میں جھومنے لگا تھا۔ اس لڑکی کی آنکھوں کی پاکیزگی اور ہونٹوں پر بکھری ہوئی معصوم سی مسکراہٹ میں وہ کچھ اس طرح سے کھو گیا تھا کہ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس وقت وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر کہیں دُور ایک ویران اور اجنبی جگہ پر موجود ہے جہاں ایک جھونپڑے میں اس لڑکی اور اس کی ماں کے علاوہ کوئی بھی نہیں ہے۔

نیلی قالینوں پر چلنے والا اور نرم خوش بودار ہواؤں میں سانس لینے والا مغل شہنشاہ جہاں گیر اس وقت زمین پر لکڑی کے ایک تختے پر بیٹھا، اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ چاروں طرف جنگل، جھاڑیوں اور ایک کھلے ہوئے میدان کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ دُور دُور تک انسانوں کی کوئی بستی نظر نہیں آرہی تھی۔ اور جہاں گیر سوچ رہا تھا کہ اس ویران بیابان میں یہ دونوں ماں بیٹی کس طرح اکیلی رہ رہی ہوں گی؟ آخر ایسی کون سی مجبوری ہوگی جس نے ان دونوں کو ایسی سنسان جگہ پر لا پھینکا ہے؟

اتنے میں ایک ادھیڑ عمر عورت، ایک تھالی میں جو کی گرم گرم دو روٹیاں اور چٹنی لے کر نمودار ہوئی۔ جہاں گیر کی سوچ کا سلسلہ رُک گیا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر عورت کو سلام کیا۔ لڑکی نے بتایا۔ ”اجنبی مسافر... یہ میری ماں ہے۔“

”آپ بیٹھ جائیں اور تھوڑا بہت کھا کر کچھ دیر آرام کرلیں۔ تھکن دُور ہوجائے گی تو پھر چلے جائیے گا۔“ لڑکی کی ماں نے دھیمے لہجے میں کہا تو جہاں گیر دوبارہ اس تختے پر بیٹھ گیا۔ لڑکی کی ماں نے تھالی اس کے سامنے رکھ دی۔

جس کے محل کے شاہی دسترخوان پر دنیا بھر کے تازہ موسمی پھل، خشک میوے، انواع و اقسام کے مہنگے، لذیذ ترین اور انتہائی پُرتکلف کھانوں کے علاوہ خوش بو دار اور راحت بخش

ٹیلی فون

جرڈ ڈ جیسن نامی ایک عورت نے 45 سال تک اخبار لانے والے لڑکے کو ہر روز فون کیا۔ کبھی کبھی تو ایک دن میں اس نے 12 فون کیے۔ 1973ء میں اس عورت کے کتے نے اخبار والے لڑکے کو کاٹ لیا۔ اس کے بعد سے یہ عورت فون کرنے لگی کہ تم جھوٹے ہو۔ میرے کتے نے تمھیں نہیں کاٹا۔ کبھی کبھی تو رات میں دو بجے وہ اس لڑکے کو فون کر ڈالتی۔ لڑکے نے عدالت میں بتایا کہ کتے کے کاٹنے کی رپورٹ پولیس میں درج کرانے کے بعد اس عورت کے فون ایک لاکھ بار مل چکے ہیں ہر بار یہ عورت ایک ہی بات کہتی ہے۔ اس عورت پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس سے ہرجانہ بھی وصول کیا گیا لیکن پھر بھی اس نے فون کرنا نہ چھوڑا۔ آخری بار جج نے کہا کہ تمھاری عمر بہت ہوگئی ہے۔ اب اگر جیل گئیں تو مر جاؤ گی۔ اس پر عورت نے لڑکے کی طرف گھوم کر، ہوا میں فرضی فون نمبر ملانے شروع کردیے اور اس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کچا چبا جائے گی۔

سیف الرحمن کی عنایت

مشروبات کا ایک بازار سا سجا رہتا تھا، وہی مغل شہنشاہ جہاں گیر اس وقت ایک غریب کے خستہ جھونپڑے کے برآمدے میں ایک ٹوٹے پھوٹے تختے پر بیٹھا جو کی روٹی اور چٹنی کھا رہا تھا۔

بارہ تیرہ سال کی وہ لڑکی ذرا فاصلے پر بیٹھی اسے روٹی کھاتے دیکھ رہی تھی۔ یکا یک اس کی نظر جہاں گیر کے داہنے ہاتھ کی اُنگلی پر پڑی۔ موٹی اور بھاری انگوٹھی پر لگا ہُوا ہیرا چمک رہا تھا۔ لڑکی ذرا دیر تک انگوٹھی اور اس کے چمک دار ہیرے کو دیکھتی رہی۔ پھر یکا یک ہی اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہوگئی۔ جہاں گیر اس کی طرف سے بے خبر، سر جھکائے کھانے میں مصروف تھا۔ وہ لڑکی اٹھ کر اندر گئی پھر ذرا دیر بعد ہی وہ ایک کاپی اور پنسل لیے آئی اور دوبارہ اسی جگہ بیٹھ گئی۔

دونوں روٹیاں کھا لینے کے بعد جہاں گیر نے مٹی کا کٹورا اٹھا کر پانی پیا۔ لڑکی کی ماں نے آگے بڑھ کر اس کے آگے سے تھالی اٹھائی اور بولی۔ ”یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ ہمارے یہاں آئے ہیں۔ مگر ہم بہت ہی غریب لوگ ہیں۔ اتنے غریب کہ اپنے مہمان کے سامنے جو کی روٹی اور پانی کے سوا کچھ رکھ ہی نہیں سکتے۔ پھر بھی اگر ہماری خدمت میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو ہمیں معاف کر دیجیے گا۔“

”خاتون۔ معافی مانگ کر آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں...“ جہاں گیر نے کہا۔ ”معافی تو مجھے مانگنی چاہیے تھی کہ میں اچانک آپ کے گھر آ گیا اور میری وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔“

”تکلیف کیسی؟ ہمیں تو خوشی ہوئی ہے کہ بہت دنوں بعد ہمارے گھر کوئی مہمان آیا ہے...“ یہ کہہ کر وہ عورت ذرا رُکی پھر بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مگر افسوس ہے کہ ہم اپنے مہمان کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے۔“

”خاتون۔ آپ نے جو کچھ کیا ہے، وہ میرے لیے ایک نعمت سے کم نہیں ہے...“ جہاں گیر بولا ”ویسے میں ایک بن بلایا مہمان ہی تو ہوں، ایک معمولی سپاہی ہوں۔ ایک بھوکا پیاسا، راستے سے بھٹکا ہُوا مسافر ہوں جو راستہ بھول کر یہاں آ گیا ہے۔“

اِدھر لڑکی کی ماں اور جہاں گیر باتیں کر رہے تھے اور اُدھر وہ لڑکی ایک سفید کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ وقفے وقفے سے پھر وہ ایک ایک لکیر کو دھیان سے دیکھنے بھی لگتی تھی جیسے ان لکیروں میں کچھ ڈھونڈ رہی ہو۔

جہاں گیر نے گردن گھما کر اس کاغذ پر بکھری ہوئی آڑی ترچھی سی لکیروں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر اسے بچپن کا ایک کھیل سمجھ کر ہنس پڑا۔

”آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟“ لڑکی نے اسے ہنستے دیکھ کر بڑی معصومیت سے پوچھا۔

”نہیں، میں ہنس نہیں رہا...“ شہنشاہ جہاں گیر نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تو تمھارا کھیل دیکھ رہا ہوں۔“

”یہ کھیل نہیں ہے۔“ لڑکی نے فوراً ہی کہا۔

”تو پھر کیا ہے...؟“ جہاں گیر نے کہا۔ ”میں تو اسے کھیل ہی سمجھ رہا ہوں۔“

”جی نہیں۔“ یہ کہہ کر لڑکی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر اپنی ماں کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ ماں نے بھی مسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔

”تم نے بتایا نہیں بیٹی کہ کھیل نہیں ہے تو اور کیا ہے؟“ جہاں گیر نے اس کے سر پر انگلی مارتے ہوئے پوچھا۔

”ان لکیروں سے آدمی کی قسمت معلوم ہو جاتی ہے...“ لڑکی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ؟“

”اچھا... پھر تو یہ بڑا دل چسپ اور عجیب کھیل ہے...!“ جہاں گیر نے مسکرا کر کہا۔ ”ذرا مجھے بھی سمجھاؤ کہ یہ سب کیسے معلوم ہوتا ہے؟“

”اچھا... تو پھر لائیے اپنا ہاتھ!“ لڑکی نے اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا اور بولی۔ ”میں آپ کے ہاتھ کی لکیریں دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”اچھا... تو لو، دیکھ لو۔“ جہاں گیر کو بھی اب اس انوکھے کھیل میں مزہ آنے لگا تھا، اس لیے اس نے جھٹ اپنا ہاتھ لڑکی کے سامنے پھیلا دیا۔ لڑکی نے اپنے نرم نرم ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھاما پھر جھک کر اس کی ہتھیلی کی لکیروں کو دیکھنے لگی۔ جہاں گیر مسکراتا ہُوا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

ذرا دیر بعد لڑکی نے اپنا سر اٹھایا اور جہاں گیر کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی گمبھیر سے لہجے میں بولی۔ ”آپ کی قسمت بہت اچھی ہے اور آپ ایک بہادر آدمی ہیں...“

”اچھا! یہ تو بڑی اچھی بات ہے...“ جہاں گیر نے مسکرا کر کہا۔ ”ایک سپاہی کو بہادر تو ہونا ہی چاہیے... خیر، اب آگے بتاؤ۔“

”آگے یہ کہ میرا نصیب بھی بہت اچھا ہے کہ میں آپ کا ہاتھ دیکھ رہی ہوں۔“ لڑکی نے کہا تو شہنشاہ جہاں گیر بے ساختہ ہنس پڑا اور بولا۔ ”میری ہتھیلی کی لکیروں میں کیا تمھارا نصیب کی لکیریں بھی ہیں؟“

''بالکل ہیں...'' لڑکی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایک بات تو صاف ہے کہ آپ نے میری ماں سے جھوٹ بولا ہے۔''

''جھوٹ! کیسا جھوٹ؟'' جہاں گیر حیرت سے اُچھل پڑا۔ اور ٹھیک اسی وقت اس کی نظر اس کاغذ پر پڑی جس پر لڑکی نے آڑی ترچھی لکیریں بنا رکھی تھیں۔ اس نے ذرا دھیان سے دیکھا تو اسے اپنی زندگی کا شدید ترین جھٹکا لگا۔

اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگی تھیں۔ کیوں کہ لڑکی نے اس سفید کاغذ پر جو آڑی ترچھی لکیریں کھینچی تھیں وہ محض لکیریں نہیں تھیں۔ ان لکیروں کو وہ اب تک لڑکی کے بچپنے کا ایک کھیل سمجھ رہا تھا لیکن حقیقت میں لڑکی نے کاغذ پر ایک زائچہ بنا رکھا تھا اور علمِ نجوم کے مطابق جتنے بھی گروح... جتنے بھی ستارے ہوتے ہیں' وہ سب کے سب اس زائچے میں اپنی اپنی جگہ پر موجود نظر آرہے تھے۔

یکا یک شہنشاہ جہاں گیر کو ایک اور جھٹکا لگا۔ اس بار اسے جو خیال آیا تھا اس خیال نے اس کے پورے وجود پر کپکپاہٹ طاری کردی تھی۔ اسے لگنے لگا تھا کہ یہ ماں بیٹی یقیناً کوئی بدروح ہیں۔ ورنہ اس بیابان اور خوف ناک جنگل میں جہاں کسی انسان کا گزر تک ہونے کا امکان نظر نہیں آتا' ایسے بیابان میں ایک تنہا جھونپڑے میں ان دونوں کا رہنا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ بغیر کسی مرد کے سہارے کے یہ دونوں اس ویرانے میں رات دن کس طرح رہتی ہوں گی؟ ایسے خوف ناک ماحول میں رہنا تو کسی آدمی کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ یقیناً یہ بدروحیں ہی ہیں جن کے چنگل میں وہ خود ہی پھنسنے کے لیے آگیا ہے۔ یہ سب باتیں سوچتے سوچتے اچانک اس نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

وہ لڑکی بولی۔ ''کیوں؟ ڈر گئے نا آپ!'' یہ کہہ کر اُس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور رازدارانہ لہجے میں دھیرے سے بولی۔ ''ماں! میں نے چوری پکڑلی ہے۔ میں اصلیت جان گئی ہوں ماں۔''

''کیسی چوری؟ کیسی اصلیت؟'' شہنشاہ جہاں گیر بوکھلا گیا۔

''آپ نے میری ماں سے جھوٹ بولا تھا...'' لڑکی نے کہا اور ایک بار پھر اپنی ماں کو مخاطب کرکے بولی۔ ''ماں' میرا حساب بالکل درست ہے اور شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

''روپ متی...!'' ادھیڑ عمر عورت نے پہلی بار اپنی بیٹی کو اس کا نام لے کر مخاطب کیا ''اگر تم سمجھتی ہو کہ تمھارا حساب صحیح ہے تو جو کہنا ہے' وہ کہہ دو۔''

شہنشاہ جہاں گیر باری باری ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُن کی باتیں اُس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں جس کی وجہ سے یہ دونوں ماں بیٹی اب پہلے سے بھی زیادہ پُراسرار لگنے لگی تھیں۔

''روپ! آخر تم بتاتی کیوں نہیں...؟'' اس بار لڑکی کی ماں نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔ ''کیا کہتا ہے تمھارا حساب؟''

''میرا حساب کہتا ہے کہ یہ سپاہی نہیں ہیں۔'' لڑکی نے شرارت بھرے لہجے میں پھر وہی بات دہرائی اور پھر جہاں گیر کی جانب مڑ کر بولی ''اجنبی مسافر! آپ ہم سے کچھ چھپا رہے ہیں۔''

''نہیں... میں کچھ بھی چھپا نہیں رہا ہوں۔'' اس بار شہنشاہ جہاں گیر نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں ایک معمولی سپاہی ہوں۔ میں آگرے کا رہنے والا ہوں اور راستہ بھول کر اس طرف نکل آیا تھا۔ آپ کا جھونپڑا نظر آیا تو پانی پینے کے لیے یہاں آگیا۔''

لڑکی کی آنکھوں میں بے یقینی کی جھلک صاف نظر آرہی تھی۔ اور اس کے ہونٹوں پر نمودار ہونے والی پُراسرار مسکراہٹ بھی یہ بتا رہی تھی کہ اسے اب بھی اس کی بات کا یقین نہیں آیا ہے۔ شہنشاہ جہاں گیر نے اس کے چہرے کے تاثرات، اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی بے یقینی اور اس کی مسکراہٹ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ لڑکی کو اس کی بات کا اعتبار نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی وہ ایک کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''میری بات پر یقین کرو بیٹی... سچ مچ ایک معمولی سپاہی ہوں۔''

لڑکی کے ہونٹوں پر تھرکتی ہوئی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ پھر اچانک وہ دھماکا خیز لہجے میں بولی۔ ''آپ سپاہی نہیں ہیں۔ آپ بادشاہ سلامت ہیں۔ ہندوستان کی سلطنت کے مالک ہیں نے آپ کو پہچان لیا ہے...'' یہ کہہ کر اُس نے اپنی ماں کے مسکراتے ہوئے چہرے پر نظر ڈالی اور پوچھنے لگی۔ ''دیکھ لیا ماں! میرے حساب کتاب کا کمال؟''

ماں نے اسے دونوں بازوؤں میں بھر کر اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

جہاں گیر بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ لڑکی سے پوچھ بیٹھا۔ ''مگر تمھیں کیسے معلوم ہُوا؟'' اصل میں شہنشاہ جہاں گیر کو اب بھی یہی لگ رہا تھا کہ یہ دونوں ماں بیٹی بدروح ہی ہیں۔

روپ کی ماں ہنس رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک تو روپ بھی ہنستی رہی پھر اس نے بڑے دھیمے لہجے میں جہاں گیر سے کہا۔ ''میرا اور میرے پتا جی کا علم کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔''

شہنشاہ جہاں گیر حیران تو تھا ہی' اس نے ایک جھٹکے سے روپ کی ماں کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''کون ہیں آپ؟ آپ کی شناخت کیا ہے؟ کہاں سے آئی ہیں اور اس ویرانے میں کیوں رہ رہی ہیں؟''

''یہ تو ایک سوال نہیں ہے بادشاہ سلامت... بلکہ یہ تو بہت سارے سوالات ہیں۔'' کے بجائے روپ نے کہا۔ ''لیکن میں بتاتی ہوں۔ اصل میں ہم بہت غریب ہیں۔ میں نے علم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ میرے پتا جی پنڈت تھے۔ علوم میں انھیں سند حاصل تھی اور میں نے علم انھی سے سیکھا۔ اپنی موت سے پہلے انھوں نے مجھے کچھ باتیں بتائی تھیں۔ کچھ ایسی نشانیاں بتائی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہی چند نشانیاں ہیں جن کی مدد سے تم شہنشاہ جہاں گیر کو پہچان سکتی ہو۔''

''تو کیا تمھیں معلوم تھا کہ میں یہاں آنے والا ہوں؟'' جہاں گیر نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں' مجھے معلوم تھا'' روپ نے جواب دیا ''اور میں نے آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ کیوں کہ میرے پتا جی نے جو نشانیاں بتائی تھیں وہ سب آپ میں موجود ہیں۔''

بارہ تیرہ برس کی اس معصوم لڑکی کے چہرے پر فرشتوں جیسی پاکیزگی اور سچائی جیسی مٹھاس تھی۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر ٹکٹکی باندھے اس کے معصوم چہرے کو تکتا رہا۔ اس کا دل اندر ہی اندر ایک عجیب سی خوشی سے جھوم رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی جیسے اس نے گدڑی میں لعل دیکھ لیا ہو۔ جہاں گیر خوشیوں کے سمندر میں ڈوبتا چلا جارہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کی سلطنت میں کیسے کیسے انمول رتن کونوں کھدروں میں پڑے ہیں جن کی قدر کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ اسے ان ماں بیٹی کی حالت پر دکھ ہو رہا تھا۔ مگر یہ سوال بار بار اس کے ذہن میں آرہا تھا کہ اتنی قابلیت ہونے کے باوجود یہ عورت اپنی ہونہار بیٹی کو لے کر اس جنگل میں کیوں رہ رہی ہے؟ آخر ایسی کیا مجبوری ہوسکتی ہے؟ وہ سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔ آخر اپنی الجھن مٹانے کی غرض سے اس نے روپ کی ماں سے پوچھ لیا۔ ''میں جب سے یہاں آیا ہوں۔ اس وقت سے ہی یہ سوچ رہا ہوں کہ اس خوف ناک جنگل کے کنارے آپ لوگ کس طرح اور کیوں رہ رہے ہیں؟''

''پاپا نے چڑیا گھر میں بھی منافع کمایا۔ انھوں نے دوڑتے گھوڑوں پر شرط لگائی اور پچاس ڈالر جیت لیے۔''

''ہمیں یہاں آئے ہوئے بہت لمبا عرصہ نہیں ہُوا ہے۔'' روپ کی ماں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''روپ کے پتا جی ریاست بیجاپور کے شاہی شاستری اور نجومی تھے۔ اس کے علاوہ وہ وہاں کے بڑے پنڈت بھی تھے۔ ریاست کے تمام امور میں ان سے مشورہ کیا جاتا تھا اور ان کی رائے کو اہمیت بھی دی جاتی تھی۔ لیکن ایک بار ان کی منتری جی سے کچھ ان بن ہوگئی جس کی وجہ سے مہامنتری جی نے انھیں راج دربار سے نکلوا دیا۔ روپ کے پتا جی نے جب ان کی شکایت کرنا چاہی اور ان کے کالے کرتوت کا راز کھولنے کی کوشش کی تو مہامنتری جی ان کی اور ہماری جان کے دشمن ہوگئے اور ہمیں اپنی جان بچانے کے لیے اس ویرانے میں آکر پناہ لینا پڑی۔ تبھی سے ہم یہاں چھپ چھپا کر جینے پر مجبور ہیں۔''

''تو روپ کے پتا جی اب کہاں ہیں؟'' شہنشاہ جہاں گیر نے پوچھا۔

''یہاں آنے کے کچھ دنوں بعد وہ بیمار پڑ گئے'' روپ کی ماں بولتے بولتے روہانسی ہوگئی ''ہمارے پاس تو علاج کے لیے بھی پیسے نہیں تھے اور اس جگہ سے انھیں علاج کے لیے بیجاپور لے جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مہامنتری کے غنڈے کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ ہم ماں بیٹی جنگلی جڑی بوٹیوں سے ان کا علاج کرتے رہے مگر وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہے۔''

"پھر...؟" شہنشاہ جہاں گیر نے ذرا رُک کر پوچھا۔ "ان کی ارتھی...؟" لیکن جواب دینے سے پہلے روپ کی ماں نے ساڑھی کے آنچل میں اپنا چہرہ چھپالیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ روپ نے اپنی ماں کو روتے دیکھا تو اس سے لپٹ کر خود بھی رونے لگی۔ ذرا دیر بعد ماں نے کہا۔ "ان کی ارتھی کو کوئی کندھا دینے والا بھی نہیں تھا۔ بڑی افسوس ناک موت تھی ان کی۔ ایک گم نام موت۔ ہم دونوں ماں بیٹی نے مل کر کسی طرح اس جھونپڑے کے پیچھے ان کی آخری رسم ادا کردی تھی۔" اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگی تھی۔

شہنشاہ جہاں گیر کے جبڑے تنگ ہوگئے۔ غصّے سے اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اور کچھ پوچھتا، روپ کی ماں ہی بول پڑی۔

"اس جھونپڑے میں آنے کے بعد ہی انھوں نے اپنا علم روپ کے سینے میں منتقل کرنا شروع کردیا تھا۔ میری یہ بچی بہت ہوش یار ہے اور اس کے پتا جی کو یہ بات معلوم تھی کہ ان کے بعد ان کی بیٹی روپ ہی ان کے علم و فن کو زندہ رکھ سکے گی۔ تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے علمِ نجوم میں اسے اتنا ماہر بنادیا کہ یہ ان سے ٹکر لینے لگی۔ مرنے سے صرف چند روز پہلے ہی باپ بیٹی نے دہلی کے تخت پر موجود بادشاہ سلامت کی کنڈلی (زائچہ) بنائی تھی۔ دونوں نے بادشاہ سلامت کی اپنے حساب سے الگ الگ کنڈلی بنائی تھی لیکن دونوں کے حساب کتاب اور اندازے ایک ہی تھے۔ یہ دیکھ کر اس کے پتا جی کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ پھر انھوں نے ایک دن روپ کو بتایا کہ اسی سال میں ایک دن شہنشاہ جہاں گیر یہاں اس جھونپڑے میں آئیں گے اور تمھارے مہمان ہوں گے۔ ان کے داہنے ہاتھ کی تیسری انگلی میں یاقوتی ہیرے کی ایک انگوٹھی ہوگی۔ وہ ایک گھوڑے پر اکیلے ہی آئیں گے۔ ان کے جسم پر سپاہیوں جیسا لباس ہوگا۔ کندھے پر تیر کمان اور کمر میں اٹکے ہوئے خنجر کی وجہ سے وہ شکاری لگ رہے ہوں گے۔ اور یہ سب نشانیاں اس وقت آپ کے پاس موجود ہیں... جنھیں دیکھ کر روپ آپ کو پہچان گئی تھی۔ اور جب وہ آپ کے لیے پانی لینے اندر گئی تھی تو اس وقت اس نے مجھے یہ بات بتادی تھی۔"

"اوہ!" جہاں گیر کے ہونٹ سکڑ گئے اس کی حیرت کی کوئی حد ہی نہیں تھی۔ روپ کی ماں سے یہ ساری بات سُن کر وہ دنگ رہ گیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ یہ علم اتنا عظیم اور طاقت ور بھی ہوسکتا ہے کہ آدمی آنے والے واقعات کے بارے میں پہلے سے جان جائے؟

جہاں گیر سوچتا رہا اور روپ کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا جی چاہا کہ بارہ تیرہ برس کی اس معصوم لڑکی کی گود میں اپنا سر رکھ کر سو جائے۔ وہ روپ کے چہرے کو دیکھ کر اس قدر جذباتی ہوگیا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے روپ کی ماں کی طرف دیکھا اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میری ایک درخواست ہے۔ اگر اسے رد نہ کیا جائے تو کہوں؟"

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں بادشاہ سلامت!" روپ کی ماں نے کہا "آپ تو شہنشاہ ہیں، اَن داتا ہیں۔ آپ درخواست مت کریں، حکم دیں... آپ کا حکم بجالانا ہمارا فرض ہے۔"

"اس وقت نہ تو میں بادشاہ ہوں نہ شہنشاہ... اس لیے آپ کو کوئی حکم نہیں دے سکتا۔" جہاں گیر نے دھیمے لہجے میں کہا "اس وقت تو میں ایک مہمان ہوں اور میں نے سنا ہے کہ ہندو برہمن اپنے گھر آئے ہوئے مہمان کو کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے۔"

"یہ درست ہے عالم پناہ!" یہ کہہ کر روپ کی ماں نے جھکا دیا اور بولی۔ "مگر مہمان کی مانگ ایک بیٹی کی غریب ماں کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے کو دیکھ کر ہی ہونی چاہیے تاکہ اسے اپنے مہمان کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہوگا..." یہ کہہ کر جہاں گیر نے ایک نظر روپ پر ڈالی اور پھر سے بولا۔ "جب میں یہاں آیا تھا تو اس وقت روپ میری انگوٹھی کو دیکھ رہی تھی اور تب میں نے سوچا تھا کہ شاید یہ انگوٹھی اسے بہت پسند ہے۔ چوں کہ اس انگوٹھی پر اس کی پہلی نظر پڑی تھی اس لیے یہ انگوٹھی میں اسے دینا چاہتا ہوں..." یہ کہہ کر جہاں گیر نے اپنی انگوٹھی اتار کر روپ کی انگلی میں پہنادی اور پھر بولا۔ "اور روپ آج سے میری بیٹی ہے۔"

شہنشاہ جہاں گیر نے اپنے بازو پھیلائے تو روپ بھاگ کر اس کے بازوؤں میں سمٹ گئی اور پھر اس نے جہاں گیر کا ہاتھ چوم کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ ماں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ تبھی روپ نے اپنی ماں کو یاد دلاتے ہوئے کہا۔ "تم بھول گئی ہو ماں، پتا جی نے ان کی ایک امانت تمھارے پاس رکھوائی تھی۔"

"ارے ہاں!" روپ کی ماں چونک پڑی اور اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ "میں تو بھول ہی گئی تھی۔ عالم پناہ، روپ کے پتا جی نے آپ کے لیے ایک امانت رکھوائی تھی اور انھوں

نے کہا تھا کہ جب آپ آجائیں تو اسے آپ کے حوالے کردیا جائے۔ میں ابھی اسے لے کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر روپ کی ماں جھونپڑے کے اندر چلی گئی۔

روپ کی ماں کے اندر جاتے ہی تقریباً درجن بھر گھڑ سوار اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے جہاں گیر کے گھوڑے کو جھونپڑے کے باہر کھڑا دیکھ لیا تھا۔ اس لیے وہ بھاگتے ہوئے جھونپڑے تک پہنچ گئے۔ انھوں نے اپنے بادشاہ سلامت کی تلاش میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ انھوں نے جہاں گیر کو فوراً پہچان لیا تھا۔

شہنشاہ جہاں گیر کو اپنے سامنے صحیح سلامت دیکھ کر اُن کی جان میں جان آئی اور وہ اپنے گھوڑوں سے اتر کر ادب سے کھڑے ہوگئے۔

اسی وقت روپ کی ماں ایک چھوٹی سی صندوقچی لے کر باہر آئی۔ لیکن اپنے جھونپڑے کے باہر اتنے سارے گھوڑوں کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ روپ نے اس کی گھبراہٹ دُور کرتے ہوئے اسے بتایا کہ یہ سب سلامت کے سپاہی ہیں اور انھیں تلاش کرتے ہوئے

اس چھوٹی سی صندوقچی پر ایک چھوٹا سا تالا لگا ہُوا روپ کی ماں نے فرش پر شہنشاہ جہاں گیر کے سامنے ہی صندوقچی کے اندر ایک کاغذ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ ماں نے اس تہہ کیے ہوئے کاغذ کو نکال کر شہنشاہ کی حادیا اور ایک جانب کھڑی ہوگئی۔

جہاں گیر نے اس کاغذ کو کھولا اور اس پر لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا تھا...

"میں شہنشاہ عالم پناہ جہاں گیر کی خدمت میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مجھے یہ خط لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ میں نے سنا تھا کہ ایک دن عالم پناہ اتفاق سے راستہ بھٹک کر اس جھونپڑے میں آجائیں گے۔ لیکن میری بدنصیبی ہے کہ میں آپ کے درشن نہیں کرسکوں گا۔ کیوں کہ موت مجھے کچھ ہی مہلت ہی نہیں دے گی اور اس کا افسوس مجھے دم تک رہے گا۔

میری حقیقت تو میری بیوی اور بیٹی روپ متی کے ذریعے معلوم ہوگئی ہوگی۔ میرے بعد یہ دونوں بالکل ہی بے سہارا ہوگئی ہیں۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ آپ ان پر ضرور رحم کریں گے۔ اور جب میرا یہ خط آپ کے ہاتھ میں آئے گا، اس کے ٹھیک ایک سال بعد بیجاپور کی ریاست سے آپ کی جنگ ہوگی اور اس جنگ میں آپ کو فتح ہوگی۔ یہ میری پیش گوئی ہے جو حرف بہ حرف سچ ثابت ہوگی۔ اس کا مجھے پورا یقین ہے۔"

یہ خط روپ کے پتا جی کا لکھا ہُوا تھا۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد شہنشاہ جہاں گیر نے روپ کو اپنے سینے لگایا اور پھر شہنشاہ جہاں گیر نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اب وہ صرف شہنشاہ جہاں گیر ہی نہیں تھا بلکہ ایک معصوم سی لڑکی روپ متی کا باپ بھی تھا۔

اس نے فوراً ہی اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ روپ متی اور اس کی ماں کو عزت و احترام سے شاہی محل میں پہنچایا جائے۔

باپ بننے کے بعد شہنشاہ جہاں گیر نے روپ متی کا اسی طرح خیال رکھا جس طرح ایک باپ اپنی بیٹی کا رکھتا ہے۔ روپ متی اور اس کی ماں کو شہنشاہ جہاں گیر کی سرپرستی میں جب ایک سال کا عرصہ گزر گیا تو ایک جنگ کی ابتدا ہوئی اور پھر جلد ہی بیجاپور شہنشاہ جہاں گیر کے قبضے میں آگیا۔ اس فتح پر سب سے زیادہ خوشی روپ متی کو ہوئی تھی کیوں کہ اس فتح کی پیش گوئی اس کے پتا جی نے کی تھی۔

دن گزرتے گئے اور دھیرے دھیرے روپ متی جوان ہوکر شادی کے قابل ہوگئی اور اس وقت بھی شہنشاہ جہاں گیر اپنے فرائض میں غافل نہیں رہا تھا۔ اس نے خود روپ متی کی ماں کی مدد سے برہمن خاندان کے ایک شریف اور پڑھے لکھے لڑکے سے روپ متی کی شادی کرادی۔ برہمن ذات کے جو رسم و رواج تھے وہ سارے رسم و رواج اس نے پورے کیے اور ہر موقع پر وہ خود وہاں موجود رہا۔ باپ کے گھر سے بیٹی کو جو جہیز دیا جاتا ہے، اس نے ویسا جہیز دیا جو ایک بادشاہ اپنی شہزادی بیٹی کو دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی بیٹی روپ متی کو ایک جاگیر بھی دی تھی جس کی آمدنی تقریباً پندرہ لاکھ روپے تھی۔

شادی کی رسومات کی ادائیگی کے بعد جب روپ متی کی رخصتی کا وقت آیا تو وہ خود اپنی بیٹی کو ڈولی میں بٹھانے محل کے صدر دروازے تک آیا تھا۔ جہاں دیر تک روپ متی اس کے سینے سے لگ کر روتی رہی اور جہاں گیر اس کے سر پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ پھیرتا رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے جیسے اس کی سگی بیٹی اس کے گھر سے رخصت ہورہی ہو!

سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ

بابر زماں، ایک سرپھرے، سرزور نوجوان کا فسانۂ زندگی

وہ تحریر جس کا انتظار کیا جاتا رہے

شہر گیا کے ہونہار لڑکے بابر زماں خاں نے بدھ مت کے سالانہ میلے میں ایک بوڑھے شخص کے ساتھ حُسن و جمال میں یک تا و یگانہ وہ نو عمر دیکھی تھی۔ اُس پری پیکر کی صورت بابر کی آنکھوں میں نقش ہوگئی۔ تعاقب کرتے کرتے وہ اُن کی کٹیا تک پہنچ گیا۔ لڑکی کا نام کورا تھا، بوڑھے بھکشو کا اُنھیں۔ رفتہ رفتہ کورا اور بابر ایسے گھل مِل گئے جیسے اُن میں کبھی کوئی دُوری ہی نہ تھی۔ اُنھیں بھی بابر سے خاصا مانوس ہوگیا تھا۔ کورا کے جہانی باپ تبت کے جانگ قبیلے کا سردار تھا۔ باپ کی موت کے بعد چچا نے سرداری غصب کرلی۔ وہ کورا کو راستے سے ہٹا دینا چاہتا تھا تاکہ اتالیق جہاں دیدہ عالم اُنھیں خود کو داؤ پر لگا کر اُسے مقتل سے نکال لایا۔ قبیلے کے کچھ خفیہ نقشے اور مترک دستاویزیں بھی وہ ساتھ لایا تھا کے آدمی ہر طرف کورا کو تلاش کررہے تھے۔ کورا سے زیادہ اُنھیں مترک دستاویزوں کی جستجو تھی۔ جیسے ہی موقع ملتا، بابر بدھ بھکشو کا روپ روز وہ بہ اصرار اُنھیں اور کورا کو اپنے گھر لے آیا۔ بابر کے والد صفدر زماں خاں کا شمار شہر کے شرفا میں ہوتا تھا۔ وہ ایک بھرا پُرا گھر تھا۔ اماں کے علاوہ دو چھوٹے بھائی، اکبر، جہاں گیر، چار چھوٹی بہنیں، فہمیدہ، فرّخ، فریال اور فارہہ۔ سبھی نے اِن دو اجنبیوں کی پذیرائی کی۔ اُنھیں قیمتی تحائف پیش کیے۔ اِس واقعے کے چند روز بعد ایک رات کورا اچانک بابر کے گھر پہنچ گئی، بکھرے ہوئے بال، شکستہ لباس۔ اُس کہ جانگ قبیلے کے سرکش کھوجیوں نے آخر اُنھیں تلاش کرلیا۔ بوڑھا اُنھیں مزاحمت کرتے ہوئے مارا گیا۔ کورا بچتی بچاتی یہاں تک پہنچ گئی نوادر کی پوٹلی اور مترک کاغذات بھی بچا کے لائی تھی۔ بابر کے والد پولیس کو مطلع کرنا چاہتے تھے لیکن بابر کا یہ گوارا نہ ہوا۔ وہ کورا کو ساتھ لے کر سے گھر سے نکل گیا۔ دونوں چھپتے چھپاتے کلکتے جانے والی گاڑی میں سوار ہوگئے۔ ایک مہربان شخص مولوی محمد شفیق سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اپنے حجرے میں لے گئے۔ بابر نے اُنھیں کچھ اَور ہی کہانی سنائی تھی۔ اُسے خوف تھا کہ سچ کب تک چھپ سکتا ہے۔ چناں چہ ایک روز وہ سے بھی فرار ہوگئے۔ ہوٹل میں ٹھیر کے بابر نے ملازمت ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ وہ گھر سے کچھ رقم اور چاقو لے آیا تھا۔ صرف چاقو باقی رہ در بہ در ٹھوکریں کھانے کے بعد اُنھیں دوبارہ مولوی صاحب کے حجرے ہی میں پناہ ملی۔ بابر نے اِس بار پھر کچھ جھوٹ، کچھ سچ پر مشتمل ایک دا داستان اُنھیں سنائی۔ مولوی صاحب کا ارادہ تھا کہ اپنے کاموں سے نمٹ کے چند دن بعد وہ اُنھیں اپنے آبائی شہر لے جائیں گے۔ ایک شا اُن دونوں کی دل بستگی کے لیے اُنھیں دریا کی سیر کرانے لے گئے تھے کہ چند مسلح آدمیوں نے حملہ کردیا۔ بدنگا ہوں کو کورا مطلوب تھی۔ حملہ آ سے بابر کے گٹھے گٹھا ہوجانے کی وجہ سے مولوی صاحب کورا کو دُور رکھنے اور بھاگ جانے میں کام یاب رہے۔ بابر کو سات سال کی سزا ہو مولوی صاحب نے پھر اُس سے کوئی رابطہ کیا نہ اُس نے مناسب سمجھا۔ جیل میں کلکتے کا نامی گرامی اُستاد بنھل، بابر کی سرکش معصومیت اور چو سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں سے ایسا متاثر ہوا کہ ایک طرح سے وہ بابر کا مربی اور نگراں بن گیا۔ جیل میں اُستاد بنھل اور اُس کے شاگردوں آمد و رفت ایک معمول تھی۔ بنھل نہ ہوتا تو جیل میں اُس کے اڈّے کے کارندے بابر کا بہت خیال رکھتے۔ اُنھوں نے چاقو زنی کے کرتب لاٹھی کے گُر اور جسمی داؤ پیچ اُسے سکھائے۔ بنھل کی تحریک پر بابر نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور امتیازی نمبروں سے ایم اے کرلیا۔ بابر نے سا سال کے روز و شب گن گن کے کاٹے تھے۔ رہا ہو کر اُسے اپنے مشفق و محسن بنھل کے اڈّے پر پہنچنا چاہیے تھا، لیکن وہ کورا کی تلاش میں نکل کلکتے کے مدرسے میں مولوی شفیق سات سال سے نہیں پلٹے تھے۔ مولوی صاحب کے آبائی شہر میں بھی کسی کو اُن کا کوئی علم نہیں تھا۔ ہر طرف مایوس ہو کے بابر نے اپنے شہر گیا کا رُخ کیا۔ وہاں اُسے بتایا گیا کہ اُس کی ماں، بیٹے کے غم میں گھل گھل کر مرگئی۔ عرصہ ہوا، باپ، جائداد وغیرہ بیچ کے اور بچّوں کو ساتھ لے کے شہر سے چلے گئے ہیں۔ کسی کو اُن کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اب کلکتہ ہی بابر کی منزل ہوسکتی تھی جہاں بنھل اُس لیے بہت پریشان تھا۔ بابر کی آمد سے اڈّے پر بہار آگئی۔ بنھل نے زرّیں کو بھی باپ کے مانند شفقت دی جو راستے سے بابر کے ساتھ ہوگئی

خود وہ بھی ہمہ صفت تھی۔ ذرا سا سکون ملنے پر اُس کے جوہر کھلے۔ اڈّے پر سبھی بنجھل کے لاڈلے بابر کی خاطر میں لگے رہتے تھے، مگر سمتوں میں اپنی کورا کی آہٹیں کھوجتا رہتا تھا۔ زرّیں کی پتاسن کے بنجھل نے اڈّے کے چند خاص آدمیوں کو بابر اور زرّیں کے ساتھ فیض کیا۔ وہاں کے اڈّے کے اُستاد جامو اور اُس کے ساتھیوں کی اعانت سے زرّیں کی وسیع و عریض حویلی اور جاگیر اُس کے ستم شعار ا سے چھڑالی گئی۔ زرّیں نے اپنی ساری جائداد بابر کے نام لکھ دی اور بابر کے مسلسل انکار کے باوجود اُس نے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی بھی نہیں ابھی فیض آباد ٹھیرا ہُوا تھا۔ اُن دنوں شہر میں نیلم جان نامی مغنیہ کی بڑی دھوم تھی۔ ایک شام اُستاد جامو بابر کو نیلم جان کے بالا خانے آرائی کے لیے جب نیلم جان اندر سے برآمد ہوئی تو بابر کو سکتہ سا ہو گیا۔ دوسری طرف نیلم جان کی حالت بھی غیر ہو گئی۔ یکا یک کسی طرح وہ کھڑکی کی طرف لپکی اور دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر کود گئی۔ بابر دیوانہ وار زینے کی جانب دوڑ پڑا۔ چند ہی لمحوں میں نیلم جان بازار میں اُس کے زانوؤں پر دم توڑ دیا۔ یہ اُس کی بہن فہمیدہ تھی، اُس کی فمی۔ بابر اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا۔ تار ملتے ہی بنجھل بھی کلکتے سبھی بابر کی اٹک شوئی میں مصروف تھے، مگر اُس کی دیوانگی بڑھتی ہی گئی اور ایک رات کسی کو کچھ بتائے بغیر وہ حویلی سے نکل کھڑا ہُوا۔ اُ نیلم جان بنانے والی نایکا چمپا بائی کا سراغ لگانا تھا۔ تلاشِ بسیار کے بعد وہ اُسے آگرے میں کہیں مل پائی۔ چمپا بائی سے معلوم ہُوا کہ فہم سے لایا گیا تھا۔ چمپا بائی کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بابر کے منشا کے مطابق اُس کے ساتھ بمبئی کا سفر کرے۔ چمپا بائی پر نگاہ رکھنے فرسٹ کلاس میں سفر کرنا مناسب تھا۔ سفر کے دوران رات کو ایک ہم سفر پر قاتلانہ حملہ ہُوا۔ عین وقت پر بابر حملہ آور پر حاوی ہو گیا۔ وہ تعینات ایک بہت بڑا پولیس افسر راج کرشنا تھا۔ سو بابر کے لیے کرشنا کا التفات فراواں تھا۔ بمبئی پہنچ کے چمپا بائی کی نشاں دہی پر بابر خاندان کی تلاش شروع کر دی تھی اور آخر وہ اُس عمارت تک پہنچ گیا جہاں اُس کے باپ اور بہن بھائیوں کا قیام رہا تھا۔ ایک دردمند پڑوسی نے اُسے بتایا کہ فہمیدہ کی گم شدگی کے بعد اُس کے باپ پھر یہاں نہ رہ سکے۔ قریبی مراسم کے باجود اُنھوں نے پیپو مولوی کو کچھ نہیں تھا۔ بیش تر وہ گھر میں بند رہتے تھے۔ کتابوں کا ڈھیر لگا ہے، جب دیکھو، کسی نامعلوم زبان میں تحریر شدہ کاغذات پر جھکے خاکے کھینچ کاغذات ہو سکتے تھے جو کورا نسبت سے اپنے ساتھ لائی تھی۔ بابر کی ہمّت جواب دے گئی۔ کوئی گھر نہ پرسانِ حال۔ جدھر مُنہ اُ نہ کھانے کا ہوش نہ کپڑوں کا۔ اسی درماندگی اور دیوانگی کے عالم میں ایک دن کرشنا نے اُسے دیکھ لیا اور زبردستی اپنے بنگلے لے آیا۔ کرشنا کی طرح اُس کی خبر گیری کی۔ بابر نے اپنے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ اپنے بچھڑے ہوئے گھر والوں کی بازیابی کے لیے سرگر ایک پولیس افسر کے سامنے یہ حقیقت آشکارا کرنے میں اُسے جھجک ہوئی کہ وہ ایک طوائف کا بیٹا ہے اور اُس نے جیل میں ایم اے کیا ہے۔ اُس کی ذہانت دیکھ کے ایک معلّمہ کا انتظام کیا۔ بابر اُس نفیس طبع، خوش اندام جولین سے دھڑلے کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ چمپا بائی بھی و تھی۔ کچھ اپنی ندامت، کچھ بابر کی شکستگی سے وہ خود ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ وہ مستقل کرشنا کے ہاں رہنے لگی اور چمپا بائی سے نیک نفس چمپا بیگ فرض شناس کرشنا کے گھر آئے دن پولیس افسروں کے خفیہ اجلاس ہوتے رہتے تھے اور بابر کو سُن گن ملتی رہتی تھی۔ کرشنا ان دنوں کسی سخت دو چار ہے۔ ایک روز بابر کسی کو کچھ بتائے بغیر گھر سے چلا گیا اور بائی گلا کے بدنامِ زمانہ دادا کے آدمیوں سے اُلجھ پڑا۔ اُس کی زور آزمائی دادا نے اُسے اپنے پاڑے سے وابستہ کر لیا۔ دو ہفتوں تک بابر علاقے کے کالے مقامات اور آدمیوں کی معلومات جمع کرتا رہا پھر ایک را سے فرار ہو گیا۔ اُسی رات اُس کی نشاں دہی پر پولیس نے سارا علاقہ گھیرے میں لے لیا۔ دادا ساتھیوں سمیت جیل چلا گیا۔ اِس وا کرشنا پر پے در پے حملے ہوئے اور آخر بابر کی سپر بھی کام نہ آئی۔ کرشنا اپنی تمام جائداد، نقدی وغیرہ بابر کے نام کر گیا تھا، مگر بابر پر خون کرشنا جی کے قاتلوں تک رسائی کے لیے اُسے کسی مستقل پاڑے کی ضرورت تھی۔ مختصر عرصے میں چاقو آزمائی کے بل پر اُس نے کئی پاڑ کر لیے۔ شہر کے داداؤں میں اُس کی دھاک بیٹھ گئی۔ بابر کی دیوانگی سے خوف زدہ ہو کے چمپا بیگم نے کلکتے میں بنجھل کو مطلع کر دیا۔ بنجھل لیے پہلے ہی مضطرب تھا، فوراً بمبئی پہنچ گیا۔ بنجھل نے مزید پاڑے حاصل کرنے کے بجائے بمبئی کے ایک بڑے دادا پیرو کے پاس جا درخواست کی۔ پیرو ایک خوش وضع اور بہادر شخص تھا۔ اُس نے خندہ پیشانی سے اپنا پاڑا بنجھل کے حوالے کر دیا۔ پھر بنجھل کو کرشنا کے قا پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ بابر کے سینے کی آگ بجھی تو اُس نے کورا کی تلاش میں نکل جانا چاہا۔ بنجھل اُس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ دونوں ساتھ روانہ ہوئے اور شہر شہر بھٹکتے رہے۔ نہ مولوی صاحب ملے نہ بابر کے والد، البتہ حیدر آباد میں بابر کو اپنا چھوٹا بھائی جہاں گیر مل گیا۔ نوچندی میں اپنے گھر والوں سے بچھڑے کے بھوپال کے ایک جاگیر دار کے ہاں پہنچ گیا تھا، جہاں حیدر آباد کی مشہور مغنیہ خانم کی نظر کو بھا گیا جاگیر دار سے مانگ لائی اور بیٹے کی طرح نگہداشت کرتی رہی۔ خانم عام گانے والی نہیں تھی۔ اُس کی بزم آرائی ایک بڑے رئیس عالم محدود تھی۔ بنجھل نے جہاں گیر کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا تو خانم بہت دل گیر ہوئی۔ نواب عالم تاب کی شدید مزاحمت کے باوجو

ان کے ساتھ فیض آباد چلی گئی۔ خانم کی زیرِ تربیت نوعمرنٹ کھٹ سی لڑکی نیساں بھی اُن کے ہم راہ آئی تھی۔ زرّیں کی حویلی آباد ہو گئی۔
آباد کے قصبہ اور بابر پھر در در کی خاک چھانتے چل کھڑے ہوئے اور جیسلمیر شہر میں خدا خدا کر کے اُنھیں مولوی شفیق کا کچھ سُراغ
میں ایک شخص منیر علی کے پڑوسی رہ چکے تھے۔ منیر علی نے اُنھیں بتایا کہ جیسلمیر کے رنگیلے اور سرکش جاگیر دار رانا مہتاب تک کسی طرح
وہ مال کی خوش بُو پہنچ گئی تھی۔ اُس کا پیغام مسترد کر دینے کی گستاخی مولوی صاحب کو راس نہیں آئی۔ ایک رات وہ اور کورا پُراسرار
وہ گئے۔ منیر علی کا مہمان ہونے کی وجہ سے بنجھل اور بابر کے لیے براہِ راست رانا مہتاب کی مزاج پرسی کو جانا مناسب نہیں تھا۔ بنجھل
کو بلوایا اور گم شدگان کی بازیابی کے لیے رانا مہتاب کی حویلی روانہ کیا۔ معلوم ہُوا کہ رانا مہتاب کے ایک ملازم نے کورا اور مولوی
معصومیت اور سادگی پر ترس کھا کے اپنے آقا کا ہاتھ دراز ہونے سے پہلے اُنھیں فرار کرا دیا تھا۔ پیرو کو حویلی سے خالی ہاتھ لوٹنا اچھا نہیں
آئے وہ رانا مہتاب کی آنکھیں نکال لایا۔ اِس واقعے کے بعد منیر علی کا اب جیسلمیر میں عزّت و عافیت سے رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ
کا شانہ بنتے بنجھل انھیں پورے کنبے سمیت فی الفور فیض آباد لے آیا۔ کرشنا نے اپنی زندگی میں سارے ہندستان کی پولیس کو ایک
تھا کہ بابر کے والد کے حلیے کا کوئی شخص نظر آئے تو مطلع کیا جائے۔ فیض آباد میں بابر کو کرشنا کے دستِ راست ایس پی شکلا کا
کے والد جیسا ایک شخص آسام میں ملا ہے۔ بنجھل اور بابر فوراً کلکتے آ گئے اور بنجھل نے بمبئی سے پیرو اور اُس کے چند منتخب آدمی
گزار راستے عبور کرتے ہوئے بہت پہنچ گئے اور کورا کے دیس میں سفر کی ساری اذیتوں کا ازالہ ہو گیا۔ بدھ بھکشو کے روپ میں بابر
جاگ قبیلے کی خانقاہوں میں موجود تھے۔ انھوں نے کورا کے لائے ہوئے کاغذات کے اسرار دریافت کرنے میں ایک عمر صَرف کر دی
کاغذات میں صدیوں پرانے دفینوں کے نقشے بھی تھے۔ صفدر زماں آخر کار دفینے تک پہنچ گئے تھے، لیکن اِدھر
شدہ خزانہ خود اُن کے پاس پہنچ گیا۔ اپنے بیٹے بابر کو دیکھ کے اُن کی کمر سیدھی ہو گئی، تاہم وہ مدفون خزانے کے بغیر واپس جانے
تھے۔ سب نے اُن کا ساتھ دیا اور وہ تہ خانے چند روز میں کھود ڈالے جن کے لیے اکیلے صفدر زماں کو جانے کتنی مدّت لگ جاتی۔
اُن کے پاس زر و جواہر سے بھرے صندوق تھے۔ اِس دولت کا صحیح اندازہ کرنا مشکل تھا۔ واپسی کا سفر آسان نہیں تھا، جانگ قبیلے
بیٹیوں کی طرح اُن سے ملی تھی۔ بابر کو اپنے بچھڑے ہوئے بھائی بہنوں سے ملنے کے لیے جلد سے جلد بمبئی پہنچنے کی بے چینی تھی۔
لدے ہوئے صندوق زرّیں کی حویلی کے تہ خانے میں محفوظ کر کے وہ بمبئی روانہ ہوئے۔ راستے میں مراد آباد پڑتا تھا۔ بابر سے نہ
ہے، اس دوران مولوی صاحب اپنے شہر واپس آئے ہوں۔ مراد آباد اُترنا کسی قدر سُود مند ہی ہُوا۔ مسافر خانے میں درج تھا کہ کسی
خاتون کے ہم راہ مولوی صاحب اپنے شہر واپس آئے تھے اور اپنے مستقل پتے کے طور پر حیدر آباد کا پتا لکھوایا تھا۔ بابر کی عاجزی
گیا اور وہ بمبئی کے بجائے حیدر آباد پہنچ گئے۔ وہ ثروت یار نامی نواب کا گھر تھا۔ نواب نے بتایا کہ مولوی صاحب مستقل قیام کے لیے
آباد آنے کا کہہ گئے تھے لیکن ابھی تک اُن کا انتظار ہے۔ بابر دل گرفتہ وہاں سے لوٹا۔ بمبئی آ کے پھر یہ قافلہ ایک سہ منزلہ مکان کے
دلیر پر قدم رکھتے ہوئے بابر کا دل دھڑک رہا تھا۔ مدّتوں کے بچھڑے ہوئے بھائی بہن مولوی اکرم نامی ایک بزرگ کی نگرانی میں
تھے۔ وہ منظر سب کے لیے دیدنی تھا۔ فرخ، فریال، فارہہ اپنے کزیل بھائی کو جھُک جھُک کے دیکھتی تھیں اور آنسو بہاتی تھیں۔ چھوٹے
کا بھی یہی حال تھا۔ بمبئی میں پیرو کے غیاب میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ پیرو کے مرکزی پاڑے پر بھتا بھیجنے والے تین سرکش داداؤں نے
تھا۔ ایک رات پیرو اور اُس کا دستِ راست ماچھی گھر واپس جا رہے تھے کہ اُنھیں گولی مار دی گئی۔ پیرو بمبئی کا سب سے بڑا دادا تھا۔
پولیس حرکت میں آ گئی۔ اسپتال سے لاشیں لے کر بنجھل ماہم کے پاڑے پہنچا تو علاقے میں کہرام مچ گیا۔ پیرو کے جاں
قاتلوں کے سر اُتارنے کا عہد کیا تھا، مگر اُس کی نوبت نہیں آئی۔ ایک روز پیرو دادا کی پروردہ ماری نے صبح سویرے تھانے آ کے اپنے
اور اُس کے ساتھی کے قتل کا اعتراف کیا اور وجہ یہ بتائی کہ اُنھی دونوں نے اُس کے معنوی باپ پیرو کا قتل کیا تھا۔ پیرو کی موت کے چودہ
سارے افرادِ امرا کی بستی میں بابر کے والد کی خریدی ہوئی محل جیسی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ اُدھر حیدر آباد سے نواب ثروت کے خط نے بابر کو
کر دیا۔ نواب نے لکھا تھا کہ مولوی محمد شفیق حیدر آباد واپس آ گئے ہیں۔ بنجھل نے حیدر آباد روانگی کا اعلان کر دیا۔ اُس نے جمرو اور زورا کو

بھی ساتھ لے لیا تھا۔ حیدر آباد پہنچ کر اُنھوں نے ویکا جی ہوٹل میں قیام کیا اور سورج غروب ہونے کے بعد وہ نواب ثروت کی طرف روا
صرف بنھل اور بابر کوٹھی میں داخل ہوئے۔ نواب کی پذیرائی اندھیرے میں روشنی کے مترادف تھی۔ جھجکتے ہوئے آخر اُس نے مولوی صاحب کی حید
موجودگی کا اقرار کر لیا۔ یہ سن کے بابر کی حالت خفقانی سی ہوگئی۔ نواب نے یہ بتا کے اُسے اور آزمائش سے دوچار کیا کہ مولوی صاحب شہر سے
کی زمینوں والے مکان میں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ رات ہو چکی تھی۔ نواب نے دوسرے دن صبح روانگی کا ارادہ ظاہر کیا۔ بابر نے وہ رات
گزاری یا کانٹوں کے بستر پر۔ دوسرے دن صبح مقررہ وقت پر وہ نواب کے ہاں پہنچ گئے۔ جمرو اور زورا کو ہدایت کی گئی کہ وہ نواب کو
احساس دلائے بغیر موٹر میں پیچھے پیچھے چلتے رہیں۔ بابر اور بنھل کے سان وگمان میں نہیں تھا کہ نواب ثروت بنھل اور بابر کو ختم کرنے کی غر
یہاں لایا ہے۔ آدھی رات کو مسلح آدمیوں نے یلغار کی اور اُن دونوں کو گھیر لیا۔ نواب ثروت یار کو معلوم نہیں تھا کہ بنھل اور بابر کے دست و
کیسا زور ہے۔ وہ حملہ آوروں پر غالب آ گئے اور نواب اپنے خریدے ہوئے حملہ آوروں کی زد پر آ کے بُری طرح زخمی ہو گیا۔ بنھل اور با
شہر واپس لے آئے اور شکستہ حالت میں اُس کے خاندانی ڈاکٹر کے سپرد کر کے اپنے ہوٹل لوٹ آئے۔ تیسرے دن نواب اپنے آپ سے
دمِ واپسیں اُسے کچھ دیر کے لیے ہوش آیا تھا کہ اُس نے ڈاکٹر سے اعتراف کیا کہ اُسے اپنی بدطینتی کی سزا ملی ہے۔ اُسے یقین دلایا گیا
بابر زماں کی موت ہی کورا کے دل سے اُس کا نقش مٹا سکتی ہے، سو اُس نے یہ بہیمانہ طور اختیار کرنے کی ٹھانی۔ وہ کورا کو یہ ہر قیمت
کرنا چاہتا تھا۔ معمول کے مطابق تیسرے دن رات کو بنھل اور بابر نواب کی خیر خیریت لینے کے لیے ڈاکٹر کے گھر پہنچے تو وہاں سناٹا چھایا
نواب کی لاش اُس کے گھر لے جائی جا چکی تھی۔ نواب نے ڈاکٹر کو حیدر آباد میں مولوی صاحب کی قیام گاہ کا پتا بتا دیا تھا، مگر رات ہو چکی تھی اور
ہو رہی تھی، لیکن اُنھوں نے مولوی صاحب کے دروازے پر جا کے دَم لیا۔ مولوی صاحب وہاں سے جا چکے تھے۔ بنھل کی ہدایت پر زورا نے اب
کے گھر جا کے اُس کے ڈرائیور کو پکڑ لایا۔ اُس سے معلوم ہوا کہ بعد کو مولوی صاحب شکایت نہ کریں، انھیں بھی نواب ثروت کی شکست حا
اطلاع کر دینی چاہیے، یہی کچھ سوچ کر وہ از خود مولوی صاحب کے گھر گیا تھا۔ مولوی صاحب نے کرید کرید کے سارا واقعہ پوچھا۔ ڈرائیور
کے ساتھ جانے والے دو آدمیوں کا ذکر بھی اُن سے کیا تھا۔ اُسے تو قع تھی مولوی صاحب اپنے مربی نواب ثروت کی پُرسش کے لیے دوڑ
آئیں گے۔ وہ نہیں آئے۔ وہ آتے بھی کیسے۔ اُنھوں نے تو نواب کے ساتھ بابر اور بنھل کی موجودگی کی خبر سنتے ہی اسباب باندھ لیا ہو
اور بابر نگر یا سادات آ گئے اور ایک اوسط درجے کی حویلی کے دروازے پر دستک دی۔ حویلی کے مالک حافظ عبدالخالق کے بارے میں اُنھیں
ہوا تھا کہ وہ اور مولوی صاحب کبھی مراد آباد میں ساتھ پڑھاتے تھے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ بعد کو حافظ صاحب درس و تدریس ترک
مستقلاً اپنی زمینوں پر آ گئے۔ اِدھر اُدھر کی رسمی باتوں کے بعد بنھل نے دبی زبان میں اُن سے اپنی آمد کا مقصد بتایا تو حافظ صاحب کے چ
کا رنگ بدل گیا اور اُنھوں نے دوٹوک لفظوں میں مولوی صاحب کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیا، مگر بنھل اور بابر کی وحشت، اُن
دیکھ کے اُنھیں آخر زبان کھولنی پڑی اور وہ اپنے دوست مولوی شفیق کی وکالت کرنے لگے کہ بابر تو جیل چلے جانے کے بعد کورا سے عملاً دست
ہو چکا تھا۔ مولوی صاحب نے اُس کے لیے گھر بار، کاروبار سب کچھ ترک کر دیا، اِس لیے مولوی صاحب کو اختیار ہے، وہ کورا کے بارے
چاہیں، فیصلہ کریں۔ بابر نے کہا، اگر واقعی کورا اُس کی مدعی نہیں رہی ہے تو اُس کا بھی کوئی دعویٰ نہیں رہے گا۔ مولوی صاحب نے یہ کیوں کہ
کہ بابر سے ملنے کے بعد کورا اُن سے دُور ہو جائے گی۔ بابر کے دل سوز لہجے سے حافظ صاحب متأثر ہوئے۔ اُنھوں نے ایسا دل گرفتہ نو
نوجوان کہاں دیکھا ہوگا۔ اُنھوں نے اعتراف کیا کہ بیس پچیس دن پہلے مولوی صاحب نگر یا سادات آئے تھے اور حیدر آباد میں مستقل قیا
ارادے سے روانہ ہو گئے تھے۔ اُس کے بعد سے اُن کی کوئی خیر خبر نہیں۔ حافظ صاحب نے وعدہ کیا، مولوی صاحب کے نگر یا سادات آ
بابر کے بارے میں ضرور بات کریں گے۔ بنھل نے حافظ صاحب سے پوچھا کہ کسی دن ہم مولوی صاحب تک پہنچ گئے تو وہ کس طرح ہمارا
کر سکیں گے؟ وہ وقت پھر اُن کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ بابر اور بنھل اُسی رات وہاں سے چل پڑے۔ لیکن ابھی اور حادثے اُن کے منتظر تھے
پولیس کو مطلوب ہو گئے تھے۔ پولیس نے کوئی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے گو اُنھیں آزاد کر تھا، لیکن فیض آباد سے باہر جانے پر پابندی عائد کر دی
بیس بائیس روز بعد یہ پابندی کہیں ختم ہوئی، پھر حویلی کے مکینوں کو اُداس چھوڑ کے مولوی شفیق اور کورا کی تلاش میں وہ سفر پر روانہ ہو گئے۔
ابھی چالیس میل دُور تک آئی تھی اور اکبر پور جنکشن رکنے والی تھی کہ انجن کی خرابی سے جھٹکے لینے لگی۔ بہت سے مسافر زخمی ہو گئے۔ ہر طرف نفسی
کی حالت تھی۔ خوابیدہ بنھل کا سر بھی جھٹکوں سے ڈبے کی دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔ نئی گاڑی کی تبدیلی دوسرے دن صبح ہو سکی۔ بنھل نے بابر سے
چوٹ کی شدّت کا اظہار نہیں کیا تھا، لیکن اُس کی حالت بہ تدریج خراب ہوتی گئی اور سفر ملتوی کر کے اُنھیں پٹنا شہر رُکنا پڑا۔ پہلے ایک ہوٹل
اُنھوں نے کمرا لیا، پھر اسپتال کا رُخ کیا۔ اسپتال میں بنھل کی حالت اور خراب ہو گئی۔ صبح کپڑے تبدیل کرنے اور تار دینے کے لیے بابر ہوٹ

ہوٹل خالی تھا۔ وہاں ایک جیب کترے نے اُس کا بٹوا اُڑا لیا۔ بابر نے اُس کا تعاقب کر کے قریبی گلی میں دبوچ لیا۔ بٹوا واپس لینے میں وہ
[illegible] ہو گیا تھا کہ دو آدمی چاقو لہراتے ہوئے اُس کے راستے کی رکاوٹ بن گئے۔ اور اُن دونوں میں ایک کی نادانی سے بابر کے بجائے اُس
[illegible] ساتھی کی پسلی میں چاقو پیوست ہو گیا۔ بابر گلی سے نکل کے تانگے میں سوار ہو گیا تھا کہ اُسے ایک ہجوم دکھائی دیا۔ پولیس بھی ہجوم میں
[illegible] وہ اُس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تانگے سے کود کے بابر ایک گلی میں داخل ہو گیا اور گلیاں گلیاں گھومتے ہوئے آخر اُس نے ایک مکان پر
[illegible] دی۔ سرخ و سپید رنگ کے ایک خوش قامت شخص نے دروازہ کھولا۔ کھلے چاقو کے زور پر بابر اُسے دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔
[illegible] اُن سب سے اِس طرح گھر میں داخل ہونے کی معافی چاہی اور اپنا احوال بیان کیا۔ صاحب خانہ، اکبر علی خاں ایک وکیل، قانون کے
[illegible] روشن خیال اور آسودہ حال شخص تھے۔ اُنھوں نے بابر کی روداد پر کوئی شبہ نہیں کیا۔ گلی میں پولیس کا خطرہ ٹل جانے کے بعد بابر نے
[illegible] نکل جانا چاہا تو اکبر علی خاں نے اُسے جانے بھی نہیں دیا۔ وہ شہر کے اڈّا اُستاد میدا کی شہرہ پشتی سے اچھی طرح واقف تھے۔ بے شک اُس
[illegible] نکلنے کے بعد بابر کو راستے میں پولیس، یا میدا کے آدمی گھیر سکتے تھے۔ کوئی چارہ نہ دیکھ کے اُس نے سیدھے میدا اُستاد کے اڈّے پر
[illegible] کا ارادہ ظاہر کیا تو اکبر علی خاں نے بابر نے یہ اعلان کر کے سبھی کو حیران کیا کہ اڈّوں کی ریت کے مطابق وہ اڈّے کی چوکی حاصل کرنے آیا ہے،
[illegible] لازم ہے کہ چاقو حوالے کے سامنے آئے۔ موجود اُستاد دعوے دار کی سرکوبی کے بعد ہی چوکی پر قائم رہ سکتا ہے۔ اُستاد میدا کو بھی بابر کے
[illegible] چاقو پر اُس کی گرفت کا تخمینہ کرنے کے لیے کچھ وقت تو چاہیے تھا۔ اُس نے متعلّق غیر متعلّق باتوں میں یہ وقت لیا۔ اُدھر بابر اُسے مسلسل
[illegible] کرتا رہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ میدا مبارزت سے کترا رہا ہے۔ اُس کے دستِ راست عمر رسیدہ اُستاد نے ہوش مندی کی اور میدا کا چاقو بابر
[illegible] طرف اُچھال دیا۔ جواب میں بابر نے بھی چند لمحوں کی۔ اُس نے بھی اپنا چاقو میدا کی طرف پھینک دیا۔ چاقوؤں کی اِس تبدیلی سے مراد تھی کہ
[illegible] مبارزت ملتوی کی جاتی ہے۔ اپنے بیمار بھائی کی صحت یابی کے بعد بابر میدا سے زور آزمائی کر سکتا ہے، جو نتیجہ کچھ بھی ہو۔ بوڑھے اُستاد کی
[illegible] اِس سے اِدھر بابر کو مہلت مل گئی تھی، اُدھر میدا کی چوکی عارضی طور پر محفوظ ہو گئی تھی۔ اُسی رات، آخری پہر اسپتال کے دروازے پر دستک
[illegible] کرانے والا تھا۔ آنے والوں نے بابر کے بارے میں پوچھا۔ نرس ایمی نے ہوش مندی سے کام لیا اور دروازہ نہیں کھولا، اندر سے جواب دیا کہ
[illegible] موجود نہیں ہے۔ پھر یکا یک راہ داری میں بھاگتے ہوئے لوگوں کی چاپیں سنائی دیں اور سناٹا چھا جانے میں دیر بھی نہیں لگی۔ صبح
[illegible] معلوم ہوا کہ اُس کی تلاش میں کمرے کے دروازے پر دستک دینے والے لوگ اسپتال کے عملے کی بیداری پر بھاگ کھڑے ہوئے
[illegible] کے پاس ایک نوجوان ملازم انتھونی راہ میں رکاوٹ بن گیا اور اُن میں سے کسی ایک کو دبوچ لینے میں کام یاب ہو گیا تھا، لیکن
[illegible] اِس جرأت کی بھی دل ناک سزا ملی، وہ اپنی جان گنوا بیٹھا۔ نرس ایمی شاہد تھی کہ رات آنے والے لوگ کس کی تلاش میں آئے تھے۔ بابر کی
[illegible] پر اُس نے ڈاکٹر رائے کو اصل بات سے بے خبر رکھا۔ ایمی شاید ایسا نہ کرتی اگر بابر گذشتہ روز شہر میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات
[illegible] اُسے اعتماد میں نہ لیتا۔ اسپتال میں پولیس آ چکی تھی اور ہر ایک سے تفتیش کر رہی تھی۔ اُسی صبح ڈاکٹر رائے نے مژدہ سنایا کہ بنھل کے ہاں
[illegible] علامتیں نظر آ رہی ہیں، شاید آپریشن کی ضرورت نہ پڑے۔ دوپہر کو اُس نے اپنے تشفی آمیز بیان میں اضافہ کیا۔ اُس نے بتایا کہ بنھل کے
[illegible] کی جلد بری طرح متأثر ہوئی ہے، وہیں سوجن ہے اور سر کھولنے کی ضرورت نہیں۔ رات کو اکبر علی خاں کھانا لے [illegible] کچھ فراغت میں
[illegible] رات کو وہ بابر کے پاس ہی رُک جانا چاہتے تھے، لیکن گھر کہہ کے نہیں آئے تھے۔ رات گئے بابر نے اسپتال کے صدر دروازے پر اُنھیں
[illegible] اور تانگے کے اوجھل ہو جانے تک وہیں کھڑا رہا۔ صبح اکبر علی خاں کے بجائے نفن لانے اور واپس لے جانے والے لڑکے کی آمد پر بابر
[illegible] معلوم ہڑبڑا اڈّے سے اُس کی وابستگی، ہر وقت جیب میں چاقو کی موجودگی، اکبر علی خاں کے گھر میں چاقو کے زور پر داخلہ، شہر کے نامی
[illegible] اُستاد میدا کے اڈّے پر پہنچ کے چوکی کی دعوے داری۔ پولیس افسروں نے بابر کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اِسی دوران خلاف توقع
[illegible] کمرے میں آ کے مداخلت کی اور دلائل و شواہد سے پولیس کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ بابر کی گرفتاری کا کوئی جواز نہیں۔ یوں بھی
[illegible] بھائی کی نگرانی کے لیے اُس کا اسپتال میں رہنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر نے بالواسطہ پولیس کو تنبیہ کی کہ اُس نے شہر کے سب سے بڑے وکیل

بھاگو سے اِس معاملے پر بات کی ہے۔ پولیس بابر کو یہاں سے لے گئی تو وہ زیادہ دیر حوالات میں نہ روک سکے گی۔ اُس نے اُنھیں یقین بابر یہیں موجود رہے گا، کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ خود اُسے پولیس کے حوالے کردے گا۔ پولیس افسر چلے گئے، لیکن پولیس اسپتال میں تھی۔ بابر کی نگرانی کی جارہی تھی۔ اُس نے خود کو بہ جبر اپنے کمرے تک محدود رکھا۔ نرس ایمی اور نرس سیورین اُس کی دل داری کرتی رہیں دوسرے دن صبح ایک اَور سانحے نے سارے شہر کو خوف و ہراس میں مبتلا کردیا۔ گذشتہ روز جہاں اکبر علی خاں کی لاش پائی گئی تھی، ٹھیک اُسی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ یقیناً اِس طرح کوئی یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ اکبر علی خاں کے قاتلوں کو انجام تک پہنچا دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر رائے میں تھا کہ بابر نے یہ پیش گوئی کرکے اُسے اَور حیران کیا کہ آج کسی وقت اُستاد میدا کو اسپتال آنا چاہیے۔ بابر کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی چار بجے اُستاد میدا اپنے مقربین کے ساتھ اسپتال میں وارد ہوا۔ ڈاکٹر رائے اپنی خواہش پر بابر کے پہلو بہ پہلو تھا۔ میدا کا سر جھکا ہوا تھا۔ اُ اکبر علی خاں کے سانحے پر غم اور غصّے کا اظہار کیا اور اشارتاً یہ بتایا کہ تلافی تو نہیں ہوسکتی، لیکن اکبر علی خاں کے قاتل اپنی سزا تک پہنچ گئے ہیں پہنچا دیے گئے ہیں۔ میدا نے بابر کا چاقو واپس کردیا اور کہا کہ اُس نے اڈّے کی چوکی سے دست برداری کا فیصلہ کرلیا ہے۔ لیت و لعل کے نے اپنا چاقو واپس لے لیا۔ اُس نے بھی پھر میدا کا چاقو واپس کردیا اور اڈّے کی چوکی پر میدا ہی کو برقرار رہنے دیا۔ میدا کی آنکھیں لب ر تھیں۔ ڈاکٹر کے لیے یہ سارا واقعہ بہت عجیب اور ناقابلِ یقین تھا۔ اُس نے بابر کو رات کے کھانے پر اپنے گھر مدعو کیا۔ ڈاکٹر خاصا گوشہ گیر قسم کا آدمی تھا۔ نرس ایمی اور نرس سیورین کے لیے دعوت کی یہ پیش کش حیرت انگیز تھی۔ اسپتال سے پیوستہ سبزہ زار کے علاقے میں ڈاکٹر رائے کی کوٹھی میں بابر نے جھجکتے ہوئے قدم رکھا۔ ڈاکٹر کے علاوہ اُس کی بیٹی چمپئی رنگت کی، سرپہ سرسونے جیسے بدن کی ماہ پارہ لڑکی بابر کا خیر مقدم کیا۔ بینا عرصے تک انگلستان میں رہی تھی اور ہر اعتبار سے ایک منفرد لڑکی تھی۔ ڈاکٹر نے بابر کے بارے میں اُسے سارا بتا دیا تھا۔ وہ ایک مصوّر، مجسّمہ ساز، تعلیم یافتہ اور نہایت حسّاس لڑکی تھی۔ اُس کی شائستگی، وسیع النظری، مطالعے اور غیر معمولی سے بابر بہت متاثر ہوا۔ رات گئے بابر وہاں سے واپس ہوا۔ اُس نے بڑی عاجزی کی، لیکن ڈاکٹر باہر تک اُسے چھوڑنے آیا۔ در آتے وہ اپنی اکلوتی اور عزیز ترین بیٹی بینا کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اُس نے بابر سے کہا کہ بابر سفر کرتا رہتا ہے، بینا کے لیے نوجوان پر نظر رکھے جو ایسا ہی پُرخیال، پڑھا لکھا اور جرأت مند ہو، جیسا بابر ہے۔ پھر گھر کی طرف جاتے جاتے ڈاکٹر رائے یکایک پلٹ ''اور وہ تم بھی ہوسکتے ہو۔'' کچھ دیر بعد ڈاکٹر کی طلبی پر بابر کو دوبارہ اسپتال کی مرکزی عمارت کا رُخ کرنا پڑا۔ اُسے گمان ہوا کہ کہیں ڈاکٹر گذشتہ اپنی پیش کش کے بارے میں سلسلہ جنبانی نہ کرے لیکن ڈاکٹر اسپتال کے باہر اُمڈتے ہوئے مجمعے کی خبر سے متوحش تھا۔ جلد ہی اسپتال کے کارندو ذریعے معلوم ہوگیا کہ میدا ایک ہجوم کے ساتھ موجود ہے۔ یہ عقدہ کھلنے میں دیر نہیں لگی کہ میدا اُستاد کے نام، اُس کی مرتبت سے اچھی طرح واقف جامو اور زورا پنٹا ٹیشن سے باہر آئے تھے کہ پولیس نے اُنھیں دھر لیا تھا۔ ساری رات اُن پر تشدد کیا جاتا رہا، پھر میدا نے تھانے آکے اُنھیں کرایا اور عزّت و احترام سے اڈّے لے آیا تھا۔ اُنھی کی زبانی میدا کو معلوم ہوا کہ کِلے پر اسپتال میں کون شخص زی ہے۔ بٹھل کی نسبت سے میدا اُستاد بابر کو بھی جانتا تھا۔ وہ سرپیٹ رہا تھا، کاش اُسے اسپتال میں اپنے مربی اور محسن بٹھل کی موجودگی کی بھنک مل چند آدمیوں کو اندر آنے کی اجازت دے دی گئی۔ کمرے میں پہنچ کے میدا بٹھل کے پیروں سے لپٹ گیا اور داد فریاد کرنے لگا کہ یہ کیا ستم ہے، اُس شہر میں اُستاد بٹھل آئے اور اُسے خبر نہ ہو۔ معمول کے خلاف ڈاکٹر کوئی ساڑھے 9 بجے شب بٹھل کو دیکھنے آیا اور اُس نے بابر کو ایک اَور جان کاہ خبر کہ شام اکبر علی خاں کی فاتحہ خوانی کے اجتماع میں اُن کی بیگم بھی حوصلہ کھو بیٹھی اور اپنے محبوب شوہر کے پاس چلی گئی۔ بٹھل کے پاس مختصر وقت گزا اور اُس کی حالت سے مطمئن ہوکے ڈاکٹر کمرے سے باہر آگیا اور ازراہِ مہربانی اُس نے زورا اور جامو کو رات تک اسپتال میں ٹھیرنے کی اجازت دی۔ بابر کو ساتھ لیے کچھ آگے جاکے اُس نے بتایا کہ میدا اُستاد صبح حوالات میں مردہ پایا گیا ہے۔ ڈاکٹر رائے نے حواس باختہ بابر کو اپنے دفتر لے تفصیل بتائی کہ پے در پے خوں ریز سانحوں کے بعد شہر کی پولیس ہٹا کے بیرونِ شہر کی پولیس طلب کی گئی تھی۔ اِس اجنبی پولیس سے اڈّے لوگوں کی کوئی سلام دُعا نہیں تھی۔ ڈاکٹر کے بہ قول، پولیس نے پہلے اڈّے کے گرفتار آدمیوں پر شک کا ہدف قائم کرکے تفتیش کا آغاز کیا، کے بجائے اڈّے کے دیگر آدمیوں کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ پولیس کا مفروضہ چوں کہ بے جواز نہیں تھا، اِس لیے کہیں اَور جانے کی ضرورت پڑی۔ میدا کے دستِ راست بر جونے وعدہ معاف گواہ بن جانے کی رعایت پر سارے سچ کی توثیق کردی۔ سب سے آخر میں پولیس میدا پاس پہنچی۔ شہادتوں پر مبنی اپنے معتمدوں کے اعترافات سن کے میدا کے پاس تردید کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ایک ہی پہر کرب میں گزارنے بعد رات کو خودکشی کرکے اُس نے اپنا فیصلہ خود کرلیا۔ شہری پولیس سے رسم و راہ کی خوش گمانی میں، اُسی نے اکبر علی خاں کو ختم کیا تھا کہ سارا بابر پر ڈال کے اُسے شکنجے میں جکڑا جاسکتا ہے۔ اُسے اندازہ نہیں تھا کہ ایک نیک نفس، انسان دوست شخص ڈاکٹر رائے عین وقت پر بابر کے

ناکامی کے بعد بابر سے مفاہمت کی تدبیر ہی میدا کے لیے قرینِ ہوش تھی۔ اپنی شرمندگی کا اظہار کرنے وہ بابر کے پاس اسپتال ڈاکٹر رائے بھی وہاں موجود تھا۔ اُس کے سامنے میدا نے اکبر علی خاں کے خونِ ناحق پر بڑا رنج و غم ظاہر کیا تھا۔ وہ کیسا مکّار تھا۔ اُس نے اکبر علی خاں کے لیے اپنے آدمی بھیجے تھے اور اُسی نے اپنے تین آدمیوں کا خون کرکے بابر کو باور کرانے کی کوشش کی کہ اکبر علی خاں کے مجرموں کا انجام سے دوچار کردیا گیا ہے، بعد کو پولیس کی تفتیش سے سارا کچھ عیاں ہوگیا تھا۔ میدا سے اِس انتہا درجے کی سفّاکی بابر کے تصوّر سے بعید تھی۔ ڈاکٹر کو ملال تھا کہ اِتنی سنگین وارداتوں کے بعد میدا نے کیسی آسان سزا منتخب کرلی تھی۔ اڈّے کی چوکی پر برقراری کے لیے کتنے لوگ اُس قتل کردیے، کیسے آباد گھر اجاڑ دیے۔ بابر کو احساس تھا کہ سارا کچھ ڈھکا چھپا رہتا، اگر ڈاکٹر رائے پولیس کو مہیز نہ کرتا، اُسی کے اشارے پر پولیس کا تبدیل کی گئی ہوگی۔ اُسی نے پولیس کا حوصلہ بڑھایا ہوگا۔ دو دن بعد آخر ڈاکٹر نے بٹھل کو گھر جانے کی نوید سنادی۔ پولیس کی نگرانی میں اسپتال لایا گیا اور جب تک گاڑی چل نہ پڑی، پولیس اُن کے آس پاس منڈلاتی رہی۔ عیادت کے لیے صبح و شام اسپتال آتے آتے میدا غائب ہوجانے کا عذر بٹھل نے بہ اکراہ تسلیم کرلیا تھا اور چُپ رہا تھا، لیکن اَب روانگی کے وقت بھی میدا کی غیر حاضری، دو دن سے اسپتال میں قیام، آئی جی کی طرف سے گل دستہ، سڑکوں کا سناٹا، جگہ جگہ پولیس کا گشت، یہ سارے مظاہر بٹھل کے لیے تشویش کا باعث ہونے چاہیے تھے۔ زورا، جامو اور بابر کو اِس کا احساس تھا، مگر گاڑی کے حرکت میں آجانے کے بعد ہی اُنھوں نے زبان کھولی بٹھل کی بیماری اور بے خبری کے دوران پیش آنے والے سانحوں سے آگاہ کیا تو بٹھل بہت حیران ہوا، پشیمان اور آزردہ بھی۔ اُس نے بابر راہوں میں بھیج لیا۔ کلکتے کے اڈّے کا قیام نہایت مختصر تھا، دو راتیں، ایک دن۔ زورا اور جامو کو کلکتے چھوڑ کے بابر اور بٹھل مشرقی اور مغربی بنگال مختلف بستیوں کی خاک چھانتے ہوئے ممبئی کے پہنچ گئے، اور کسی جگہ شہر کے اڈّے کے ایک آدمی سے اُن کا آمنا سامنا ہوگیا۔ وہ شاہے تھا، بٹھل کا شناسا۔ شاہے ضد کرکے اُنھیں اڈّے پر لے آیا۔ یہاں ملہاری نامی ایک شخص عرصے سے چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بنیادی طور پر سازو آہنگ کے کاروبار کا واسطہ تھا۔ بٹھل نے ایک پختہ کار کے مشورے سے شاہے کو چوکی بٹھایا اور ملہاری کی سازو آہنگ کی دنیا میں واپسی کا اعلان کردیا۔ ملہاری نے دو لڑکیاں چمپا اور چندا مچل گئیں، اُن کا اصرار تھا کہ ملہاری ہمیں بھی اپنے ساتھ لے جائے۔ ملہاری نے دو کی یکجائی پر اعتراض کیا۔ چندا اور چمپا نے اُسے آپس کے ایثار کا یقین دلوایا۔ بٹھل کی ایماء پر چندا اور چمپا کو بھی ملہاری کے ہمراہ کردیا گیا۔ ہم وہاں سے کلکتے پہنچ کے آنے کی اطلاع ملتے ہی اڈّے پر کہرام مچ گیا۔ حاضری کے لیے ہجوم اُمڈ پڑا۔ میں نے نصیب میاں سے اُن کے خاص پانوں کا لے کے سونا گاچھی پہنچ گئے، جمرو اور ورا بھی ہمراہ تھے۔ وہاں ہمارا سامنا ایک خود عبارت دیوانے سے ہوا۔ اُس کے بارے کو وہ خود خوار اتنا نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ شخص مرتعش ہوگیا۔ مجھے سینے سے لگایا میرے ہاتھوں کو مَس کیا اور بوسہ دیا۔ نصیب اُس کا یہ عمل دیکھ کے میری مراد بر آنے کا مژدہ سنایا۔ راہ چلتے ہم گلاب بانو کے بالاخانے پر چڑھ گئے۔ بالاخانہ اُس رات کلکتے میں ساہوکاروں کے لیے وقف تھا۔ زورا گلاب بانو سے اڑ گیا۔ وہ مجبوراً ہمیں اندر لے گئی۔ ہمیں دیکھ کے ایک نوجوان ساہوکار بپھر اٹھا اُس نے نکال لیا۔ میں نے بمشکل بات سنبھالی اور ان تینوں سمیت اڈّے پر واپس آگیا۔ ساہوکاروں کو ہمارے متعلق علم ہوا تو وہ گھبرا گئے اور بٹھل کے واقف کار سابق پولیس افسر کے ہمراہ اڈّے پر معافی کے خواستگار ہوئے۔ بٹھل تمام معاملے سے بے خبر تھا۔ گلاب بانو بھی پہنچ گئی۔ نے وہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹا دیا۔ چند روز کلکتے میں قیام کے بعد بٹھل ہمیں لے کے نکل کھڑا ہوا۔ زورا اور جمرو بہ اصرار ساتھ ہم لکھنؤ، گورکھ پور، فرخ آباد، ہردوئی کے شہروں میں گھومتے رہے۔ مختلف شہروں اور بستیوں کی خاک چھانتے پچیس روز میں دلی آپہنچے۔ اطراف میں گنجان آباد شہروں اور قصبوں کو کھنگالتے ہوئے ہم جودھ پور اور باڑیر کے علاقے میرپور خاص آگئے۔ وہاں سے حیدرآباد، ٹھٹھہ ہوتے ہوئے کراچی پہنچے۔ کراچی سے ہم بمبئی کے لیے بحری جہاز پر سوار ہوگئے۔ جہاز انگلستان سے آرہا تھا۔ جہاز میں ہماری ملاقات پروفیسر تھامپسن سے ہوئی۔ وہ ہندستان میں انگریزوں کی کمزور پڑتی گرفت کے اسباب جاننے نکلے تھے۔ وہ ہمیں انگریزوں کے مخصوص ریستوران میں لے گئے، وہاں ہماری ملاقات حسین و جمیل مایا سے ہوئی۔ مایا کی ماں ہندوستانی تھی اور باپ انگریز تھا۔ وہ اپنے پروفیسر برنارڈ کے ساتھ بمبئی جارہی تھی۔ پروفیسر تھامپسن بابر سے گفتگو کرکے مرعوب ہوگیا تھا۔ مایا بھی بابر سے بے حد متاثر ہوئی وہ ریستوران کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک مایا کا شوہر میجر برنارڈ وہاں آموجود ہوا۔ وہ ریستوران میں ہندوستانی لوگوں کو دیکھ کے سخت مشتعل ہوگیا پروفیسر تھامپسن سے ہندوستانیوں کو فی الفور باہر نکالنے کا کہا۔ مایا اور پروفیسر تھامپسن نے اُسے سمجھانا چاہا، لیکن بابر نے جھگڑے کو طول دینا بھانپا اور از خود وہاں سے اُٹھ کے چلا آیا۔ زورا اور جمرو بھی آگئے تھے۔ بابر بیٹھ میں بھرا ہوا عرشے پر پہنچا، وہاں بٹھل طمانیت اور اطمینان سے بیٹھا تھا۔ بابر نے اندازہ لگایا کہ اُسے بمبئی والے گھر پہنچنے کے خیال سے شاداں تھا۔ بابر نے میجر برنارڈ سے الجھنے کا خیال ترک

کردیا۔ رات کے خاموش پہر میں مایا بابر سے معذرت کرنے چلی آئی۔ وہ فرطِ جذبات سے بابر سے لپٹ گئی۔ اس دوران مایا کا شوہر میجر اپنے دوست کے ہم راہ وہاں آن پہنچا۔ برنارڈ نے طمنچے کی زد پر بابر کو جہاز سے کودنے پر مجبور کردیا۔ بٹھل بابر کی بے چینی سے بے خبر تھا اس کشمکش کے دوران وہ نزدیک ہی تھا۔ بٹھل میجر برنارڈ پر حملہ کر کے اُسے بے دست و پا کر دیا، لیکن ان کے لیے صورتِ حال انتہائی مخدوش تھی۔ انھیں جلد یا بدیر گرفتار ہی ہونا تھا۔ اسی اثنا میں کاٹھیاواڑ کا نام ور ڈاکو رانجی کا باروٹیہ کے سیکڑوں مسلح افراد جہاز پر چڑھ آئے اور انھوں نے جہاز پر قبضہ کرلیا۔ باروٹیہ کے آدمیوں نے کمالِ انتظام سے جہاز کے سرکردہ انگریزوں کو باندھ کے کشتیوں میں ڈال لیا۔ جہاز پر موجود ایک غلط فہمی سے بابر کو انگریزوں کا گماشتہ بنا دیا جس پر باروٹیہ نے بابر کو بھی جہاز سے اتارنے کا حکم دے دیا۔ بٹھل کی مداخلت پر باروٹیہ نے اُسے زورا اور جمرو سمیت جہاز سے اتار کے کشتیوں میں ڈلوا دیا۔ گھنٹا بھر مسافت کے بعد کشتیاں ساحل سے جا لگیں۔ وہاں بابر، بٹھل، زورا سمیت سَو کے لگ بھگ انگریز مغویوں کی مشکیں کس کے انھیں بوریوں میں ٹھونس دیا گیا۔ ان بوریوں سے لدا چالیس کے لگ بھگ چھکڑوں پر مشتمل قافلہ نہ معلوم حاصل سے نامعلوم منزل کی طرف چل پڑا۔ بابر بوری میں بنائے گئے جھروکے سے باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ چھکڑے جنگل سے نکل کر ایک قصبے کی بیرونی سڑک سے گزرے۔ وہاں مسافر لاری پر سوار ہو رہے تھے، اسی لمحے باہر نے اپنی زندگی کا حاصل منظر مولوی شفیق، کورا کے ہم راہ لاری میں سوار ہو رہے تھے۔ بابر بیک وقت طفلِ مجبور اور برق قہر انداز کی طرح چَل اٹھا، وہ رسیوں میں جکڑا اور بوری میں محبوس تھا۔ چھکڑا خراماں خراماں قصبے سے آگے جنگل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ بابر کے ساتھ لدی ہوئی بوری میں وائسرائے بند کا معتمد لیونارڈ جکڑا پڑا تھا۔ بابر نے اُس کی مدد سے رسیاں کاٹنے کی جدوجہد شروع کردی، جو بالآخر ایک صبر آزما کشمکش کے بعد کام یاب ہوئی۔ بابر کے تلوے پہ گہرا زخم آ گیا۔ بابر لیونارڈ کے ہم راہ چھکڑے سے گھنے جنگل میں کود گیا، لیکن زخم سے مسلسل بہتے خون کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوگیا۔ لیونارڈ نے وفاداری کا تقاضا بہ خوبی نبھایا۔ بابر کو جب ہوش آیا تو وہ درخت کے تنے سے لگا بیٹھا تھا اور لیونارڈ جنگلی پھلوں کو اُس کے مُنہ میں ٹپکا رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں ایک شیر ببر نے لیونارڈ پر حملہ کردیا۔ بابر کا چاقو آنکھ کو چیرتا ہُوا شیر کے دماغ تک جا گھسا۔ شیر موذی مارا گیا۔ کئی روز تک چلتے گھسٹتے ایک بستی میں پہنچ گئے۔ جہاں چھلیا نامی ایک بدمعاش نے بابر کو گھیر لیا۔ وہ باروٹیہ کا خیر خواہ نکلا۔ چھلیا کاٹھیاواڑ کا نامی گرامی ناقابلِ شکست چاقو باز۔ بابر نے چھلیا کو معمولی مقابلے کے بعد بے دست و پا کردیا۔ جس پر چھلیا اُس کا بے دام غلام ہوگیا۔ چھلیا نے بابر کو بتایا کہ بابر کی موت کی اطلاع پر اُس کا ساتھی بٹھل مشتعل ہوگیا۔ بٹھل باروٹیہ کو ہلاک کر کے جنگل میں روپوش ہوگیا۔ اس کے ساتھ ایک انگریز خاتون مایا اور اُس کا ایک ساتھی ہے، جب کہ جمرو ہلاک ہو چکا ہے۔ تمام انگریز مغوی ہلاک کردیے گئے ہیں۔ چھلیا بٹھل کی کھوج میں نکل پڑا۔ بابر نے بستی ہی میں ٹھہرنا مناسب سمجھا۔ رات کے پچھلے پہر بابر کی آنکھ کھلی تو اُس نے ایک خوب رُو دوشیزہ لکشمی کو سرہانے بیٹھے پایا۔ وہ نزدیکی شہر دیواڑا کے امیر کبیر شخص کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ بابر سے مضمر ہوگئی کہ رگھو بھگی والا نامی داد اسے اُسے بچائے۔ رگھو والا لکشمی پر دل و جاں سے فریفتہ ہو چکا۔ بابر کو وہ کرنے پر ہی بن پڑی۔ تب وہ آفتِ جاں دوشیزہ اڈّے سے نکل بھاگنے کی صبح بابر لنگوا اور دھیرا راہ بستی کا جائزہ لینے نکلا۔ بھُوا مہاجن نامی ایک ساہوکار نے اُسے اپنی دکان میں بصد اصرار بلا لیا۔ اُس کی دکان ہمہ قسم کے ساز و سامان سے پھدی تھی۔ وہاں بابر کو شیشے کے ایک نمائشی صندوق میں نادر و نایاب موتی نظر آیا۔ یہ موتی ہو بہو کورا کی دی ہوئی بالا میں پروئے موتیوں کا تھا۔ بابر موتی دیکھ کر بے چین ہوگیا۔ اُس نے بھُوا سے موتی کی بابت دریافت کیا۔ بھُوا نے بابر کو بتایا کہ یہ موتی اُس نے دلواڑا شہر میں مولوی صاحب سے خریدا ہے۔ بابر کی مزید کرید پر بھُوا مہاجن محتاط ہوگیا اور مزید بتانے سے پہلو تہی کرنے لگا۔ بابر طیش میں آ گیا اور بھُوا کو طرح زدوکوب کرنے لگا اور مار مار کر اُس کا برا حال کردیا۔ بھُوا کی دکان سے باہر بستی والوں کا ہجوم پڑ گیا۔ آخر بھُوا نے ہار مان لی اور اُس نے بتایا کہ مولوی صاحب دلواڑا کے تاجر شاکر بھائی کے ہاں مقیم ہیں۔ بھُوا مزید گفتگو کے لیے بابر کو دکان کے عقبی حصّے میں بنے گودام میں لے گیا۔ بھُوا نے بابر کو بتایا کہ دلواڑا میں وہ اپنے دوست حسین والا کی دکان میں بیٹھا تھا، مولوی صاحب حسین والا کے پاس شاکر بھائی کی وساطت سے آئے۔ انھوں نے یہ موتی انتہائی ارزاں داموں میں فروخت کیا تو بھُوا چونک گیا۔ بھُوا نے حسین والا سے منت سماجت کر کے موتی خریدے اور سیدھا شاکر بھائی کے پاس جا پہنچا۔ موتیوں کی بابت سن کے شاکر بھائی کے منہ میں پانی آ گیا۔ اسے اس بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ شاکر بھائی دوڑا مولوی صاحب کے حجرے پر پہنچا تو وہ اپنی صاحب زادی کو دوا دلوانے کے لیے نکل رہے تھے، جو خاصی بیمار تھی۔ بھُوا نے فوراً اپنی مدد کردی۔ راستے میں دو ایک مرتبہ اُس نے مولوی صاحب کی صاحب زادی کا چہرہ کیا دیکھا دیوانہ ہوگیا اور موتیوں کو بھول گیا۔ شاکر بھائی کو دھمکی دی کہ وہ دوبارہ مولوی صاحب کی طرف نظر نہ آئے، لیکن جب بھُوا دیوانگی کے ہاتھوں مجبور ہو کے چکّر لگاتا رہا اور ایک دن جب مولوی صاحب سے مزید موتیوں کا سودا کر رہا تھا تو شاکر بھائی آن پہنچا اور غنڈوں کی مدد سے اسے مہمان خانے میں بند کردیا۔ اور بھُوا کو پٹوا

مسلمان ہو جائے تو اُس کی شادی مولوی صاحب کی صاحب زادی سے کروائی جاسکتی ہے۔ بھُوا کچھ دن کی سوچ بچار کے بعد مسلمان تیار ہوگیا، لیکن اُسی دن مولوی صاحب کہیں چلے گئے۔ بھُوا کو شک تھا کہ انھیں شاکر بھائی نے کہیں چھپایا ہے۔ بھُوا نے بابر کو بتایا کہ اُس نے اُسی لیے بلایا تھا۔ اگر بابر شاکر بھائی سے مولوی صاحب کو برآمد کروادے تو منہ مانگے دام دے گا۔ بابر کے جوابی رویے سے بھُوا نے وہ جانا ہو بابر کسی کو نہیں بتاتا تھا۔ بھُوا نے اسی وقت خود کو چھرا گھونپ لیا۔ عین اسی وقت وہاں پولیس پہنچ گئی۔ انسپکٹر اجیت نے بابر کو بھُوا کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ کئی روز تک بابر بھوکا پیاسا تھانے میں بند رہا۔ ایک دن پولیس کے بڑے افسر نے اُسے بلوایا اور کہا کہ اسے دلی سرکار کی جانب سے رہا کیا جا رہا ہے، تاہم پولیس کو بٹھل کی تلاش ہے۔ بھُوا مرتے ہوئے اپنی کل مال و متاع بابر کو سونپ گیا ہے۔ اگر بابر دلی سرکار میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ان کی ریاست کے لیے کچھ آسانیاں دلوا سکتا ہے تو بٹھل کو جانے دیا جائے گا، بہ صورتِ دیگر بٹھل ریاست سے نہیں نکل سکے گا۔ بابر رہا ہو کر باہر نکلا تو چھلیا، رگھو، لنگوا اور دھیارا وغیرہ نے اس کا استقبال کیا۔ رگھو کے ڈیرے پر بٹھل کو دیکھ کے بابر کے درد کا گویا مداوا مل گیا۔ بٹھل نے اُسے بے طرح مارا پیٹا۔ پھر بابر کو گلے لگا کے آب دیدہ ہوگیا۔ رات بابر رگھو کے کمرے میں اس کی پیشوائی کر رہا تھا کہ شور مچ گیا۔ بٹھل نے لالٹین کمرے میں لے کر چھاپا مارا تھا۔ چھلیا، بٹھل کو لے کے چور راستے سے باہر نکل گیا۔ پولیس نے انسپکٹر اجیت کی سرکردگی میں چھاپا مارا تھا۔ اڈّے کا دروازہ کھلتے ہی پولیس اڈّے میں لاٹھیاں بلم لے کر پل پڑی۔ اڈّے کے آدمیوں پر بہیمانہ تشدد کیا گیا۔ پورے اڈّے کی تلاشی لی گئی۔ بٹھل کو غائب پا کر انسپکٹر اجیت آپے سے باہو ہوگیا۔ اسی اثنا میں باہر سے اطلاع آئی کہ بٹھل چھلیا اور دیگر افراد کو فرار ہوتے ہوئے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ بابر زماں نے انسپکٹر اجیت کی گردن پر چھُرا رکھ دیا اور بٹھل کے اندر بلوانے کا مطالبہ کردیا۔ اور تمام سپاہیوں کو غیر مسلح کردیا۔ بٹھل جب اندر آیا تو بابر طیش میں آ گیا۔ اس نے اس انتقام کو احمقانہ اور بچگانہ قرار دیا۔ بٹھل کے کہنے پر بابر نے اجیت کو چھوڑ دیا اور سپاہیوں کی بندوقیں واپس کردیں۔ انسپکٹر اجیت نے بٹھل کو دیکھا اور سٹپٹا گیا۔ اس کی ترشی یک دم نرم خوئی میں تبدیل ہوگئی۔ انسپکٹر اجیت نے بٹھل کی ہتھکڑی کھلوا دی اور تھانے لے آیا۔ تھانے میں اس نے انکشاف کیا کہ وہ بچپن میں بٹھل کو چاچا کہتا رہا ہے اور بٹھل کے استادوں میں سے ایک استاد شرلی رام برسوں پہلے کلکتے کی ایک اسٹانی اسے اڈّوں کی دنیا سے دور یہاں دلواڑے میں لے آئی تھی۔ بٹھل کو گھر لے جانے پر اصرار کیا تو بٹھل نے انکار کردیا کہ وہ اس کی ماں کے چہرے پر ترّدد نہیں دیکھنا چاہتا۔ اجیت مہربان ہُوا تو دلواڑا میں تمام راستے آسان ہوگئے۔ بابر اگلی صبح شاکر بھائی کو تلاش کرنے نکل کھڑا ہُوا۔ اسے پتا چلا شاکر بھائی بمبئی جا چکا ہے جہاں اُس کا دوست لکشمی پٹیل کے بنگلے میں مقیم ہے تو بابر، راج پٹیل کو کھوجتا ہُوا اس کی مل تک پہنچا اور وہاں سے اس کے گھر۔ راج پٹیل لکشمی کا باپ تھا۔ لکشمی جو رگھو کو مسترد کرچکی تھی۔ لکشمی بابر کو دیکھ کے دیدہ و دل فرشِ راہ کے مصداق ہوگئی۔ لکشمی نے بابر کو اپنی ماں سے ملوایا اور اپنا وعدہ یاد دلوایا۔ لکشمی کو اڈّے پر لے آیا اور رگھو کو مقابلے کے لیے پکارا۔ اڈّے میں بھی ہڑبڑا اٹھے۔

اڈّے سے ایک معمّر شخص بارو دادا طیش میں مقابلے پر آ گیا۔ اسے گمان تھا کہ چھلیا، بٹھل اور بابر سے ساز باز کر رہا ہے۔ بارو دادا نے بابر کے بجائے بٹھل کو مقابلے کے لیے للکارا۔ چھلیا پھر گیا، تاہم بٹھل کے بھڑکنے پر چپ سادھ لی۔ بٹھل نے بارو دادا کے تمام وار نہایت آسانی سے خطا کردیے۔ بارو دادا کو ضرب پہنچانے سے گریز کیا۔ بٹھل نے جب چاقو کے بغیر لڑنے کا ارادہ کیا تو بارو دادا شرم سار ہو کے بٹھل کے پاؤں پڑ گیا۔ اس نے پھر بابر کو للکارا۔ عین مقابلے کے دوران بابر پر انکشاف ہُوا کہ رگھو جان بوجھ کے اس کے چاقو کا نشانہ بننا چاہتا ہے۔ بابر نے رگھو کو گلے لگا لیا۔ بٹھل اب تک اس تمام معاملے سے لاعلم تھا۔ وہ رگھو کی جاں فروشی سے متاثر ہوا اور لکشمی کا رشتہ مانگنے سیٹھ راج پٹیل کے گھر پہنچ گیا۔ خاصی گفتگو کے بعد سیٹھ راج پٹیل لکشمی کا رشتہ رگھو کو دینے پر آمادہ ہوگیا۔ اس خوش خبری کے ساتھ یہ لوگ اڈّے پر واپس پہنچے تو شان دار جشن منایا گیا۔ مٹھائی تقسیم کی گئی۔ بابر رگھو کے ساتھ اس کے کمرے میں موجود تھا جب یہ اطلاع ملی کہ لکشمی اٹیچی کیس کے ہم راہ گھر سے بھاگ کے اڈّے پر آ گئی ہے۔

میں الٹے قدموں صحن میں آیا۔ رگھو بھی میرے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ لکشمی بٹھل کے کندھے سے لگی بلک رہی تھی۔ سرخ رنگ کا اٹیچی کیس دھرا تھا۔ سبھی ان کے گرد سمٹ آئے تھے۔ اڈّے پر سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی، خاموشی طاری تھی۔ لکشمی کے بلکنے کی آواز تیر کی طرح سینہ چھلنی کر رہی تھی۔

''چپ ہو جاری... ہمیں جان کاری پڑ گئی تھی تیرے باپ

کی۔ ''بٹھل سُتے ہوئے لہجے میں اسے پچکارنے لگا۔ ''چپ ہوجاری... تجھے بٹیا بولا ہے، لاج رکھیں گے۔'' بٹھل کی آواز پگھل رہی تھی۔ وہ اڈّے کا آدمی نہیں لگ رہا تھا۔

بٹھل کی پچکار سے لکشمی کی سسکیاں مزید بلند ہوگئیں۔ بٹھل کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ خود کو بے بس محسوس کررہا ہے۔ اس نے بے چارگی سے مجھے دیکھا۔ بٹھل کی آنکھوں میں کچھ تھا جسے یہ پدرانہ شفقت بھی کہا جاسکتا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کے لکشمی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''لکشمی، حوصلہ رکھو۔'' میرے مُنہ سے دبی دبی سی آواز نکلی۔

میری آواز سُن کر وہ یک لخت مڑی اور بٹھل کو چھوڑ کے میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔ اس کی ہچکیاں بندھ رہی تھیں۔ میں تو خود تنگ داماں تھا، اسے کیسے سمیٹتا۔ بٹھل کی بے بسی بڑے بھیانک انداز میں مجھ پر آشکار ہوئی تھی۔

''منّا کو دیکھ رہے ہو کیا! تمھاری ماں کی... سالو!'' بٹھل یک لخت گھوم گیا۔ آن کی آن میں سبھی کائی کی طرح چھٹ گئے۔ ''بٹیا کو اندر کہیں لے جارے۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

رگھو میری پشت پر کھڑا تھا۔ میں نے رگھو کی طرف مُڑ کے دیکھا تو وہ راستہ دینے کو ہٹ گیا۔ میں لکشمی کو سمیٹتا ہُوا رگھو کے کمرے میں لے آیا۔ بٹھل چھلیا اور شرلی رام میرے ساتھ ہی چلے آئے تھے۔ سیٹھ راج پٹیل نے ہمیں خوش گوار تاثر کے ہمراہ اپنے گھر سے رخصت کیا تھا۔ اُس کی نشست و برخاست میں کوئی کھوٹ نظر نہ آتا تھا۔ لیکن لکشمی کا یوں بلکتے ہوئے اڈّے پر چلے آنا، کچھ اَور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ وہاں سب کچھ خوش اسلوبی سے طے ہُوا تھا۔ سیٹھ صاف اور کھرا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ لیکن بٹھل کہہ رہا تھا کہ اسے سیٹھ راج پٹیل کے ارادوں کا اندازہ ہوچکا تھا۔ معاملہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ لکشمی کو میں نے دھیرے سے سوفے پر بٹھادیا۔ وہ اب خاصی حد تک سنبھل گئی تھی۔ میں نے اس سے کچھ پوچھنا چاہا تو بٹھل نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کردیا۔ وہ لکشمی کو، ہوش وحواس مکمل طور پر بحال کرنے کی مہلت دینا چاہتا تھا۔ ہم کچھ دیر یونہی ساکت بیٹھے رہے۔ اس کی ہچکیاں تھم گئی تھیں۔ بٹھل بے حد مضطرب دکھائی دیتا تھا۔ اس کی پیشانی پر گہرا تفکر نمایاں تھا۔ پیش آنے والے حالات خاصے خطرناک ہوسکتے تھے۔ ہمیں اب تک معلوم نہیں ہُوا تھا کہ لکشمی پر کیا بیتی ہے؟ ممکن ہے، بٹھل غلط اندازے لگا رہا ہو۔ راج پٹیل مجھے خاصا معتبر آدمی دکھائی دیتا تھا۔ لکشمی اب سنبھل گئی تھی۔ سوجی ہوئی آنکھیں اس کے

حُسن کو سوگوار کررہی تھیں۔ بٹھل کے استفسار پر لکشمی نے کہ ہمارے چلے آنے کے بعد اس کے گھر میں خوب ہنگا ہُوا۔ لکشمی کے دونوں بھائیوں نے یہ رشتہ ماننے سے صاف انکار کردیا۔ راج پٹیل نے کچھ دیر تو بیٹوں سے مزاحمت کی آخر کار اسے ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ باپ بیٹوں نے فیصلہ کیا کہ صبح سورج طلوع ہونے سے قبل ہی لکشمی کو دیپک پٹیل کے ہمراہ بمبئی روانہ کردیا جائے اور وہاں سے ولایت! اور لکشمی اس وقت تک ولایت میں ہی رہے گی جب تک رگھو کا قضیہ نہیں نمٹ جاتا۔ دیپک کی رائے تھی کہ رگھو سے خائف ہونے کے بجائے آگے بڑھ کے رگھو سے نمٹا جائے۔ اس کام کے لیے انھوں نے کسی اُجرتی قاتل سے مدد لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ جب پرراج پٹیل کا کہنا تھا کہ شاکر بھائی سے مدد لی جاسکتی ہے۔ لکشمی یہ ساری باتیں سُن رہی تھی۔ اس نے خاموشی سے اٹیچی کیس میں اپنے گہنے لتے رکھے اور اڈّے پر چلی آئی۔

''آپ ادھری کیوں چلی آئی ہو...؟'' بٹھل بدبدایا۔

''کس برتے پر آئی ہو بٹیا؟''

میں نے بٹھل کو تشکیک نظروں سے گھورا۔ اسے اس وقت سے ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر بٹھل میری تنبیہ کو خاطر میں لایا۔ ''بھلا ہی سوچتے ہیں تیرے ماتا پتا، تیرے بھیّے ری۔''

''پتا جی نے کبھی نہیں موڑا۔ جو مانگا وہ دیے ہیں جی!'' لکشمی نے دھیرے دھیرے کہا۔ اس کی ٹھوڑی سینے پر ٹکی ہوئی تھی اور نظریں انگلیوں پر تھیں، جو ہتھیلیاں کریدرہی تھیں۔

''آپ پتا جی کو کیا دیے ہو بٹیا!'' بٹھل کی آواز جھلس رہی تھی۔

''ہم نے بہت مان دیا ہے پتا جی کو۔ ہر بات مانے آئے ہیں۔'' لکشمی کی آنکھوں سے پھر پانی چھلکنے لگا تھا۔

''بٹیا... ہم اُدھری لے چلیں، تو چلوگی؟ پتا جی کی یہ بات اَور مان لو۔'' بٹھل کے پہلو میں زرّیں آ کے بیٹھ گئی تھی۔ بٹھل مستفسرانہ نظروں سے لکشمی کو دیکھ رہا تھا۔

''شمشان گھاٹ چلے جائیں باؤ جی!'' لکشمی نے جلد سے ہتھیلیاں آنکھوں پر ملیں اور کڑک کے بولی۔

''رگھو کے برتے پر بول رہی ہو بٹیا؟'' بٹھل نے دھیرے سے کہا۔

لکشمی نے تیر انداز نظروں سے مجھے گھورا۔ گویا میرا سانس یک دم کسی نے بند کردی تھی۔ میں نظریں چُرا کر بٹھل کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں رگھو کے برتے پر، آپ کے برتے پر، موہن بابو کے برتے پر۔ ہم آپ بھی کے برتے پر آئے ہیں۔'' اس نے بٹھل کو جواب کردیا تھا۔

''ہم اس اڈّے کے برتے پر ہیں ری... اس کے بھی کچھ رہی رواج ہیں۔'' بٹھل نے گھوتے ہوئے کہا۔

''موہن جی...!'' لکشمی میری طرف دیکھ کے رہ گئی۔

''جانے دیجیے۔ یہاں آ کے غلطی کرگئے۔''

لکشمی یک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عجیب متلوّن مزاج لڑکی تھی، پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ میں سٹپٹایا ہُوا تھا۔ راج پٹیل کی ناراضی ناقابلِ یقین تھی۔ اس پر لکشمی کا قدم قطعی غیر متوقع تھا۔ بٹھل لکشمی کو واپس بھیجنا چاہتا تھا۔ لکشمی کی سرپرستی کسی طور بھی مناسب نہیں تھی۔ لیکن لکشمی کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کسی طور بھی واپس نہیں جائے گی۔ رگھو کی دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ سُتا ہُوا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر وہی دائمی خاموشی آڑے آگئی۔

''چھلیا، موٹر منگوارے...!'' بٹھل نے لکشمی کی طرف ایسے دیکھا جیسے نوہ لے رہا ہو۔ کچھ ایسا اسے ضرور نظر آگیا تھا جس کی بنا پر بٹھل کے چہرے کے عضلات ڈھیلے پڑگئے تھے۔ لکشمی نے جواباً ''فکر نہ کر، ری! تیری ڈولی بمبئی لے جائیں گے۔''

اس کے ہاتھ دھیرا لکشمی کا اٹیچی کیس کمرے میں رکھ کے چھلیا موٹر کا انتظام کرنے چلا گیا تھا۔ رگھو بھی چھلیا کے پیچھے گیا۔ وہ جیسے کوئی بات کہنا چاہتا۔ اس کا بھی کوئی ارادہ تھا۔ اب کمرے میں بٹھل، میں اور شرلی رام تھے۔ شرلی رام اب تک خاموش رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اُلجھن تھی، جیسے فیصلہ شناسوں کے چہروں پر ہُوا کرتی ہے۔ لکشمی کافی حد تک نارمل دکھائی دیتی تھی۔ اس جیسی لڑکی سے کچھ بعید نہ تھی۔

''باؤ جی! ہمیں گھر واپس کیوں بھیجنا چاہتے ہو؟ پتا جی سے ڈرتے ہو؟'' لکشمی نے بٹھل کی طرف نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ وہ اپنے ناخنوں سے کھیل رہی تھی۔

''اپنی بٹیا سے ڈرتے ہیں ری۔ ادھری فیض آباد میں تیری بھی اک بٹیا ہے۔'' بٹھل یک دم کہیں کھو سا گیا تھا۔

لکشمی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اٹیچی کیس اٹھا کے صوفے پر رکھا۔ اٹیچی کیس خاصا وزنی لگتا تھا۔ ''ہم بہت سا دھن بھر لائے ہیں، اسے رکھ لیں۔'' لکشمی نے اٹیچی کیس کھول دیا۔ وہ سونے کی ڈلیوں اور گہنوں سے بھرا تھا۔ لاکھوں کی مالیت کا ہوتا تھا۔ کئی سیر وزن تو یقیناً تھا۔ ''اسے آپ رکھ لیں، ہمیں ضرورت نہیں چاہیے۔ ہمارا اچھا پوری کردیجیے باؤ جی!''

میرا خیال تھا کہ بٹھل کو طیش آجائے گا مگر وہ یک دم ہنس پڑا۔ ''کیا اچھا ہے ری تیری؟''

''ہمیں اپنے ساتھ لے چلیے۔ اپنی بٹیا کے پاس لے چلیے۔''

بٹھل یک دم سناٹے میں آگیا۔ پھر نہ جانے کیا ہُوا، مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ بٹھل اُٹھا تو اِدھر سے لکشمی بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ایک بار پھر بٹھل کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔ اس مرتبہ بٹھل کی آنکھیں بھی خشک نہ رہی تھیں۔

''تو فکر نہ کر، ری... ذرا نہ فکر... تیرے پتا جی سے آخری بات کرلیں گے۔''

''اس گھر میں نہیں رہنا چاہتی... دیپک کے ساتھ ولایت نہیں جانا باؤ جی... باؤ جی، ہمارے سوا دیپک کا بھید کوئی نہیں جانتا۔ وہ راکھشس ہے۔'' پھر لکشمی نے جو بات بتائی، اسے سُن کر سب پتھر کے ہوگئے تھے۔ اب بات واضح ہوئی تھی کہ وہ کیوں گھر سے اڈّے پر آگئی تھی۔ وہ مزید بولتی مگر بٹھل نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش کردیا تھا۔ اس دوران میں چھلیا آگیا تھا۔ موٹر کا انتظام ہوگیا تھا۔ چھلیا کو دیکھتے ہی بٹھل اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس نے مجھے اٹیچی کیس اٹھانے کا اشارہ کیا اور خود لکشمی کو سہارا دے کر باہر لے چلا۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہوچکا تھا۔ موٹر کے ساتھ گلی کے کتے دُور تک بھونکتے ہوئے گئے۔ سیٹھ راج پٹیل کی کوٹھی تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ وقت نہیں لگا۔ قندیلیں روشن تھیں۔ رات کے اس پہر بھی کوٹھی جاگی ہوئی لگتی تھی۔ دروازے پر پہرے داروں کا جیسے جمگھٹا لگا ہُوا تھا۔ موٹر کے کتے ہی سب چونک کے ہماری طرف دیکھنے لگے۔ ولایتی نسل کے دو شکاری کتے نہ جانے کہاں سے موٹر پر آگرے۔ کتے بری طرح سے بھونک رہے تھے اور موٹر پر پڑنے والے ان کے پنجوں سے چرچر کی دل خراش آوازیں پیدا ہورہی تھیں۔ کتے چیر پھاڑ کے لیے بے تاب نظر آتے تھے۔ بٹھل موٹر کا دروازہ کھول کے باہر اُتر گیا۔

اس سے قبل کہ کتے بٹھل پر جھپٹتے اور وہ ان سے نمٹتا، لکشمی بھی کتوں کو پچکارتی ہوئی، کار کا اگلا دروازہ کھول کر اُتر گئی۔ کتے بٹھل کو بھول کے لکشمی کی طرف لپک آئے اور محبت سے اس کے پیر چاٹنے لگے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہُوا تھا کہ ہمیں سوچنے سمجھنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ شاید بٹھل پیش بینی کرچکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لکشمی اُتر کے کتوں کو سنبھال لے گی۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ مردانگی کے اپنے تیور ہُوا کرتے ہیں، اپنا مزاج ہوتا ہے۔ کبھی کبھی پھول سے ایک پتّی توڑنا بھی

مردانگی اور کبھی کبھی پھول بن جانا بھی مردانگی کا شیوہ ہُوا کرتا ہے... کہ کوئی توڑ لے۔

بٹھل نہ جانے کیا سوچ کے آیا تھا۔ وہ کسی کو نہ کچھ بتا رہا تھا اور نہ کسی لمحے توقف کر رہا تھا۔ اس کے سبھی کام بہ ظاہر ہوائی گھوڑے دِکھتے ہیں مگر بعد میں یوں لگتا ہے جیسے صدیوں کی سوچ بچار کے بعد اس نے قدم اٹھایا ہو۔ پہرے داروں کے جھنڈ میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ اندر اطلاع پہنچ گئی ہوگی۔ بٹھل نے ڈھلکی ہوئی چادر کو لکشمی کے سر پر ٹھیک کیا اور لکشمی کو کندھوں سے پکڑ کے آگے بڑھ گیا۔ بٹھل کے خفیف اشارے پر چھلیا آگے بڑھ کے لکشمی کے داہنی طرف ہوگیا۔ میں نے اٹیچی کیس اٹھالیا، وہ خاصا وزنی تھا۔ دس سیر کے لگ بھگ وزن ہوگا۔ شرلی رام اور میں بٹھل کے پیچھے تھے۔ پہرے داروں میں سے ایک جو معتبر لگتا تھا، تیز تیز چلتا ہُوا ہماری طرف آیا۔

''بی بی صاب کو چھوڑ کے آپ لوگ جانے کا ہے۔'' وہ اپنے لہجے کو بارُعب بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ادھری بٹیا کو چھوڑنے نہیں آئے کا کا! سیٹھ جاگتے ہوں گے؟'' بٹھل نے درشتی سے کہا۔

''سیٹھ کو بولنے کا ہے، دادا۔ سنیا آنے تک ٹھیرنے کا ہے۔'' پہرے دار بٹھل کے لہجے سے خائف ہوگیا تھا۔

''جو گندر بابا! ہمیں ان کے ساتھ اندر جانے دیں، آپ ہٹ جائیں۔'' لکشمی بوکھلائے ہوئے تیوروں سے بولی۔

''آپ چپکی رہو بٹیا!'' بٹھل نے لکشمی کو سرزنش کی۔

کتنے ہمیں چھوڑ کے کوٹھی کی دیوار سے جا لگے تھے۔ پہرے داروں میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ اچانک کوٹھی کا دروازہ کھلا اور سیٹھ راج پٹیل اپنی بیوی کے ہمراہ باہر آیا۔ اس کا لباس شکن آلود تھا، وہ اُجڑا اُجڑا لگ رہا تھا۔ لکشمی کی ماں دوڑتی ہوئی آئی اور بیٹی سے چمٹ کے بلکنے لگی۔ سیٹھ راج پٹیل بھی تھکے ہوئے قدموں سے ہماری طرف لپکا۔ ''لکشمی، یہ کیا کیا تُو نے؟ ماتا پتا کو بتایا ہوتا۔''

''ادھری ہم سے بات کرو سیٹھ!'' بٹھل نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''بٹھل بھائی، آپ سے میں بے حد شرمندہ ہوں!'' سیٹھ کے لہجے میں واقعی شرمندگی اور خجالت تھی۔

''گلیارے میں نمٹاؤ گے سیٹھ صاب؟''

''نہیں نہیں۔ چلیں چلیں، اندر چلیں۔''

''بٹیا کی وجہ سے بولے ہیں۔ ہم تو ادھری نمٹ جاتے۔''

''میں آپ سے نظر ملانے کے قابل نہیں۔'' سیٹھ راج پٹیل ہمیں لے کے اندر کی طرف بڑھ گیا۔

ہم دوبارہ اسی انتظار گاہ میں آموجود ہوئے۔ لکشمی کو اس کی ماں اندر لے جانے لگی۔ مگر بٹھل نے منع کر دیا۔

''بٹیا کو ادھری رہنے دو بیگم صاب! یہ ہمیں بہت کچھ سمجھ کے لائی ہے۔''

''ساوتری! لکشمی کو یہیں بیٹھنے دو۔'' سیٹھ راج پٹیل نے مداخلت کی۔

لکشمی وہیں بٹھل کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں اور چھلیا داہنی طرف کے سوفے پر بیٹھے تھے جب کہ شرلی رام بٹھل کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ لیکن اب اس کی آنکھوں میں تجسس نہیں تھا۔ شاید وہ معاملہ سمجھ گیا تھا۔ ایک تحسین آمیز چمک تھی اس کی آنکھوں میں، جو یقیناً بٹھل کے لیے تھی۔

''لاڈلے! یہ بکس تمھارے سیٹھ کو!'' بٹھل نے مجھے اشارہ کیا۔

میں نے اٹیچی کیس سیٹھ کے سامنے دھری میز پر رکھ دیا۔

''کھول کے دکھادے رے... سیٹھ! دیکھ لو۔ ہووے تو بول دینا۔''

میں نے اٹیچی کیس کھول دیا... سیٹھ راج پٹیل کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں اور وہ چونک کے اُچھل پڑا۔ وہ اس واردات سے بے خبر تھا۔ یہ... یہ کیا! لکشمی، یہ کیا!''

''سیٹھ، پہلے جان لو، ہم بعد میں بولیں گے کہ یہ کیا ہے۔'' بٹھل فوراً سے پیش بول پڑا۔ لکشمی کی طرف سے سب کچھ کہہ دینے کا ذمہ اس نے لے لیا تھا۔

''بٹھل بھائی، اسے جانچ کے میں نے کیا کرنا ہے۔ میری لکشمی، میرا کُندن تو یہ لکشمی ہی ہے۔''

''سیٹھ، ذرا سوچ کے بولنا۔ ہم بول سُن کے ہی گئے تھے۔''

''میں بے حد شرمندہ ہوں۔ بیٹوں کے سامنے مجبور ہوگیا ہوں۔''

''ابھی رگھو کی طرف سے نہیں آئے ہیں۔ اپنی بٹیا کے ساتھ آئے ہیں۔''

''بٹھل بھائی، اڈّے باڑوں کو لوگ بدنام کرتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو ایسے سلوک کی امید تو دلہاڑے کے بھلے مانسوں سے نہیں تھی۔ لاکھوں کا کُندن واپس لے آئے۔ لکشمی کے سر پر چادر رکھ کے آئے۔ میں نے آپ سے دھوکا کیا اور آپ... آپ...'' سیٹھ کی آواز ڈوب گئی۔ اس کی آنکھوں میں شمعیں جلنے لگیں۔

''سیٹھ، اکیلے میں دو باتیں کرنی ہیں۔ اس کے بعد ہم چلے جائیں گے۔ فیصلہ تم کرنا۔'' بٹھل اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ خاصی عجلت میں لگتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اسے کیا بات کرنی ہے۔

''اوہ... بٹھل آجایئے... ضرور، آپ ہزار باتیں کرلیں۔''

سیٹھ بٹھل کو لے کر اندر کسی کمرے میں چلا گیا۔ لکشمی ایک مرتبہ پھر مچلنے لگی۔ لکشمی کی ماں دوڑی دوڑی آئی اور ایک مرتبہ پھر بیٹی سے چمٹ گئی۔ ماں بیٹی کی ہچکیوں سے انتظار گاہ کے در و دیوار لرز گئے۔ ماں اسے چمکارتی، لکشمی اَور روتی۔ ماں اس کے ساتھ مزید روتی۔ وہ دونوں کافی دیر تک یونہی روتی رہیں۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ انھیں کچھ کہتا۔ بٹھل نہ جانے اندر سے کیا فیصلہ کر کے نکلتا۔ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ لکشمی کے بھائیوں میں سے کوئی یہاں نہیں آیا تھا۔ چھلیا اُٹھ کے شرلی رام کے پاس چلا آیا تھا۔ دونوں کھسر پھسر کرنے لگے۔ بہت سارو لینے کے بعد دونوں کا جی ہلکا ہوگیا تھا۔ اب وہ خاصی مطمئن نظر آرہی تھیں۔

پھر جیسے لکشمی کی ماں کو خیال آیا، اس نے ملازم کو آواز دے کر بلایا۔ اور اشیائے خورونوش کا اہتمام کرنے کا کہا۔ میں نے اسے روکنا چاہا، ایسے حالات میں کھانا زہر مار کرنا ہی تھا۔ کچھ کہہ نہ سکا۔ کچھ دیر بعد ایک ملازم طشت میں سرخ شربت کے جام لادے چلا آیا۔ میں نے بہ مشکل ایک جام اٹھا لیا۔ لکشمی کی ماں سے مزید کچھ کھانے پینے سے معذرت کرلی۔ اس نے اصرار کیا مگر پھر خاموش ہورہی۔ بہت دیر ہو چلی تھی، بٹھل اب تک واپس نہیں لوٹا تھا۔

''دیپک بتا رہا تھا کہ آپ انگریزی بہت اچھی جانتے ہیں، خاصے پڑھے لکھے ہیں۔'' لکشمی کی ماں دھیرے سے بولی۔ وہ باوقار خاتون تھی۔ خوب صورتی میں لکشمی سے کم نہیں تھی اور نہ ہی اس کی ماں نظر آتی تھی۔

''زیادہ اچھی تو نہیں جانتا۔ تھوڑی بہت بول لیتا ہوں۔'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ اچھا ہُوا وہ بول پڑی، میں خاموش بیٹھے بیٹھے اُکتا گیا تھا۔

''لکشمی بتا رہی تھی، آپ کے سامنے کوئی سورما بھی زیادہ دیر نہیں ٹک سکتا۔''

''لکشمی ہی بہتر بتا سکتی ہے، مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے یک دم خجالت سی محسوس کی۔ ایسی براہِ راست تعریف گراں ہی گزرتی ہے۔

''سوچا، ہم بھی آپ سے کہیں آپ کے بارے میں۔''

''جی ضرور... میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''راج کمار لگتے ہو بابر... بٹیا!'' اس نے بابر کی ساتھ بٹیا کا لفظ خاصی تاخیر سے لگایا۔

اپنی ماں کو دیکھ کے لکشمی عجیب انداز سے کسمسائی۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ مزید یہ بات کرنے کی ہمت نہ پا کے مسکرا کے خاموش ہوگیا۔ لکشمی نے اپنے گھر کے بارے میں بڑے گھناؤنے انکشافات کیے تھے۔ سارا قصہ سیٹھ راج پٹیل کی معذوری سے شروع ہوتا تھا۔

''ہم بمبئی آئیں گے تو ہمیں بمبئی کی سیر کراؤ گے؟'' لکشمی کی ماں بات کرنے پر مُصر تھی۔

''کیوں نہیں... ضرور... آپ آئیں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

اس دوران میں بٹھل اور سیٹھ راج پٹیل اندر داخل ہوئے۔ انھیں دیکھ کے لاشعوری تحرک کے باعث سبھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بٹھل کے چہرے پر اطمینان تھا جب کہ سیٹھ کا چہرہ دُھواں دُھواں ہو رہا تھا۔ تاریکی اس کی صورت پر ثبت ہو کے رہ گئی تھی۔ مجھے اس لمحے سیٹھ راج پٹیل پر بے حد ترس آیا۔ اس کے بازو کندھوں پر محض جھول رہے تھے۔

''چھلیا! بلوا رے سب کو ادھری۔'' بٹھل نے چھلیا کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ کچھ انتظام کر کے چلے تھے۔ اس صورتِ حال کے منطقی انجام سے گویا بٹھل باخبر تھا۔ چھلیا دوڑا دوڑا باہر چلا گیا۔

''شرلی رام، بٹیا ادھری سے تیرے گھر جائے گی۔ ماسٹرنی سے نمٹ لے گا استاد۔''

''ارے بٹھل! ماسٹرنی کی ایسی کی تیسی۔ بُڈھیا ہوگئی ہے سالی۔'' شرلی رام سینہ ٹھونکتے ہوئے بولا۔

''لاڈلے! شرلی رام کے ساتھ چلا جا، رگھو اور بٹیا کو لے کے۔ ہم آرہے ہیں۔ جو ہو سکے کر لینا۔'' بٹھل بڑی تیزی سے احکامات دے رہا تھا۔

''موٹر لے جاؤں؟'' میں نے بٹھل سے پوچھا۔ رات کے اس پہر سواری ملنا ناممکن تھا۔ جب کہ موٹر کی بٹھل کو ضرورت پڑ سکتی تھی۔

''ہاں، لے جا! وہ دو چار موٹریں لے آیا ہوگا۔''

سیٹھ لکشمی کو سینے سے لپٹائے بلک رہا تھا۔ ''اِتنا کچھ ہوتا رہا میری بچی، تو نے کچھ بتایا بھی نہیں۔''

میں شرلی رام کے ہمراہ باہر نکل آیا۔ ادھر سے چھلیا گویا

پوری برات کے ساتھ آرہا تھا۔ میں سٹپٹا گیا۔

آخر یہ انتظام کیسے کرلیا گیا! یہ سب میرے سامنے ہی تو وہاں سے رخصت ہوئے تھے۔ یہ تیاری اس بات کی غماز تھی کہ بٹھل کو ہزار فیصد یقین تھا کہ وہ لکشمی کی ڈولی لے کے اٹھے گا۔ رگھو سفید کُرتے پاجامے اور گلابی پگڑی میں بھلا دکھ رہا تھا۔ ان کے ہمراہ پنڈت بھی تھا۔ آس پڑوس کی کچھ خواتین بھی تھیں۔ رگھو مجھے دیکھتے ہی گلے سے لگ گیا۔ میرے سینے میں آگ سی لگ گئی۔ میں یک دم اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھا تھا۔ کورا کہیں دُور مجھے دیکھ کے مسکرا رہی تھی۔ میرا جسم روح سے خالی ہو چکا تھا۔

میں نے بہ مشکل خود کو رگھو سے علاحدہ کیا۔ اسے مبارک باد دی اور شرلی رام کے ہمراہ وہاں سے نکل آیا۔ بٹھل لکشمی کو بیاہ کے اڈّے پر لانا نہیں چاہتا تھا۔ یعنی بٹھل بھی اڈّے کو گھر نہیں سمجھتا تھا۔ تو پھر چھوڑ کیوں نہیں دیتا یہ سب کچھ! گھر بار، بیٹی، رونق... سب کچھ تو ہے اس کے پاس۔ میں جانتا ہوں، یہ تھک گیا ہے۔ چار قدم کی سکت نہیں رہی ہے میں لکشمی کو بیٹا کہتے ہوئے کیسی شفقت اس کے لہجے میں در آئی تھی۔ نہ جانے کتنے باپ بٹھل کے اندر بھٹک رہے تھے۔

''پہلے تھانے جانا ہوگا۔ اجیت کی نوکری کا وقت ہے۔'' شرلی رام نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

میں چونک پڑا۔ ''جی جی.... جی ہاں، شرلی بابو!''

''تم ٹھیک تو ہو نا بیٹے! اجیت تمھاری بڑی تعریف کرتا ہے۔ اجیت کی ماں تمھارا درشن کے لیے ترس رہ گئی تھی۔''

ہمیں دیکھ کے پہرے داروں نے تعظیم سے دروازہ کھولا۔ مجھ میں شرلی رام بابو سے بات کرنے کی سکت نہ تھی، تاہم میں نے کہا۔ ''اجیت بہت ایمان دار اور دیش بھگت پولیس والا ہے۔''

''دیش بھگتی کی تعلیم اس کی ماں نے دی ہے اُسے... ہر وقت کسی نئی مصیبت میں پھنسا رہتا ہے۔ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔'' شرلی رام بھنّا کے بولا۔ وہ اپنی بیوی سے خاصا تپا ہُوا لگتا تھا۔

میرا سر بری طرح سے چکرا رہا تھا۔ ''آپ مجھے راستہ بتاتے جایئے گا۔'' میں نے موٹر چلاتے ہوئے کہا۔

''تمھیں بخار لگتا ہے بابر بیٹا!'' شرلی رام نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ شرلی رام اپنی نشست و برخاست سے ذرا بھی اڈّے والا نہیں لگتا تھا۔ وہ اس وقت ایک مہذّب اور نفیس آدمی کی طرح میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں چشمِ تصوّر میں اسے قاضی پاڑے کے ایک کھوکے میں کھٹا چونا لگاتے دیکھ سکتا تھا۔ محبت انسان کو کیا سے کیا کر دیتی ہے۔

''اتنی حرارت مجھے اکثر رہتی ہے۔ فکر کی بات نہیں۔'' میں نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

''بیٹا، یہ اچھی علامت نہیں ہے۔ فوراً ڈاکٹر سے معائنہ کرواؤ۔''

''ضرور کرواؤں گا۔'' حیل وحجت بے کار تھی۔ مزید گفتگو سے جان چھڑانے کا بہتر طریقہ یہی تھا کہ بات مان لی جائے۔

''نہیں، بلکہ میں خود تمھیں ایک ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔ اجیت کا دوست ہے وہ۔''

شرلی رام اپنی شفقت کے مجبور تھے۔ مجھ سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

کچھ دیر بعد ہم تھانے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اونگھتا ہُوا سنتری ہمیں دیکھ کے چوکنا ہو گیا تھا۔ شرلی رام کو موٹر سے اُترتا دیکھ اس نے فوراً سلامی دی۔

میں کار سے نہیں اُترا تھا۔ شرلی رام رُکے تو میں نے کہا۔ ''آپ اجیت کو لے آیئے، میں یہیں انتظار کر رہا ہوں۔'' حقیقتاً مجھ میں گاڑی سے اترنے کی سکت نہیں تھی۔

اس وقت کیا انتظام کیا جاسکتا تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ اجیت کی والدہ بن سکتی تھیں۔ اڈّے کے لوگ تو ہزاروں میں پہچانے جاتے ہیں۔ ان سے کیسے چھپائے جاسکتے تھے۔ شرلی رام کو بیوی کے نمٹنے کی اپنی صلاحیت پر شاید پورا بھروسا نہیں تھا۔ جبھی وہ اجیت کو پشت پناہی کے لیے ہمراہ لے جانا چاہتا تھا۔ اجیت کا مکان کشادہ تھا، جملہ عروسی کے لیے ایک کمرا تو بہ آسانی دست یاب ہو سکتا تھا۔ بٹھل نے مجھے کچھ سوچ سمجھ کے ہی بھیجا تھا۔ حالاں کہ یہ موقع میرے وہاں سے آنے کا نہیں تھا۔ راج پیٹل کے بیٹے کوئی ہنگامہ کھڑا کر سکتے تھے۔ مگر شاید بٹھل نے ماسٹرنی کے پاس ایک پڑھے لکھے اڈّے والے کو بھیجنا مناسب سمجھا تھا۔ یہ بھی دل چسپ صورتِ حال تھی، دلواڑا کے نامی گرامی بدمعاش کا جملۂ عروسی بھی قانون کے جری محافظ، انسپکٹر اجیت کے گھر میں بنایا جا رہا تھا۔ اوپر والے کے کھیل نرالے ہی ہوتے ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد شرلی رام بابو، انسپکٹر اجیت کے ہمراہ تھانے کی عمارت سے باہر نکلتے نظر آئے۔ میں نے موٹر چلانے کی ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کا یہ موقع غنیمت سمجھا۔ اس طرح اجیت کو راستے بتانے نہیں پڑتے۔ میں دروازہ کھول کر اُتر آیا۔ میرے پیروں پر میرا وجود سنبھالنے کی سکت نہیں تھی۔

''آہا...! بابر زماں...'' اجیت گلے سے لگ گیا۔ ''پتا جی تو بڑی گرما گرم خبریں سنا رہے ہیں۔ رگھو کی شادی سیٹھ راج پٹیل کی بیٹی سے! اور وہ بھی رات کے اس پہر... اور وہ بھی انسپکٹر اجیت کے گھر پر۔ ہاہاہا، مزہ آ گیا بابر!'' اجیت خوش دلی سے بولا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ کسی مصلحت کا شکار نہ ہو جائے۔

''ہاں، یہ سب کچھ میرے لیے بھی غیر متوقع ہے۔''

شرلی رام نے اجیت کو جلدی چلنے کا کہا۔ اجیت نے موٹر وہیں چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ اجیت اپنی جیپ اُڑاتا ہُوا بہت مختصر عرصے میں ایک سادہ اور باوقار مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ اِردگرد ہول ناک تاریکی اور گہرا سناٹا تھا۔ شرلی رام کے چہرے سے گھبراہٹ مترشح تھی۔ بٹھل کے سامنے اس نے جو سینہ ٹھونکا تھا، وہ واقعی تھکا ہُوا لگتا تھا۔ عزم اور حوصلے کو جمع کرتے ہوئے شرلی رام جیپ سے اُترا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ دروازے تک پہنچتے پہنچتے اجیت نے سست روی اختیار کر کے باپ کی پشت پناہی حاصل کر لی تھی۔ دستک کے فوراً بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ ماسٹرنی درمیانے قد کی ایک وضع دار خاتون تھی۔ اس نے ناک پر بڑے سلیقے سے نظر کی عینک جمار کھی تھی۔ کاسنی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی جس کے کساؤ میں ذرا بے ترتیبی نہ تھی۔ یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا کہ رات کے اس پہر یہ خاتون جائے استراحت سے اٹھ کر آ رہی ہے۔ بالوں میں ہلکی ہلکی سفیدی تھی جسے، کس کے جوڑا باندھ کر غیر نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

''فرصت مل گئی لفنگے بٹھل سے آپ کو!'' ماسٹرنی نے ٹھیری ہوئی مگر کرخت آواز میں کہا۔

''اَمّو راستہ چھوڑ دیں، مہمان ہے ہمارے ساتھ!'' اجیت نے مری مری آواز نکالی۔

''تم چپ کرو لڑکے! تمھارے باپ سے پوچھ رہی ہوں۔ نکلتے ہی چلے جاتے، گھر کیوں تشریف لائے ہیں؟'' ماسٹرنی نے اجیت کو گھرک دیا اور پھر شرلی رام پر چڑھائی کر دی۔

''روپا، یہ سے لڑنے جھگڑنے کا نہیں ہے۔ ہٹو ایک طرف۔'' شرلی رام پوری زندگی کا حوصلہ جمع کر کے بولے تھے۔ روپا کرور واقعی جوانی میں شعلہ رُخ رہی ہوں گی جو شرلی رام کو جلا کے خاکستر کر گئیں۔ اس عمر میں بھی وہ کم حسین و دل کش نہیں تھیں۔

''ہاں، یہ سے ایک عورت کے گھر میں اکیلے بیٹھ کر، اپنے پتی کا انتظار کرنے کا ہے۔ وہ پتی جو اڈّے پاڑوں پر، عیاش دوستوں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے گیا ہے۔'' ماسٹرنی بھنائی ہوئی لگتا تھا کہ رات کا یہ وقت اس نے پہلی مرتبہ تنہا گزارا ہے۔

''روپا! حد سے نہ بڑھو۔ اجیت، اپنی ماتا کو سمجھاؤ۔'' رام نے یک دم در آنے والے طیش پر قابو پایا اور اجیت کو میں گھسیٹ لیا۔

''یہ کون ہے تمھارے ساتھ؟'' ماسٹرنی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ اجیت کا دوست ہے!'' شرلی رام نے جلدی سے وضاحت کی۔

''آپ چپ کریں جی! اجیت کی ماں ہوں، جانتی ہوں یہ اجیت کا دوست نہیں ہے۔'' روپا کرور بہت ذہین عورت تھی جس وقت شرلی رام نے مجھے اجیت کا دوست بتایا تھا، عین لمحے اجیت کے چہرے پر غیر تائیدی تاثرات ابھرے تھے روپا کرور سے مخفی نہ رہے تھے۔

''بابر، برامت ماننا۔ میری ماتا جی بے حد اَ... ہیں۔ اپنے بنائے گئے اصولوں سے انحراف ان کی سرشت نہیں ہے۔'' اجیت نے مجھ سے انگریزی میں کہا۔

''کوئی بات نہیں اجیت! تمھاری ماں، میری ماں ... ہیں۔'' میں نے اجیت کو انگریزی ہی میں جواب دیا۔ میں آواز ذرا بلند رکھی۔ اجیت کی منشا سمجھ گیا تھا۔ روپا کرور اپنی ماں جیسی کہتے ہوئے اس کا چہرہ میرے سامنے گھوم گیا، مجھے دیکھ کے خاص انداز سے مسکرائی تھیں، مجھے ان ہاتھ کا زردہ بہت پسند تھا۔ میرے لیے ہمیشہ علاحدہ ... رکھا کرتی تھیں۔ منحوس بیٹے کا غم اُنھیں کھا گیا۔ سینے میں غبار سا اٹھ کے حلق تک آیا۔ پھر مجھے پتا نہیں چلا۔ چکر سا اور میں غش کھا کے گر پڑا۔

ذرا دیر میں حواس بحال ہوئے۔ اجیت اور شرلی رام ... دے کے مجھے بستر پر لٹا رہے تھے۔ روپا کرور پانی کے ... میرے مُنہ پر مار رہی تھی۔ میرا جسم ٹوٹ رہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ روپا کرور آگے ... کے میرا سر سہلانے لگی اور مٹھاس بھرے لفنگیں لہجے میں بولی ... بابر بیٹے، آپ اپنی ماں کے پاس ہی ہو... اجیت! اسے بہت بخار ہے۔ میرے کمرے سے دوائی کا بکس اٹھا لاؤ۔''

مجھے اس کی ممتا بھری آغوش میں بے حد سکون مل رہا ... جب کبھی مجھے بخار ہوتا تو امی اسی طرح رات بھر مجھے لے ...

... ہاتھ میں ... ٹوٹکے دم درود، جھاڑ پھونک کرتیں۔ ابا جان کو حکیم ... کی دکان اور بعض اوقات گھر تک دوڑائے رکھتی تھیں۔ ... امی کو ہمیشہ یاد کرتا، میرا دل اتنا ہی مٹھی میں آ جاتا۔ میں گھر ... جاتا تو کبھی بالاخانے نہ پہنچتی اور نہ ہی امی ہم دونوں ... میں اس جہاں سے جاتیں۔ میں اپنی ماں کا قاتل تھا! ... گھر کا قاتل!

... دوائی کا بکس اٹھا لایا۔ ماسٹرنی نے کچھ گولیاں ... حلق میں ڈال دیں اور ذرا سا سہارا دے کر مجھے اٹھایا پھر ... کا گلاس میرے مُنہ سے لگا دیا۔ میرا حلق کانٹوں کی آماجگاہ ... تھا۔ میں نے ان کی آن میں کٹورا خالی کر دیا۔ پانی پی ... میرے حواس بحال ہوئے تو مجھے ... آیا۔ نہ جانے کتنی دیر ... گئی ہے۔ بٹھل لکشمی کو رخصت کر کے پہنچنے والا تھا۔ میں ... سے اٹھ بیٹھا اور بستر سے نیچے اترنے لگا۔

''ارے ارے بیٹا! کیا کر رہے ہو، تمھاری طبیعت ٹھیک ... ہے۔'' ماسٹرنی اٹھ کے میرے سامنے آ گئی۔ شرلی رام اور ... میرے اضطراب کی وجہ سمجھ گئے تھے۔

''ماں جی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کی شفقت اور ... سے سرشار ہو گیا ہوں۔'' میرے لہجے میں خود بہ خود ... تھی۔

''آرام سے واپس لیٹ جاؤ اور پھر بات کرو اجیت، ... دوست کی مدد کرو۔'' ماسٹرنی کے لہجے میں پھر کرختگی سمٹ آئی تھی۔

اجیت نے مجھے اشارے سے دوبارہ بستر پر لیٹنے کو کہا اور ... ''بابر، تم آرام کرو اور فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب ... ہو جائیں گے۔''

میں ماسٹرنی کے تیور اور اجیت کا اشارہ پا کے پھر سے ... گیا۔

''بیٹا، تمھاری ماں جی کو کیا ہُوا؟ تم مدہوشی میں امی امی پکار ... تھے۔'' ماسٹرنی پھر میرے سرہانے آ بیٹھی تھی۔ پھر نہ ... اس نے میری دھندلائی ہوئی آنکھوں میں کون سی کہانی ... خود ہی بولی۔ ''اچھا اچھا، میں کچھ نہیں پوچھ رہی۔ آرام ...'' وہ اٹھ کے باہر نکل گئی۔ ''اجیت، ادھر آؤ۔ تم کس انتظام ... بات کر رہے تھے؟ یہ لڑکا کیوں پریشان ہے؟'' باہر جاتے ... ماسٹرنی اجیت کو بلا گئی تھی۔ شرلی رام بھی بھلا وہاں کیا ... وہ بھی چلے گئے۔ پھر گھر کے اندر کہیں سے ان کے تیز ... بولنے کی آوازیں آتی رہیں۔ ماسٹرنی کی آواز سب سے بلند

محبت

محبت کے کئی روپ ہیں اور ہر روپ لافانی حیثیت کا حامل ہے۔ محبت خدا ہے اور خدا محبت ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو انسان کو زندگی کا سرور بخشتا ہے اور جینے کا ڈھنگ سکھاتا ہے۔ محبت ایک روشنی ہے جو ہر دل کو منور کر دیتی ہے اور دل کا ہر گوشہ محبت کا پیمانہ بن جاتا ہے۔ محبت انسان کے دل کے تاروں کو سرگم بنا دیتی ہے۔ محبت کے رنگ ہر آنکھ کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں تو دُنیا بہت حسین دکھائی دینے لگتی ہے۔ ہر طرف محبت کی کلیاں بکھری نظر آتی ہیں۔ محبت دل کے جذبوں کی سچائی ہے۔ محبت زندگی کا سُر سنگیت ہے جو انسان گنگنائے تو چاروں طرف جل ترنگ بج اٹھتے ہیں اور قوسِ قزح کے رنگ بکھر جاتے ہیں۔ یہ وہ جذبہ ہے جو نفرت کی آگ کو سرد کر دیتا ہے۔ دشمن دل کو بھی پیار میں بدل دیتا ہے۔ محبت دونوں جہاں کی پناہ ہے۔ محبت دل کی صدا ہے جو ہر دل تک اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ محبت زندگی کا سرور ہے، زندگی کی جھنکار ہے، مہکار ہے اور مترنم گیت ہے جو ہر دل میں سما جائے اور ہر دھڑکن کی صدا بن جائے۔

ابن حسن عثمان آبادی کے قلم سے

تھی۔ خاصی دیر ان کی کھسر پھسر چلتی رہی۔ مجھے فکر ہو رہی تھی کہ کہیں یہ ماسٹرنی لکشمی کی ڈولی دروازے سے واپس نہ کر دے۔ ہندوؤں کے ہاں اسے بہت برا شگون سمجھا جاتا ہے۔ آخر کافی دیر بعد ماسٹرنی غصے میں بھری، طمطماتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور سیدھا میرے کُرتے کی جیب پر ہاتھ مارا۔

جیب میں چاقو موجود تھا۔ ماسٹرنی روپا کرور نے وہ چاقو نکال لیا۔ میں نے اذیت سے آنکھیں موند لیں۔

''اس چاقو سے چھیننے کے لیے میں نے کلکتہ، اپنا گھر بار، سب کچھ چھوڑا اور آج یہ چاقو میرے گھر میں پھر گھس آیا ہے۔'' ماسٹرنی روپا کرور کی آنکھوں میں شعلے رقص کر رہے تھے اور پیشانی عرق آلود تھی۔

اس دوران میں اجیت اور شرلی رام بھی قدموں کی تیز آواز کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ شرلی رام بابو خاصے برہم نظر آ رہے تھے۔

ماسٹرنی روپا کرور نے میری طرف دیکھا۔ نہ جانے اُس نے کیا دیکھ لیا تھا، وہ مسکرائی۔ اس کے چہرے کے سکڑے

ہوئے عضلات دھیرے دھیرے نرم پڑتے چلے گئے۔ وہ کچھ دیر تفکر کے عالم میں کھڑی رہی۔ پھر اس نے مسکرا کے دوبارہ میری طرف دیکھا اور چاقو شرلی رام بابو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے، مگر ان سب سے کہنا اپنے چاقو گھر سے باہر پھینک کے آئیں۔“

دوا اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ میری غنودگی بڑھتی چلی گئی۔ آخر مجھے اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔

دوسرے دن جب میری آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا۔ روشن دان سے دھوپ کمرے کے فرش پر پڑ رہی تھی۔ کمرے میں گہما گہمی تھی۔ دھیارا سرہانے بیٹھا میرا سر دبا رہا تھا۔ فرش پر عنابی رنگ کی تپائی بچھی ہوئی تھی جس پر بٹھل بیٹھا مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔ خلاف معمول اس کے ہاتھ میں بیڑی یا حقے کی نے نہیں تھی۔ یہ ماسٹرنی کی کرامات تھیں۔ بٹھل کے ہمراہ ایک طرف شرلی رام اور دوسری جانب چھلیا بیٹھا ہُوا تھا جب کہ داہنی دیوار سے سیٹھ راج پٹیل لگا بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ رگھو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ مجوب سا تھا جب کہ سیٹھ راج پٹیل گاہے بہ گاہے اس سے کھسر پھسر کر رہا تھا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کے سب سے پہلے رگھو اٹھ کے میری جانب آیا۔

”لاڈلے! تُو نے بتایا ہی نہیں، تجھے تاپ چڑھا ہُوا تھا۔“

میں نے مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔ مزید میں کیا کہتا۔ اس دوران میں سبھی میری طرف سمٹ آئے تھے۔ طبیعت بشاش معلوم ہو رہی تھی۔ میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔

”سوامی جی، کیا کرنے کا ہے؟ ابھی ادھری اپنے رگھو کا سادی... ادھری تم لم لینے کا ہے سوامی جی!“ چھلیا نے سرہانے آ کے گردن پر چٹکی بھری۔

بٹھل بھی اٹھ آیا تھا۔ مگر وہ کچھ بولا نہیں، بھنّایا ہُوا لگتا تھا۔ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ ”نوٹنکی بند کردے۔ چل، اتر آ نیچے۔“ بٹھل نے مُنہ پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ بٹھل اب بٹھل نہیں رہا تھا۔

ان کے چہروں سے لگتا تھا کہ رات تمام کام خوش اسلوبی سے نمٹ گیا تھا۔ شبِ عروسی منالی گئی تھی۔ رگھو کی ہتھیلیوں پر بھی منہدی رچی ہوئی تھی۔ میں بستر سے اتر آیا۔ شرلی مجھے روکنے لگا تھا مگر بٹھل نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا تھا۔ اجیت مجھے غسل خانے تک چھوڑ آیا۔ غسل خانے سے جب میں باہر آیا تو خود کو بشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔ بھرپور نیند نے کسل مندی کو رخصت دے دی تھی۔ میرے کمرے میں آتے ہی ناشتے کا شور پڑ گیا۔ دسترخوان دالان میں بچھایا گیا تھا۔ صحن میں سوت کی نم آلود چادر تان کے سایہ کیا گیا تھا۔ گمرو ندے کے جھاڑ دیواروں پر منڈلا رہے تھے۔ ماسٹرنی نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ ملازمین دوڑتے پھر رہے تھے۔ وہ حلیے بشرے سے پولیس والے دکھائی دیتے تھے۔ آناً فاناً دسترخوان پر قابیں چُن دی گئیں۔ پوریوں سے بھرے طشت بیچ میں رکھ دیے گئے۔ گرما گرم بھاپ اُڑاتے چھولوں اور بھجیا سے بھرے ڈونگے بھی چُن دیے گئے۔ ماسٹرنی روپا کرور بار بار آتی جاتی دکھائی دیتی تھی۔ ملازم اس کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر میری طرف لپکی آتی تھی۔ میری طبیعت کی خوب تسلی کر کے پھر گئی۔ انتظام کی ذمے داری نہ ہوتی تو شاید اس آسانی سے نہ جاتی۔ کچھ طشت کچوریوں سے بھرے ہوئے بھی آئے اور انواع واقسام کے حلوے ڈونگوں میں بھر کے رکھ دیے گئے جن کی میٹھی میٹھی خوش بو بھلی لگ رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی سفید کٹوریوں میں رنگ بہ رنگی چٹنیاں بھی تھیں، بٹریوں کے سالن تھے۔ خواتین کے لیے اندر کمرے میں اہتمام کیا گیا تھا۔ معلوم ہُوا تھا کہ لکشمی کی ماں بھی آئی ہوئی ہیں۔ میں بٹھل کے ساتھ جا بیٹھا تھا۔ طبیعت سے کسل مندی دُور ہوئی تو بھوک بھی چمکنے لگی تھی۔ زور کا جوع بھی آ گئے تھے۔ اڈّے سے اَور بھی کئی لوگ آئے ہوئے تھے۔ ماسٹرنی کا دالان کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ اجیت اور شرلی رام بھی دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ بٹھل کے تیور بگڑے ہوئے لگتے تھے۔ ناشتا شروع ہو گیا تھا۔ ہر چیز لذت سے بھری ہوئی تھی۔ ناشتے کے بعد چائے کا دَور شروع ہُوا۔ چائے سے فراغت پاتے ہی بٹھل اٹھ کھڑا ہُوا۔

”ابھی ہمیں اجازت دیو... ادھری مٹی ہو رہا ہوگا۔“ بٹھل شرلی رام کے گھر سے نہیں، دلواڑا سے جانے کی بات کر رہا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی میں، جمرو اور زورا بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اے دادا، کدر کو جانے کا۔ آرام سے بیٹھنے کا ہے۔“ چھلیا لپک کے اٹھ آیا۔

”دو چار دن میں رگھو کو بمبئی بھیج دینا... سنبھال لیں گے۔“ بٹھل نے چھلیا کی سنی ان سنی کر دی۔

”بٹھل بھائی، یہ ناممکن ہے۔ آپ کو کچھ دن سیوا کا موقع ضرور دینا ہوگا۔“ سیٹھ راج پٹیل بھی تڑ مڑا کے اٹھا۔ سب سٹپٹا گئے تھے کہ یہ بٹھل کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی ہے۔

بٹھل کا اضطراب سمجھ رہا تھا۔ میرے لیے اس کی یہ بات ناقابلِ فہم نہیں تھی۔

”ابھی ادھر اڈّے پر چلو، دادا اُدھری سے جانا۔“ رگھو بھی دھیرے سے بولا۔

”اؤ! تیرے مُنہ سے نہیں سنیں گے رے۔ ادھری سے بمبئی۔ دو چار دن ماسٹرنی سے سیوا کروالے۔“ بٹھل کسی کی نہیں سن رہا تھا۔ میں نے بٹھل کو ممنونیت سے دیکھا۔ پڑھنے والے لوشتہ پڑھ لیتے ہیں۔ بٹھل کے جانے کا غلغلہ ایسا مچا کہ اس کی آن میں وہاں جمگھٹا لگ گیا۔ چھلیا، رگھو اور سیٹھ راج پٹیل نے بہتیرا کہا کہ بٹھل ایک دن مزید رُک جائے مگر بٹھل نے ایک پل بھی مزید رُکنے سے انکار کر دیا تھا۔ دھیارا اور لکشمی بیوں میں پڑ گئے کہ انھیں بھی ساتھ لے جایا جائے۔ بہری بھی انھیں ساتھ لے جانے کی مرضی تھی۔ بٹھل نے انھیں بھی منع کر دیا۔ کہا کہ رگھو کے ساتھ وہ بھی بمبئی آ جائیں۔

ماسٹرنی نے سنا تو وہ بھی دوڑی دوڑی آئی۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ رات بٹھل سے اس کی خوب گُٹھی ہے۔ ”بٹھل بھائی، آپ بہن کے گھر سے اجازت کے بغیر نہیں جا سکتے۔“ روپا کرور نے خود کو بٹھل کی بہن کہا تھا۔ وہ بٹھل کے راستے میں آ کھڑی ہوگئی۔

”ہمیں جانا ہے۔ بہنیا کے گھر پھر آئیں گے ری۔“ بٹھل کی آواز نرم پڑ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کے ماسٹرنی کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ جب بٹھل نے کچھ پیسے ماسٹرنی کے ہاتھ پر رکھے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اجیت نے ماں کو سنبھال لیا۔ وہ بار بار بٹھل کے دیے ہوئے پیسے چومتی تھی اور کہتی تھی۔ ”بٹھل بھائی، میرا کوئی بھائی نہیں تھا۔ بٹھل بھائی، میرا کوئی بھائی نہیں تھا۔“

شرلی رام کی آنکھیں بھی نم ہو رہی تھیں۔ وہ بھڑک کے بٹھل کے سینے سے لگ گیا۔ اور اُبلتی ہوئی ہانڈی کی طرح ہلکنے لگا۔ ہر آنکھ اشک بار تھی اور ہر چہرہ سوگ وار۔ بنارسی لہنگے میں ملبوس لکشمی بھی چلی آئی تھی، اس کی ماں بھی ساتھ تھی۔ لکشمی نے جب سنا کہ ہم جا رہے ہیں تو مچل گئی۔ اسے بڑی مشکل سے سنبھالا گیا۔ آخر طے یہ پایا کہ رگھو ہفتہ بھر شرلی رام کے گھر رہے گا اور اڈّے سے اس کا اب کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اگلے روز دن رگھو، دھیارا اور منگو کے ہمراہ بمبئی چلا آئے گا، جہاں وہ اور سیٹھ راج پٹیل مشترکہ سرمایہ کاری سے ایک مل لگائیں گے۔ رگھو اور لکشمی کچھ دن ابا جان کے پاس بہ طور مہمان ٹھیریں گے۔ اس کے بعد اپنے مکان میں منتقل ہو جائیں گے۔ بھُوا مہا جن کی جائیداد اور دولت کا مصرف بھی ہو گیا تھا۔ ماسٹرنی روپا کرور ایک اناتھ آشرم چلا رہی تھی جس کے اخراجات مخیر حضرات کے تعاون سے پورے کیے جاتے تھے، تاہم تنگی کا عذر موجود تھا۔ اناتھ آشرم کا تذکرہ یوں سامنے آیا کہ چلتے چلتے مجھے بھُوا مہا جن کی جائیداد اور دولت کا خیال آ گیا تھا۔ میں نے رگھو سے کہا تھا کہ اسے یہاں کسی رفاہی کام میں خرچ کر دیا جائے۔ تب اجیت نے بتایا کہ امّو ایک اناتھ آشرم چلا رہی ہیں جو کہ آج کل مالی مسائل کا شکار ہے۔ اوپر والا یوں ہی کام بنایا کرتا ہے۔ میں نے ایک سادہ کاغذ لکھ دیا جس پر سیٹھ راج پٹیل اور انسپکٹر اجیت جیسے معتبر گواہان نے دست خط کر دیے، باقی تمام معاملات نمٹانے کا ذمے رگھو نے لے لیا تھا۔ وہ بے انتہا خوش اور مطمئن نظر آتا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے خوش دیکھ کے میرا دل بجھ بجھ جاتا تھا۔

بمبئی پہنچنے کے لیے دو دو رائج تھے۔ اگر ہم سمندری راستے سے جاتے تو یہاں سے پور بند جانا پڑتا۔ وہاں سے چھوٹی کشتیاں بمبئی جاتی تھیں۔ دوسرا راستہ ریل گاڑی کا تھا۔ بمبئی کی ریل گاڑی جونا گڑھ سے ملتی۔ بٹھل نے ریل گاڑی کے ذریعے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو سیٹھ نے اپنی موٹر اور ڈرائیور ہمارے ساتھ کر دیے۔ ڈرائیور ہمیں جونا گڑھ ریلوے اسٹیشن تک چھوڑ کے واپس آ جاتا۔

موٹر میں بیٹھتے بیٹھتے ہمیں گھنٹا مزید لگ گیا۔ ماسٹرنی روپا کرور نے تانبے کے توشہ دان میں کھانا باندھ دیا تھا۔ وہ بار بار روئے جاتی تھی۔ نہ جانے بٹھل نے رات اس پر کیا جادو کیا تھا۔ چھلیا بھی زبردستی موٹر میں بیٹھ گیا۔ بٹھل نے ہر چند اسے منع کیا مگر وہ بہ ضد رہا کہ جونا گڑھ سے واپس آ جائے گا۔ ڈرائیور نے بھی تو آنا ہی ہے! جب موٹر چلی تو سبھی کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔ دھیارا اور لنگو دُور تک دوڑتے آئے۔ دھیارا دھاڑیں مار مار کے رو رہا تھا۔ جب تک موٹر ان کی نظروں سے اور وہ ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہوئے، وہ ہاتھ ہلاتے رہے اور ہم سب انھیں مڑ مڑ کے دیکھتے رہے۔ دلواڑا سے جونا گڑھ کا سفر کچھ زیادہ نہیں تھا۔ سڑک پختہ اور کشادہ تھی، گھنٹا بھر میں ہم جونا گڑھ کے ریلوے اسٹیشن کے باہر تھے۔ اسٹیشن پر گہما گہمی کا منظر تھا۔ مسافر تیزی سے اندر کی جانب دوڑے جا رہے تھے۔ شاید کوئی ریل جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ہم جلدی جلدی موٹر سے اتر آئے۔ گیروے لباس میں ملبوس یاتریوں کے جھنڈ

کے جھنڈا اسٹیشن پر بکھرے ہوئے تھے۔ چھلیا نے بتایا کہ گرمناتھ کا میلا شروع ہونے والا ہے جس میں شرکت کے لیے پورے ہندوستان سے یاتری یہاں آتے ہیں۔

میں ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر پہنچا تو وہاں قطار لگی ہوئی تھی۔ میلے کی وجہ سے اسٹیشن پر خلاف معمول ہجوم تھا۔ میں نے اپنے سے آگے کھڑے ہوئے ادھیڑ عمر شخص سے پوچھا کہ بمبئی جانے والی ریل کب روانہ ہوگی۔ تو اس نے مجھے مفید مشورہ دیا کہ براہِ راست بمبئی جانے کے لیے تو ایکسپریس شام سات بجے روانہ ہوگی... لیکن اب سے پندرہ منٹ بعد ایک ریل یہاں سے بھوپال کے لیے روانہ ہونے والی ہے، ہمیں اس میں سوار ہوجانا چاہیے اور احمد آباد اتر کے بمبئی کے لیے ریل پکڑنی چاہیے۔ احمد آباد سے ہر گھنٹے بعد بمبئی کے لیے ٹرین ملتی ہے۔ اس کی بات معقول تھی۔ شام سات بجے تک بمبئی ایکسپریس کا انتظار فضول تھا۔ میں نے ٹکٹ گھر سے ٹکٹ لینے کا ارادہ ترک کیا اور بٹھل کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرکے پلیٹ فارم کی جانب بڑھ گیا۔ ٹکٹ گھر میں باری آنے تک ٹرین روانہ ہونے کا امکان تھا۔ پلیٹ فارم پر دُور تک زرد رنگ پھیلا ہُوا تھا۔ بیش تر یاتریوں نے پلیٹ فارم ہی کو ٹھکانا بنایا ہُوا تھا۔ ریل تیار کھڑی تھی۔ ہمارے پہنچتے ہی انجن نے بھونپو بجادیا۔ جوڈبا سامنے نظر آیا، ہم اسی میں سوار ہوگئے۔ چھلیا بلک بلک کر رونے لگا۔ بٹھل نے اس کی چھاتی پر دوہتڑ مارے اور بھینچ لیا۔ ''آئیں گے رے... ادھر آجا تار گھو کے ساتھ۔''

''ابھی استاد جاستی کرنے کا ہے۔ سیدا کا دکھت نہیں ملنے کا ہے استاد!'' چھلیا بڑبڑانے لگا۔

ریل گاڑی نے رینگنا شروع کردیا تھا۔ ہم ٹرین میں چڑھ چکے تھے۔ بٹھل ٹرین میں سوار ہُوا تو چھلیا دوڑا چلا آیا تھا۔ وہ کافی دُور تک ریل کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا۔ یہاں تک کہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ احمد آباد تک کا سفر ہمیں کھڑے کھڑے ہی گزارنا تھا، سو ہم نے گزارا۔ قریباً چار گھنٹوں کے بعد ریل احمد آباد اسٹیشن پر جا ٹھیری۔ ہم وہاں اُتر گئے۔ یہ ریل آگے اندور، اجین سے ہوتی ہوئی بھوپال جارہی تھی۔ جب کہ ہمیں اترائی کی طرف بمبئی جانا تھا۔ جتنا سفر ہم طے کرآئے تھے، اتنا ہی سفر آگے بمبئی کے لیے تھا۔

بٹھل پانی کی ٹنکی کی طرف بڑھ گیا۔ میں اسے بتا کے اگلے گاڑی کی معلومات اور ٹکٹ لینے چلا گیا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی سنسان پڑی تھی۔ اندر کرسی پر بیٹھا ہُوا شخص اونگھ رہا تھا۔

''بمبئی کے لیے چار ٹکٹ فرسٹ کلاس میں چاہئیں۔'' میں نے کھنکھارتے ہوئے کہا تو وہ آدمی چونک کے سیدھا ہوگیا۔

''کون سی گاڑی سے جاؤ گے؟'' اس نے جماہی لیتے ہوئے پوچھا۔

''جس کی روانگی قریب ترین اوقات میں ہو، اس کے ٹکٹ دے دیں۔''

اس نے جلدی جلدی مہریں لگا کے چار ٹکٹ مجھے تھما کے پیسے وصول کرلیے۔

ہم دن کے چار بجے احمد آباد اسٹیشن پر اترے تھے اور تقریباً چھ بجے ٹرین وہاں سے روانہ ہوئی۔ نداد، کجن، سرسا، وساد، ودوڑا، پانڈواور اس طرح کے چھوٹے چھوٹے قصبوں پر ٹھیرتی ہوئی رات گئے صورت پہنچی۔ بٹھل راستے بھر سوتا آیا تھا۔ جوں جوں بمبئی قریب آرہا تھا، میرے دل کی نشست برخاست بے ہنگم ہونے لگی تھی۔ ابا جان، فرخ، جمیلہ، ماں جولین، گیتا اور بہت سے چہرے میرے اردگرد اکٹھے ہوئے۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہُوا چاہتا تھا جب ٹرین روانہ ہوئے۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہُوا چاہتا تھا جب ٹرین ہمیں دادر ریلوے اسٹیشن پر اُتارا۔ میں گھر پہنچنے کے لیے تاب ہو رہا تھا۔ کئی ماہ ہوچکے تھے ابا جان سے ملے ہوئے۔ مجھے یقین تھا، سخت ناراض ہوں گے۔ مولوی صاحب بھی بمبئی میں دیکھے گئے ہوسکتا ہے، اب یہ دشت نوردی اختتام کو پہنچنے والی ہو۔ ممکن ہے مولوی صاحب کو مجھ پر رحم آگیا ہو اور مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے بمبئی میں میرے گھر آپہنچے ہوں۔ خوش گمانیاں ہی تو انسان کو زندہ رکھتی ہیں۔ نہ جانے مولوی صاحب نے مجھ سے کیا گمان باندھ لیا تھا۔ شاید وہ یہی سمجھے تھے کہ میں کورا کو ان سے جدا کردوں گا۔ میں ایسا قصور کبھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ مجھے اتنا کم ظرف، بے حس اور سنگ دل کیوں سمجھتے تھے۔ وہ مجھ پر ہی نہیں، کورا پر بھی جبر کررہے تھے۔ کیا اتنے دنوں میں بھی یہ نہیں جان سکے تھے کہ کورا اپنی بھی نہیں ہے۔ وہ اسے اعلیٰ سے اعلیٰ لباس، بہترین غذائیں فراہم کرسکتے ہیں، مگر کیا وہ اس کی آنکھوں کو چمک اور اس کے ہونٹوں کو مسکراہٹ دے سکتے ہیں۔ انھیں کورا کا اس قدر خیال ہے ایک سامنے کی بات ان کی عقل میں کیوں نہیں سما رہی ہے۔ میری صورت، میری حیثیت کورا کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ میں اچھا ہوں یا برا، میرے چہرے پر سیاہی ملی ہوئی ہو یا سفیدی، جیل سے میں بدمعاش بن کے نکلا ہوں یا شریف میں جیسا بھی ہوں، وہ مجھے اپنی قسمت سمجھ کے قبول کرلے گی

ہے۔ کاش، کوئی مولوی صاحب کو جا کر کہہ دیتا کہ میرے پاس بے انتہا دولت آچکی ہے، وہ سب کی سب ابا جان نے فیض آباد میں پوشیدہ کررکھی ہے۔ مولوی صاحب کو میں تمام دولت دے سکتا ہوں۔ مجھے یقین ہے ابا جان معترض نہ ہوں گے۔ مولوی صاحب وہ ساری دولت لے جائیں... بس، ایک بار کورا کو مجھے دے جائیں۔ اب میرا صبر جواب دے چکا ہے۔ یہ میں نہیں ہوں، مولوی صاحب اور بابر زماں نہیں جسے آپ نے سترہ برس کی عمر میں شیروانی پہنے دیکھا تھا۔ مولوی صاحب، اس بابر زماں کو وقت نے کرچی کرچی کردیا ہے۔ نوبت، سفر ختم کرنے تک آن پہنچی ہے۔ مگر سفر بھی ختم کیا جاسکتا ہے! نہیں، سفر کبھی اختتام پذیر نہیں ہوتا، البتہ ہمراہی تبدیل کیے جاسکتے ہیں۔ کاش مولوی صاحب، مجھے یقین ہوجائے کہ آپ کورا کے ہمراہ اس شہرِ نارسا میں موجود ہیں۔ کاش مولوی صاحب، ہوا میں کچھ ایسی تاثیر ہوتی کہ یہ بدحال مسافروں کو راستے بتادیا کرتی۔ اچھا ہُوا تھا کہ میں نے سیٹھ راج پٹیل کی کوٹھی کا پتا معلوم کرلیا تھا۔ ممکن ہے، میں نہ کھوج سکا لیکن شاکر بھائی نے انھیں کھوج لیا ہو۔

ٹم ٹم ابا جان کی عالی شان حویلی کے باہر آرکی۔ مجھے خبر ہی نہ ہوسکی کہ کب ہم دادر سے باہر نکلے اور ٹم ٹم میں سوار ہوئے۔ قندیلیں انگارہ ہورہی تھیں۔ مکان کے در و دیوار پر تازہ روغن کروایا گیا تھا۔ بیرونی دیوار کے ساتھ دُور تک سبزہ چلا گیا تھا۔ دروازے پر مسلح پہرے دار چوکس کھڑا تھا۔ ہم جیسے ہی ٹم ٹم سے اترے، وہ بندوق سنبھال کے مزید چوکس ہوگیا۔ وہ ہمارا شناسا نہیں تھا۔ ابا جان نے ہماری غیر موجودگی میں اسے ملازم رکھا رکھا ہوگا۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا، اس نے بندوق تان لی۔ ''اپنی شناخت بولو۔''

ابا جان نے خاصے شاہانہ ٹھاٹ باٹ اپنا لیے تھے۔ ''بابر زماں خاں!'' میں نے مختصر جواب دیا۔ مجھے گھر کے باہر یہ باوردی دربان اچھا لگا تھا۔

''بابر زماں خاں!'' وہ آنکھیں پٹپٹانے لگا اور قدرے آگے آکے مجھے گھورنے لگا۔ پھر جیسے وہ مجھے پہچاننا ہو۔ اُلٹے قدموں اندر دوڑ گیا۔

میرے نام سے یہ فرد واقف ہوگا۔ کیا گھر میں تذکرہ نہ ہوتا ہوگا۔ مگر صرف نام بتانے سے شناخت نہیں ہوتی، بابر زماں خاں تو کوئی بھی اپنی زبان سے ادا کرسکتا ہے۔ لمحوں میں پورا گھر بیدار ہوتا محسوس ہُوا۔ راہ میں پتھریلی دیوار حائل تھی، مگر اس پار بچ جانے والی افراتفری بہ خوبی دیکھی جاسکتی تھی۔ دھیما دھیما

شور، خوشی میں پھوٹتی چنگاریاں، جذبوں کے وجود سے اُمڈنے والا سیلاب، سبھی کچھ تو میں دیوار کے اُس پار دیکھ رہا تھا۔

دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا، سب سے پہلے جہاں گیر نظر آیا، وہ ننگے پاؤں ہی اٹھ دوڑا تھا۔ وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح نکلا اور مجھ سے چمٹ کر بلکنے لگا۔ میرے اندر بھی سیلاب اُمڈنے لگا۔ میں نے اسے بھینچ لیا۔ چند مہینوں میں وہ بڑا بڑا ہو گیا تھا۔

''بھائی جان، یہ آپ ہی ہیں!'' جہاں گیر وارفتگی سے مجھے چومنے لگا۔ پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ مجھ سے جدا ہو کر بٹھل سے جا لگا۔ ''بٹھل بھائی!'' ہچکیوں کا طوفان تھا جو تھمتا نہ تھا۔

میں نے قدم بڑھائے تو ابا جان کھڑے تھے۔ متانت اور وقار سے، مگر آنکھیں متانت اور وقار کا بوجھ کب اٹھا سکتیں۔ آنکھیں تو چٹانوں کے مانند جھرنوں کو سنبھالے پھرتی ہیں کہ کب گر پڑے! میں ابا جان سے لپٹ گیا۔ اب میری ہچکیوں کا موسم تھا۔ کیسی شفقت تھی ان کی پناہ میں، کیا حدّت خیز جادو تھا ان کے لمس میں، لمحوں میں پگھلا کے رکھ دیا۔ ابا جان مُنہ سے مسلسل کچھ بدبدا رہے تھے اور بڑھ بڑھ کے مجھ پر پھونک رہے تھے۔ اور میں تھا کہ مجھے ان کی آغوش میں نیند آنے لگی تھی۔ معاً مجھے اپنے کندھے پر کسی کے لمس کا احساس ہُوا، گداز اور معصوم شکوہ! وہ فرخ تھی۔ شکایتوں کا ڈھیر معلوم ہوتی تھی، آج اس کی آنکھوں سے غصّہ جھلک رہا تھا۔ فارہہ اور فریال بھی تھیں، اکبر بھی۔ ان سب کی ہچکیاں بندھ رہی تھیں۔ میں ابا جان سے جدا ہُوا تو تتلیاں ہی تھیں جو مجھ سے چمٹ گئی تھیں۔ فرخ مجھے چھُو چھُو کر دیکھتی تھی کہ یہ میں ہی ہوں نا؟ سب کچھ صحیح سلامت ہے نا۔ فارہہ اور فریال میرے بازوؤں میں جھول گئی تھیں۔ اکبر سامنے سے مجھے لپٹا ہُوا تھا۔ فرخ کی وارفتگی میں ناراضی تھی۔ وہ بہت کچھ لیے بیٹھی تھی۔ وقت ملنے پر بہت سا ادھار چکانے کا سوچ رہی ہوگی۔ ابا جان بٹھل سے شکایتیں کر رہے تھے۔ بٹھل خاموشی سے ان کے سینے لگا ہُوا تھا۔ پھر خود بہ خود میری متلاشی نظریں ایک طرف اٹھ گئیں۔ وہ مجھے نظر آ گئی۔ سفید اور سادہ لباس میں سراپا مہتاب، جولین کچھ فاصلے پر کھڑی، خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے قیام میں حجاب تھا۔ وہ جہاں کھڑی تھی اس سے اگلا قدم اس کے بس میں نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی چمپا بیگم بھی کھڑی تھیں۔ ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا، ہاتھ میں تسبیح مسلسل گردش کر رہی تھی۔ جگنو اور دیوا بھی بٹھل کے پیروں سے لپٹے ہوئے تھے۔ فارہہ اور فریال مجھ میں یوں پیوست تھیں گویا میرے وجود کا حصّہ۔

دروازے پر جمگھٹا لگ گیا۔ دربان ایک طرف کھڑا اپنی آنکھیں پونچھ رہا تھا۔ پھر مجھے گیتا نظر آئی اور رانی بھابی بھی۔ وہ سراسیمگی کے عالم میں چلی آ رہی تھیں۔ شاید شور سے آنکھ کھل گئی ہوگی۔ مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ ان کا یہاں قیام عارضی ہے یا مستقل اٹھ آئی تھیں۔ شاید ابا جان لے آئے ہوں۔ گیتا نے جب مجھے دیکھا تو وہیں پتھر کی ہوگئی۔ شاید اسے بٹھل نظر آ گیا تھا۔ وہ دوڑی اور ایسی دوڑی کہ زندگی میں کبھی نہ دوڑی ہوگی۔ اور بٹھل کی آغوش میں سما گئی۔ بٹھل جیسا آدمی کب روتا ہے۔ مگر وہ بھی رو پڑا تھا۔ گیتا نے وہ رنگ جمایا کہ سب اپنی کیک بھول گئے، اس کی فکر پڑ گئی۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی غش پر غش پڑ رہے تھے۔ ''بابا... آپ مجھے چھوڑ کے چلے گئے تھے... بابا! بابا! اب نہیں جاؤ گے نا بابا۔''

''نہیں جائیں گے، ری... نہیں جائیں گے۔'' بٹھل کی آواز سمندروں میں ڈوب رہی تھی۔

''نہیں، آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ وچن دیا تھا، اب نہیں جاؤ گے!'' گیتا بری طرح تڑپ رہی تھی۔ شاید پیرو دیوی آ گیا تھا۔

''کہیں نہیں جائیں گے... بٹیا کے پاس ہی رہیں گے۔'' بٹھل بکھر رہا تھا۔ مجھے تو لگتا تھا کہ گیتا نہیں بٹھل بیٹھ ہو گیا ہے۔

''بٹھل بھائی، آپ مجھ کو کا گھر بھول گئے۔'' رانی بھابی پتھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑی تھیں اداس اور سراسیمہ۔

بٹھل نے فوراً آگے بڑھ کر رانی بھابی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ بٹھل نے مُنہ کندھے کی طرف پھیرا ہُوا تھا۔ رانی بھابی سسکنے لگی۔

''لڑکیو! دروازے پر کھڑے رہنا مناسب نہیں ہے!'' ابا جان کھنکھار کے بولے۔ ان کی آواز میں اعتماد لوٹ آیا تھا۔ وہ ویسے بھی اس آنے جانے کے عادی تھے۔

ابا جان کی آواز سُن کے جیسے سب کو ہوش آ گیا۔ فارہہ اور فریال مجھ سے علاحدہ ہونے کو تیار نہ تھیں۔ میرے ساتھ ساتھ ہی اندر گئیں۔ چمپا بیگم میری بلائیں لیتی نہ تھکتی تھیں۔ ابا جان نے گھر کا نقشہ بدل دیا تھا۔ پورے گھر میں سنگِ مرمر بچھا دیا گیا تھا۔ قیمتی اور شفاف آبگینے میں جلتی قندیلوں سے خوب روشنی ہو رہی تھی۔ دہلیز پر چمچماتی ہوئی دو موٹریں کھڑی تھیں۔ عشی حبشی سے آنکھیں ملتے ہوئے کچھ لوگ چلے آ رہے تھے، ان کے انداز

خدام اور ملازمین جیسے تھے۔ گمان تھا کہ ابا جان نے عقبی حصے میں ملازم خانہ تعمیر کروا دیا تھا اور گھر میں ملازم رکھ لیے گئے تھے۔ ان کی خادماؤں بھی تھیں۔ شاید اہلِ خانہ کو کلّی طور پر ملازم رکھ لیا گیا تھا۔ ان سب نے ہمیں پیشانی پر ہاتھ رکھ کے سلام کیا۔ ابا جان انھیں ہدایات دینے میں مصروف ہوگئے۔ صحن عبور کر کے دالان میں پہنچے تو دالان میں سرخ رنگ کا دبیز قالین بچھا ہُوا تھا۔ پاؤں دھنسے جاتے تھے۔ گھر کی تمام قندیلیں روشن کر دی گئی تھیں۔ میرا کمرا گھر کے بغلی حصّے میں تھا۔ یہاں سے وہاں تک جانے میں کئی راہ داریاں عبور کرنی پڑتی تھیں۔ ابا جان نے یہ مکان نہیں، کوئی چھوٹا سا قصبہ خرید لیا تھا۔ بٹھل، گیتا کو لے کر دالان میں رُک گیا۔ فرخ بھی بٹھل کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بھی گیتا سے ملنے وہاں کو چل دیا۔ فارہہ اور فریال مجھ سے جدا ہونے کو تیار نہیں تھیں، وہ ابھی تک بٹھل سے نہیں ملی تھیں۔ میرا رخ بٹھل کی طرف دیکھ کے وہ یا انھیں کچھ یاد آیا۔ اب تک وہ اپنے آپ میں نہیں تھیں۔ دوڑی دوڑی گئیں اور بٹھل کو سلام کیا۔ بٹھل نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ بھی بٹھل سے شکوے کرنے لگیں۔ گیتا نے مجھے دیکھا تو بٹھل کو چھوڑ کے مجھ سے لپٹ گئی۔ اور پھر سے بلکنے لگی۔ پیرو دادا آ جاتا تو اچھا تھا۔ کاش، وہ آ جاتا! دالان میں بیٹھے بیٹھے ایک پہر بیت گیا۔ باتیں، شکوے شکایتیں تھیں کہ ختم نہ ہوتی تھیں۔ جولین مجھ سے بے وفائی کا پوچھ کے چلی گئی تھی۔ اس کا صبر اب اس کا لگتا نہیں تھا۔ اس نے مجھے کچھ پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں جانتا تھا، اس نے یہ موقع گنوایا نہیں تھا، بلکہ بچایا تھا۔

لڑکیاں ساری رات بیٹھی رہتیں جو ابا جان انھیں ڈانٹ ڈپٹ کے نہ اٹھاتے۔ طعام گاہ میں کھانا لگا دیا گیا۔ اس وقت ابا ہی بھوک نہ تھی۔ مگر کبھی کبھی انسان اپنے گھر میں بھی مہمان ہو جاتا ہے۔ تکلف اور راہ و رسم آڑے آ جاتے ہیں۔ مجبوراً مجھے اٹھنا پڑا۔ ابا جان نے مکان میں ایک کمرا باقاعدہ طعام گاہ کے لیے مختص کیا ہُوا تھا۔ بلوریں چاندنی پر زرد رنگ کا دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ جو انواع و اقسام کے کھانوں سے لدا بھرا تھا۔ مرغ بھُنا ہوا بھی تھا اور مرغ کا سالن بھی۔ گرم گرم پراٹھے ہاتھ کے ہاتھ لائے جا رہے تھے۔ ہر قسم کے گوشت سے بنا ہُوا پلاؤ موجود تھا۔ قورمہ اور زردہ بے حد لذیذ بنایا گیا۔ ہر چیز اعلیٰ معیار پر بنائی گئی تھی۔ لگتا تھا کہ ابا جان نے کڑا امتحان لینے کے بعد خانساماں رکھا ہے۔ میں نے کھانا رسم طعام کے طور پر کھایا تھا۔ بس واجبی سا تھوڑا تھوڑا سا چکھ لیا تھا۔ میں نے بارہا دیکھا، ابا جان میری کم خوری کو اضطراب سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے سے مترشح تھا کہ وہ کہنا چاہتے تھے۔ بابر بیٹا، کھانا کیوں نہیں کھا رہے۔ ٹھیک طرح سے کھاؤ۔ مگر میں یہ بھی جانتا تھا وہ ایسا کہہ نہیں سکیں گے۔ دیکھ دیکھ کے کڑھتے رہیں گے۔ جولین بُت بنی بیٹھی، دھیرے دھیرے کھا رہی تھی۔ وہ چور نظروں سے مجھے دیکھتی تھی مگر میں جیسے ہی اسے دیکھتا، وہ نظریں چرا لیتی۔ وہ اس سوگ واری میں بلا کی حسین لگ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر سیراب صفت پیاس چمک رہی تھی اور رخسار اپنے آپ کو دیکھ کے دہک رہے تھے۔

کھانے کے بعد فرخ، فارہہ، فریال، اکبر اور جہاں گیر نے مجھے گھیر لیا۔ جہاں گیر نے بتایا کہ وہ کچھ دن قبل ہی فیض آباد سے ابا جان سے ملنے آیا تھا۔ فیض آباد میں سب خیریت سے تھے۔ زریں باجی بہت اداس اور ملول رہتی ہیں۔ بہنیں مجھے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ بٹھل کو گیتا اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ زورا اور جمرو، جگنو اور دیوا کے ہمراہ چلے گئے تھے۔ چمپا بیگم تہجد پڑھنے میں مصروف ہوگئی تھیں۔ کہتی تھیں کہ آج شکرانے کے نفل بھی پڑھنے ہیں۔

''ابا جان نے آ کر فرخ، فارہہ کو ڈانٹا۔'' بھئی لڑکیو! تمھارا بھائی تھکا ہارا سفر سے آیا ہے۔ تمھیں اس کے آرام کا خیال ہے کہ نہیں... فرخ، فارہہ، اکبر، فریال، چلو تم لوگ اپنے اپنے کمروں میں!''

''میں بھائی جان کے ساتھ ہی سوؤں گا۔'' اکبر مچل گیا۔

''اور میں بھی!'' فارہہ بھی بولی۔

''اور میں بھی۔'' فریال بھلا کیا پیچھے رہتی۔

''فرخ!'' ابا جان نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''ان سب کو لے کے جاؤ، بھائی کو آرام کرنے دو!''

''جی ابا جان...!'' فرخ بھی بے دلی سے بولی۔ ''چلو بھئی، اٹھو! بھائی جان کے کان کل پکڑوائیں گے۔'' فرخ نے فارہہ کو ہاتھ پکڑ کے اٹھایا۔ اکبر اور فریال کو جہاں گیر نے اٹھا لیا۔ وہ پانچوں طوعاً و کرہاً وہاں سے چلے گئے۔ امی اور فمی کی کمی تھی، ورنہ میرا سارا گھر پورا تھا۔ کاش، امی زندہ ہوتیں۔ اس وقت ہمیں دیکھ کے کتنا خوش ہوتیں۔ فمی کی یاد سے دل پھٹنے لگتا تھا۔ میں ہی تو اس کا قاتل تھا، اپنی جان سے پیاری بہن کا قاتل!

''بابر بیٹے! اب آرام کرو۔ ان شاء اللہ صبح ملاقات ہوگی۔'' ابا جان اتنا کہہ کے رخصت ہوگئے۔ پھر جیسے جاتے

جاتے پلٹے اور نظریں چراتے ہوئے بولے۔ ”بابر بیٹا، ایک بات کہنا چاہ رہا تھا۔“

”جی ابا جان! بلا تاخیر فرمائیں!“

”بیٹا، ہو سکے تو اب کہیں نہ جانا۔“ ابا جان کی آواز میں زمانے بھر کی خلش سمٹ آئی تھی۔ انھوں نے یہ جملہ کچھ اس طرح کہا تھا جیسے منوں وزنی سل سینے سے دھکیلی ہو۔ پھر ابا جان ٹھیرے نہیں۔ کوشش کے باوجود وہ اپنی ہچکیاں روک نہیں سکے تھے۔

میں پژمردگی سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ راہ میں جولین کا کمرا پڑتا تھا۔ مگر اب مجھ میں مزید دکھ اٹھانے کا یارا نہیں تھا۔ میرے کمرے کا نقشہ ہی بدلا ہُوا تھا۔ فرش پر دبیز قالین، گدیلے بستر پر مخملیں پوشش۔ چاروں اطراف میں قیمتی گل دان جن میں انتہائی نفیس نمونے آویزاں تھے۔ کمرا گلاب کی خوش بو سے معطر تھا۔ دُھلا دُھلا اور اُجلا اُجلا لگ رہا تھا۔ گرد نام کو نہیں تھی۔ صفائی کی نوعیت ایسی نہیں تھی کہ زیادہ دیر قبل کی گئی ہو۔ بلکہ گمان پڑتا تھا کہ روزانہ باقاعدگی سے اس کی ہر شے کی دیکھ بھال کی جاتی رہی ہے۔ میں اوندھے مُنہ بستر پر جا پڑا۔ فی الحال میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن سوچیں میرے گرد مکڑی کی طرح جالے بُن رہی تھیں۔ بہت سے خواب باریابی کے لیے بے چین تھے۔ مگر نیند کوسوں دُور تھی۔ صبح میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔ شاکر بھائی کا پتا مجھے ازبر تھا۔ وہاں سے واپس آ کے آرام کیا جا سکتا تھا۔ کل سب دن چڑھے تک سوئیں گے۔ ان کے بیدار ہونے تک واپسی کچھ مشکل نہ تھی۔ شاکر بھائی سے ملاقات کا راستہ اب سہل ہو گیا تھا۔ سیٹھ راج پٹیل کا حوالہ بہت تھا۔ کہیں وہ دلواڑا واپس نہ چلا گیا ہو۔ شاکر بھائی صرف موتیوں کی وجہ سے انھیں تلاش کر رہا تھا یا کوئی اَور بات تھی۔ کورا کسی انمول موتی سے کم نہ تھی۔ اپنا آزار نمتا دکھائی دیتا تھا۔ کیا خبر تھی شاکر بھائی نے مولوی صاحب کو کھوج نکالا ہو۔ قسمت نے بارہا ایسا کیا ہے، اب بھی کر سکتی تھی۔ ہم جس وقت دلواڑا سے بمبئی آ رہے ہوں، اس وقت شاکر بھائی اور اس کے کارندے مولوی صاحب اور کورا کو لیے دلواڑا جا رہے ہوں۔ دوسری صورت میں وہ موتیوں کی مالا اُڑا لے گیا ہو اور مولوی صاحب پھر انسانوں کے سمندر میں گم ہو گئے ہوں۔ میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ معاملہ فہمی کے بعد بستر درازی کہاں ممکن تھی۔ گدیلے بستر پر کانٹے اُگ آئے تھے۔ پو پھٹتے ہی نکل جانا مناسب لگتا تھا۔ اس وقت نکلنا بے سود ہی تھا۔ کیا خبر ابا جان جاگتے ہوں۔ وہ دالان میں ٹہلتے ہوں گے۔ مجھے معلوم تھا ابا جان فجر کی نماز سے قبل نہیں سوئیں گے۔ مگر اب چین کسے پڑتا تھا۔ اور اک بُری بلا ہے۔ انسان کو جانور بنا دے! میں کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ سوچنے کو مسائل بے شمار تھے۔ فرخ، فارہہ، فریال جوان العمر ہو چکی تھیں، ان کے لیے گھر بار کرنا اب میری ذمے داری بنتی تھی۔ ابا جان تنہا کب تک سہتے۔ کیسے بکھرے بکھرے اور اجڑے اجڑے لگتے تھے۔ التجا کر گئے تھے کہ اب نہ جانا۔ لیکن میں جا بھی کہاں رہا تھا۔ بمبئی ہی کے ایک علاقے میں۔ سب کے بیدار ہونے سے قبل ہی لوٹ آتا۔ لیکن نیت کا تعلق تو راستے سے ہوتا ہے، فاصلے سے نہیں۔ فاصلہ مختصر تھا مگر راستہ تو وہی تھا جو مجھے دربدر کیے ہوئے ہے۔ میں جانتا تھا کہ خود کو سمجھا نہیں سکتا۔ مگر خود کو سمجھا بھی رہا تھا، بہلا بھی رہا تھا۔ درحقیقت وقت گزار رہا تھا۔

دروازے پر آہٹ سی ہوئی اور ایک سایہ سا لہرا کے رہ گیا۔ مجھے امید تھی، وہ ضرور آئے گی۔ سفید کُرتے اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس جولین کھڑی تھی۔ اُجلی اُجلی، نکھری نکھری۔ پہلی نظر میں تو مجھے زریں کا گماں ہُوا۔ جولین کو اس لباس میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔

میری بوکھلاہٹ پر وہ گھبرا گئی۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ وہ متردّد لہجے میں بولی۔

”ہاں ہاں.. ہاں میری طبیعت کو کیا ہُوا ہے۔“ میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ حالاں کہ اس کی آمد متوقع تھی مگر پھر بھی میں گھبرا گیا تھا۔ اس کی آمد سے نہیں، اس اذیت سے جو وہ میرے اندر سے کشید کرنے آئی تھی۔

”کیلاش اور رما آتے ہیں؟“ میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”کیلاش نے کوشلی سے شادی کر لی ہے!“ جولین کے لہجے میں چبھن تھی۔

”اور رما؟“ میں بے اختیار بول گیا۔

”شاید وہ کسی کا انتظار کر رہی ہے!“ جولین نے کُرتے کے دامن سے کھیلتے ہوئے کہا۔

”وہ یہاں آتے ہیں؟“

”کیلاش کوشلی کے ساتھ پونا چلا گیا ہے۔ وہیں مقیم ہے۔ رما یہیں ہے، بمبئی میں۔“

”وہ تنہا رہتی ہے!“ میں نے متعجب ہوتے ہوئے کہا۔

”تنہائی وہ نہیں ہوتی، جو نظر آتی ہے۔ تنہا نظر آنے والا ہر شخص تنہا نہیں ہوتا۔“ جولین نے زیرلب کہا۔ اس کے ہونٹ

بکھری تھے گلاب کی۔ ایک دوسرے سے مل کے جدا ہوتے تو گویا باندر بچوں سے خوش بو کو آزاد کر دیا گیا ہے۔

”تم بھی تنہا ہو؟“

”میں رما کی بات کر رہی ہوں۔ رما تنہا لگتی نہیں ہے۔“

”رما یہاں آتی ہے؟“ میں نے اپنا سوال تیسری بار دہرایا۔

”صبح خود دیکھ لینا!“

”کیا مطلب؟“

”یوں لگتا ہے جیسے یہاں آنے ہی کے لیے وہ بمبئی میں رکی ہوئی ہے۔ شام باقاعدگی سے آتی ہے۔“ جولین کی آواز کانپ رہی تھی۔ وہ گریزاں سی نظر آتی تھی۔

”تم سے تو خوب بنتی ہوگی!“

”ہاں۔ وہ کہتی ہے صرف جولین سے ملنے آتی ہوں۔ اپنی اپنی لگتی ہے.... جڑواں بہنوں کی طرح۔“ جولین کے لہجے میں بیزاری، کاٹ تھی۔

”تم کہاں رہے اتنے دنوں؟ فیض آباد سے کئی تار یہاں آئے اور یہاں سے کئی جا چکے۔ منیر علی چند روز قبل ہی فیض آباد سے لَوٹے۔ زریں بھی آئی تھی!“

”ہاں پہلی فرصت میں فیض آباد تار بھجوانا ہے۔“

”کیلاش بھائی یہ کام جمرو بھائی کے ذمّے لگا چکے ہیں۔ کہاں ہے وہ کب تک یوں غائب ہوتے رہو گے۔“ وہ دل گرفتگی سے بولی۔

”اسی سوال کا جواب تلاش کر رہا ہوں۔ یہی تو دربدری کی وجہ ہے!“ میرے اندر کچھ جل گیا تھا۔

”کہو کچھ پتا چلا؟“ وہ کچھ اَور قریب ہو گئی تھی۔

”پتا چلتا تو یوں لوٹتا؟“

”اب پھر جاؤ گے؟“

”کہو، تم کیسی ہو!“ میں نے بات کا رُخ دوسری جانب گھمانا چاہا۔ اس کے سوالوں کے جواب میرے پاس کہاں تھے۔

”تمھارے سامنے ہوں۔ دیکھ لو کیسی ہوں!“ اس کی آواز میں گداز بھر آیا تھا۔

”پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی ہو!“ اس کی آنکھیں کسی غزال سے کم نہیں تھیں اور ان پر جھکتی پلکیں، مور کے پنکھ کی طرح آنکھوں کی رکھوالی بھی کرتی تھیں اور سلامی بھی بھرتی تھیں۔

”خوب صورتی سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو خود فریبی کا بے ضرر ہتھیار ہے۔ خود فریبی سے زیادہ خود شناسی کا!“

”تم نے کیا فریب کھایا ہے؟“

”صرف خوب صورت کہہ دینے سے انسان خوب صورت نہیں ہو جاتا!“ وہ پھیکی سی مسکان چہرے پر سجائے ہوئے بولی۔

اس کی آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔ وہ رکھ رکھاؤ سے بیٹھی تھی، ورنہ بھید کھلنے کو کچھ رہ نہ گیا تھا۔

”کیلاش اچھا لڑکا تھا۔“

”ہاں خوب صورت بھی بہت ہے، اس میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو کسی خواب میں ہونی چاہییں!“ جولین نے دھیرے سے پہلو بدلا۔

”مجھے ملال ہی رہا کہ اس کا خواب کسی نے نہیں دیکھا۔“

”ایک بات کہوں؟“

”ہاں ہاں کہو۔“

”تم نے زریں کے بارے میں کچھ سوچا ہے!“

میں نے مجذوب نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تمھیں یک دم زریں کا خیال کیوں آ گیا؟“

”مجھے رما کا اور زریں کا خیال رہتا ہے۔ تم نے رما کا پوچھ لیا تھا، اس لیے زریں کا تذکرہ میں نے کر دیا۔“

ایجنٹ/قارئین کی توجہ کے لیے

اگر آپ کو سب رنگ کے حصول میں کوئی دشواری پیش آ رہی ہو تو مندرجہ ذیل نمبروں پر رابطہ کریں۔ ان شاء اللہ مسئلہ فوری حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

محمد اقبال (سرکولیشن منیجر) 0300-2313256/ 0213-5802930/5802942

"تم سب جانتی ہو، پھر مجھے کچوکے کیوں لگاتی ہو!"

"تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ بہت تھک گئے ہو!"

"یہ تھکن نہیں ہے۔"

"کچھ ہے تو سہی!"

"کچھ بھی نہیں ہے۔" میں نے کبیدگی سے کہا۔ میرا دل پھٹا جاتا تھا۔ جولین، زریں، رما! میرا کیا قصور ہے۔ میرا کیا دوش!

"تم سے کرنے کو بہت سی باتیں جمع کر رکھی ہیں۔ کسے خبر پھر موقع ملے یا نہ ملے!"

"موقع کیوں نہیں ملے گا۔ میں یہیں تو ہوں!"

"تمھارا کیا بھروسا۔ چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتے ہو..." جملہ مکمل کرتے کرتے یک دم وہ گڑبڑا گئی۔ اس کا چہرہ تمازت سے جلنے لگا۔ اور تذلیل کا احساس سرخی بن کے پھیل گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اچھا میں چلتی ہوں۔ تم تو یہیں ہو۔ بات کا موقع ملتا رہے گا۔" اس نے موقع کا لفظ خاصا چبا کر بولا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹھو نا!"

"چلتی ہوں۔ صبح اسکول جانا ہے۔ پڑھانا پھر سے شروع کر دیا ہے۔"

وہ اٹھنے لگی تو میں نے غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی کلائی کانچ کی بنی ہو۔ ذرا تیز گرفت سے ٹوٹ جائے گی۔ مگر دوسرے ہی لمحے میرے جسم سے طاقت کسی نے چھین لی۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا یا مجھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے دیکھا اس کا سراپا بھی کسی شاخ کی طرح لچک گیا ہے۔ وہ لرزتی ہوئی بیٹھ گئی۔ مجھے احساس ہی نہ ہوا میں روانی میں کیا سے کیا بول گیا تھا۔ وہ بیٹھ گئی، لمحوں تک خاموشی طاری رہی۔ نہ میں نے اس سے کچھ کہا اور نہ اس نے مجھ سے کچھ۔

"تمھاری باتیں سننا مجھے اچھا لگتا ہے۔ کبھی کبھی دل کرتا ہے تم بولتی رہو اور میں سنتا رہوں۔" آخر میں نے خاموشی کا طلسم توڑا تو وہ کسمسائی۔

"تم سے کچھ چھپا ہوا تو نہیں۔ سبھی کچھ کہہ چکی ہوں۔ تم سبھی کچھ تو جانتے ہو۔ بس اس کہے کی تجدید از راہِ خاطر کرنی تھی۔ ذرا اضافہ نہیں کر سکتی۔" وہ بولتے بولتے رُک گئی۔ پھر بولی۔ "تم بھول جاتے ہو۔ بار بار بھول جاتے ہو، بھول جانا اور یاد آنا آدمی کے بس میں نہیں۔ لیکن آدمی کے بس میں تو اور بہت کچھ نہیں ہے۔ زندگی بھر انسان اپنی مقدور بھر اختیار کی چادر کھینچتا پھیلاتا رہتا ہے اور شاید زندگی سے بھی اتنی ہی۔"

جولین ایک مرتبہ پھر رُک گئی۔ اپنے شوق کے باوجود اس کے کلام میں گرہ پڑ جانے کے خوف سے میں کچھ نہ بولا، چپ ہی رہا۔ جولین کا چہرہ جل بجھ سا رہا تھا اور آواز بھی جیسے پگھل رہی ہو۔ اپنے دامن کا کونا مروڑتے ہوئے وہ بولی۔ "انسان آزاد پیدا ہوتا ہے۔ بالکل آزاد! مگر جدھر دیکھو زنجیروں میں جکڑا نظر آتا ہے۔"

"میں تمھاری بات سمجھا نہیں...؟" گذشتہ ملاقات میں کہی ہوئی اس کی باتیں کچھ کچھ یاد آ رہی تھیں۔ "حالاں کہ یہ بات درست نہیں لگتی، یوں کہا جائے تو کیا غلط ہوگا کہ آدمی پابند پیدا ہُوا ہے کہ وہ جنگل میں پیدا نہیں ہوتا اور وہ اپنی آزادی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔"

"تم جنگل میں پیدا ہونے والوں کو آزاد سمجھتی ہو؟"

"ہاں... وہ کسی ضابطے اخلاق اور قاعدے کے پابند نہیں ہوتے۔ جنگل کے باسی صرف اپنی زندگی گزارتے ہیں، کسی اور کی نہیں!"

"تم اپنی بات جاری رکھو!"

"آدمی تو اپنی پیدائش کے ساتھ ہی آزادی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیتا ہے۔ ہر دم اس جتن میں رہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اپنی زندگی جی لے۔ مگر یہ تو اس کے آگے پیچھے کی دیواروں اور زنجیروں پر منحصر ہے کہ وہ کتنی اس پر مہربان ہوتی ہیں۔ ہاں، اگر کوئی آدمی اپنے جتن میں کامیاب ہو جائے تو کیا زنجیریں تڑوا کے ہی جنگل کی طرف جائے۔ مگر وہاں کے آدم زاد زنجیریں پہنچ جائیں اور اس کے گرد گھیرا ڈال دیں تو وہ کیا کرے...؟" اس نے میری جانب استفہامیہ انداز سے دیکھا۔ پھر بلا توقف اپنی بات جاری رکھی۔ "تنہا آدمی کا بھی کوئی وجود نہیں۔ آدمی تو آدمی سے عبارت ہے۔ ایک جنگل گزیں کی زندگی خواہ کتنی ہی اپنے لیے ہو۔ مگر دوسروں کے لیے اس کی موت کے مانند ہے۔ وہ جنگل میں رہ کے جیا یا مرا اس سے کسی کو کیا فرق پڑتا ہے۔ آدمی ہمیشہ دوسروں کے حوالے ہی سے مرتا ہے۔ اگر اس کی موت کا احساس کرنے والے پسماندگان نہ ہوں تو مرگ کی گواہی کون دے گا۔ کون یہ کہے کہ فلاں مر گیا۔ موت کا احساس کرنے والے پسماندگان ہی ہوتے ہیں۔ وہ خود تو ہر قسم کے احساس سے مبرا ہو جاتا ہے۔ کوئی جنگل میں چلا گیا ہے تو وہ صرف اپنے لیے زندہ

دوسروں کے لیے نہیں۔ تنہائی آزادی نہیں ہوتی اور تنہائی کی یہ آزادی تو پھر بھی مشروط ہے۔ آزادی سے کیا مراد ہے؟ ذات کی آزادی! پھر یہ تو اسی وقت مکمل ہوگی جب آدمی ہر قسم کے بیرونی اثرات اور نقش و نگار سے مستثنیٰ ہو جائے۔ ابتدا ہی سے اس کی تربیت مختلف ہو اور انسانوں سے اس کا واسطہ یک سر نہ پڑے... لیکن یہ ایک اَن ہونی بات ہے۔ آدمی کی فطری ساخت ہی ایسی ہے کہ اسے ابتدا سے دوسروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ آزاد کب پیدا ہوتا ہے۔"

جولین کے تراشیدہ ہونٹوں پر لفظ جیسے اُمڈ اُمڈ کے آ رہے تھے۔ کہتے ہیں، نہاں خانے کی تپیدگی کے بغیر لفظوں میں یہ روانی پیدا نہیں ہوتی، اس کی آواز دھڑکنے لگی تھی۔

کہنے لگی۔ "یقیناً آدمی کو کچھ دیر اپنے آپ کے ساتھ بھی رہنا چاہیے کہ دوسروں پر صرف ہونے کے لیے یہ توانائی از حد ضروری ہے۔ وقت جس قدر بھی ایسی سہولتیں دے اسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔ ورنہ وقت کے ہاں ان کی کم یابی ہی کا شور رہتا ہے۔ کسی کو پہلت ملا ہی نہ کرتی اور آدمی، آدمی عارضی زندگی کے بیچ میں نہ رہا کرتا۔ یہ عارضی آزادیاں تو اسے اور پریشان کن ہی بناتی ہیں۔ اسے دوبارہ معمول کی زندگی سے مطابقت کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ پھر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے۔ آدمی کا تعلق اپنی ذات سے کچھ کم نہیں ہوتا۔ اس کے خواب اپنے ہوتے ہیں، خیال اپنے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خواب آدمی کو آسودہ رکھتے ہیں یا پراگندہ رکھتے ہیں۔ کوئی تخلیق کسی فکر کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ اور فکر خلوت کے بغیر اور پھر اس بات کیا خلوت آزادی ہے؟ تخلیق کی قدرت کسی نہ کسی طور آزاد اور فکر کی آزادی کی نشان دہی کرتی ہے۔ مگر خیال ہو یا خواب ہو یا تخلیق، سب پر ان کے عہد کی چھاپ ہوتی ہے۔ آدمی خواب اپنی زبان میں دیکھتا ہے۔ اور سوچتا بھی اپنے عہد کے حوالوں سے ہے۔"

وہ کہتی رہی۔ چپکے سے، دھیمے دھیمے سے، دھیرے دھیرے سے تند و تیز باتیں۔ بلاشبہ میری حیرت میں اشتیاق بھی شامل تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اسے پہلی بار دیکھ اور سن رہا ہوں۔

"نہ جانے میں کیا سے کیا کہتی رہی۔ پھر بھی یہ سب ایسا نہیں ہے جو مشکل سے میں سمجھ میں آئے۔" وہ خود سے بولی۔

"تم بے وجہ ملال کرتی ہو۔ میں ایک ایک بات سمجھ رہا ہوں!"

"میں کچھ زیادہ کہہ گئی۔ اتنا... اتنا کچھ نہیں کہنا تھا مجھے۔"

"اگر میں کہوں کہ اسی طرح، بالکل اسی طرح کہتی رہو تو؟"

"کیوں؟" اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ کچھ گل نار سا ہو گیا تھا۔

"مجھ پر تمھاری جز بینی کا سحر طاری ہو گیا تھا۔"

"سحر، کم زوری کی اختراع ہے۔ انسانوں کو کبھی سحر کی ضرورت نہیں رہی۔ انسانی ساخت کے تقاضے سحر کے پُر فریب جال سے قطعاً مختلف ہیں۔ حالاں کہ انسانی احساسات سحر ہی کا پرتو ہیں۔ محبت ایک سحر کا نام ہے، نفرت ایک سحر کا نام ہے۔ مسرت کی پایابی سحر کا نام اور غصہ بھی سحر ہی کا نام ہے۔ جیسا کہ تم نے جز بینی کو سحر کہا۔ جیسا کہ تم سحر میں..."

جولین کی آواز گڑبڑا گئی۔ بات تو ادھوری تھی مگر بے حد مکمل بھی تھی۔ بعض جملے ادھورے رہ کر ہی تکمیل کا تاثر پاتے ہیں۔

"یہ باتیں کرتے ہوئے تم کیسی مختلف لگتی ہو۔" میں نے اسے اشتیاق سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھی نہیں لگ رہی ہوں گی۔" وہ سر سراتے ہوئے بولی۔

"نہیں نہیں، یہ تم... تم سے کس نے کہا۔"

اس کا سر اور جھک گیا۔ ٹھوڑی سفید گردن سے جا لگی۔

"تم خاموش کیوں ہو گئیں۔" میں نے مضطربانہ کہا۔

"شاید کہنے کو کچھ رہا نہیں۔"

"تم پر کسی احساس کا غلبہ ہو گیا ہے۔"

"کیسا احساس!"

"یہی کہ... یہی کہ میری کوئی بات بُری لگ جائے۔ مگر جولین تم بہت اچھی باتیں کر رہی ہو، بہت اچھی!"

وہ مسکرانے لگی اور جھجکتے ہوئے بولی۔ "صرف اتنا کہنا تھا کہ تم اکیلے نہیں ہو۔ بہت سے ہیں جو تمھاری طرف دیکھتے ہیں۔ تمھیں دیکھ کے جن کی ہمت فزوں ہوتی ہے اور خوشی ہوتی ہے کہ تم ان کے پاس ہو، وہ تمھارے پاس ہیں۔ باوا جان، فرخ، فریال، فارہہ، اکبر، جاں گیر... کس کس کا نام لوں، بٹھل باوا، زریں، نیساں، خانم رانی بھابی، گیتا... یہ بھی تو تمھاری زندگی میں شامل ہیں۔ آدمی دیکھنے میں ایک نظر آتا ہے مگر اس میں اور بھی بہت سے ہوتے ہیں۔ ان سب سے مل کے ہی کسی آدمی کی تکمیل ہوتی ہے۔"

میں نے مضطربانہ انداز میں تائید کرنی چاہی تو وہ عاجزی

سے بولا۔ ”بہتر کہ تم کوئی جواب نہ دو۔ اگر تمھیں کچھ کہنا ہی ہے تو خود کو کچھ کہو۔ لگتا ہے فرخ اور فریال تمھیں پا کر بھی تم سے دُور ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ تمھیں کسی اور طرف دیکھنے کی فرصت ہی کب ملتی ہے۔“

میرے سینے میں گرہیں پڑنے لگی تھیں۔ میں نے کچھ بولنا چاہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے پھر روک دیا۔

”ایسا نہیں ہے کہ مجھے تمھارے حال کا اندازہ نہیں ہے۔ مجھے تمھارے حال کا اندازہ ہے۔ تم دوسروں کے لیے خود پر کم جبر نہیں کرتے۔ لیکن وہ اس سے سوا چاہتے ہیں۔ اور سوچو تو تمھارے لیے یہ بھی بے حد ضروری ہے۔ وقت بہت گزر گیا ہے۔ پہلے کی بات اور تھی۔ اب تمھیں اور طرف بھی دیکھنا ہے۔“

”میں اپنی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔ یا یوں سمجھ لو کہ ایسا کرنا میرے اختیار میں نہیں۔“

”نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ دوسرے لوگ جیل خانہ نہیں ہوتے، وہ تمھارے کام آنا چاہتے ہیں، سب کی یہی آرزو ہے کہ تم کسی طرح خوش رہو۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ دوسرے بھی تو کسی کے کام آتے ہیں۔ آدمی کو کبھی نہ کبھی کسی ایک جگہ ٹھیر کے پیچھے کی طرف دیکھنا چاہیے، کچھ سوچنا ضرور پڑتا ہے۔ میں جانتی ہوں، تم بے حد کوشش کرتے ہو۔ مگر کیا ایسا نہیں اب کچھ دوسروں پر چھوڑ دو، کچھ عرصے کے لیے سہی۔“

”میرا کیا مطالبہ ہے۔ اب کچھ بھی نہیں۔“ میری آواز ڈوبنے لگی۔ ”اور پہلے بھی کچھ نہیں تھا۔“

”اسے شکایت مت سمجھنا۔ میں شاید اپنی بات کہہ نہیں پا رہی۔“ اس کا بدن بے قرار سا ہو گیا۔ اور وہ مضطرب لہجے میں بولی۔ ”نہ جانے میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔“

”تم گھبرا رہی ہو۔ تم نے کچھ غلط نہیں کہا۔“

”مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تمھارے لیے یہ نیا نہیں ہے۔ پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ تم شاید مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔“

”ضروری نہیں کہ صرف نئی باتیں کی جائیں۔ دوسرا کوئی کہتا ہے تو اپنے کو زبان مل جاتی ہے۔ کوئی تصدیق ہو جاتی ہے۔ یقین کرو میری تو ہر دم یہی کوشش رہتی ہے کہ مجھے کچھ یاد نہ رہے، کچھ بھی... لیکن میں... میں کیا کروں۔“ میری آواز بھرّانے لگی۔ وجود میں بہت کچھ تڑ مڑا رہا تھا۔

”ایسے نہیں۔ ایسے کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔ اس کے لیے تو بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مگر کوئی جتن کرے بھی تو... اور یہ تو گرہوں پر ہے کہ کتنی پڑی ہیں، نقش پر ہے کہ کتنا گہرا ہے۔ ہر آدمی سامنے کی زندگی کیوں کھو دے۔ دھوپ ہی میں کیوں کھڑا رہے۔ رما کے بقول آدمی چھوٹی چھوٹی چھاؤں سے کیوں کنارہ کش رہے۔“

”رما اور تمھاری باتوں میں کیسی مماثلت ہے۔ لگتا ہے، نے سبھی کچھ دہرا دیا ہے۔“ میں نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

”وہ ایک نفیس لڑکی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ بمبئی کی بھیڑ بھاڑ میں سکون کی بہت سی جگہیں ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے ظہیر صاحب کو وہاں سے لے جاؤں تو میں نے کہا کہ بہت اچھا ہوگا۔“

”وہ بالکل اپنے بھائی کے مانند ہے۔ دوست درد مند اور شاید وہ مجھے مریض سمجھتی ہے کوئی۔“

”مریضوں کی کمی نہیں ہے اس شہر میں!“

”میں کسی مریض سے کیا کم ہوں؟“

”تم اس مرتبہ خاصے مضمحل نظر آتے ہو۔ مایوس ہو گئے ہو، ہوا میں ضبط قائم نہ رکھ سکا۔ ضبط کا تعلق ہوا سے ہے۔ امید نہ ہو تو ضبط بھی قائم نہیں رہتا۔ میری پھر بھر نے لگیں۔ وہ کیسی سچی باتیں کر رہی تھی۔ اس سینہ دہکا دیا تھا۔ میں نے بے بسی سے نظروں کو دیوار جما دیا۔ انسان کی آنکھیں نہ ہوتیں تو اچھا ہی ہوتا۔ نوشتہ چھپا رہتا۔ جس کی آنکھیں نہیں ہوتیں وہ بھی تو جیتے ہیں وہ دھیرے سے

”جا رہی ہو؟“ میری آواز محرومی کے بوجھ سے دب لگی تھی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے سرہانے آ بیٹھی اور میرا سر اٹھا کے اپنی آغوش میں رکھا اور سہلانے لگی چارہ گری کے یہی تو اطوار ہیں۔ پھر مجھے معلوم نہ ہو سکا کب میری آنکھ لگ گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ روشن دان تیز دھوپ چھن چھن کے قالین کے بوسے لے رہی تھی میرے سامنے فارہہ کھڑی تھی اور ایک ٹک مجھے تک رہی تھی۔ میں بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ فارہہ مجھ سے چمٹ گئی اس کے انداز میں وارفتگی تھی۔ جیسے وہ اپنے بھائی کی جاں بننے کو بے چین ہو۔ اس کی آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے۔ چہرے پر لالی پھوٹی پڑتی تھی۔ اسے یوں لالہ زار دیکھ کے جولین کی باتیں میرے جسم و جاں میں گونج

گئی۔ آدمی کو اپنے لیے نہیں تو دوسروں کے لیے روشنی بن [illegible]۔ میرے کانوں میں کچھ چہکتی چٹکتی آوازیں [illegible]۔ پھڑ پھڑاتی ہوئی وہ دونوں بھی آ گئیں۔

”فارہہ، بھائی جان! یہ تو بڑی بے ایمانی کی بات ہے۔“ [illegible] سے چمٹے دیکھ کے وہ چیخ پڑیں۔

فارہہ کچھ اور بھی چمٹ گئی۔ ”جی نہیں... آپ کیسے [illegible]۔ بھائی جان آج صرف میرے ہیں۔“ فارہہ کے لہجے [illegible] دھری بھی تھی اور ناز و اشتیاق بھی۔

میری آنکھیں [illegible] نے لگیں۔ فرخ اور فریال مچلنے لگیں۔ فارہہ کی آرزو کے خیال سے اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔ [illegible] سے چھوٹی تھی۔ فرخ نے سب سے بڑا ڈکا برتاؤ رکھا ہُوا [illegible] بھائی امی جان تھی۔ اپنے جگر زادوں کو دیکھ دیکھ نہال [illegible] تھی۔ شاید اتنی فرحت فارہہ کو [illegible] نہ کرتی ہوگی جتنی [illegible] دید سے فرخ کو حاصل ہو رہی تھی۔

”بھائی جان سیر و تفریح کی غرض سے آج کہیں چلیں [illegible]۔“ فرخ نے جذبات سے رُندھی ہوئی آواز سے کہا۔ وہ [illegible] میرے پہلو میں آ بیٹھی تھیں۔ رشتوں کے طواف کی [illegible] فارہہ اچھلنے لگی اور بلک اٹھی۔ فرخ اس کے بالوں [illegible] پھیر رہی تھی۔ فرخ کی اس دل جوئی میں حسرت [illegible] شامل تھی اور گمان بھی۔ اپنی سکت سے زیادہ کوئی کتنا [illegible] سکتا۔ کوئی کتنا [illegible] سکتا۔ وہ تو مسلسل تماشا بنی رہی [illegible] تماشے دیکھتی رہی ہیں۔ میرے گھر سے اچانک غائب [illegible] کے صدمے سے وہ کس قدر سنبھلی ہوں گی کہ اچانک امی [illegible] داغِ مفارقت دے گئیں۔ آپائی گھر چھوٹ گیا۔ اور ایک [illegible] ان کے مقدر میں لکھ دی گئی۔ ابا جان ایک شہر سے [illegible] شہر، آج یہاں کل وہاں۔ خانہ بدوشوں کی طرح انھیں [illegible] پھرتے رہے۔ فی کو اندھیرے نگل گئے۔ جہاں گیر [illegible] کیا۔ ابا جان ایک اجنبی گھر میں انھیں چھوڑ کے ایسے سفر پر [illegible] گئے جہاں سے واپسی قسمت کی یاوری کے بنا ممکن ہی [illegible]۔ جانے کتنی منتوں اور مرادوں کے بعد انھیں ایک [illegible] خوشیاں نصیب ہوئی تھیں۔ ابا جان کی واپسی اور وہ بھی [illegible] اہراہ، میں بھی بازیاب ہُوا تھا ان کے لیے! جہاں کے [illegible] کا مژدہ۔ انھوں نے جانا ہوگا کہ اندھیری رات اب [illegible] ہوگی۔ خدا نے ان کی سُن لی ہے۔ مگر انھیں کتنے دن فرصت [illegible] یہاں بھی آئے روز اک نیا صدمہ ان کا منتظر رہتا تھا۔ [illegible] گیا۔ پھر انھیں گیتا سمجھنے والا پیر گیا۔ پھر مارٹی چلا گیا۔ اور پھر میں کب انھیں دست یاب ہوں۔ میری موجودگی، غیر موجودگی ان کے لیے یکساں ہی ہے۔ یہ تو مسلسل جلتی بجھتی ہی رہی ہیں۔ سفر تو وقت سے کم، فاصلوں سے کم، راستوں سے زیادہ عبارت ہے۔ کس کے ساتھ راستے کس طرح پیش آئے۔ ابا جان کے لعل و جواہر سے لدے ہوئے صندوق کیا کیا تلافیاں کر سکتے تھے اور مجھ پر تو ان کے بہت سے قرض تھے۔ ساری عمر بھی چکاؤں تو ادا نہ ہو سکیں۔ سب سے زیادہ خود غرضی تو میں نے کی تھی۔ میں انھیں چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ اس رات کسی مجرم کے مانند گھر سے فرار نہ ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ امی کا دست شفقت میرے سر پر ہوتا اور فی بھی چہک رہی ہوتی۔ یہ محل جیسا عظیم الشان گھر ان کے گھر کا بدل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں امی نہیں تھی، فہمیدہ نہیں تھی تو اور بھی بہت کچھ تھا، جو نہیں تھا۔ انھیں کون بتاتا کہ جب یہ میرے سامنے آتی ہیں تو میرے سینے میں کیسی ہوک اٹھتی ہے۔ جتنے شد و مد سے فرخ نے تفریح پر جانے کا کہا تھا اتنی ہی شدت سے میں نے تائید کی۔ ”ہاں ہاں، چلیں گے، لیکن کہاں؟“

”یہ تو آپ فیصلہ کیجیے۔ آپ بتائیے بھائی جان۔“ فریال نے اٹھلا کے کہا۔

”بولو چلیں؟“

”کہیں بھی!“ فرخ بکھرتے ہوئے بولی۔

”نہیں بھائی جان، کشمیر چلتے ہیں۔“ فارہہ نے ضد کی۔

”سنا ہے کشمیر تو کوئی گوشۂ فردوس ہے!“

”کشمیر کا موسم بڑا دل فریب ہوتا ہے۔“ جولین نے کہا۔ جو نہ جانے کب آ کھڑی ہوئی تھی۔

میری نظریں بے اختیار جولین کی طرف گئیں۔ وہ بالکل چپ کھڑی تھی۔ مگر ہلکی سی مسکان تھی، بالکل ذرا سی۔ جیسی جاتی صبح میں گلوں پر معدوم ہوتے شبنم کے قطرے!

”ہاں واقعی! کشمیر تو ہر موسم میں کشمیر ہوتا ہے، برف کا بھی اپنا ایک لطف ہے۔ بہت سے لوگ تو بطور خاص برف باری کے موسم میں کشمیر جاتے ہیں۔“

”ہائے اللہ! بھائی جان، برف باری کے موسم میں۔“ فارہہ کی چیخ نکل گئی۔ ”کیا کرتے ہوں گے لوگ؟ نہیں بھئی، ہم برف باری کے موسم میں نہیں جائیں گے۔“ اس نے کان پکڑ لیے۔

”تم نہیں جانا۔ مجھے تو ارمان ہے برف باری دیکھنے کا۔“ فریال نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔ اس کی خوشی میں کچھ

فارہہ کو چڑانا بھی مقصود تھا۔ ''میں ضرور جاؤں گی... چلیں بھائی جان، چلیں۔ کب چلیں گے؟''

ان کی نوک جھونک میرے اندر بھی چلبلاہٹ پیدا کررہی تھی۔ فارہہ کے کان کھینچوں، فریال کے چٹکی بھروں اور فرخ کو زور سے دھکا دے دوں۔ امی جان، فہمیدہ اور میری باقاعدہ کشتی کروایا کرتی تھیں۔ اور میں سدا شکست خوردہ ہی رہتا۔

''وہاں کشتیوں میں گھر بھی ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے اور سجے سجائے گھر۔ انھیں کشتی گھر کہا جاتا ہے۔''

''سنا ہے ان کشتی گھروں میں دنیا کی ہر چیز موجود ہوتی ہے۔ بالکل چھوٹے موٹے جہازوں کی طرح ہوتے ہیں۔'' فرخ نے چہک کے کہا۔ فرخ کو مطالعے کا شوق ورثے میں ملا تھا۔ گھر میں میرے بعد سب سے زیادہ کتاب خور فرخ کو کہا اور سمجھا جاتا تھا۔

''پھر تو منہگے بھی زیادہ ہوتے ہوں گے۔'' فارہہ کو بھی کشمیر کی گفتگو میں دل چسپی پیدا ہو چلی تھی۔

''ابا جان ایسا ہی کوئی گھر لے لیں گے۔'' فریال نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

میرے جی میں آئی کہ کہوں، ابا جان کی کیا بات ہے، وہ گھر تو کیا کچھ بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ کشتی کیا، پورا جہاز خرید سکتے ہیں۔ وہ تو ساری جھیل، سارا دریا خرید سکتے ہیں، مگر شاید سمندر نہیں۔ جولین جلدی باہر آنے کا کہہ گئی تھی۔ وہ ناشتے کے انتظامات کی دیکھ بھال کررہی تھی۔ وہ تینوں کافی دیر مجھے گھیرے بیٹھی رہیں، چہلیں کرتی رہیں۔ طرح طرح خیال آرائیاں کرتی رہیں، منصوبے باندھتی رہیں۔ جیسے کل ہی سفر درپیش ہو۔ وہ سب زیتون کی ڈالی پر جھولتی چڑیاں لگتی تھیں۔ میں بھی انھیں دیکھ دیکھ کے نہال ہورہا تھا۔ اچانک فرخ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے انداز میں عجلت تھی۔ ''اُف! ابا جان نے آپ کو دیکھنے بھیجا تھا۔ وہ کئی بار آپ کا پوچھ چکے تھے۔ کہتے تھے، دیکھ کے آؤ بابر بیدار ہوگیا ہے یا سو رہا ہے۔''

میں نے رات بھی محسوس کیا تھا کہ ابا جان اس مرتبہ مجھ سے کچھ واضح اور دوٹوک گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ ''کیا کوئی خاص بات ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ بٹھل بھائی، زورا بھائی اور جمرو بھائی سب بیدار ہوچکے ہیں۔ آپ تشریف لائیں گے تو کوئی ناشتا کرسکے گا.. اب آپ جلدی سے اٹھ جائیے۔ غسل کیجیے اور طعام گاہ میں پہنچیں۔'' وہ جاتے جاتے مڑی۔ ''اور ہاں بھائی جان! غسل خانے کی الماری میں آپ کے کپڑے استری شدہ حالت میں موجود ہیں۔ بس جلدی سے آجائیے... چلو فارہہ، فریال، تم اٹھو یہاں سے۔ ورنہ بھائی جان کو لے کر بیٹھی رہو گی!''

فرخ کے ساتھ ساتھ فارہہ اور فریال بھی چلی گئیں۔ میں کمرے سے متصل غسل خانے میں جا گھسا۔ غسل خانے میں دیوار گیر الماری نصب تھی جو اس سے قبل نہ تھی۔ اس میں نفاست سے میرے کپڑے ٹنگے تھے۔ آسمانی رنگ کا کُرتا اور سفید پاجامہ۔ ڈاڑھی بڑھ رہی تھی۔ میں نہا دھو کے اور ڈاڑھی بنا کے غسل خانے سے نکلا تو باہر ملازمہ نئے شاہی کھُسّے لیے کھڑی تھی۔ کہنے لگی کہ فرخ باجی نے بھجوائے ہیں اور کہا ہے کہ یہ لازمی پہن کے آیئے گا۔ اتنا کہا اور ملازمہ جھپاک سے دروازہ بند کرگئی۔ میں نے کھسے پہنے تو چُرمُر چُرمر کرتے تھے۔ نجاب مالی ہُوا۔ مگر فرخ کے خیال سے ہمت کرلی۔ بہنوں کے ارمانوں کی فراوانی ہُوا کرتی ہے۔ غسل خانے میں اور اقسام کے عطریات موجود تھے۔ غسل خانہ تھا یا عطر خانہ!

''بھائی جان طعام گاہ میں آپ کا انتظار ہورہا ہے۔'' فرخ دوڑی دوڑی کمرے میں داخل ہوئی اور بھونچکی رہ گئی۔ جیسے سنبھل گئی۔ نگاہوں کو شمار کرتے ہوئے بولی۔ ''اللہ آپ کو نظرِ بد سے بچائے۔''

''چاپلوسی کہاں سے سیکھ لی!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھائی، آئینہ دیکھیں گے تو شاید...''

''شاید!''

''تڑخ سے ٹوٹ جائے گا۔'' فرخ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ وہ ہنستے ہوئے بڑی بڑی سے لگی، اجنبی غیر مانوس۔ اس کو جان کہا کرتی تھیں، بیٹیاں بیل کی طرح بڑھتی ہیں۔

''بھائیوں کو بہنوں کی نظریں دیدنی بناتی ہیں! چلیں!''

فرخ کے کندھے پر ہاتھ رکھے میں طعام گاہ میں داخل ہوا تو سب کی نظریں گومجھی کو تلاش کررہی تھیں۔ اٹھی کی اٹھی رہ گئیں۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ''چشمِ بد دور... نظرِ بد ہو دور... ماشاء اللہ یا کریم، یا غفور۔'' چمپا خانم نے پنجوں کے بل بلند ہوکر پیشانی چومی۔ گلے سے جھٹ گلوبند نوچا اور میرے اوپر سے کے نزدیک کھڑے ملازم کو دے دیا۔

میں کیا کہتا۔ فجالت اور حجاب بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ا

کبھی کبھار گراں گزرتی ہے۔ میرا ذہن شاکر بھائی کی طرف منتقل ہوگیا تھا۔ جولین کے قرب میں نہ جانے کیسی آسودگی تھی کہ اس نے میرے ارادے کو بھول بھلیوں میں دھکیل دیا۔

''یہاں آجاؤ بیٹا میرے پاس۔ ماشاء اللہ!'' ابا جان نے کہا۔ وہ زیرلب کچھ پڑھ رہے تھے۔

جولین آگئی، وہ ملازموں کو کھانے کی ہدایات دینے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھا تو میرے نزدیک ہی ٹھٹک کے رُک گئی۔ الجھی ہوئی سرگوشی میں بولی۔ ''تم بے حد وجیہہ ہو۔''

اس کی سرگوشی کی سنسناہٹ نے یک دم مجھے گدگدا سا دیا۔ اس نے دیکھا تھا تو۔ چہرے کے تاثرات بھلا کب چھپے رہتے ہیں۔ افعال پوشیدہ رہیں، چہرے سب کچھ کہہ دیتے ہیں، وہ آموختہ بھی جو امتحان کا مقصود ہو۔ جولین کے سامنے اتنے قریب آکے پوشیدگی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ غیر شائستہ بات ہے۔ میں نے سب کی طرف سے بولی دیکھ نہیں سکا تھا۔ یا کسی نے معیوب نہ سمجھا تھا۔ جولین کے پاس جا بیٹھا۔ انھوں نے پگھل کر میری پلیٹ بھر رکھ دیا تھا۔ ذرا دیر میں کھانا چُن دیا گیا۔ بٹھل نے بھیڑی کی رانوں چھوڑ رہا تھا۔ شاید فیض آباد اسے نام لے دیا اور بالے کو پانڈے دادا کے ساتھ کردیا۔ بنارسی دادا نے تھوڑی بہت چہ میگوئی کی تھی، تاہم مقابلے پر آنے سے گریز کیا تھا۔ پانڈے دادا اور بالے کو کل کے چھوکرے سمجھتا تھا۔ بٹھل نے ماہم پاڑے سے رُخصت ہوتے ہوئے کہا تھا۔ ''کان کھول کے سُن لو رے۔ پھر نہ کہنا سنائی نہیں پڑی۔ بالے، پانڈے کے ساتھ ادھر رہے گا۔ جب تک ہم پلٹ کے نہ آئیں۔ اور تم لوگ کو بلا کے نہ پوچھیں کہ ابھی تم میں سے کس جوان بلوان کی کھال کتنی موٹی کی ہے۔ کس نے چاقو کی بولی کتنی سیکھی ہے اور اسے اپنی کتنی سکھائی ہے! اپنے تین پاڑوں کے سوا سارے پاڑے، ماہم پاڑے سے الگ رہیں گے، بھتا بھی نہیں پہنچائیں گے، قلابے، اندھیری اور دادا کے سوا۔ ہمارے پیچھے کسی کا دماغ اُلٹے گا تو اسے چھاتی پھلا کے ادھر آنے سے تم روکو گے۔ جدھر ہم پانڈے اور بالے کو بول کے جائیں گے، وہ ہم کو خبر کریں گے۔ ہمارے لوٹنے تک تم اس تیس مار خاں کو انتظار کرنے کا بولو گے۔ ہمارے آنے سے پہلے کسی نے پانڈے اور بالے کو چھیڑا اور تم ہاتھ تاپتے رہے تو ہم تم کو دوبارہ اس طرح نہیں بلائیں گے۔ ہم خود اسے دیکھ لیں گے، پھر آگے ہم بولیں گے بھی نہیں۔ یہ سب تمھاری خاطر کرنا پڑا ہے۔''

آباد جانے کا بولوں گا۔ ہچر مچر کرے گا تو زبردستی کی جاسکتی.. جگنو اور دیوانے زور اور جمرو کے قریب اپنے سر کیے ہوئے تھے۔ ماہم پاڑے میں ہماری غیر موجودگی میں جو کچھ ہوتا رہا اس کا احوال ہی مذکور ہوگا۔

ماہم پاڑے میں بٹھل نے چوکی پر منگل دادا کو بٹھایا تھا اور اس کی نیابت کے لیے بالے کو تعینات کیا تھا۔ میرے اندراک ٹیس سی اُبھر آئی۔ بھویں ذرا کرید تو چنگاری کا نکلنا بھی فرض عین ٹھیرا ہے۔ پیرو دادا کا پاڑا ماہم پاڑا۔ پیرو دادا کے بعد ماہم پاڑے کا سکندر بٹھل کے آگے آگیا تھا۔ بٹھل کو چوکی پر بیٹھنا ہی پڑا۔ ابتدا میں پیرو دادا اور ماچھی کے قتل کا محرک پولیس نے بٹھل کے گرد تلاش کیا تھا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ پیرو دادا کو بٹھل نے ماہم پاڑا سنبھالنے کے لیے راستے سے صاف کیا ہے۔ شاید یہی عذر ہو یا کچھ اَور، بٹھل نے ماہم پاڑے کی چوکی سنبھالنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ سارے داداؤں نے بٹھل کے سامنے ہاتھ جوڑ لیے کہ بٹھل کی یہ بے اعتنائی ماہم پاڑے کی مرکزی حیثیت ختم کردے گی۔ آخر بٹھل نے ماہم پاڑے کی چوکی اس شرط پر کی تھی کہ وہ جسے نام زد کردے گا، سب اسے تسلیم کریں گے۔ سب نے ہامی بھری تو بٹھل نے پانڈے دادا کا نام لے دیا اور بالے کو پانڈے دادا کے ساتھ کردیا۔ بنارسی دادا نے تھوڑی بہت چہ میگوئی کی تھی، تاہم مقابلے پر آنے سے گریز کیا تھا۔ پانڈے دادا اور بالے کو کل کے چھوکرے سمجھتا تھا۔ بٹھل نے ماہم پاڑے سے رُخصت ہوتے ہوئے کہا تھا۔ ''کان کھول کے سُن لو رے۔ پھر نہ کہنا سنائی نہیں پڑی۔ بالے، پانڈے کے ساتھ ادھر رہے گا۔ جب تک ہم پلٹ کے نہ آئیں۔ اور تم لوگ کو بلا کے نہ پوچھیں کہ ابھی تم میں سے کس جوان بلوان کی کھال کتنی موٹی کی ہے۔ کس نے چاقو کی بولی کتنی سیکھی ہے اور اسے اپنی کتنی سکھائی ہے! اپنے تین پاڑوں کے سوا سارے پاڑے، ماہم پاڑے سے الگ رہیں گے، بھتا بھی نہیں پہنچائیں گے، قلابے، اندھیری اور دادا کے سوا۔ ہمارے پیچھے کسی کا دماغ اُلٹے گا تو اسے چھاتی پھلا کے ادھر آنے سے تم روکو گے۔ جدھر ہم پانڈے اور بالے کو بول کے جائیں گے، وہ ہم کو خبر کریں گے۔ ہمارے لوٹنے تک تم اس تیس مار خاں کو انتظار کرنے کا بولو گے۔ ہمارے آنے سے پہلے کسی نے پانڈے اور بالے کو چھیڑا اور تم ہاتھ تاپتے رہے تو ہم تم کو دوبارہ اس طرح نہیں بلائیں گے۔ ہم خود اسے دیکھ لیں گے، پھر آگے ہم بولیں گے بھی نہیں۔ یہ سب تمھاری خاطر کرنا پڑا ہے۔''

ہم کئی ماہ بعد لوٹے تھے۔ ماہم پاڑے کی صورتِ حال سے قطعاً بے خبر تھے۔ ہمارا کوئی مستقل پتا تو تھا نہیں، جو پانڈے اور ہالے کو دے کے جاتے، بٹھل نے بھرم جمایا تھا۔ بٹھل نے جگنو اور دیوا کو خاص تاکید کردی تھی کہ وہ پاڑے صرف سُن گن رکھنے جائیں گے۔ وہاں کے کاروبار میں ان کا کوئی دخل نہیں۔ جگنو اور دیوا کے چہروں پر ہیجان بتا رہا تھا کہ گرما گرم خبریں ہیں۔ مگر اتنی بھی نہیں کہ پریشان ہُوا جائے۔ یقیناً صبح اول دم بٹھل تک تمام کارگزاریاں ترسیل کردی گئی ہوں گی۔ بٹھل کی صورت پر ویرانی پاڑوں سے متعلق نہیں تھی۔ وہی زریں تھی جس کا آشیانہ شاخِ گلِ بہار پر تھا۔

رات کھانا میں نے واجبی سا کھایا۔ خمیری اور فطیری دونوں اقسام کی روٹیاں تھیں۔ کوفتے تھے جن میں پنیر کا بگھار لگا ہُوا تھا، شیشے کے چھوٹے چھوٹے نفیس مرتبانوں میں اچار، چٹنیاں اور مربّے تھے۔ بھنے ہوئے تیتر اور بھنی ہوئی مچھلی الگ تھی۔ فرخ بتا رہی تھی، ہر کھانے کا دسترخوان اتنا ہی کشادہ ہوتا تھا۔ ایک وقت کا کھانا دوسرے وقت کے لیے نہیں اٹھایا جاتا تھا۔ غربا اور فقرا میں تقسیم کردیا جاتا۔ ہر جمعرات ابا جان خیرات کیا کرتے تھے۔ جس کا شہرہ بمبئی کے مساکین سے زیادہ اُمرا میں تھا۔ کھانا بے حد لذیذ تھا۔ میں نے سیر ہو کے کھایا۔

دسترخوان سے فراغت ہوتے ہی ابا جان میرا ہاتھ پکڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ ”بٹھل ذرا باہر آجاؤ! زورا اور جمرو تم بھی آجاؤ!“

صحن میں گویا بکرا منڈی لگی ہوئی تھی، سیاہ رنگ کے بکرے ہی بکرے نظر آئے تھے۔ معلوم ہُوا کہ چالیس بکرے ہیں۔ ابا جان نے میرے، بٹھل، زورا اور جمرو کے تناسب سے فی آدمی دس بکرے منگوائے تھے، اور سب کے سب سیاہ۔ کسے خبر کہ اس قدر بھاری تعداد میں سیاہ بکرے کہاں کہاں سے تلاش کرکے لائے گئے ہوں گے۔ وہیں ایک باریش مولوی صاحب موجود تھے۔ ابا جان کے سامنے بچھے جاتے۔ بات کرنے سے قبل وضع داری سے مسکراتے ضرور تھے۔ کچھ قصاب بھی ایک جانب جمگھٹا بنائے کھڑے تھے۔

”مولوی صاحب ماشاءاللہ... دعا کروائیں!“

مولوی صاحب ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کے مسکرائے۔ اس مسکراہٹ میں بے طرح پھیل جانے والی باچھیں ان کی وضع داری کو متاثر کرتی تھیں۔ ”جی ماشاءاللہ، ماشاءاللہ۔“

”قصابوں سے حلالی چھریاں منگوا لیجیے۔ مناسب ہوگا کہ حلال کرنے کے واسطے چار قصاب منتخب کرلیجیے۔ اور وہی چھریاں لے آئیں۔“ مولوی صاحب نے چٹے کی شکن درست کی۔ ہم صحن کے سبزے میں کھڑے تھے۔ دھوپ کی حدّت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جلدی جلدی چار منتخب کردہ قصاب چھریوں سمیت آگئے۔ مولوی صاحب یکے بعد دیگرے چھریاں ہمارے آگے کرتے رہے، ہم دھار پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ پھر مولوی صاحب ہر مرتبہ مختصر دعا کرواتے اور چار قصاب کے حوالے کرتے ہوئے کہتے کہ میاں تم نے گنتی کی دس جانور ذبح کرنے ہیں، ایک کم نہ ایک زیادہ۔ اور سب سب اسی چھری سے حلال کرنے ہیں۔ مجھے صدقے کے اطوار کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتے تھے، تاہم ابا جان کی داری بھی مقصودِ خاطر تھی۔ اس کام سے فراغت کے بعد ملاقاتی کمرے میں اٹھ آئے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا مولوی صاحب بار بار مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش کر تھے، تاہم اجنبیت آڑے آجاتی تھی۔

ملاقاتی کمرے میں سہیل ہوگئی۔ مولوی صاحب برابر ہی فروکش ہوئے تھے۔ بٹھل دروازے سے ہی پلٹ ”چلورے ادھری دیکھ آئیں۔ حرامی یہاں آجائیں بٹھل نے دیوا اور جگنو کو مخاطب کرکے کہا۔ ”لاحول ولا قو مولوی صاحب نے بٹھل کا جملہ سُن کے کڑواہٹ سے پھلایا۔ ”مغلظات سے پرہیز کیجیے۔“

بٹھل جواب دینے کے لیے بے کلی سے پلٹا تھا، مگر پھر رہا۔ مولوی صاحب نے بھی ٹھنکے مُنہ بنایا۔ ابا جان کبیدہ خاطر لگتے تھے۔ مگر کچھ نہ بولے۔ میں بھی خاموش رہا۔ بٹھل فوری طور پر اڈّے کا رُخ کر رہا تھا۔ جگنو اور دیوا اسے یقیناً کوئی اہم بات معلوم ہوئی ہوگی۔ میں بھی ہمراہ ہو کے لیے اٹھ کھڑا ہُوا۔

”دیکا رہ رے۔ ابھی آجائیں گے... باپ کا چوکھٹا بنا ان کا تاپ نہیں اُترے گا۔“ بٹھل نے مجھے درشتی سے اس کا لہجہ حتمی تھا جس میں کسی حیل وحجت کی گنجائش نہ تھی خاموشی سے بیٹھا رہا۔

”ابھی چلو دادا، اپن ایک دم چالو ہے۔“ جگنو کے بولا۔

”اپن بھی ساتھ جائیں گا نا استاد۔“ زورا نے ہوئے کہا۔ بٹھل نے جس درشتی سے مجھے جواب دیا نے اسے کمزور کیا۔ زورا کے ساتھ جمرو نے بٹھل کی

اٹھائیں۔ یعنی وہ بھی زورا کے سوال میں شریک تھا۔

”اور اپنی ماں کا...“ بٹھل یک دم مولوی صاحب کے ...ے رک گیا۔ ”ہاں، چلو رے۔“

”اب زورا اور جمرو جاسکتے ہیں تو میں کیوں نہیں!“ بٹھل ...ور کرنے لگا تو میں نے آواز لگائی۔

...ن وہ ٹٹکا بھی نہیں اور نکل گیا۔ زورا، جمرو، دیوا اور جگنو ...ھک کے اس کے پیچھے نکل گئے۔ میرے اندر کھلبلی ...ا کوئی اہم بات ہی تھی۔ تبھی بٹھل اتنے غصے اور ...ں گیا ہے۔ اگر ماہم پاڑے جانے میں اس کی غرض ...حال احوال تک محدود ہوتی تو وہ زورا اور جمرو کو بھی ہمراہ ...ا۔ معاملہ کچھ اور ہی لگتا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ...ے شاکر بھائی کی طرف نکلوں گا اور اس کے بعد وہاں ...ا ماہم پاڑے کی راہ لوں گا۔

”ماشاءاللہ! تو آپ ہیں، بابر زماں خاں۔ والد محترم ...یاد کرتے رہتے ہیں۔“ مولوی صاحب نے بٹھل کے ...ے روئے سخن کے بجائے وجودِ سخن میری طرف ...ے ہوئے کہا۔

...وقت ان کا کلام کرنا ناگوار گزر رہا تھا۔ مگر ابا جان ...ے دیکھ رہے تھے۔ صاف دِکھتا کہ ابا جان پر ...ا تصرف حاصل کرلیا تھا۔ ان کی ہر ادا ...ھک رہی تھی۔

...م بجا فرمایا! بندے ہی کو بابر زماں کہتے ہیں۔“ ...داری سے کہا۔

”آپ کی غیر موجودگی میں والدِ محترم نے دن خاصی ...ر ارے ہیں۔“

...دل میں آئی کہ کہوں جی ہاں والد صاحب کی ...ے صدقے آپ نے بھی خوش حالی میں دن گزارے ...ہہ سکا، اسی دوران میں ابا جان باہر دیکھ بھال ...ا گئے۔

...ی قبلہ بے شک! آپ کے وجود ناتواں پر بارِ گراں ...آپ جایئے، فرزند محترم و مکرم موجود ہیں، ہم ان ...ھ اور استقامت کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

...مولانا صاحب! اوہ، میں معذرت خواہ ہوں، ...کا تعارف کروانا بھول گیا تھا۔“ ابا جان کھڑے ...ہے ہیں قبلہ... اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔“

مولوی صاحب کچھ اور تن گئے۔

”بیٹے، یہ مولانا علیم الدّین باقی ہیں، سلسلے میں خلیفہ ہیں۔ لکھنو سے تعلق رکھتے ہیں۔ شعر کا شوق رکھتے ہیں۔ ذوق میں تفنن ہے۔ ظرافت کلام میں چھلکتی ہے۔ عالم فاضل آدمی ہیں اور بیٹا... بیٹا، جب تمھاری طرف سے میں پریشان ہوگیا تھا تو ان سے رجوع کیا تھا۔ چالیس بکروں کے صدقے کی منت کا وظیفہ مولانا صاحب ہی نے مرحمت فرمایا تھا۔“

”جی ہاں۔ بفضلِ تعالیٰ منّت ماننے کے صرف تین دن بعد آپ آموجود ہوئے۔“ مولوی صاحب نے ابا جان کا بقیہ جملہ از خود مکمل کرنا ضروری سمجھا تھا۔

”اور... اور بیٹا...“ ابا جان ہچکچانے لگے۔ ”بیٹا، مجھے مولانا صاحب کی اس بات سے بھی اتفاق کرنا پڑ رہا ہے کہ تم پر گیا کے اطراف میں پھرنے والے بداثرات کا سایہ ہے۔ اگر اس سلسلے میں مولانا صاحب تم سے کچھ تعاون طلب کریں تو انکار نہ کرنا۔ اسے باپ کی التجا سمجھ لو یا صفدر زماں خاں کا حکم۔“

ابا جان کی بات سُن کے طبیعت میں کبیدگی اور بوجھل پن پیدا ہوگیا۔ ابا جان مطالعہ کار، صاحبِ نظر اور روشن نظریات کے آدمی تھے۔ مگر شاید ایک باپ بھی تو تھے۔ باپ تو باپ ہی ہوتا ہے۔ اس کا مطالعے، مذہب، نظر اور روشنی سے کیا واسطہ۔ ابا جان نے واضح طور پر اسے صفدر زماں خاں کا حکم قرار دیا تھا۔ صفدر زماں خاں وہ تھے جن کے جلال سے میں تھر تھر کانپتا تھا۔ بید میں جب تک کھال نہ اُدھڑ کے لگ جاتی یا امی جان ہاتھ جوڑ کے سامنے نہ آ کھڑی ہوتیں، ابا جان کا ہاتھ نہیں رُکتا تھا۔ بٹھل سے ابا جان یقیناً یہ گفتگو کرچکے ہوں گے، تبھی وہ مجھے ساتھ لے کر نہیں گیا۔ ورنہ میرے ساتھ جانے میں کیا عذر تھا۔ صبح سے اس کا چہرہ جو سُنتا ہُوا تھا، اس کی وجہ شاید یہی گفتگو تھی۔ ابا جان مجھے مولوی علیم الدین باقی کے حوالے کرکے رخصت ہوگئے۔ ان کی چال میں آزردگی اور ملال کی لڑکھڑاہٹ تھی۔

”ہاں تو بٹیا بابر زماں خاں، کہاں رہے اِتنے دن۔“ مولوی صاحب کھنکھارتے ہوئے بولے۔

بوریوں میں بند ہو کے چھکڑوں پر لادے جاتے وقت بھی اتنی تذلیل محسوس نہ ہوئی تھی، جتنی اس وقت محسوس کر رہا تھا۔ جی چاہا کہ نزدیک رکھا گل دان اس کے سر پر دے ماروں۔ مگر ابا جان کا خیال آتے ہی میں نے یہ ارادہ ترک کردیا۔

”بٹیا، میں جانتا ہوں آپ کے اندر موجود ایک بری

علامت مجھے جوابات دینے سے روکے گی۔ یقیناً آپ کو اشتعال انگیز رجحان کی طرف مائل بھی کیا جائے گا۔ لیکن آپ پڑھے لکھے نوجوان لگتے ہیں۔ تحمل کا دامن تھام کے رکھیے گا۔ اب بتائیے۔ کہاں رہے اتنے دن؟ کسی کو کوئی خبر نہیں ہوئی۔"

مولوی صاحب کے طرزِ استدلال پر میرا غصہ خوش گواری میں تبدیل ہوگیا۔ گفتگو کا تعلق بس ذہانت ہی سے جڑا ہے۔ مخاطب کتنا ہی خاطر دار کیوں نہ ہو، اگر ذہانت سے بے بہرہ ہے تو لطفِ کلام نہیں رہتا۔ مخاطب ناپسندیدہ ہو تو ہوا کرے مگر آزمودہ کارِ سخن ہے تو واہ وا کیجیے۔ رسم عدو بھی راہِ حُب سے زیادہ لطف دے جاتی ہے۔ مولوی ذہین آدمی لگتا تھا۔

"قبلہ محترم مولوی صاحب! آپ نے یہ سوال ان تین افراد سے کیوں نہیں پوچھا جو میرے ساتھ غائب رہے ہیں۔ مجھی سے کیوں؟ صرف اس لیے کہ میں صفدر زماں خاں کا بیٹا ہوں جو متمول ہیں؟"

"لاحول ولاقوہ... گفتگو میں متمول کا لفظ اضافی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ برخوردار علم الاعداد کی رُو سے اثرات صرف آپ ہی پر ناقص ہیں۔ وہ آپ کی گردش کے زیرِ اثر آ گئے ہیں۔ دراصل آپ کو اس گرداب سے نکال کر ہی میں ان حضرات کی مدد کرسکوں گا۔ یعنی کہ برخوردار اپنی حسِ نفیس کے تحت آپ یہ تسلیم کرلو گے، اگر آپ اپنے علاج سے دیدہ و دانستہ غفلت کے مرتکب ہو گے۔ احتراز برتو گے تو لامحالہ طور پر آپ اپنے احباب کی جان و آبرو کے درپے بھی ہو گے۔"

مولوی صاحب نے مجھے پھر لاجواب کر دیا تھا۔ میں جلد از جلد ان سے جان چھڑانے کی فکر میں تھا۔ شاکر بھائی کہیں دلواڑا واپس نہ چلا جائے۔ "میں سیر و سیاحت کی غرض سے گیا ہُوا تھا۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ گلوخلاصی کی اک یہی سبیل نظر آتی تھی۔

"دشت نوردی اور سیر و سیاحت میں فرق جانتے ہیں آپ برخوردار؟"

"جی نہیں... البتہ سیاحت کو دشت نوردی کے ضمن نہیں لیتا۔"

"برخوردار سیاحت کے اب تک دو یہی مقاصد آئے ہیں۔ ایک مقصد راحت و آسودگی کشید کرنا ہے مقصد حصولِ علم و دانش ہے۔ آپ کس مقصد کے لیے فرماتے ہیں؟"

"کیا ضروری ہے کہ سیاحت کے صرف یہی دو رہیں۔"

"ماشاءاللہ، سبحان اللہ برخوردار تیسرا آپ خود کر دیجیے۔"

"سیاحت کا ایک مقصد راہ پیمائی بھی تو ہے۔ قد استطاعت اور جان کاری بھی تو ہے۔ حوصلوں کی پیمائش کی جاتی ہے سیاحت میں۔ رفاقت کی آزمائش بھی سیا مطلوب رہتی ہیں۔ کسی کی تلاش بھی ہے... اور..."

"برخوردار یہ تمام مضامین علم و دانش کے ضمن ہیں۔ تمھیں کس کی تلاش ہے؟"

"میں آپ کے سوال کا جواب دے چکا ہوں۔"

"کیا آپ کو کسی خاتون کی تلاش ہے؟" مولوی نے ذومعنی انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کے لہ بتا رہا تھا کہ وہ سب جانتے تھے۔ کیا ابا جان نے ان سب کچھ کہہ دیا ہے جو میری ہے امانت کی طرح ہے۔ اُف میرا خدا! میری رسوائی اگر کیا ساماں ہوگا سمٹے ہوئے اعصاب لمحوں میں منتشر ہو گئے۔

"اس خاتون کا نام کیا ہے... شاید وہی ارواح الم تجسیم تھی؟"

اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ میں نے رکھا ہوا گل دان اٹھا کے پوری قوت سے صاحب پر دے مارا۔

"بازی گر" سب رنگ کا سب سے مقبول
اُمنگوں، حوصلوں، آنسوؤں اور آہوں کے داس
پانچویں درویش کا
ایک سرآفراز، سینہ فگار نوجوان کا سفرنامہ
باقی واقعاتِ آئندہ شمار

فصد

ڈیبنے گورڈنے / محمد عباس ثاقب

معاشرے کے ایک جرّاح کا کریہہ، ناسور زدہ اعضا کی جراحی
اُس کے لیے ہر شے سے زیادہ اہم تھی... ہر شے زیادہ!

آدم کے دو بیٹوں کے نئے قضیے کا مآل

انھوں نے لڑکے کو گولیوں سے چھلنی کر ڈالا۔ وہ بے چارہ ان کے راستے میں آ گیا تھا، چناں چہ انھوں نے بلا تردّد اسے بھون ڈالا۔ وہ اتنی عجلت میں تھے کہ شاید انھیں ادراک ہی نہیں ہو پایا کہ وہ محض ایک نوعمر لڑکا تھا۔ یا پھر انھیں اس بات کی پروا ہی نہیں تھی۔

اسی اثنا میں شراب کے اسٹور کا کلرک فضا میں ہاتھ لہراتا، باہر بھاگا۔ انھوں نے اس کی پشت میں بھی گولی اُتار دی۔

"اوہ خدا!" میں نے کہا اور اضطراب کے عالم میں ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ گاڑی کا انجن بری طرح غرّایا۔ وہ لوگ چند لمحوں کے اندر گاڑی میں ٹھنس گئے۔ "گاڑی بھگاؤ!" میری گدّی پر پستول کی نال جمائے بیٹھا شخص غرّایا۔

میں نے گاڑی آگے بڑھائی اور انھیں وہاں سے دُور لے جانے لگا۔ عقب میں آنے والی گاڑیوں نے ہمارے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کیا، بلکہ رفتار دھیمی کر کے بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ جیسے انھیں خطرہ ہو کہ کہیں وہ غلطی سے ہمیں اوورٹیک نہ کر لیں۔ میں گاڑی کو پتلی پتلی، پُر پیچ گلیوں میں گھما پھرا کر شاہ راہ پر پہنچا اور ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہو گیا۔ وہ لوگ آپس میں گپ شپ کرنے لگے۔ تب مجھے اندازہ ہُوا کہ ہم خطرے کی زد سے باہر آ چکے ہیں۔ وہ شاہ راہ شہر کے کاروباری علاقے کی طرف جاتی تھی۔

پستول میری گردن کی پشت سے ہٹ چکا تھا، تاہم ساتھ والی سیٹ پر موجود، بندر نما بدمعاش کا بایاں ہاتھ ابھی تک میری سیٹ کے پشتے پر جما ہُوا تھا۔ ”ایک سگریٹ مل سکتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ وہ بایاں ہاتھ سیٹ سے ہٹائے بغیر جیب ٹٹولنے لگا اور پھر ایک سگریٹ مجھے تھما دی۔ میں نے عقب نما آئینے میں ٹمپا کو دیکھا۔ وہ وائٹی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میری فرمائش سُن کر اس نے بھی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”نہیں، میں تجھ سے نہیں مانگ رہا، نطفۂ...!“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ مجھے اس کے لیے کوئی اور شایانِ شان لقب سوجھتا تھا۔ آپ اپنے سگے بھائی کو تو اس طرح کے نام سے نہیں پکار سکتے نا!

”تم بلاوجہ خون جلا رہے ہو، چھوٹے! ٹھنڈے ہو جاؤ۔“

میں نے اچانک اسٹیرنگ سے پاؤں ہٹا لیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے دھیمی ہوئی۔ عقب میں آنے والی گاڑی سر پہ چڑھ آئی۔ ڈرائیور نے پوری قوت سے ہارن بجا کر گویا مغلظات مجھ تک پہنچائیں۔

”یہ بڑے بھائی والا برتاؤ اب نہیں چلے گا...“ میں نے دانت پیس کر کہا۔ ”میں لعنت بھیجتا ہوں اس رشتے پر۔ میرے لیے اب اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔“

”ایسا نہ کہو چھوٹے...!“ میرے بھائی نے پچکارتے ہوئے کہا۔ ”خون کا رشتہ ایسے ختم تھوڑی ہوتا ہے۔ تم بہت جلد پھر راستے پر آ جاؤ گے۔“

”چھوڑو اس بات کو، تم ڈرائیونگ پر دھیان دو۔“ میرے پہلو میں بیٹھے شخص نے کہا۔ میں نے ایک بار پھر رفتار بڑھا دی اور ٹریفک کے ساتھ چلنے لگا۔ گاڑی چلانا بہت سہل اور پُر لطف تھا۔ علی الصباح کی جنونی چہل پہل دم توڑ چکی تھی۔ اب مال دار اسامیوں کی اپنے کاروباری ٹھکانوں کی طرف مراجعت کا وقت تھا۔

ٹمپا اور وائٹی لُوٹی ہوئی رقم گن رہے تھے۔ بندر نے گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ ”کتنا مال ہے؟“

”تین لاکھ!“ ٹمپا نے جواب دیا۔

”بہت لمبا ہاتھ مارا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، ٹھیک ہی ہے۔“ ٹمپا نے اعتراف کیا۔

”ڈیڑھ لاکھ فی کس!“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ ٹمپا نے حیرانی سے پوچھا۔

”تم نے دو قتل کر کے یہ مال لوٹا ہے نا؟ تو ایک قتل لاکھ میں پڑا!“

”اپنا منہ بند رکھو...“ ٹمپا نے تلملا کر کہا۔ ”میری غیر موجودگی میں تمھاری زبان کچھ زیادہ ہی چل پڑی ہے۔“

”میں اس کی زبان کی تیزی کا تو نہیں کہہ سکتا، ٹمپا۔“ وائٹی نے مداخلت کی۔ ”لیکن اس کی بات میں مجھے وزن ہے۔ تمھاری گن کچھ زیادہ ہی خوں خوار ہوتی جا رہی ہے۔“

”وہ دونوں چشم دید گواہ تھے...“ ٹمپا نے کہا۔ اس کا میری توقع سے کم تلخ تھا۔ ”قانون کے پجاری میں اناڑی پھنسا کرتے ہیں جو صفائی کا کام نمٹانا نہیں رکھتے۔“

وائٹی نے مزید کچھ نہیں کہا، غالباً ٹمپا کے خو... سے۔ میں اس کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔ میں بھی ٹمپا سے ڈ... زدہ تھا، ہمیشہ سے رہا تھا۔ حتّٰی کہ اس زمانے سے جب ہم ہُوا کرتے تھے، وہ مجھ سے دس سال بڑا تھا اور اس کے ا... یا خوف نام کی کسی چیز کا کبھی شائبہ تک نہیں رہا تھا۔ جن چ... واقعات سے دیگر بچے خوف زدہ... بلکہ حواس باختہ ... کرتے تھے، ٹمپا ان پر قہقہے لگایا کرتا تھا۔

وہ مجھ سے زیادہ مار پیٹ نہیں کرتا تھا۔ اس کے ہا... دوسرے بچوں کی دُرگت میری روح فنا کرنے کے لیے ہوتی۔ وہ انتہائی بے دردی سے ان کی پٹائی کرتا تھا اور مار ... ہوئے اسے اس بات کی ذرّہ برابر پروا نہیں ہوتی تھی کہ ... والے کو کہاں کہاں چوٹ لگ رہی ہے، بس اندھا دُھند مار ... جاتا۔ اس کی وحشیانہ جارحیت نے اسے خود بہ خود باقی لڑکوں پر غالب کر دیا تھا۔

انھوں نے ہمارے گھر سے تین بلاک پہلے مجھے گاڑی ... کو کہا۔ میرے گاڑی سے اترنے پر وائٹی نے اسٹیرنگ سنبھال ...

”تم گھر نہیں چل رہے؟“ میں نے ٹمپا سے پوچھا۔

”بعد میں آؤں گا چھوٹے۔ رقم بہت بڑی اور معاملہ گرم ہے۔ ہمیں جلد از جلد گاڑی سے بھی جان چھڑانی ہے۔

مجھے قطعاً علم نہیں تھا کہ وہ گاڑی چوری کی ہے۔ مجھے ... کہ میں کتنی بے فکری سے، سج سج اسے ٹریفک کے درمیان ... رہا تھا۔ ٹمپا خوب سمجھ رہا تھا کہ میں کس سوچ میں ہوں۔ ... نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ”اب یہ معصوم بلونگڑے جیسی شکل ... کوئی فائدہ نہیں۔ تم نہ صرف چوری شدہ گاڑی چلاتے ... بلکہ شراب کا اسٹور لوٹنے میں بھی شامل رہے ہو۔“

”تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم وہاں سے صرف ایک بوتل ... چاہتے ہو۔“ میں نے دانت پیس کر کہا۔

”اور ہم نے ایک ہی بوتل لی ہے...“ وائٹی نے ہاتھ میں ... بوتل لہراتے ہوئے دانت دکھائے۔ ”میں نے وہاں ... اٹھائی تھی۔“

وہ سب ہنس پڑے۔ میں جھینپ کر بایاں ہاتھ ڈالے وہاں ... کال پڑا۔ میں نے عقب میں انجن کی گرج سنی، تاہم گاڑی ... پاس سے نہیں گزری۔ میں نے اندازہ لگایا کہ انھوں ... یو ٹرن لے لیا ہوگا۔ میں سوچ میں ڈوبا، جانے پہچانے ... پر آگے بڑھنے لگا۔ بلاک کے کونے پر لیفٹیننٹ الفریڈ ... سامنا ہُوا۔ اس نے میرے والدین کا حال چال پوچھا۔ ... کسی طرح اسے تشفی بخش جواب دینے میں کام یاب ... کتنی مرتبہ ٹمپا کو چوری کرتے پکڑ چکا تھا۔ وہ ... کا احترام کرتا تھا۔ وہ انھیں ہمیشہ تسلی دیا کرتا ... ایک محفوظ دور سے گزر رہا ہے۔ ٹمپا اس دور سے بھی ... چکا تھا۔ وہ نجانے کتنے ادوار سے گزر چکا تھا اور ہر دور ... والے سے بدتر تھا۔

گلی کے آخری سرے پر میں نے اپنے والد کو بلڈنگ میں ... ہوتے دیکھا۔ میرے قدم خود بہ خود دھیمے پڑ گئے۔ میری ... میں نہیں آ رہا تھا کہ انھیں کیا بتاؤں۔

ہم ایک ہال کے اوپر بنے کمروں میں مقیم تھے۔ میرا ... ماں، میں اور ٹمپا... جب بھی وہ جیل سے واپس آتا! اس ہال ... میرے والد غیر ملکی زبان کا ایک اخبار شائع کرتے ... میرے والد ایک دیانت دار انسان تھے، ٹمپا کے مطابق عقل ... ماری۔ لیکن وہ عقل سے عاری ہرگز نہیں تھے۔ بس اپنی دیانت ... سے خسارے میں رہتے تھے۔ دیانت تو اخبارات کے ... کی ترقی میں آڑے آیا ہی کرتی ہے، خواہ وہ ہمارے ... اشاعت والا اخبار ہو۔ اس سے اشتہاروں میں بھی کمی ... اور خبروں کی تعداد میں بھی۔ میرے والد ایسی ہر خبر تلف ... تھے جس کی سچائی پر انھیں یقین نہ ہوتا۔ اور اگر آپ ایسی ہر خبر ردّی کی ٹوکری میں پھینکتے رہیں جس کی صداقت مشکوک ہو تو آخر میں آپ کے پاس اتنی کم خبریں باقی بچتی ہیں کہ وہ اخبار کا پیٹ بھرنے کے لیے قطعاً ناکافی رہتی ہیں۔ ایسے میں آپ حیران و پریشان ہونے کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔

میں نے ایک طرف کھڑے، کھلی چھت والے منی ٹرک کی طرف دیکھا۔ اس میں اخبارات لدے ہوئے تھے۔ میں بھاری دل کے ساتھ والد کے پاس پہنچا۔ وہ میز پر جھکے لکھ رہے تھے۔ میں نے ان کے شانوں کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ وہ ڈیومیکرسن کو دی جانے والی سزائے موت پر نیوز اسٹوری تیار کر رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک کاغذ پر ڈیومیکرسن کی تمام سابقہ وارداتوں کی فہرست درج تھی اور وہ باری باری ان کا تذکرہ کرنے کے بعد اس حالیہ واردات تک پہنچ رہے تھے جس کے ارتکاب کے سبب ڈیو قانون کے پھندے میں پھنسا تھا۔ ونکی سیکلون کا قتل۔

ڈیومیکرسن، ونکی سیکلون، ٹمپا، وائٹی اور وہ بندر جو شراب کا اسٹور لوٹنے میں شریک تھا، یہ سب ہمیشہ ایک ساتھ سفر کرتے تھے۔ اور پھر ایک دن بالآخر سیکلون اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ شہر کی حدود کے کنارے واقع چھوٹے سے، متروک اسٹیٹ پارک میں، چیڑ کے گھنے جھنڈ تلے۔ یا پھر شاید اسے کہیں اور قتل کر کے اس کی لاش وہاں پھینکی گئی ہو۔

میرے والد کو اسٹوری آگے بڑھانے میں مشکل ہو رہی تھی۔ انھوں نے شہ سرخی لکھ رکھی تھی۔ سیکلون کا قاتل انجام کو پہنچا۔ میں سمجھ گیا یہی شہ سرخی ان کے قلم کی رفتار دھیمی کر رہی ہے۔ وہ خواہ جتنے صفحے لکھ لیتے، انھیں وہ صبح ضرور یاد آ رہی ہوگی۔ سیکلون کے قتل کے اگلے دن ٹمپا کمرے میں آیا تو میں نے اس کے لباس سے چیڑ کے کانٹے نما پتوں کے گچھے جھڑ کر فرش پر بکھرتے دیکھے۔ ماں کے لیے تو یہ محض کام میں اضافہ تھا لیکن میرے باپ کے لیے یہ منظر ایک الگ ہی معنی رکھتا تھا۔ میرا خیال ہے وہ بات کی تہہ تک پہنچ گئے تھے۔

بالآخر میرے باپ نے میری طرف دیکھا اور سرنفی میں ہلایا۔ ”نہیں، مجھے یہ سرخی تبدیل کرنی پڑے گی۔“

”کیا فرق پڑتا ہے پاپا؟ ڈیومیکرسن کئی اور لوگوں کا بھی قاتل ہے۔“

”یہ بات شاید پوری طرح درست نہ ہو...“ پاپا نے کہا۔ ”مجھے ہرگز یقین نہیں کہ وہ قتل ڈیومیکرسن ہی نے کیا ہے، جس کی سزا اسے موت کی شکل میں دی جا رہی ہے۔“

انسانی دل

انسانی دل بظاہر گوشت کا بنا ہوا ایک عضو ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک حیرت انگیز پمپ ہے، اور اس کا بنیادی کام سارے جسم میں خون مہیا کرنا ہے، جو دل سے منسلک خون کی نالیوں کے نظام کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس نظام میں سارے جسم سے گندہ خون جس میں آکسیجن بہت کم ہوتی ہے، وریدوں کے ذریعے دل کے دائیں حصے میں آتا ہے۔ وہاں سے یہ صفائی کے لیے پھیپھڑوں میں پمپ ہوتا ہے، جہاں پھیپھڑوں میں سانس کے ذریعے آنے والی آکسیجن اُس میں شامل ہوتی ہے۔ آکسیجن سے بھرپور صاف خون پھیپھڑوں سے دل کے بائیں حصے میں آتا ہے، جہاں سے یہ شریانوں کے ذریعے سارے جسم میں پہنچتا ہے۔

انسانی دل مٹھی کے برابر ہوتا ہے، اور اُس وقت سے دھڑکنا شروع ہوجاتا ہے، جب بچہ ماں کے پیٹ میں ایک ماہ کا ہوتا ہے۔ دل سے ایک سیکنڈ میں 70 سی سی خون پمپ ہوتا ہے، گویا ایک منٹ میں تقریباً 5000 سی سی (5 لیٹر) خون پمپ ہوتا ہے، جو ایک گھنٹے میں 300 لیٹر بنتا ہے۔ اندازہ کیجیے کہ ایک ہفتے، یا ایک مہینے، یا ایک سال میں کتنا خون پمپ ہوتا ہوگا۔ یہ ایک حیرت انگیز پمپ ہے، جو بغیر کسی توقف کے، دن رات اپنے کام میں مصروف رہتا ہے، اور ہمارے سوجانے کے باوجود سوتا نہیں، کام کرتا رہتا ہے۔ اگر کبھی دل کی حرکت میں خلل پڑ جائے تو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ دل کا کام دیکھ کر قدرت کی صناعی کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔

انسانی دل جتنا محنتی اور سخت جاں ہے، اُتنا ہی نازک بھی ہے، دل کو اپنا کام کرنے کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ خوراک خون کی سپلائی سے مہیا ہوتی ہے۔ یہ خون کی سپلائی دل کی شریانوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ ان شریانوں کو 'Coronary arteries' کہا جاتا ہے۔ ان شریانوں میں سے ایک دل کے دائیں طرف اور دوسری بائیں طرف خون پہنچاتی ہے۔ ان شریانوں سے خون دل کے پٹھوں کو آکسیجن اور دیگر ضروری اجزا مہیا کرتا ہے، تاکہ دل اپنا پمپ کرنے کا کام باقاعدگی سے کرتا رہے۔ اگر کسی وجہ سے خون کا مہیا ہونا کم یا منقطع ہوجائے تو یقینی طور پر دل کا وہ حصہ، جہاں خون کی گردش میں کمی آیا ہے، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، جس سے دل کی تکلیف کی علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں۔

جوں جوں انسانی عمر بڑھتی ہے، دل کی شریانوں کے موٹے ہونے کا احتمال رہتا ہے، اور شریانوں کا قطر کم ہونے کے باعث خون کی فراہمی میں رکاوٹ ہوسکتی ہے، جس سے دل کے مختلف امراض جنم لیتے ہیں۔ ابتدا میں 'انجائنا' سینے میں درد محسوس ہوتا ہے، جو سینے کے کسی بھی حصے میں ہوسکتا ہے، لیکن عام طور پر سینے کے بائیں طرف یا درمیانی ہڈی کے پیچھے محسوس ہوتا ہے، اور یہاں سے دونوں کندھوں یا بازوؤں کی طرف، یا گردن کی جانب سرایت کرتا محسوس ہوتا ہے۔ انجائنا ابتدا میں تو کوئی بھاری کام کرنے، وزن اٹھانے، دوڑنے یا سیڑھیاں چڑھنے سے ہوتا ہے، اور کچھ دیر آرام کرنے سے رفع ہوجاتا ہے، لیکن جوں جوں شریانیں موٹی ہوتی جاتی ہیں، خون کی فراہمی میں مزید کمی کے باعث انجائنا معمولی حرکت سے بھی ہوسکتا ہے، اور دل کے دورے کی نوبت بھی آسکتی ہے، جو دل کی کسی شریان میں خون کی گردش میں رکاوٹ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دل کے دورے کا مطلب یہ ہے کہ خون کی گردش میں رکاوٹ کی وجہ سے دل کے پٹھوں کا کوئی حصہ ناکارہ ہوگیا ہے، اور دل کے پمپ کرنے کے کام میں خلل پڑ گیا ہے۔ بعض اوقات دل کا دورہ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ دل کے دورے کی علامات میں سینے کے درمیانی حصے میں شدید درد، ڈوبنے کی کیفیت، پسینا آنا، بے چینی کا احساس اور بلڈ پریشر میں کمی شامل ہیں۔

آخر دل کی شریانیں موٹی کیوں ہوتی ہیں؟ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، عمر بڑھنے کے ساتھ یہ ایک قدرتی عمل ہے، لیکن اس عمل میں مٹاپا، تمباکو نوشی، بلڈ پریشر کی زیادتی، ذیابیطس، خون میں چربی کی زیادتی، ورزش اور سیر کی کمی وغیرہ شامل ہیں، جو دل کی شریانوں کی اندرونی جھلیوں میں تبدیلیاں پیدا کرکے اُنھیں موٹا کرنے کا باعث بنتی ہیں، جس سے خون کی فراہمی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، اور خطرناک نتائج کا خدشہ رہتا ہے۔

ان عوامل کا سدِباب انسانی دسترس میں ہے۔ مٹاپا کم کیا جاسکتا ہے؛ تمباکو نوشی چھوڑی جاسکتی ہے، بلڈ پریشر کی زیادتی پر قابو پایا جاسکتا ہے، ذیابیطس کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے، اور خون میں چربی کی زیادتی کو روکا جاسکتا ہے۔ روزانہ ورزش، پیدل چلنا اور صبح کی سیر ایسے اعمال ہیں، جو ان عوامل پر قابو پانے میں مددگار ہیں۔

مطالعہ و تلخیص ✿ ڈاکٹر قمر ریاض

میں نے ان سے بحث نہیں کی۔ میری رائے کے مطابق خواہ میکرسن نے قتل کیا ہو یا نہ کیا ہو، اس کی موت سے دنیا کو ایک غلیظ بیماری سے نجات ملنے والی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق پاپا بھی یہ بات جانتے تھے لیکن ان پر اپنے اخبار میں صرف سچ چھاپنے کی دھن سوار تھی۔

''ٹمپا واپس آگیا ہے۔'' میں نے بتایا۔

لمحہ بھر کے لیے وہ خوش دکھائی دیے لیکن پھر ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ ''اوہ...'' انھوں نے کہا۔ ''کب رہائی ملی اسے؟''

''دو دن پہلے۔ وہ لوگ کوئی شہادت پیش نہیں کرسکے۔ انھوں ہار مان لی اور اسے چھوڑ دیا۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''یہیں ہے، اپنے دوستوں کے پاس۔ وہ لوگ کوئی کاروبار کرنے والے ہیں۔'' میں نے بتایا۔ میں انھیں بس یہی بتا سکتا تھا۔ کیا میں انھیں بتا سکتا تھا کہ ان کا بڑا بیٹا چند گھنٹے پہلے دو لوگوں کو ٹھکانے لگا آیا ہے؟ میں یہ کیسے بتاتا؟ میرا باپ بوڑھا ہو چلا تھا۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کرپاتا۔

میں سیڑھیاں چڑھ کے اوپر باورچی خانے میں آیا۔ ماں خریداری کے لیے باہر گئی ہوئی تھی۔ میں نے کچھ کھایا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ بند تھا، میں نے ٹمپا بستر کے کنارے پر بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ سگریٹ پیتے ہوئے اپنی گن صاف کررہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ غراتے ہوئے اچھل پڑا۔ مجھ پر نظر پڑی تو ایک بار پھر بیٹھ کر گن کی صفائی میں مصروف ہوگیا۔ سستے سے اونی بیڈ کے کنارے بیٹھا وہ کوئی مسخرہ دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کوئی نہیں، خوں خوار درندہ ہے۔

''تم کب آئے؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ ہی دیر پہلے۔ میں پچھلے دروازے سے آیا تھا۔ بڑے میاں کے سامنے جانے سے پہلے برش وغیرہ کرلوں۔'' میں نے گن پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، تو واقعی بہت ضروری ہے۔ پاپا کل کے اخبار کے لیے اسٹوری لکھ رہے ہیں۔ ڈیومیکرسن کا انجام۔''

ٹمپا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''آج رات اسے بجلی کی کرسی پر بٹھایا جارہا ہے؟''

''بہت تاخیر کردی انھوں نے۔ یہ کام تو برسوں پہلے ہوجانا چاہیے تھا۔''

وہ بُش پڑا، ہمیشہ کی طرح۔ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا کہ اسے ہنسی آگئی تھی۔ ایک شخص اس کے جرائم کا خمیازہ بھگتنے جارہا ہے، موت کی بھینٹ چڑھ رہا تھا، اس کے باوجود ٹمپا اس پر ہنس سکتا تھا۔

''یہ بات اہم نہیں ہے کہ تم کیا کرتے ہو...'' ٹمپا نے کہا۔ ''اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ تم کیا کچھ کرنے کے بعد بچ کے نکل سکتے ہو۔''

مجھے بھی متلاتا محسوس ہُوا۔ میں کمرے سے باہر جانے کے لیے مڑا۔ میں بھول چکا تھا کہ وہاں کس مقصد سے آیا تھا۔

''ارے ٹھیرو!'' ٹمپا نے کہا۔

میں رک گیا۔ ٹمپا جو کہے، وہی کرنا چاہیے، خواہ آپ اس کی بھلائی ہو۔ اسی میں عافیت ہے۔

''وہ لوگ...'' اس نے تیل میں بھیگا چیتھڑا گن پر رگڑتے ہوئے کہا۔ ''کریسٹ ویو کی طرف گئے ہیں۔ وہاں ایک چھوٹا سا بینک ہے جو تین بجے بند ہوجاتا ہے۔ میں اور تم اڑھائی بجے روانہ ہوں گے۔ ہم بینک کے سامنے ان سے ملیں گے۔ وہ وہاں سے کچھ رقم نکلوانے والے ہیں۔''

''میں نہیں جاؤں گا۔''

''تم جاؤ گے اور ضرور جاؤ گے...'' ٹمپا نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''ورنہ میں بڑے میاں کو صبح والی واردات کے بارے میں بتادوں گا۔''

''یہ خبر ان کی جان لے لے گی۔'' میں نے کہا۔ اور میں یہ بات مذاقاً نہیں کہہ رہا تھا۔ پاپا کے لیے اس بات کا یقین کرلینا بہت مشکل ہوتا کہ او لیور اسٹریٹ پر ٹمپا اور ان لوگوں سے میری ملاقات محض اتفاق تھی اور جب انھوں نے شراب کے اسٹور سے بوتل خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے وہ شان دار گاڑی چلانے کے اشتیاق سے مجبور ہوکر رضاکارانہ طور پر انھیں وہاں پہنچانے کی پیش کش کردی تھی۔ اور میری کھوپڑی میں یہ

احمقانہ خیال کیوں آیا؟ صرف اپنے بھائی کو نشے میں گاڑی چلانے کے جرم میں اندر ہونے سے بچانے کے لیے...

''یہ اطلاع انھیں مار ڈالے گی۔'' میں نے پھر کہا۔

''میں تم سے یہی جواب تو سننا چاہتا تھا۔'' ٹمپا نے کہا۔

گھر میں سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ یہاں بیش تر وقت، ہال میں چلنے والے پریس کی گونج سنائی دیا کرتی تھی... یا باورچی خانے میں ماں کے برتن دھونے کی کھٹکھناہٹ، لیکن اس لمحے ہر طرف خاموشی کا غلبہ تھا۔ گھر ہی کیا، مجھے تو لگا جیسے ساری دنیا دم سادھے منتظر ہو کہ کب میں اپنے بھائی کو قتل کرنے کا فیصلہ کرتا ہوں۔

پھر میں نے پولیس طلب کرنے کے بارے میں سوچا۔ اور بھی ہزاروں خیالات میرے ذہن میں در آئے۔ میں نے ان سب خیالات کو رد کر دیا۔ ان میں سے کوئی بھی کارآمد نہیں تھا، ماسوائے پولیس طلبی کے۔ لیکن وہ راستہ میرے باپ کی صحت کے لیے مہلک ثابت ہوتا۔

میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا، اور تبھی میں نے نیچے ہال میں ایک تختہ چرچرانے کی بہت دھیمی سی آواز سنی۔ میں یہ آواز اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میں جب کبھی تاخیر سے گھر لوٹتا تو دبے پاؤں زینہ چڑھتا تھا تو یہ تختہ بالکل اسی طرح چرچراتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی اوپر آیا تھا یا کوئی نیچے جا رہا تھا۔

''ٹمپا، بجے ہیں؟'' میں نے ٹمپا سے پوچھا۔

''...'' میں نے مطمئن لہجے میں کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ میں کار کی چابی لینے نیچے ہال میں پہنچا۔ مجھے خریداری کے لیے جانا تھا۔ کار وہاں موجود نہیں تھی۔ گویا پاپا اور ماں ابھی تک باہر تھے۔ میں نے پاپا کی میز کی دراز کھولی اور ان کی گن کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ میں یہ گن لے جانے سے کترا رہا تھا کیوں کہ پولیس والوں کے ریکارڈ میں اس کا اندراج موجود تھا۔ انھوں نے باریک بینی سے چھان بین کی تو مجھے ٹمپا کے قتل کی پاداش میں دھر لیں گے۔ طوعاً و کرہاً ہی سہی، مجھے یہی گن لے جانی تھی، کیوں کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ ویسے بھی چہرے پر ایسی بدحواسی کے ساتھ شاید مجھے گن خریدنے میں بھی مشکل پیش آتی۔

☆☆☆☆☆☆

ٹمپا نے اس بار بھی عمدہ کار کا بندوبست کیا تھا۔ ہم نے شہر سے باہر جانے کے لیے پرانی سڑک کا انتخاب کیا۔ گاڑی ٹمپا چلا رہا تھا۔ ہم آپس میں بہت کم بات کر رہے تھے۔ میرے

اندازے کے مطابق ٹمپا ابھی تک سُرور میں تھا جب کہ پر خیالات کا غلبہ تھا۔

ہم پہاڑی کے اوپر پہنچے تو مجھے وادی کے دوسری طرف واقع متروک اسٹیٹ پارک دکھائی دیا۔ آسمان کے پس منظر میں چیڑ جھنڈ گہرے نیلے دکھائی دے رہے تھے۔ سڑک گھاٹیوں کے درمیان بل کھاتی سطح وادی میں اتر رہی تھی۔

''یہ وہی جگہ ہے نا جہاں ونکی سیکلون کو قتل کیا گیا تھا آگے اسٹیٹ پارک میں؟'' میں نے پوچھا۔

''کم از کم وہ تو یہی کہتے ہیں۔''

''میں تم سے پوچھ رہا ہوں ٹمپا۔''

کار کا سر ایک لمحے کے لیے سے میری طرف گھوما۔ اس وقت ہم ایک موڑ کی طرف بڑھ رہے تھے، لہٰذا اسامنے دیکھنا پڑا۔ ''ٹھیک ہے...'' اس نے کہا۔ ''تم نے مجھ سے پوچھا چناں چہ میں بتاتا ہوں۔ اس کے دماغ میں فتور تھا، لہٰذا اس نے کھوپڑی میں ہی گولی کھائی۔ ٹھیک ہے؟''

''لیکن وہ تو میکسن کو موت کی سزا دینے والے ہیں!''

''تو کیا ہُوا؟ وہ وہاں موجود تھا۔ قسمت ہمیشہ تو ساتھ دیتی نا!''

یہی مناسب وقت تھا۔ زیادہ تر موڑ پیچھے رہ گئے تھے۔ اب آخری خطرناک موڑ اسٹیٹ پارک کے قریب آنے والا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تم نے ٹھیک کہا ٹمپا، قسمت ہمیشہ ساتھ دیتی ہے۔'' میں نے گن نکال کر اوپر اٹھائی۔

تبھی اس نے اچانک بریک لگا دیے۔ میرا سر ونڈ اسکرین سے ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی ٹمپا نے فولادی پانے سے میرے ہاتھوں پر وار کیا۔ وحشیانہ ضرب سے مجھے کلائیاں سن محسوس ہوئیں۔ میں جانتا تھا کہ گن میری گرفت سے نکل گر چکی ہے۔ اس نے ایک بار پھر پانا لہرایا۔ اس مرتبہ اس نے میری ٹانگ کو نشانہ بنایا تھا۔

''نکلو باہر!'' میرے بھائی نے کہا۔ ''دفع ہو جاؤ، تم غلیظ سڑک کا کنارہ نرم اور غیر ہموار تھا۔ میں نے خود کو اور اس کے کف اُڑاتے اور مسخ چہرے پر نظریں جمائے انجام کا انتظار کرنے لگا۔ میں اسے قتل کرنے میں ناکام لہٰذا اموت کا حق دار تھا۔

''مجھے نہیں معلوم میں تمھارے گندے وجود کو اتارے بغیر کیوں جا رہا ہوں...'' اس نے کہا۔ ''لیکن میں آکر تمھیں ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ تمام زندگی اپنی اس

پر پچھتاتے رہو گے۔ ابھی میرے پاس وقت نہیں ہے۔ یہ لو۔'' اس نے گن میری طرف اچھالی جو میرے پیروں میں ریت پر گری۔ ''پہلے اس چیز کو استعمال کرنا سیکھو، اس کے بعد اسے لہرانے کا شوق پورا کرنا۔''

اس نے ایک دھماکے سے دروازہ بند کیا۔ اس کا چہرہ اب بھی طیش سے سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے گن نہیں اٹھائی۔ بس اسے وہاں جاتے دیکھتا رہا۔

اس کی چرائی ہوئی کار بہت شان دار تھی۔ لمبی چوڑی۔ پستی کی طرف جانے والی سڑک پر اس کے ٹائر دھیمی سی گونج اور بھنبھناہٹ پیدا کر رہے تھے۔ گاڑی انتہائی تیز رفتار سے اندھا موڑ گھومی اور نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اچانک ایک زوردھماکا ہوا۔

میں سمجھ گیا کہ ٹمپا کی گاڑی ٹکرا گئی ہے... کس چیز سے، میں اندازہ نہ لگا سکا۔ لیکن تبھی مجھے اس طرف سے دھواں اٹھتا دکھائی دیا۔ میں نے گن اٹھائی اور لنگڑاتا ہوا اس طرف دوڑ پڑا۔ چوٹ بہت تکلیف دہ تھی لیکن میں دوڑتا رہا۔ موڑ خاصا دور تھا، میرے اندازے سے کہیں زیادہ۔ بالآخر میں وہاں پہنچ گیا۔

مجھے عجلت دکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارا منی ٹرک ابھی تک سڑک روکے کھڑا تھا۔ ہر طرف اخبار بکھرے ہوئے تھے اور زیادہ تر بنڈل آگ پکڑ چکے تھے۔ ٹمپا کی گاڑی ٹرک کے اگلے حصے سے ٹکرائی تھی اور وہاں سے لگ بھگ تیس فٹ بلند شعلے اٹھ رہے تھے۔

اپنا بھائی قتل کرنے کا ارادہ الگ بات ہے اور یہ علم ہونا بالکل الگ بات کہ وہ ہلاک ہو چکا ہے۔ میں وہاں کھڑا شعلوں کا رقص دیکھ رہا تھا اور میرے عقب میں چیڑ کے جھنڈ سیٹیاں بجا کر گویا سنگت دے رہے تھے۔ میں نے یہی کچھ چاہا تھا لیکن اپنی خواہش کی تکمیل پر میں قطعاً مسرور نہیں ہوا تھا۔

مجھے لگا کہ میں نے کسی کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی ہے۔ یہ ایک دوسری کار تھی۔ بلند ہوتی سڑک پر، خاصی دُور۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے درختوں کے نیچے سے برآمد ہوئی اور پہاڑی کی بلندی کی طرف فراٹے بھرتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

میں کچھ دیر اس کار کے بارے میں قیاس آرائی کرتا رہا لیکن کسی جواب تک نہ پہنچ سکا۔ اسی وقت مجھے ایک اور کار کی آواز سنائی دی۔ میں لڑکھڑاتا ہوا سڑک سے ہٹا اور درختوں میں گھس گیا۔ میں کسی کو نہیں دیکھنا چاہتا۔ بس شہر پہنچنے کا خواہش مند تھا۔

میں اپنے علاقے میں پہنچا تو اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا۔ گلی کوچوں میں بچے کھیل رہے تھے، جیسے کبھی میں کھیلا کرتا تھا... اور شاید ٹمپا بھی۔

پاپا اپنے دفتر میں تھے۔ میری آہٹ پا کے انھوں نے کرسی گھمائی۔ جانے کیوں، مجھے وہ پہلے سے زیادہ بوڑھے دکھائی دیے۔ ''اوہ لڑکے! میں تمھارے لیے فکرمند تھا۔ خدا کا شکر ہے تم بہ خیریت واپس آ گئے۔''

''بہ خیریت؟'' میں نے ان کی بات دہرائی۔ ہاتھ پیروں کی چوٹوں سے جان نکلی جا رہی تھی اور تلوے جل رہے تھے۔ سر میں بھی درد ہو رہا تھا، شاید اس خیال سے کہ انھیں کیا بتاؤں اور کیسے بتاؤں۔ ''کیا خبریں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارا ٹرک...'' پاپا نے بتایا۔ ''کوئی چرا لے گیا۔ اور دو افراد کریسٹ ویو بینک لوٹنے کی کوشش کرتے گرفتار ہو گئے۔ میں نے ان کی ہتھ کڑیوں سمیت تصویر بنالی ہے۔''

''اچھا...؟'' میں نے ان سے نظریں بچانے کے لیے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ نیوز اسٹوری والا صفحہ سامنے ہی رکھا تھا۔ سیکلون کا قتل انجام کو پہنچا۔ ''یہ شہ سرخی... میں آپ کی جگہ ہوتا تو اسے ایک رہنے دیتا۔''

''کیا واقعی لڑکے؟''

میں نے ان کی طرف دیکھا، ان کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے آج سہ پہر کو یہاں میری آمد کی طرف میرا ذہن مبذول کرا دیا۔ میری آنکھیں پھیل گئیں۔ مجھے کار کی ضرورت تھی لیکن ٹمپا کے ساتھ میری روانگی سے بہت پہلے ہی کار یہاں سے جا چکی تھی۔ میں اپنے باپ کی طرف بڑھا اور ان کے شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ میں نے ایسا پہلے کبھی نہیں کیا تھا، لیکن ہم دونوں میں سے کسی نے اس بات پر توجہ نہیں دی۔ ''ہاں، میں ایسا ہی کرتا...'' میں نے انھیں بتایا۔ ''میرا خیال ہے یہی سب سے بہتر ہوگا۔''

چمک دار سفید روشنی تلے ان کا سر خالص چاندی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ان کے شانوں سے ہاتھ ہٹا اور ان کے بالوں میں انگلے چیڑ کے دو عدد کانٹے نما پتے کوڑے کے ڈبے میں پھینک دیے۔

خواتین ہفت رنگ، پھلدار نگ + پشتو کہانی
سات شیریں زبانوں سے منتخب سات جادو گدان، دلِ نواز کہانیاں

سفید دوپٹا

پروفیسر ڈاکٹر صاحب شاہ/قیوم منظر خٹک

ایک کاہی پر جو بیٹھ آرٹ کا فسانہ، تمام گلشن میں اس کا چرچا تھا

وہ باغ بان کو گلے چینی کی خواہش تھی... مگر کاوش تھی تو یہ کہ لوگ کیا کہیں گے!

غوثی کی جوانی کیا تھی جیسے بہار کی پہلی بارش، جس نے ہر دل میں محبت کے پھول کھلا دیے اور ہر نظر میں وفا کے چشمے رواں کر دیے۔ سارے گاؤں میں اُس کے حسن کا چرچا تھا۔ جب وہ پاپا کے لیے کھانا لے کر کھیتوں میں جاتی یا پھر کھیت سے بھینس کے لیے چارے کا گٹھا اُٹھائے گھر لوٹتی تو گاؤں کے ہر نوجوان کی نظریں اُس کے بوسیدہ کپڑوں کے آر پار ہو جاتیں۔ اگرچہ جوانی اُس پر اُس اُسے ہر قدم پر ٹوکتے دیتا۔ تاہم وہ اپنے دل کو اس بات پر مطمئن کر لیتی کہ مجھ سے دو کام ایک ساتھ ہونا ممکن نہیں... سر پہ گھڑا اور منہ پہ چہرہ کیسے چھپایا جائے۔

گھڑا نہ ہوتا تو سر پہ روئی کی چنگیر یا پھر گھاس کا گٹھا ہوتا۔ اور وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ محنت مزدوری اور پردہ ایک ساتھ ہونا ممکن نہیں۔ پردہ کرنی تو کھیتوں کے کام سے ہاتھ کھینچتی۔ کام سے ہاتھ کھینچتی تو گاؤں مرتی اور موت کو آسانی سے گلے نہیں لگایا جاتا۔

اس گاؤں میں بہت سے نوجوان اس کے حسن و شباب کے دیوانے تھے۔ تاہم اس کے ساتھ منگنی اور شادی پر کوئی آمادہ نہ تھا، کیوں کہ وہ ''گل افضل خان'' کے دہقان کی بیٹی تھی۔ اگر غربت کے کوئلے کا سیاہ داغ اس کے ماتھے پر نہ ہوتا تو وہ کب کی کسی کی ہو چکی ہوتی۔ اور تو اور خود گل افضل خان اُس پہ قربان ہو جاتا کہ وہ صرف 45 سال کا جوان آدمی تھا۔ سیکڑوں جریب زمین کا مالک اور صرف دو ہی بیویاں تو تھیں اُس کی۔

غوثی کو وہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتا۔ مگر وہ مجبور تھا کہ کیسے اپنے دہقان کی بیٹی سے شادی رچاتا؟ یہ اُسے اُس کی جوانی اور خانی دونوں کے ساتھ مناسب معلوم نہ ہوتا تھا۔

اگر گاؤں کا کوئی نادار آدمی ہوتا یا پھر ساٹھ ستر سال کا رنڈوا خان ہوتا تو پھر یہ گناہ ہوتا اور نہ طعنے کی بات!

غوثی کے دیکھنے پر اُسے کبھی کبھار کشمالے کی زندگی کا

ارمان ہوتا۔ وہ دل ہی دل میں سوچتا۔ ’کاش میں کشمالے ہوتا تو یہ میری گھر والی ہوتی۔‘

کشمالے اُس کی بھینسوں کا رکھ والا تھا۔ تاہم جلد ہی وہ اس خواہش کو دل سے نکال باہر کر دیتا اور یہ خیال اُسے دیوانے کا خواب محسوس ہوتا۔ وہ اپنے کھیت کی اونچی منڈیر پر کھڑا ہوتا تو دُور کہیں اسے ایک کونے میں غوثی کا بابا اور کشمالے کام میں مصروف نظر آتے۔

پھر وہ اپنی خانی کے نشے میں چُور، جھولتا ہُوا گھر روانہ ہو جاتا۔ اور دل ہی دل میں کشمالے کی زندگی کو بُرا بھلا کہتا۔ کشمالے یوں تو خان کی بھینسوں کا رکھوالا تھا مگر حقیقت میں اُس کی زمیں داری کا کام اُسی کے دم قدم سے تھا۔ فصل کی نگہداشت، دہقانوں کے کام کاج کی خبر گیری، مویشیوں کا خیال رکھنا، یہ سب اُسی کی ذمے داریوں میں شامل تھا۔

وہ اس گھر میں چھوٹی سی عمر سے پلا بڑھا تھا۔ یہ گھر اُسے اپنا گھر لگتا تھا اور وہ اپنے ہی گھر کی طرح اس کا خیال رکھتا۔ خان کے مال اموال اور جائیداد سب کچھ وہ اپنا سمجھتا تھا۔ خان کے لیے بھی کشمالے کے یہی جذبات تھے۔ اُس نے بھی اسے بار بار کہہ رکھا تھا کہ یہ تمھارا اپنا گھر ہے اور یہ مال جائیداد سب تمھارا ہے۔

ان سب پر نظر رکھنا اس کا فرض تھا۔ اس فرض کے نبھانے کو کشمالے جس ریاضت سے کام لے رہا تھا۔ گاؤں کا ہر شخص اس سے واقف تھا۔ ہر ایک اس کی کڑیل جوانی، فراخ سینے، مضبوط اور لمبے کھردرے ہاتھ پاؤں کو حیرت سے دیکھتا۔ گاؤں بھر میں اُس کی خوبو، غوثی کی خوب صورتی کی طرح مشہور تھی۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مگن رہتا۔ اگر آج بھینسے کو آرام دینا مقصود ہے تو بھینسے کا بار خود اپنی کمر پہ لادتا۔ کل بھینس کے کٹے کو کندھے پہ اٹھائے جانوروں کے اسپتال کی طرف روانہ ہوتا۔ اگر کل کڑی دھوپ میں گندم کی کٹائی شام ڈھلے تک کرتا تو آج تن تنہا خرمن میں گندم بچھانے میں مگن ہوتا۔ اگر کچھ وقت پہلے کھیتوں تک گیا ہوتا تو دوسرے لمحے گھر کے کام کے سلسلے میں بازار کی جانب دوڑتا نظر آتا۔ ہر کوئی کہتا۔ ”کشمالے! پانچ آدمیوں کے برابر کام کرتا ہے اور دس کے برابر کھانا کھاتا ہے۔“ ہر کوئی اس کے کام اور کھانے پر حیران نظر آتا۔ تاہم ہر ایک کی اس سے محبت تھی۔ وہ سب کے لیے پیارا تھا۔ جیسے ہی کسی کی نظر اس پہ ٹھہرتی تو وہ نظر بد کے خوف سے اُس کی جانب تھوک جاتے، مبادا نظر نہ لگ جائے۔ وہ بھی ہر ایک سے پیار کرتا تھا۔

اُسے ہر ایک سے چاہت تھی۔ اگر وہ خان کے کاموں سے کچھ بھی فراغت پاتا تو دوسروں کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہاتھ بٹا لیتا۔ اس گاؤں میں بہت کچھ تھا، مگر گل افضل خان کی ”خانی“ کے بعد غوثی کے کنوارے پن اور کشمالے کی جوانی کی دھوم تھی۔ خان بھی اس حالت سے بے خبر نہ تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اپنی خانی کے نشے کے بعد ان دونوں کے سائے منڈلا رہے تھے۔

وہ نہ تو کشمالے جیسے بندے کو ہاتھ سے جانے دینا چاہتا تھا اور نہ غوثی کو گھر سے نکالنا چاہتا تھا۔ تاہم اُس کی راہ میں کشمالے بڑی رکاوٹ تھا۔ کڑیل جوانی کے باوجود شادی کا خیال اُس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آتا تھا۔ وہ صبح شام کام میں جتا رہتا۔ غوثی کے دیکھنے پر کبھی کبھار اُس کی جوانی کے سوتے پھوٹ پڑتے۔ لیکن جلد وہ اُس کی مجبوری کے جزیروں میں ایسے گم ہو کر رہ جاتے کہ...

اُس کا کوئی پتا ہی معلوم نہ ہوتا اور وہ اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ اگرچہ کشمالے کچھ بھی نہ کہتا مگر گل افضل خان آخر خان تھا۔ زیادہ عرصے بات چھپا نہیں سکتا تھا۔ آخر کشمالے سے کہنے لگا۔

”خود کو تیار کر تیری شادی کروا رہا ہوں“۔ اس کی فیصلہ کن بات پہ کشمالے کا دل زور سے دھڑکا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے۔ خان کا مال اُسے سچ مچ اپنا ماں محسوس ہوا۔ اس کا اپنے خان کی شرافت پر یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ آج رات وہ چارپائی پر پڑ گیا تو زندگی میں پہلی بار اُسے جوانی کا احساس، بیوی کے بارے میں سوچا اور گھر کے متعلق فکر لاحق ہوئی۔ میں ان دیکھی دنیا پھیل گئی۔ دماغ میں انہونی سوچیں پھیل گئیں۔ اُس کے دل کی پتنگ غوثی نے پہلی بار پاؤں پھیلائے۔ غوثی ہر خوب صورت دوشیزہ کی طرح اور کھیتوں کے کام کی ماہر بھی۔

بڑی دیر بعد اُسے نیند آئی اور جب اُس کی آنکھیں کھل گئیں سورج کی کرنوں نے در و دیوار پر سر اٹھا رکھے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ خان کے فیصلے کی کوئی اور بھی خبر رکھتا ہو۔ کل سے آج روزی کا کا اُسے اچھا لگا۔ اُس نے کھیتوں کے کام میں اُس کا ہاتھ بٹایا۔ آج غوثی کو دیکھنے کی خواہش بار بار اُس کے دل میں سر اٹھاتی رہی۔ اِدھر اُدھر دیکھا، مگر جب وہ نظر نہ آئی تو پانی پینے کے بہانے اس کے گھر گیا۔ جب اس کے دیکھنے پر غوثی شرما کر کمرے کی طرف دوڑی تو اُسے لگا ہو گیا کہ کہاں وہ غوثی جو سارا سارا دن اپنے باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی اور کہاں اس کی یہ حرکت۔ پھر اس نے دل کو سمجھایا اور کھیتوں کی طرف روانہ ہوا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ خان نے روزی کا کا کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا ہے۔ وہ بھی کشمالے کی طرح اس بات بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ وہ بھی کشمالے کی طرح کنگال تھا، پاؤں کی مزدوری تھی اور ہاتھ پاؤں کی مزدوری میں کشمالے سب طاقت ور تھا۔ روزی کا کا نے یہ بات اپنی بیوی کو بھی بتا دی تھی اور کے کان میں بھی یہ بھنک پڑ گئی تھی۔ کچھ روز تو یوں ہی گزر

کشمالے، غوثی کو دیکھنے کی ہر کوشش میں ناکام رہا، مگر شادی کی تاریخ طے ہوئی اور وہ دن بھی آیا جب غوثی کشمالے کی دُلھن بن کے آ گئی۔ اُس رات اسے وہ ”سخی ارسلا خان“ نظر آ رہی تھی، جس نے اسے سب کچھ بخش دیا تھا۔ ساری رات اسے نیند آئی اور نہ اسے تھکن کا احساس ہُوا کہ وہ اپنے گھر میں تھا۔ گھر چاہے خان کا تھا، تاہم خان کا مال اُس کا تھا اور پھر چارپائی اور بیوی تو تھی ہی اُس کی۔

اس گاؤں میں تو لوگ موت بھی اپنے ہی بستر پر آنے کے متمنی تھے۔ آج وہ خود کو ”بڑا آدمی“ تصور کر رہا تھا وہ جو اپنے گھر کا مالک ہوتا ہے۔ وہ آسمان کو دیکھے جا رہا تھا کہ بادل کی پتلی لکیر چاند کے گرد پھیل گئی۔ سفید بادلوں کی ہلکی لکیر میں گھرا ہُوا چاند کتنا خوب صورت نظر آ رہا تھا۔

اُس نے اندھیرے سے غوثی کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں یہ اٹل فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بیوی کے لیے گھانیوں کے موسم میں سفید دُپٹا خرید کے دے گا۔ بالکل وہی دُپٹا جو خان کی چھوٹی بیگم کبھی کبھار اوڑھا کرتی تھی۔ اُس نے غوثی کو اپنے دل کا حال سنایا اور اپنے فیصلے سے بھی آگاہ کر دیا۔ غوثی نے بھی یہ دُپٹا کئی بار دیکھا تھا۔ اُس کے دل میں اسی دُپٹے کے اوڑھنے کی خواہش موجود تھی۔

منہ سے تو کچھ نہ کہا مگر دل ہی دل میں گھانیوں کے موسم کے لیے دعائیں کرنے لگی۔ کشمالے اور غوثی ایک دوسرے کی باری واری ہوئے جا رہے تھے۔ دن رات گزرتے رہے۔ پہلے موسموں کی طرح اب کی بار بھی گھانیوں کا موسم در آیا اور غوثی کے دل میں سفید دُپٹے کی آرزو جاگ گئی۔

جاڑے میں شدت آئی، گھانیاں لگ گئیں۔ کشمالے دن رات کام میں جت گیا۔ اگر کھیت سے فراغت ملتی تو گھانی کی طرف آ جاتا۔ گھانی میں بیسیوں کام ہوتے۔ اسے گھر جانے کی فرصت بھی ملتی۔ وہ جلد از جلد گنے کی فصل سے فراغت پانا چاہتا تھا۔ اُس کی بھی بس یہی آرہا تھا کہ گنے اور گڑ گھانی کا کام جلد از جلد ختم ہو تو اسے اس فکر سے نجات مل جائے گی اور وہ غوثی کے لیے دُپٹا بھی خرید لائے گا۔ گھانی کا کام زور و شور سے جاری تھا اور کشمالے کی خوشیاں قریب تر تھی کہ اچانک بارش کا طویل سلسلہ شروع ہُوا۔ گنا ابھی کھیتوں میں موجود تھا اور گڑ گھانی میں پڑا ہُوا تھا۔

اس گاؤں میں گل افضل خان کے مال کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ تاہم کشمالے کو یہ بات مناسب معلوم نہیں ہو رہی تھی کہ وہ گڑ بھری گھانی یوں ہی چھوڑ دے۔ سردی کی ٹھنڈی ٹھنڈی راتوں میں وہ جاگ جاگ کر گڑ ابالتا رہا۔ چند دن بعد خان سے کہنے لگا کہ وہ گڑ کو حجرے کے ایک کمرے میں رکھ دوں گا۔ لیکن خان نے اسے دوٹوک فیصلہ سنا دیا کہ گڑ گھانی میں ہی پڑا رہے گا۔ طویل شب بیداری اور غوثی کی دوری نے اُس کی استقامت کی کمر توڑ ڈالی تھی اور وہ سرِ شام گھانی میں نہ سونے کی نیت کر چکا تھا۔ پھر بھی خان کے مال کو نقصان دینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ گومگو کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ غوثی کے دیکھنے کی خواہش اُس کے دل کو کاٹ رہی تھی۔ اُس کا سفید دُپٹا اس کے دل پر پھیل رہا تھا۔ اُس نے کچھ سوچا اور پھر ایک خالی بوری کو اٹھایا۔ بہت سی بوریوں سے تھوڑا تھوڑا گڑ نکالنے لگا اور کچھ دیر میں خالی بوری بھر دی۔

اگرچہ اس ٹھٹھرتی سردی اور طویل بارش میں آدھی رات کو کوئی بھی اس طرف آنے والا نہیں تھا مگر اس نے بار بار گھانی کے دروازے سے باہر جھانکا۔ اس لیے کہ یہ اُس کی زندگی کی پہلی چوری تھی اور وہ بھی اپنے مال کی چوری۔ بارش کچھ تھم گئی۔ گڑ کی بھری بوری کمر پہ لادے وہ گھر کی طرف روانہ ہُوا... وہ جیسے ہی اپنے گھر کے دروازے سے اندر داخل ہُوا تو اسے عجیب سا سکھ چین ملا۔ اپنے کمرے کے بند دروازے کو آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ غوثی کو آواز دی اور پھر اُس کے اٹھنے کے انتظار میں دروازے پہ کان لگائے۔

کمرے میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ اس سرسراہٹ سے اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوئیں اور بے قراری سے وہ غوثی کو بار بار پکارنے لگا۔

کچھ دیر بعد اُس نے دروازہ کھولا۔ کشمالے نے بوری کمرے کے وسط میں کمر سے اُتاری اور دیا روشن کرنے کے خیال سے اُس نے اپنی جیب سے ماچس کی ڈبیا نکالی۔ اس نے ابھی دیا سلائی روشن کی ہی تھی کہ اسے دروازے کے پیچھے ایک سایہ سرکتا ہُوا محسوس ہُوا اور دوسرے ہی لمحے گل افضل خان نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اچھا، مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم میرا مال چوری کرتے ہو۔ میں یہاں تمھاری چوری ہی پکڑنے کے انتظار میں چھپا ہُوا تھا۔ تمھیں میری گڑ مردوں کا مال نظر آتا ہے؟“

جیسے ہی کشمالے کچھ کہنے یا کچھ کرنے کے لیے تیار ہونے لگا۔ خان نے اُس پر پستول کا فائر کھول دیا۔ کچھ دیر میں گاؤں کے بے شمار لوگ دیے کی روشنی میں کشمالے کی چارپائی کے پاس کھڑے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر یہی ایک بات تھی کہ کشمالے کو چوروں نے مار ڈالا۔

گل افضل خان اپنے حجرے میں افسردہ بیٹھا تھا۔ لوگ فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ صبح جب سورج کی کرنوں نے غوثی کے گھر کی در و دیوار پر پھیلنا شروع کیا تو اس نے صندوق سے اپنا ایک سفید دُپٹا نکالا اور اُسے کشمالے کے چہرے پر پھیلا دیا۔ مگر اس دُپٹے سے گل افضل خان کی ”خانی“ کی بُو آ رہی تھی۔

پاک باطن

رجحان ترنج / ذکی انور

روشن خیالوں کے درمیان میں پھنسی ہوئی ایک دقیانوسی ہستی کی اذیتیں وہ کچھ پے در پے درد کا آپنے جگر میں محسوس کرتی تھی

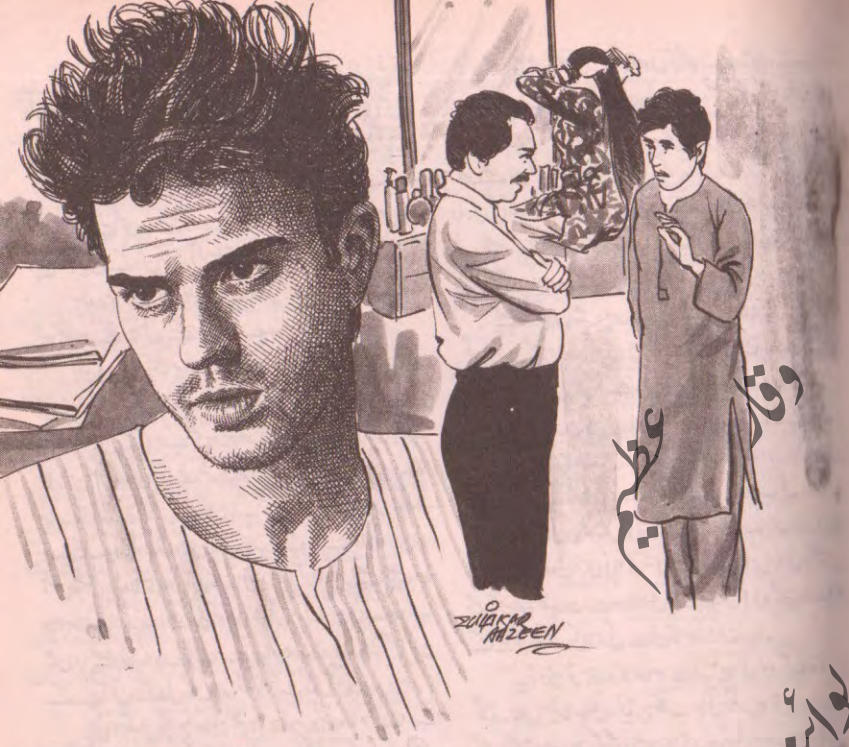

"ایک منٹ ٹھہریے، بلاتا ہوں... آپ کون ہیں؟"

وینو نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا، "میں اُن کا بیٹا وینو بول رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد پتا جی کی آواز ٹیلی فون پر سنائی دی، "ہیلو، میں بول رہا ہوں... سندرم!"

آواز سنتے ہی اب تک کا اُس کا وہ غصّہ، ہمّت اور نفرت سب کچھ جانے کہاں کافور ہوگیا، اور اُس کے لب کانپنے لگے، دل بھی زور سے دھڑکنے لگا؛ جیسے تیسے سنبھلتے ہوئے اُس نے کہا، "میں وینو بول رہا ہوں۔ آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں.... اکیلے میں۔"

"ٹھیک ہے... کچھ ہی دیر میں گھر پہنچ رہا ہوں۔"

"نہیں... اُس کے بارے میں... میں گھر میں بیٹھ کر باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ آپ وہیں رک جائیں گے تو میں خود وہاں چلا آتا ہوں... ابھی دس منٹ کے اندر۔"

"او، آئی سی... ٹھیک ہے، آجاؤ۔"

"تھینکس!"

وینو نے ریسیور رکھ دیا، اور ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھ ڈالا۔ اب بھی اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ کتنی ہی باتیں کہنی تھیں اُسے؛ جیسے کسی بڑے کام کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہا ہو۔ وہ اپنے تلوے پر مکّے مارتا ہوا بڑبڑانے لگا، "ہوں، یہ تو میرا فرض ہے... اِس خاندان کا وقار قائم رکھنا میرا فرض ہے... پتا جی کو اِس کا احساس کرانا ہے کہ اُن کی طبیعت بگڑ گئی ہے... یہاں تک کہ اُن کے اپنے بیٹے کو مجبور ہوکر اُنھیں سمجھانا پڑ رہا ہے... چھی، کتنی شرم کی بات ہے، مگر مجھے بہت صبر سے کام لینا چاہیے۔ اُن سے بحث کرنی ہے اور اُن کے اِس قابلِ نفرت راز کا سب سے پہلے اُنھی کے سامنے بھانڈا پھوڑنا ہے... ایسا کچھ بھی تو نہیں۔" یہ، وہ کہہ کر وہ بات کو ٹالنے کی کوشش کریں گے... ہوں... اُن کی میز کی دراز میں رکھا ہوا وہ... چھی... اُس پر یم پتر کو ساتھ لے جانا ہے... وہ ضرور بگڑیں گے... پوچھیں گے، 'اچھا، تو تم نے نقلی چابی سے چوری چوری تلاش کیا... کیوں؟' پوچھنے دو... چوری چوری چلنے والے اُن کے پیار کے چکر کا ہمیں پتا لگانا تھا، اِسی لیے ہم نے بھی چوری چوری دراز کھولی... کوئی بڑی بھول تو نہیں کی۔ پرسوں رات کو اُس لڑکی کے ساتھ سیکنڈ شو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد ہی تو ہم نے کمرے کی تلاشی لی... ساری بات کا پتا لگانے کے لیے۔"

جلدی سے کپڑے پہن کر وینو گھر سے نکل ہی رہا تھا کہ لیڈیز کلب جانے کی تیاری میں مشغول اُس کی ماں رمنی اُما اچانک سامنے آگئیں۔

ماں کا دل بھانپ گیا تھا کہ اِدھر کچھ دنوں سے وینو برتاؤ ٹھیک نہیں ہے۔

اب اُس کے تیور دیکھ کر وہ کچھ مشکوک سی ہوگئیں۔ اُس کے چہرے پر تھکاوٹ دیکھ کر اُنھیں شک ہونے لگا کہ کیا یہ ڈھنگ سے کھانا پیتا بھی ہے؟ لگتا ہے کہ ٹھیک سے سوتا بھی نہیں ہے۔ وہ کمزور کالا ہوگیا تھا۔ ہونٹوں کے اوپر نیچے، گالوں پر شیونہ کرنے کی وجہ سے بال بڑھ گئے تھے۔ اُس کی بے حد تھکی ہوئی آنکھیں اور اُن کے نیچے ابھری ہوئی کالی لکیروں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی بات کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔

'وہ ہوش یار ہوگیا ہے۔ اُس کی اپنی لاکھ باتیں ہوں گی، اُن میں دخل دینا ٹھیک نہیں ہوگا۔' یہ سوچتی اور اپنی زبان پر قابو رکھنے کا فیصلہ کرتی ہوئی وہ وینو کے نزدیک آگئیں!

"کہاں جارہا ہے بیٹا؟" اُنھوں نے پیار سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

وینو کانپ اٹھا۔ "تھوڑا کام ہے۔" اُس نے دبی آواز میں جواب دیا۔

"وہاٹ از رانگ وِد یو؟... خیر، کچھ بھی ہو۔ اگر میں تمھارے کام آسکتی ہوں تو کہو۔" اُنھوں نے انگریزی میں کہا۔

"تھینکس!" وینو اپنے آپ کو آزاد کرا کے جانے لگا، مگر ماں نے روک لیا۔

"جا، مہاراجن نے کوئی خاص چیز بنائی ہے آج۔ کھا لینے کے بعد چلے جانا۔" اُنھوں نے منّت سماجت کرتے ہوئے کہا۔ پھر گھڑی کی طرف دیکھا، اور دیر ہوتے ہوئے دیکھ کر باہر چلی گئی۔

کچھ دیر تک وینو سر جھکائے، کچھ سوچتا ہوا کھڑا رہا۔

"کیسی پگلی ہے ماں... پتا جی کا بھی کوئی جواب نہیں۔ دیکھو، کتنی صفائی سے چمکہ دیے جارہے ہیں۔"

پھر دوسرے ہی لمحے اِس عمر میں ماں کا وہ سنگھار، منہ پوتی ہوئی پاؤڈر کی وہ تہہ رنگے ہونٹ، شارٹ سلیو والی بلاؤز، اُس کی وہ انگریزی... یہ احساس ہوتے ہی اُس کا دل نفرت سے بھر گیا۔

باہر دالان میں 'کون وِنٹ' میں پڑھنے والے اُس کے چھوٹے بھائی اور سات سالہ بہن سوفے پر بیٹھے جوتے موزے اتار رہے تھے۔ اُسے ایسا لگا کہ یہ غیر ذمّے دار ماں اور گم راہ باپ، دونوں ہی اِن بچّوں کا مستقبل مٹی میں ملادیں گے... یک لخت اُسے اپنے دادا دادی کی یاد آگئی۔ "اچھا ہوا مجھے اِس گندے ماحول میں پلنے کی نوبت نہیں آئی۔"

پچیس سال پہلے وینو کے پتا سندرم اور رمنی اُما کالج میں ساتھ پڑھتے تھے۔ دونوں کی ذاتیں مختلف تھیں، اور ماں باپ کی مخالفت ہونے پر بھی سندرم نے رمنی اُما سے عشقیہ شادی کی تھی۔

رمنی اُما مغربی تہذیب اور ماحول میں پلی بڑھی تھیں۔ اُن کی پڑھائی کون وِنٹ میں ہوئی۔ اُن کا سارا خاندان ہی مغربی رنگوں میں رنگا ہوا تھا۔ اُن دنوں سندرم کے، رمنی کی طرف کھنچنے کا شاید یہ بھی ایک سبب تھا۔

خاندان سے باہر شادی کر لینے کے بعد لگ بھگ دو سال تک سندرم کا اپنے ماں باپ سے کوئی بھی سروکار نہیں رہا تھا۔ دو سال بعد وینو کا جنم ہوا۔ بیٹے کے پیار کو کھو دینے کے بعد پوتے کے جنم کی خبر پاکر گنپتیا پلے اور اُن کی بیوی وِشالم سے نہیں رہا گیا۔ اُسے دیکھنے دونوں گانو سے شہر چلے آئے۔ وینو کے سبب ہی اُن کے درمیان پھر سے محبّت اور تعلّق کا پُل آہستہ آہستہ بن گیا تھا۔

جب وینو چھ سال کا ہوا، گنپتیا پلے نے کہا کہ وہ اُسے ساتھ لے جائیں گے۔ جانے کہاں سے آپٹکی ایک لڑکی...

جانے کس دیس کی تہذیب کے ہاتھ، وہ اپنا بیٹا ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھے تھے۔ اُن کے دل کو اب بھی یہ بات چُوکے لگا رہی تھی۔ غالباً اسی کی تلافی کرنے کے لیے اُنھوں نے وینو کو گود لے لیا۔

وینو اپنے دادا کے گھر ہی پل کر بڑا ہوا۔ ماں باپ کا گھر اُس کے لیے کسی رشتے دار کے گھر کی طرح رہا تھا، جہاں وہ اپنی چھٹیوں کے دن گزارا کرتا تھا۔

سندرم کے پتا گنپتا پلے، ویر شیو ذات کے تھے؛ شیو بھگت تھے، تامل کے بہت بڑے عالم تھے۔

اُن کی بیوی وشالم انیسویں صدی کی خواتین کی جماعت کی آخری نمائندہ تھیں۔ خاوند کے سامنے وہ بیٹھتی تک نہیں تھیں۔

چھٹیوں میں جب بھی وینو گھر آتا، اُسے اپنے ماں باپ کا رہن سہن، اُن کے طور طریقے، سب کچھ مختلف اور پرائے پرائے سے لگتے۔ اُس کے ماں باپ بھی اُسے ہمیشہ غیر ہی لگے۔ جب تک وہ چھوٹا تھا، ماں باپ کا یہ تجزیہ وہ اپنے دادا دادی کو ہنس ہنس کر سناتا، اور اُن کا مذاق اڑایا کرتا، مگر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا اپنے دادا دادی کو وہ آدرش میاں بیوی کے روپ میں دیکھنے لگا۔ ماں باپ سے پیار ہوتے ہوئے بھی اُن کے لیے اُس کے دل میں ذرا بھی عزّت نہیں تھی۔

ہائی اسکول کی پڑھائی ختم ہونے پر وینو، گانو کے سب سے نزدیک شہر چدمبرم کے کالج میں داخل ہو گیا۔ اُس کی پڑھائی بھلے ہی جدید طرز پر ہوئی ہو، مگر نئے زمانے کی زندگی اُسے چھو تک نہیں گئی تھی۔ اب کچھ ہی مہینوں پہلے پڑھائی ختم کر کے وہ مدراس آ گیا تھا۔ کتنی مشکل سے وہ دادا دادی سے بچھڑنے پر راضی ہوا تھا۔

"مجھے نوکری نہیں کرنی ہے۔ کبھی پڑھے لکھے لوگ شہر چلے جاتے ہیں، اِس لیے آج ہمارے دیش کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ میں یہیں رہ کر اپنی زمین سنبھالوں گا۔" اُس نے دادی کو کتنا منایا تھا، دادی کو بھی اُس کی یہ تجویز پسند آئی تھی۔

دیر تک آرام کرسی پر آنکھیں موندے بیٹھے رہنے کے بعد دادا نے دادی کو سمجھایا تھا، "تم بھی کیسی ناسمجھ ہو کہ اُس کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہی ہو۔ اپنے بیٹے سے بچھڑ کر تمھیں کیسا لگا تھا؟ وینو کی ماں کی حالت بھی کیا ویسی ہی نہیں ہو گی؟ پڑھائی کے بہانے ہم نے اب تک اُسے رکھ لیا۔ اب اُسے اپنے ماں باپ کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔"

"میرے جانے نہ جانے سے کسی کو وہاں کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وینو نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"وینو! میں یقین سے کہتا ہوں کہ تمھارے ساتھ رہنے سے تم سے بھی زیادہ خوشی ہمیں ہو گی۔ زیادہ نہیں تو بھی کچھ دن کے لیے تو رہ آؤ... پھر دیکھیں گے... اِتنا کچھ کہہ تو رہا ہوں، مگر جیسے ہی تم گاڑی میں جاؤ گے پتا نہیں میری اور تمھاری دادی کی کیا حالت ہو جائے گی... کیسے ہم دن کاٹیں گے... خیر، جیسے تم چھٹیوں میں ہو آیا کرتے تھے، وہاں جا کر چند دنوں کے لیے رہ آؤ، اور کیا کہا جا سکتا ہے۔"

پہلے چھٹیوں میں پورے دو مہینے گزر جانے پر اُسے ایسی گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی جیسے اُسے کل دو ہفتے کے اندر ہی ہونے لگی تھی۔ یہاں اُسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل پر ماں اور پتا جی کا ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر کھانا، صبح آٹھ بجے تک ماں کا سوتے رہنا اور پتا جی کا دوڑ دوڑ کر ماں کی خدمت کرتے پھرنا... یہ سب دیکھ کر اُسے نفرت ہونے لگی۔

ساٹھ سال کی عمر میں بھی صبح تڑکے اٹھ کر نہانے والی، ہلدی اور کم کم سے سجی ہوئی اُس کی نکھی جیسی دادی اُسے برابر یاد آتی رہتی تھیں۔ جس لگن اور عقیدت سے وہ دادا جی کی دیکھ بھال کرتی تھیں، وہ پیار کے دیو اُن لوگوں کی زندگی سے اُن کا موازنہ کرتا رہتا۔

'یہ آدمی تو جورو کا غلام ہے!'... پتا جی کو دیکھ کر اُسے لگتا۔ ماں سنیما جاتی، لیڈیز کلب جاتی، مگر پتا جی اُسے کبھی نہیں کہتے، اور ماں کو بھی جیسے پتا جی سے کوئی مطلب ہی نہیں نہ کچھ پوچھتیں نہ کچھ بتاتیں۔ 'چھی، ایسی بھی کہیں ازدواجی زندگی ہوتی ہے؟ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔' وینو کے دل میں نفرت مضبوط ہوتی جا رہی تھی اور اُس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

"جانے دو، مجھے اِن سے کیا لینا دینا۔ دادا جی کا حکم تو رہ لوں گا اِدھر ہی کچھ دن۔ پھر ہمیشہ کے لیے گاؤں جاؤں گا۔" شروع ہی سے ذرا الگ تھلگ رہنے والے کو اور بھی بھڑکانے والا یہ واقعہ پچھلے ہفتے رونما ہوا تھا۔

رات کے کوئی آٹھ بجے ہوں گے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اُس وقت سندرم چھت پر تھے۔ وینو نے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو!..." اُس نے ٹیلی فون کا نمبر بتایا۔

"میں وِتسلا بول رہی ہوں... آپ سے ملنے کالج آئی تھی... پر آپ پہلے ہی چلے گئے تھے۔

آج "ساؤنڈ آف میوزک" کا آخری دن ہے... نائٹ شو چلیں... آپ چپ کیوں ہیں؟"

وینو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پہلے اُسے رانگ نمبر کا شک ہوا، مگر کالج میں ملنے کے ذکر نے وہ شک دُور کر

دیا۔ اب کچھ نہیں سوجھا تھا تو اُس نے چپ چاپ ریسیور رکھ دیا، اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا؛ وہاں اکیلا بیٹھا طرح طرح کی باتیں سوچنے لگا۔ اُسے یقین تھا کہ پتا جی کے علاوہ اَور کوئی مرد اس گھر میں موجود نہیں ہے، وہ لڑکی وتسلا ہمیشہ ٹیلی فون کرتی ہو گی... اور کیا؟ اُس کا خیال پختہ ہونے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں پھر سے گھنٹی بجی۔ وینو اپنی جگہ سے ٹس برابر بھی نہیں ہلا۔ نیچے اتر کر سندرم نے ہی ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو!..." اُنھوں نے نمبر بتایا۔

وینو آہستہ سے اٹھا، اور چپ چاپ اپنے اور ٹیلی فون والے کمرے کے بیچ والے دروازے پر کان رکھ کر اُن کی گفتگو سننے لگا۔ پتا جی انگریزی میں بول رہے تھے:

نہیں تو... میں چھت پر تھا... چہ چہ چہ...

اٹ از آل رائٹ۔

اور کوئی اڈلٹ تو ہے نہیں!

ٹھیک ہے، میں دیکھ لوں گا... اوکے۔

نائن تھرٹی... یس... اوکے۔

ڈونٹ وری۔

اوہ، وہاٹ آر یو ٹاکنگ۔

یس... یو...

ریسیور رکھا جاتے ہی وینو کمرے سے کھسک گیا۔

اس واقعے کے بعد آج تک وینو نے پتا جی کی صورت تک نہیں دیکھی۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی کسی طرح اُنھیں چکمہ دے کر اُن کی نظروں سے بچتا رہا۔ ابھی دو چار دن پہلے جب وہ گھر پر بالکل اکیلا تھا، پتا جی کے کمرے میں چلا گیا۔ اپنے شک کو پختہ کرنے کے لیے اُسے الماری کی کیبیں بھی سوچنی پڑیں۔ ڈپلی کیٹ چابیاں لگا کر اُس نے ان کی میز اور الماریاں کھول کر اُن کی پوری تلاشی لی۔ ایک چور کی طرح کمرے کا چپہ چپہ ڈھونڈتے ہوئے وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں تھا۔ اُس کے خیال سے، گھر میں اِس سے کہیں زیادہ قابلِ شرم حادثے ہو رہے تھے، جس کے سامنے میں اُس کی وہ حرکت نفی کے برابر تھی۔

"میں کیوں ڈروں... غلط راستے پر چلنے والے آدمی کو نظر چرانے کی کیا ضرورت ہے؟ بل کہ اُنھیں پھٹکار کر سچ راستے پر لانا ہے۔ یہ میرا فرض ہے... کہاں، کیسے؟ کیسے یہ بات کی جائے؟ گھر میں کریں گے تو ماں کو پتا چل جائے گا۔ کہیں باہر لے جا کر کہنا پڑے گا... اور اگر وہ میری بات نہ مانے تو؟ وہ سب کچھ بعد میں دیکھا جائے گا، پہلے کُھل کر باتیں ہونی چاہییں۔" رات دن اِسی ایک بات کو لے کر وہ الجھتا رہا۔ آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔

"کل ہر حال میں دو ٹوک بات ہو ہی جانی چاہیے۔ اِس میں ڈر کی کیا بات ہے؟ میں اب بچہ تو نہیں رہا ہوں۔ آئی ایم این اڈلٹ۔"

سمندر کے کنارے، حال ہی میں بنی کول تار کی اُس سڑک پر سندرم نے اپنی ماریس مائنر کھڑی کر دی۔ پاس بیٹھا وینو کار سے پہلے اتر گیا۔ اُس کی نظر دور تک پھیلے سمندر کی طرف گئی۔ ہَوا میں پھڑ پھڑاتی دھوتی اُس نے گھٹنوں تک تہ کر کے باندھ لی، اور کچھ دُور ہٹ کر ریت میں کھڑا ہو گیا۔

دس پندرہ منٹ سے وہ اِسی اُلجھن میں تھا کہ آخر بات چیت شروع کیسے کی جائے؟ حالاں کہ غلطی پتا جی نے کی تھی، لیکن جھجک اُسے ہو رہی تھی کہ کہیں میں طیش میں آ کر اپنی حیثیت بھول کر پتا جی کو کچھ کہہ نہ بیٹھوں؟ تب پھر کیا ہو گا۔

سندرم کار سے اتر آئے، اُنھوں نے اپنا کوٹ اتار دیا اور اُسے تہ کر کے گاڑی کی سیٹ پر رکھ دیا۔ پھر گاڑی کی کھڑکیوں پر شیشے چڑھا دیے اور دروازے لاک کر کے آ گئے۔

وینو کے پاس آ کر وہ رک گئے اور گھڑی دیکھتے ہوئے بولے، "ابھی تو پانچ ہی بجے ہیں۔"

"یہاں تو بالکل بھیڑ نہیں ہے۔" وینو نے کہا۔

شام کا سایہ ابھی سمندر کے ساحل پر نہیں اترا تھا۔ دونوں اچانک خاموش ہو گئے اور ریت میں کچھ دُور تک چلتے رہے۔ اُن دونوں کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ باپ بیٹے ہیں۔ لگ رہا تھا دو بھائی جا رہے ہیں یا کسی پروفیسر اور طالب علم کا جوڑا ہے۔ دونوں کی شکلیں بہت ملتی تھیں۔ قد ایک سا ہونے پر بھی پتا پر مٹاپے کی تہ چڑھ گئی تھی، اِس لیے وینو اُن سے تھوڑا المبا لگ رہا تھا۔

سر جھکا کر چلتے ہوئے وینو ریت میں دھنستے پیروں کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ ہر پل اُس کے دل کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا، اُس کے دل میں ابلتا ہوا غصہ گلے میں اٹک رہا تھا، چہرہ سرخ ہوا جا رہا تھا، لب دانتوں تلے دبے جا رہے تھے۔

اُس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں، اور دُور سمندر کی لہروں پر اپنی نظر گاڑ دی، تب آنکھوں کے کونے میں امنڈتے آنسوؤں کے قطرے ہَوا میں اڑ کر اُس کی پلکیں بھگونے لگے!

اُنھوں نے وینو کی طرف پیار سے دیکھا۔ اپنا گلا صاف کیا۔ تکلفاً مسکرائے... اُس کے لب کانپ اٹھے۔

"یہاں بیٹھا جائے؟" اُنھوں نے پوچھا۔

وہ جواب دیے بغیر بیٹھ گیا۔

'کیسے شروع کروں؟' وہ سر اٹھا کر اُن کی طرف دیکھتا، پھر نظریں جھکا کر کچھ سوچتا ہوا ریت میں انگلیوں سے لکیریں کھینچنے لگتا۔ کچھ لمحے ایسے ہی گزر گئے۔

کس بات کے لیے وینو اُن سے اکیلے میں بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ پتاجی اُس بات کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اُس ٹیلی فون کال کے بعد وینو سے اُن کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ اِس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ملول ہو جانے پر بھی جوان خون کی فطری جھجک کی وجہ سے وہ اُن کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ اِس موضوع پر کافی سنجیدہ ہے اور اُن سے اِس پر بحث کرنا چاہتا ہے، اُنھیں کچھ خاص اچھا نہیں لگ رہا تھا، مگر وہ بزدل کی طرح ملاقات کو ٹالنا نہیں چاہتے تھے، اِسی لیے تیار ہو گئے تھے۔ پھر بھی وہ خود بات چھیڑنا نہیں چاہتے تھے۔

اچانک جیسے اپنے آپ ہی سے کچھ کہہ رہا ہو، وہ بول اٹھا، "آئی ایم سوری! یہ بات ہی شرم کی بات ہے..." اُس نے انگریزی میں کہا۔ پھر پوچھا، "آپ جانتے ہیں میں کس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں؟"

ذرا بھی ہچکچائے بغیر اُنھوں نے "ہاں" کہہ کر سر ہلا دیا۔

اُن کی دلیری دیکھتے ہی وہ طیش میں آ گیا۔ "میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ آپ اِس طرح کے انسان ہیں۔" غصّے سے اُس کی مٹھیاں خود بہ خود بند گئیں، دل میں امنڈتے ہوئے جذبات کے طوفان کو اندر ہی اندر دبانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

سندرم نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپاتے ہوئے کہا، "وینو! ڈونٹ بی سلی...اب تم بچے نہیں ہو... شانت ہو کر کچھ سوچا کرو!"

"یس...یس...آئی ایم این اڈلٹ۔" اُس نے دانت پیستے ہوئے کہا، اور انگریزی ہی میں بولتا گیا۔ شاید اُس پرائی زبان ہی میں باپ بیٹے میں بحث ہو سکتی تھی۔

"آپ کو وہ ٹیلی فون والی بات یاد ہے؟...اُس دن سے میں غور کر رہا ہوں۔ اِس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میرا باپ ایک ایسا آدمی ہوگا۔ کیا یہ ہمارے خاندان کی عزّت کا سوال نہیں ہے؟...کیا ایسی حرکت آپ کی عمر اور حیثیت کو زیب دیتی ہے؟...اور یہ ماں بھی ایک احمق عورت ہے...اور آپ عمر بھر اِسے احمق بناتے رہے ہیں۔"

سگریٹ سلگا کر دھیرے دھیرے کش لگاتے ہوئے، اب تک اُس کی باتیں سنتے رہنے والے سندرم نے اچانک اُس کی بات کاٹ کر کہا، "اپنی ماں کو بیچ میں نہ لاؤ...اپنی طرف سے تمھیں جو کچھ بھی کہنا ہے کہو۔ چاہے وہ کتنا ہی نامناسب کیوں نہ ہو، مگر میں سنوں گا...ماں کو اِس میں مت کھینچو...میں اُسے تم سے زیادہ جانتا ہوں...اور تم مجھے جتنا سمجھتے ہو، اُس سے کئی گنا زیادہ وہ مجھے سمجھتی ہے۔ پچیس سال ہم نے اپنی گرہستی چلائی ہے، آگے بھی چلائیں گے، تم آگے کہو۔"

"آپ ماں کو دھوکا دے کر ایک جھوٹی زندگی جی رہے ہیں۔ آپ مجھے دھوکا نہیں دے سکتے..."

وہ ہنس پڑے۔ کچھ اِس انداز سے جیسے اُن کے لیے اُسے دھوکا دینے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے!

"آپ نے جو کچھ بھی کہا، میں سن رہا تھا۔ پھر اِس کے بعد تقریباً نو بجے آپ کار لے کر بھاگے چلے گئے تھے۔ میں نے آپ دونوں کو تھیٹر میں بھی دیکھا تھا، مگر صرف اِسی ایک بات کو لے کر کوئی کسی پر تھوڑا ہی شک کر سکتا ہے۔ اِسی لیے میں نے آپ کے کمرے میں گھس کر، الماریوں، درازوں کا چپّہ چپّہ ڈھونڈا۔ آپ کے وہ پریم پتر...اُن کی ایک فائل ہی بنا رکھی ہے آپ نے۔ یہ دیکھیے اُن میں سے ایک۔" اُس نے غصّے اور طیش کے ساتھ جیب سے ایک خط نکال کر اُن کے مُنھ پر دے مارا، پھر وہ مُنھ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ آواز بھی رندھ گئی تھی۔

ساحلی سڑک پر نیلی بتیاں جل اٹھی تھیں۔ کنارے پر لوگوں کی خاصی بھیڑ تھی۔ ایک ہجوم اُن کی طرف آ رہا تھا۔ جب تک وہ اُن کے پاس سے ہو کر گزر نہیں گیا، وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ وینو نے ہی بات چیت پھر شروع کی۔

"آپ میرے پتا ہیں۔ مجھے سچ مچ اِس بات پر افسوس ہو رہا ہے کہ یہ باتیں آپ کو سمجھانی پڑ رہی ہیں...کم سے کم اب سے آپ کو اپنی غلطیاں سدھارنی چاہئیں، اِسی لیے کہہ رہا ہوں۔"

وینو کو اِس سے زیادہ اَور کچھ نہیں سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ سندرم نے ایک لمبی سانس لی، اور آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کا دماغ "کیا کہنا چاہیے، کیا نہیں کہنا چاہیے" کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سندرم سگریٹ پیتے رہے، سر جھکائے کچھ سوچ رہے تھے، پھر ایک پختہ یقین سے اُنھوں نے وینو کی طرف دیکھا، اُسے کچھ باتیں صحیح طرح سمجھانے کا خیال اُن کے دماغ میں ابھر آیا۔ پھر اُنھوں نے اپنا

خیال بدل دیا۔ یہ سوچ کر کہ آخر جواب ایک چیز ہے، تجربہ ایک اَور چیز، اور اِن سب سے پیدا ہونے والا یقین ایک اَور ہی چیز ہے اور وینو سے کہا، "ٹھیک ہے، اب یہ بتاؤ کہ اِس سلسلے میں کون سی بات ہے جو تمھیں نقصان پہنچاتی ہے؟"

وینو کو ایک طرف تو غصّہ آ رہا تھا، دوسری طرف وہ سوچنے لگا کہ اِس آدمی کو کیا ہو گیا ہے؟ اُسے کچھ رحم آ گیا۔ اُس نے پھیکی ہنسی سے کہا، "پتاجی، آپ پروفیسر ہیں، باوقار خاندان میں پیدا ہوئے ہیں، چار بچّوں کے باپ ہیں۔ اِتنی عمر ہو جانے کے بعد آپ کے اِس طرح آوارہ پھرنے کے سبب اگر آپ کے بیٹے کو اپنے خاندان کی عزّت خاک میں ملتے دیکھ کر پریشانی ہو رہی ہو تو کیا غلط ہے؟ کیا اِس کا اِن باتوں سے کوئی بھی سروکار نہیں ہے؟"

جب وہ بول رہا تھا، وہ اُس کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ اُس کا چہرہ آدھا اندھیرے میں، آدھا اجالے میں تھا اور اُس کی آنکھیں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ وہ اُن کی طرف دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

"وینو! تمھارا کہنا کہ تم ہوش یار ہو گئے ہو۔ یہ درست بھی ہے، لیکن ایک ہوش یار آدمی میں جو یقین کی پختگی ہونی چاہیے وہ تم میں کہاں ہے؟ پہلے ایک پتا کے ناتے میں اپنی باتوں پر تم سے بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ تم کہہ رہے ہو کہ میں خاندان کا وقار اور ہماری حیثیت کے مدِنظر پریشانی ہو رہی ہے، اچھی بات ہے۔ انھیں کسی قسم کا دھکا نہیں لگے گا۔ اپنی حیثیت کی تم سے کہیں کئی گنا زیادہ فکر مجھے ہے۔ اُسے اگر چوٹ پہنچے بھی تو اِس کا مقابلہ کرنے کی ہمّت مجھ میں ہے۔ یہ بات میں تمھیں کیسے سمجھاؤں اور سمجھانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

یہ سن کر وینو کو ایسا لگنے لگا کہ کہیں بھول اُسی کی تو نہیں ہے۔ پھر لگا کہ اِس عمر میں ایک پرائی عورت سے تعلق ہوتے ہوئے بھی دیکھو کتنے نڈر ہو کر اپنی لفاظی دکھلائے جا رہے ہیں۔ اُسے پھر غصّہ آ گیا۔ "بتاؤں ضرورت کیوں ہے؟...میں آپ کی بیوی کا بیٹا ہوں...اور آپ اُسے دھوکا دے رہے ہیں۔" اُس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اچھا، تو کیا اُس نے تم سے میرے بارے میں کوئی شکایت کی ہے؟..." اُنھوں نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"پھر تم کیوں ہم میاں بیوی کے معاملے میں دخل دے رہے ہو؟"

"میں آپ کا بیٹا ہوں! یہ میرا فرض ہے۔"

"نہیں بیٹے، یہ تمھارا فرض نہیں ہے۔ میاں بیوی کے معاملے میں دخل دینے کا حق بیٹے کا نہیں ہوتا۔"

وینو نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے۔ اُسے رونا آ رہا تھا۔ پتاجی کو برا بھلا کہہ کر ہمیشہ کے لیے اُنھیں چھوڑ کر چلے جانے کی اُسے خواہش ہو رہی تھی۔

اُس کی تڑپ اور تکلیف دیکھ کر اُنھیں بہت افسوس ہو رہا تھا۔ اپنی اوقات سے باہر کی بے تعلّق باتوں سے اُس کا من ہٹانے کی طاقت اُن میں نہیں تھی۔ اُسے تلملاتے دیکھ کر اُنھوں نے پیار سے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

"وینو!"

چھوٹے بچّے کی طرح اُس نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اب تو وہ بالکل روہانسا ہو گیا۔ بھرّائی ہوئی آواز میں اُس نے پوچھا، "پتاجی! یہ بات مجھے بہت ہتک آمیز لگتی ہے...یہ سب کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟"

اُنھیں ہنسی آ گئی۔

"مائی بوائے...سمجھ دار نوجوان ہو کر تمھیں یہ سب مجھ سے نہیں پوچھنا چاہیے۔ تمھارے جذبات میں سمجھتا ہوں۔ تمھارے خیال کے مطابق اگر میں غلط کام کر بھی رہا ہوں تو بھی اُسے دل ہی میں رکھو۔ وقت کے ساتھ ساتھ تم آہستہ آہستہ سمجھنے لگو گے کہ کون سی بات درست ہے، اور کون سی غلط۔ تمھارا پتا ہونے کے ناتے، تمھاری تمام غلطیوں کو میں معاف کرتا ہوں، ذرا سوچ کر دیکھو، پتا کے نجی معاملوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے چھپے چوری ایسے کام کرنا کیا تمھیں ہتک آمیز نہیں لگتے؟...اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو ضرور اِس کے لیے عمر بھر اپنے کیے پر شرمندہ ہوتا!"

معاف کر دیے جانے کی اور اپنے کیے کے لیے شرمندہ ہونے کی باتیں اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔

پھر بھی اور کچھ کہہ کر اسے سُدھارنا یا اقبالِ جرم کر لینا، اب اُس کے بس کے باہر کی بات تھی۔ یہ وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

"ماں!"

سبھی بچّوں میں سے اکیلا وینو ہی تھا، جو رمنی اُما کو ماں اور سندرم کو پتاجی کہتا تھا، اور سبھوں کے لیے وہ ممّی اور ڈیڈی تھے!

جب وینو نے اُنھیں پکارا، وہ بالائی منزل کے برآمدے میں ایک آرام کرسی پر بیٹھی "جیولین ہکسلے" کی کتاب پڑھ رہی تھیں۔

وینو نے کتاب کا سرورق پڑھا، "ناٹج ہموراِلیٹی اینڈ ڈسٹینی۔"

"تمھارے پڑھنے میں کوئی خلل تو نہیں پہنچایا میں نے؟"

"چھی، کیا فارملی ٹیز لے بیٹھے ہو تم؟ اِدھر آؤ، بیٹھو!" اُنھوں نے پیار سے اُسے پاس بٹھالیا۔

اُسے بات کرنے کے لیے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ بے چینی سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اچانک اُن کی نظر میں اِتنے بڑے بیٹے کی ماں ہونے کے فخر کا احساس ہونے لگا۔ وہ انگلیوں کے ناخنوں کو کترتا ہوا، سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔

آج تک شاید وہ کبھی کسی مسئلے پر بحث کرنے یا مشورہ لینے ماں کے پاس نہیں آیا تھا۔ یہ سوچ کر اُنھیں ایک قسم کی خوشی ہورہی تھی۔

اُس کی جھجک دیکھ کر وہ خود بول اٹھیں، "کیوں وینو؟ یہاں تم بہت بور ہورہے ہو نا؟"

"ہوں..." وینو نے سر اٹھاتے ہوئے کہا، "بور نہیں، یہاں کی زندگی ہی مجھے پسند نہیں ہے۔ کچھ بھی ہو آخر میں ایک دیہاتی ہی تو ہوں۔ آپ لوگ بہت ہی جدید... بالکل جدید زندگی جی رہے ہیں، جس میں میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہیں کر پا رہا ہوں..." اِتنا کہہ کر اُس نے اپنا سر پھر سے جھکا لیا، اور مٹھی پر انگلیوں سے لکیریں کھینچنے لگا۔

چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد رمنی اُما نے کہا، "تمھاری اُلجھن میری سمجھ میں ٹھیک سے نہیں آرہی ہے۔ میرے خیال سے اِتنے برسوں سے ہم جیسے رہتے آرہے ہیں، ویسے آج بھی ہیں... مجھے تو اِس میں کہیں بھی، کسی قسم کی کوئی الٹراچینج نظر نہیں آرہی ہے۔ تم صاف صاف اپنے من کی بات نہیں کہو گے تو میں کیسے سمجھ سکوں گی؟" اور وہ بھی سوچنے کی کوشش کرنے لگیں کہ آخر اُس کے دل میں کس چیز سے اِس قدر اتھل پتھل مچی ہوئی ہے۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہاں آکر میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ لگتا ہے، کسی پرائے گھر میں رہ رہا ہوں... یہاں کا رہن سہن، طور طریقے، رنگ ڈھنگ، سب کچھ مجھے غیر سا لگتا ہے... تم لوگوں کی محبت، شفقت، سب دکھاوے کی ہیں... آپ ایک جھوٹی زندگی جی رہی ہیں... میں سوچ رہا ہوں کہ پھر سے دادا جی کے گھر چلا جاؤں۔" وہ رک کر بولے جارہا تھا، اور وہ بھی چپ چاپ سن رہی تھیں۔

پھر دونوں ہی کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے۔ وہ دوپہر کا وقت تھا، گیارہ بجے تھے، اِس لیے گھر میں بالکل خاموشی تھی۔ نیچے باورچی خانے میں کھانا کھانے والی بوڑھی مہاراجن بھی سو رہی تھی۔ گھر اور گلی دونوں سنسان ہوگئے تھے۔

"وینو! ...اچانک تمھارے لیے یہ ایک مسئلہ کیسے بن گیا؟ ہاں، اِتنا تو میں سمجھ سکتی ہوں کہ دادا جی کے گھر اور یہاں کے ماحول میں کافی فرق ہے، لیکن تمھاری عمر کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دراصل تمھیں دادا جی کے گھر پر بوریت محسوس ہونی چاہیے۔ خیر، آخر آدمی کی پسند اور دلچسپیاں اُس کی عادتوں ہی کا تو نتیجہ ہوتی ہیں... پھر بھی تمھارا گھر تو یہی ہے۔ تم جس ڈھنگ سے رہنا چاہو، رہو۔ تمھیں کون روکتا ہے؟ چاہے جو ہو، دوسرے کی آزادی میں دخل دینا اور اُس پر حق جمانے کی عادت ہمارے گھر میں کسی میں بھی نہیں ہے۔ تمھیں کہاں تک یاد ہے، مجھے معلوم نہیں... جب تمھارے دادا دادی گانو لوٹنے کے لیے نکل پڑے تب اُن کے ساتھ جانے کے لیے تم ضد کرنے لگے تھے... بچّوں کی آزادی کی یہاں ہمیشہ قدر کی گئی ہے۔ یہاں اپنی مرضی کے مطابق رہنے میں تمھیں کون سی رکاوٹ ہے؟... ہوں، کہو وینو؟" اُنھوں نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ چپ چاپ اُن کا چہرہ تک رہا تھا۔ "مجھے لگتا ہے شاید کوئی اَور ہی وجہ ہے جو تم گانو لوٹنے کو ہو... کیوں؟ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

"ہاں، وجہ تو اَور ہی ہے۔" وینو نے کہا، اور اپنے دل کچوکے لگانے والی کئی حقیقتوں کو ظاہر کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

"وینو! اِتنا ہی نہیں، تم کچھ اَور باتیں بھی کہہ رہے ہو۔ ہماری زندگی کے بارے میں جسے تم دکھاوا اور جھوٹ وغیرہ کہہ رہے ہو، یہ کیا ہے؟... تم اِتنی جلدی کیسے اِس فیصلے پر پہنچ گئے؟ تم کس دکھاوے کی بات کہہ رہے ہو؟ ایسا لگتا ہے کہ تمھارے دل پر کوئی بہت ہی گہری چوٹ پہنچی ہے۔ نہیں تو یہ الفاظ تمھارے مُنہ سے نہیں نکلتے... بتاؤ نا کیا بات ہے؟"

اُس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اپنی ناک اور چہرہ پونچھا؛ اُس کا چہرہ لال ہوگیا تھا۔

"ماں مجھے پتا جی کا چال چلن پسند نہیں ہے..." اُس نے مُنہ پھیر کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُسے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ ویسے ہی آگے کہنے لگا، "میں یہی سوچ کر اِتنے دن خاموش بیٹھا تھا کہ آپ لوگوں میں جھگڑا ہو جائے گا، اور آپ کی زندگی کا سکون میری وجہ سے برباد ہو جائے گا۔ ماں! وہ تمھیں دھوکا دے رہے ہیں۔ یہ بات معلوم ہونے کے بعد بھی اگر میں خاموش بیٹھا رہا تو اِس کا یہی مطلب ہوا کہ اِس دھوکے بازی میں مَیں بھی اُن کا ساتھ دے رہا

ہوں... اِس لیے اِس بے عزّت خاندان میں مَیں نہیں رہنا چاہتا... اُنھیں میں کیسے سدھار سکتا ہوں۔ ہو سکے تو تم ہی اُنھیں صحیح راستے پر لاؤ۔ یہ تم دونوں کا معاملہ ہے۔ میں جا رہا ہوں۔" ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ کر ماں کی طرف دیکھے بغیر وہ وہاں سے بھاگ جانے کے لیے مضطرب ہو رہا تھا۔

اُسے ایسا لگا کہ وہ رو پڑے گا۔ ماں اُس سے کرید کرید کر باتیں پوچھیں گی۔ غصّہ ہو کر وہ اپنے دھوکے باز خاوند کو برا بھلا کہیں گی۔ اِتنے دنوں تک اپنے دل میں چھپا ہوا راز اپنے بیٹے پر معلوم ہو جانے پر وہ اپنی بے عزّتی محسوس کریں گی اور یہ سوچ کر وہ ایک مجرم کی طرح وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"وینو!..." بالکل شانت، لیکن جذبات میں بھری ہونے کی وجہ سے ماں کی بھرّائی ہوئی آواز نے اُسے روک لیا۔

اُن کے چہرے پر کسی بھی قسم کے نقوش نہیں تھے۔ اُنھوں نے پیار سے کہا، "بیٹھو!..." اور چلنے کو تیار وینو پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "میں نے سوچا تھا، تم اپنے کسی مسئلے کو لے آئے ہو۔ یہ تو تمھارے پتا جی کے بارے میں ہے۔ اِتنی سی بات ہے!" اُنھیں ہنسی آگئی۔

"تم پہلے ہی سے اِس بارے میں جانتی ہو؟"

"میں نے اِن باتوں کے بارے میں کبھی بھی جاننا ضروری نہیں سمجھا ہے وینو!" وہ سنجیدہ ہوگئیں۔

"یہ دیکھو کہ وہ تمھارے پتا اور میرے پتی ہیں... یہ بات جتنی سچ ہے، اُتنی ہی یہ بھی کہ وہ ایک پروفیسر، جید عالم اور باحیثیت آدمی ہیں۔ ہے نا؟"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے وہ ہی بولتی رہیں، "اِن باتوں کے لیے تم اپنے پتا پر فخر کر سکتے ہو، اُن تمام باتوں کو چھوڑ کر جن کے بارے میں تمھیں ٹھیک ٹھیک معلومات بھی نہیں ہے، جو بہت ہی پوشیدہ راز ہے اُسے کرید کر معلوم یا بے عزّت ہونا کیا تمھیں اچھا لگتا ہے؟"

وہ فوراً بول پڑا، "پوری واقفیت حاصل کر کے ہی تو بول رہا ہوں ماں! آئی ہیو پروف! میں ثابت کر سکتا ہوں۔ اُن کے پاس آیا ہوا ٹیلی فون کال... اُن کی باتیں میں نے اپنے کانوں سے سنیں، اِسی لیے اُس رات تھیٹر جا کر میں نے اُنھیں اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی... اُن کے کمرے میں دراز میں پریم پتروں کی ایک فائل رکھی ہے۔ میں نے اُنھی کے مُنہ پر پھینک دیا تھا۔ وہ انکار کر ہی نہیں سکے۔"

"وہ! اِٹ اِز اے شیم آن یو... بڑے پروفس لایا ہے۔ مشہور لوگوں کو بدنام کرنے کا دھندا کرنے والے کچھ سنسنی خیز رسالے ہوتے ہیں نا، اُن کے پاس پروفس نہیں۔ یہ آدمی کا غرور، اُس کی عظمت کو چھوڑ کر اُس کی بہت ہی نازک اور خفیہ کمزوریوں کا سرِعام چرچا کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اِس سے سماج اور تہذیب کا نقصان ہی ہوتا ہے، فائدہ نہیں، اور اِسی لیے ہم اُن رسالوں سے پرہیز کرتے ہیں... اب تم نے جو کچھ بھی کیا ہے، اِس میں اور اُن رسالوں میں بتاؤ کیا فرق ہے؟ تم بھی تو اُنھیں کی طرح کہہ رہے ہو کہ تمھارے پاس پروفس ہے، اِس لیے مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے... شیم! اِٹ اِز اے شیم آن یو..." رمنی اُما نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، "کیا تم نے سچ مچ یہ سب کیا؟... وینو! اِتنے بڑے آدمی کے ساتھ تم نے کتنا بُرا برتاؤ کیا ہے۔"

وہ کانپ رہی تھیں۔ اُن کے تیور دیکھ کر اُنھیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے وینو نے کہا، "ماں! تمھاری اور اُس خاندان کی بھلائی سوچ کر ہی میں نے جان بوجھ کر یہ سب کیا۔"

"وینو! مجھے بہت برا لگ رہا ہے، اُن کے بارے میں سوچ کر نہیں، بل کہ تمھارے لیے... تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایک باپ کے ساتھ بیٹے کا ایسا برتاؤ؟... میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تمھیں دھوکا دے رہے ہیں۔"

"اِٹ اِز مائی پرابلم۔" اُنھوں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا، "وہ میرا معاملہ ہے... تمھیں میری نجی زندگی میں اپنی ٹانگ اَڑانے کا کیا حق ہے؟..." دکھ سے وہ کانپ اٹھیں، "اب سنو! ہم نے پچیس برس پُرسکون انداز میں گزارے ہیں اور آخر تک ایسے ہی رہیں گے، اِس لیے اِس سکون اور خوشی کو برباد کرنے والی کسی بات میں بھی دخل اندازی نہیں کرتی... مجھے بھی اڑتی اڑتی سی خبر ملی ہے تو کیا ہوا؟ مجھ سے بڑھ کر پیارا ساتھی اُنھیں کہیں نہیں ملے گا۔ جیسا تم کہتے ہو مجھے اِس بات کا ضرور بہت دکھ ہے!..." یہ کہتے ہوئے اُن کے دل میں پتھر کی طرح کٹھور اور بوجھل بنا وہ شدید کرب اب دبائے دب نہیں رہا تھا، بل کہ پگھلنے لگا تھا، چشمہ اتار کر بہتے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے وہ کرسی پر سے اٹھ گئیں، اور برآمدے میں کچھ دُور جا کر کھڑی ہوگئیں۔ پھر سنبھل کر واپس کرسی پر بیٹھ گئیں۔ "وینو! جیسا تم سمجھتے ہو، زندگی اِتنی سیدھی سپاٹ نہیں ہے، وہ بہت ہی پیچیدہ اور بہت ہی اُلجھن پیدا کرنے والی ہوتی ہے اور اُس

پیچیدگی کے درمیان رہ کر بھی گرہستی کو پُرسکون اور ہنسی خوشی سے چلانا زندگی کا آرٹ ہے۔ اگر میں نے تمھاری سی حرکتیں کی ہوتیں تو اِس گھر کا سکون اور وقار مٹی میں مل جانے کا سبب بن جاتی۔ کسی بھی وجہ سے اُنھیں اپنی مٹھی میں رکھنے کے لیے اِس گھر کی شانتی، وقار، بچّوں کا مستقبل، سب کا مول دے کر میرا خودغرض بن جانا کتنی بری بات ہوتی۔ میرا یہ سب کچھ کہنا سن کر یہ مت سمجھنا کہ میں کسی پوشیدہ دکھ کو دل میں چھپا کر جی رہی ہوں! ہاں، ایک چھوٹی سی کسک میرے دل میں ضرور ہے۔ مکمّل خوشی حاصل کر لینا اِتنی آسان بات تو نہیں ہے... بولنے کا حق مجھے ہے یا نہیں، یہاں اِس کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہاں یہ سوچنا ہے کہ بولنے سے آخر فائدہ کیا ہے؟... میں نے تو یہ سوچا تھا کہ اِس سے کتنا نقصان ہو سکتا ہے میرا۔ اِس سلسلے میں چپ رہنا ایک طرح سے دانش مندی ہے وینو! ہم کسی کی عزّت کرتے ہیں، اِس کا آخر کیا مطلب ہے؟ اُن کی پرائیویسی، اُن کے باطن میں زبردستی گھس کر اُسے جاننے کی کوشش نہ کرنا... کسی سے پیار کرنے کا مطلب کیا ہے؟ اُس شخص کی کسی باطنی کم زوری جانتے ہوئے بھی صرف اُس کم زوری کے لیے اُس کی دوسری خوبیوں اور بڑائی کو تباہ کرنے کی بجائے اُس کم زوری کے ساتھ اُس کی عظمت کو سمجھنے کی کوشش کرنے کا نام ہی تو پیار ہے... اور آدمی کا باطن کس قدر پاک چیز ہوتی ہے... اِٹ از سم تھنگ سیکریٹ وینو! اِس میں کسی دوسرے کا داخلہ! وہ کوئی بھی ہو، گنوار پن اور گھناؤنا ہوتا ہے۔"

"لیکن ماں، تم ان کی بیوی ہو؟"

"سو وہاٹ؟ اِس اختیار کا غلط استعمال کرنے سے میرا یہ اختیار چھن سکتا ہے... ہے کہ نہیں؟"

"ایسے معاملے میں کیا وہ بھی تمھارے ساتھ اِسی طرح پیش آئیں گے؟"

"آئیں گے کیا... آتے رہے ہیں وینو! بیوی کے لیے اپنے خاوند پر یا خاوند کے لیے اپنی بیوی پر شک کرنے کی اپنی اپنی اوقات کو بھول کر دوسرے کے باطن کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی وینو! صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے، وہ ہوتا ہے اُن کا یہ فیصلہ کہ اُنھیں اِس کا حق ہے...

"میاں، بیوی، بیٹے، ماں، باپ سب ہی رشتے کے دھاگے میں بندھے ہوتے ہیں، پھر بھی کیا وہ الگ الگ انفرادیت، الگ الگ اکائیاں نہیں ہیں؟ ہر ایک آدمی کا اپنا ایک الگ باطن ہوتا ہے، اُس کی ہمیں قدر کرنی چاہیے وینو! خاص کر جن سے ہم پیار کرتے ہیں، اُن کے باطن کی حفاظت بڑی ہوش یاری سے ہمیں کرنی چاہیے... تم نے اپنے پتا جی کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ مجھ سے جو کچھ بھی کہہ رہے ہو وہ سب اُن سے کہنے کی ہمّت تم نے کیسے کی؟... میں تو سپنے میں بھی نہیں سوچ سکتی... اوہ وینو! تم نے یہ کیا کیا؟

"خیر رہنے دو... تمھارے پتا جی بہت اسٹرانگ آدمی ہیں، اُسے جھیل لیں گے... وہ اپنی کم زوریاں بھی چھلانگ کر آ جائیں گے، ضرور چھلانگ آئیں گے۔ زندگی بہت ہی پیچیدہ ہوتی ہے وینو! زندگی کو ٹھیک سے سمجھ لینا چاہیے... یہ کتاب پڑھو۔ اِس طرح کے خیالات تمھیں وسیع النظری عطا کریں گے۔"

وینو بے حد اُلجھن میں پڑ گیا تھا۔ اُس کی نظر میں صرف اُس کے دادا دادی ہی آدرش میاں بیوی تھے۔ وینو کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ یہ بات بھی نہیں کہ آخر اُس کے دادا دادی نے بھی صرف دادا دادی ہی بن کر اپنی زندگی نہیں گزاری تھی۔

چند دنوں کے بعد ایک شام، کالج سے لوٹ کر وہ کپڑے تبدیل کر رہے تھے۔ دو دن پہلے وہ کہے بغیر گھر سے چلے گئے۔ وینو کی آئی چٹھی رمنی اُما نے نکال کر اُن کے ہاتھ میں دے دی۔ اُس کی آخری سطریں یہ تھیں:

میں دادا کا پوتا بن کر ہی رہنے کے لائق ہوں، اِس لیے چلا آیا۔ آپ لوگوں کی زندگی کم زور پیچیدہ دھاگوں کی بنی ہوئی لگتی ہے۔ اگر میں نے کوئی غلطی کی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔

آپ کا وینو

خط پڑھ کر دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"دقیانوسی ستر سال کے اوپر کی عمر والوں ہی میں نہیں ہوتے... بیس سال کی عمر والوں میں بھی دقیانوسی ہو سکتے ہیں۔" اُنھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

رمنی اُما کچھ دیر تک بے چینی سے اُنھیں تکتی رہیں۔ اُن کی آنکھیں لال ہو کر بھر آئیں۔

پھر اپنا گہرا دکھ ہٹی میں بدلتے ہوئے اُنھوں نے پوچھا، "کیا اب بھی... آپ... آپ... آپ...؟"

اور اُن کے کانپتے ہونٹ سندرم کے گالوں میں دھنس گئے۔ سندرم نے اُنھیں اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔ اِس کے بعد جو کچھ بھی ہوا... وہ اُن کا باطنی معاملہ ہے!

خواتینِ ہفت رنگ، تیسرا رنگ ● پنجابی کہانی

جنگلی گھوڑے

امجد طفیل کور

اِس گھرانے کی کہانی، اُداسی جس کا سرمایہ تھا اور نسلوں کا ورثہ۔ وہ اُداسی بلانشہ، اُداسی ترا رشتہ اور اُداسی کا سامان کرتے... آپ کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی!

کومل میرے ساتھ پڑھتی تھی۔

پڑھتی تو پہلے بھی اسی اسکول میں تھی لیکن نویں جماعت میں ہم نے ایک جیسے مضامین لے لیے تو ہمارا ایک ہی سیکشن ہو گیا۔ دو لڑکیوں کے بیٹھنے والے بنچ پر وہ میری پڑوسن ہو گئی۔ اور یوں ہماری دوستی کا آغاز ہُوا۔

آج سوچتی ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر وقت کی جانے والی وہ باتیں کیا ہوتی ہوں گی۔ کالج میں بھی ایک دوسرے کے کانوں میں کھسر پھسر کرتے رہنا۔ ہاتھوں کی اوٹ میں کچھ کچھ کر کے ہنستے رہنا... اور تمام فارغ وقت میں باتیں کیے جانا۔

دوستی کا پہلا پہلا غبار بیٹھ گیا تو ہم اداس بھی اکٹھے ہونے لگے اور بور بھی اکٹھے ہی۔ ایک دوسرے سے نہیں، ساری دنیا سے بور اور بے زار!

یہ بوریت اور یہ بے زاری زندگی میں پہلے بھی ہُوا کرتی تھی۔ ہمارے کپڑے تیزی سے چھوٹے ہونے شروع ہوئے تھے تو یہ بے زاری اور بوریت اسی تیزی سے بڑھتی گئی تھی۔

اب ہم مل کر بور ہوتے تھے۔ اور لگتا تھا ہم دونوں تنہا تنہا نہیں، دُہری بوریت بھگت رہے ہیں۔ ایک عجیب بدحواس سی تنہائی، وہ بارش سے بھیگی کملی جیسی تھی۔ نہ اتاری جاتی تھی اور نہ اوڑھی۔

جی چاہتا تھا کوئی ایسا حادثہ وقوع پذیر ہو جس کے ساتھ بس یہ یک سوزندگی تہس نہس ہو جائے۔ کچھ ایسا جو سب کچھ بدل کر رکھ دے۔ کچھ طوفان جیسا، بھونچال جیسا۔ لیکن کم بخت کچھ بھی تو نہیں ہوتا تھا۔

بہت بے تکا لگتا تھا، اسکول کی فضول کتابیں پڑھتے جانا،

امتحان دیتے جانا۔ اکبر نے کتنے بیاہ کیے تھے، ابدالی نے کب حملہ کیا تھا، پانی پت کی جنگیں کب سے کب تک ہوئی تھیں، ہمیں کیا واسطہ ان سے؟ اور ریاضی، الجبرا اور جیومیٹری! انھیں پڑھنے کی کیا تُک تھا؟ کیا تُک تھا سُود در سُود کے سوال حل کرتے جانے کا؟ الجبرا کے فارمولے، جیومیٹری کے تھیوریاں، ہم نے اچار ڈالنا تھا ان کا؟

کیا ہونا چاہیے، اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ لیکن یہ پوری طرح علم تھا کہ جو ہونا چاہیے وہ نہیں ہو رہا۔ یوں لگتا تھا کہ زندگی کو زنگ لگ گیا ہے۔ کم بخت چلتی ہی نہیں۔

یہ تمام لوگ نہ جانے کیوں بھاگے پھرتے ہیں... ہم سوچا کرتے تھے۔ ہمیں تو بھاگنے کی کوئی وجہ نظر آتی تھی، نہ رُکے رہنے کی۔

کومل کے گھر میں ایک بڑا کنبہ تھا اور کنبے کا بے پناہ شور، ہر وقت۔ گھر کے افراد جتنی دیر تک جاگتے رہتے تھے، ایک ہنگامہ برپا رہتا۔ چھوٹے بچے روتے رہتے، کپڑے ڈنڈوں کے ساتھ لٹکتے رہتے، کاریں اسٹارٹ ہوتی رہتیں، گھر واپس لوٹنے والے کاروں کے دروازے زور زور سے بند کرتے رہتے۔ سب سے چھوٹے چچا کا موٹر سائیکل شور کا طوفان پیدا کرتا ہُوا گھر سے روانہ ہوتا رہتا اور گھر واپس آتا رہتا۔ باورچی خانے میں برتن کھڑکھڑاتے رہتے۔ نوکر بہ آوازِ بلند باتیں کرتے ہوئے بیڑیاں پھونکتے رہتے یا جمع دارنی کے ساتھ جھگڑتے رہتے۔ اور جمع دارنی چیختی رہتی۔

گھر میں لوگ بھی اتنے سارے تھے۔ چچا چچیاں، دادا دادی، بچے نوکر۔ پھر مہمان بھی تو بے شمار آتے تھے۔ شام کے وقت آنے والے مہمان زیادہ تر گھر کے مردوں کے دوست ہوتے۔ ''دوستی مائی فٹ'' کومل کہتی۔ دوست، یعنی بزنس کے معاملات کو آگے چلانے والے مصنوعی رشتے۔ ہمراہ بیویاں، تاکہ بزنس کی جڑیں ایک دوسرے کے گھر میں بھی مضبوط کر لی جائیں۔ کومل کہتی۔ ''بیویاں تو بس مردوں کی پروجیکشن کے لیے ہوتی ہیں نا۔ سج دھج کر اپنے ڈرائنگ روم میں یا دوسرے کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر، مردوں کی دوستیوں اور بزنس کو بڑھاتے جاؤ۔ رشتے داروں میں بیٹھ کر رشتے داریوں کو مضبوط کرتے جاؤ۔ بچے پیدا کر کے مردوں کے خاندان کی جڑیں پاتال تک پہنچاتے جاؤ۔''

پھر گھر میں تائی اماں کی سہیلیاں آتیں، دوپہر کے وقت۔ جب مرد کام پر گئے ہوتے۔ دوپہر کے وقت مجمع لگا کر بیٹھی رہتیں۔ چچی اور اماں کی سہیلیاں، جو چوڑے پلنگ پہ بیٹھی تاش کھیلتی اور پان چباتی رہتیں۔ نوکر کو کافی بنانے کے لیے آوازیں دیتی رہتیں اور باتیں کرتی رہتیں۔ یا تو ساڑھیوں کی یا زیورات کے بارے میں۔

دادی تھیں کہ ہمیشہ نئی سے نئی کہانی سنانے کی کوشش کرتی رہتیں۔ پوچا کرتی رہتیں اور روزے رکھتی رہتیں۔ گھر میں کبھی کوئی پنڈت آ رہا ہوتا، کبھی کوئی کیرتن کرنے والا، کبھی کوئی داستان گو۔

شور کے اس سیلاب میں خاموشی کا کوئی جزیرہ کہیں نہیں تھا جس میں وہ خرگوش کی طرح دبک کر بیٹھ جاتی۔ اسی وجہ سے اس کے اندر ایک عجیب سی تلملاہٹ بھرتی رہتی تھی شب و روز۔ اور پھر بارود کے مانند پھٹتی تھی، جب بھی موقع ملتا۔

ایسے وقت میں وہ اپنے نئے کپڑوں کو پھاڑ ڈالتی، بہن بھائیوں کے ساتھ جھگڑتی تو ناخنوں کے ساتھ ان کے بازوؤں پر خراشیں ڈال دیتی۔ نوکروں پر گرجتی، ماں کے ساتھ لڑتی۔ صرف باپ سے ڈرتی تھی لیکن ان کے ساتھ زیادہ سابقہ نہیں پڑتا تھا۔ وہ بڑے کام کاج والے آدمی تھے۔ صبح طرح کے عمومًا بزنس مین ہُوا کرتے ہیں۔

''پورے گھر میں اور کوئی بچہ اس طرح تو اونچا نہیں ہو رہا! اور بچے بھی تو ہیں، چپ چاپ اسکول جاتے ہیں، پڑھتے ہیں، پاس ہو جاتے ہیں، یہ لڑکی ہے یا چڑیل!'' کومل کی ماں پریشان ہو کر سوچتیں... جب بھی انھیں پریشان ہونے یا سوچنے کی فرصت ملتی۔ ورنہ اس گھر میں تو سب کی زندگیاں اس قدر مصروف تھیں اور اپنے آپ میں مست، کہ ایک دوسرے کے لیے پریشان ہونے کا کسی کے پاس وقت تھا اور نہ ہی عادت۔

لیکن جب بھی جھڑپ ہوتی، ماں کے ساتھ ہی ہوتی۔ کیوں کہ گھر میں ماں ہی ہوتی تھی۔

روزانہ اسکول میں فرصت کے وقت وہ مجھے گھر کے تمام جھگڑے بتاتی۔

یوں تو ہماری دوستی اتنی پکی تھی کہ بیش تر اوقات اسے کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس کی پلکوں کے آس پاس منڈلاتے ہوئے سایوں سے ہی مجھے علم ہو جاتا تھا کہ آج پھر جھگڑا ہُوا ہے اس کا گھر میں کسی کے ساتھ۔

اس طرح کی گھنگھور اداسی کے وقت میں وہ اپنی سب سے چھوٹی انگلی کا ناخن دانتوں کے ساتھ کترتی اور میں اسے ہمیشہ کہتی۔ ''پگلی! تیری انگلی گھس جائے گی۔''

وہ اپنے گھر کے شور سے دُکھی تھی اور میں اپنے گھر کے

سناٹے سے۔ ہمارے گھر میں اتنی خاموشی تھی کہ سانس بھی رُک رُک کر لینے کی خواہش پیدا ہوتی۔ لگتا تھا یہ پگلائے ہوئے گھوڑوں جیسی تیز تیز سانسوں کی آواز کوئی سن لے گا تو کیا سوچے گا؟ پتا جی رات ڈھلے گھر آتے، وہ ڈاکٹر تھے۔ آ کر روٹی کھاتے ہوئے ریڈیو پر خبریں سنتے تھے، بس۔ اور پھر ریڈیو بند ہو جاتا۔ ان کا روٹی کھانے کا وقت ذرا رُعب والا ہوتا تھا۔ نوکر لسّی رُڑک رہا ہوتا تھا۔ ماتا جی گرم گرم پھلکیاں اتار رہی ہوتی، اور میں باورچی خانے میں پھلکی لے کر پتا جی کی پلیٹ میں رکھتی جاتی تھی۔ اور ریڈیو پر خبریں نشر ہو رہی ہوتی تھیں۔

باقی تمام گھر خاموش رہتا۔ ماتا جی کی کوئی سہیلیاں نہیں تھیں جو ملنے آتی رہتیں۔ اور ہی ہمارے رشتے دار زیادہ تھے، ددھیال کی طرف سے تو کوئی رشتے دار کوئی بھی نہ تھا، کیوں کہ خاندان میں کئی پشتوں سے ایک ہی بچہ پیدا ہو رہا تھا۔ پہلی پشتوں کا تو علم نہیں لیکن میری دادی ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں، میرے دادا اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اور اب میں تھی، اور میرا ایک بھائی تھا جو دون اسکول میں پڑھتا تھا، ڈیہرہ دون۔ گھر میں صرف میں ہی تھی۔ وہ صرف چھٹیوں میں گھر آتا تھا اور اپنے دوستوں کے ساتھ یا تو کرکٹ کھیلنے نکلا رہتا یا چھت پر پتنگیں اُڑاتا رہتا۔ جب وہ اور اس کے دوست پتنگ اُڑا رہے ہوتے، میرا چھت پہ جانا منع ہوتا تھا۔ کیوں کہ ''لڑکیاں لڑکوں میں جا کر ماہی لڑکے نہیں بنا کرتیں۔'' یہ کہتی تھیں میری ماتا جی۔ میری ماتا جی کو کہیں آنے جانے کا بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ یا تو باورچی خانے یا پھر پوجا پاٹھ کرنے والا کمرا۔ بس یہی ان کی پوری ''بیٹ'' تھی۔

کومل اور میں خالی پیریڈ میں اسکول کے لان کا کوئی خالی کونا کھدرا تلاش کرتیں اور باتیں کرتیں۔ من میں عجیب سی ہلچل سی ہوتی رہتی، جیسے چھاتی پھٹ جائے گی بارود کے ساتھ۔ اور ہر پناہ شکایت رہتی ہر شے سے، ہر شخص سے۔

''مسٹر ٹیٹھی کے ہونٹ دیکھے ہیں تُو نے؟ اُلٹی جوتی جیسے۔ دل چاہتا ہے کہ ٹھوکر مار کر اُلٹی جوتی کو سیدھا کر دوں۔'' جب بھی کسی ٹیچر سے ڈانٹ پڑتی ہم اسی طرح اپنا غصہ نکالتے۔

''مسٹر چوپڑا کا ناک بیل کے ناک جیسا نہیں؟ ایک رسّا اس میں ڈال کر ہانکنے کی ضرورت ہے۔'' ہم گھاس پہ لیٹ کر چاپ آسمان کو گھورتے رہتے۔

''یہ سورج پھٹ جائے تو مزہ آ جائے۔ ساری دنیا پگھل جائے نہیں؟''

''یہ پھٹے گا! چھوٹا سا غبارہ۔ پھٹ بھی جائے تو کیا ہوگا؟ صرف تاریکی ہو جائے گی۔ صرف اندھیرا ہوگا۔ ہمارے گھر تو نہیں گر جائیں گے۔'' اور سورج کے پھٹنے میں ہماری دل چسپی غائب ہو جاتی۔

آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کبھی لگتا کہ پیلی، سبز طشتریاں سی ہَوا میں تیر رہی ہیں۔ کمال تو یہ تھا کہ یہ اُڑن طشتریاں اگر کومل کو پہلے نظر آ جاتیں تو مجھے کبھی آنے لگتیں۔ اور اگر میں انھیں پہلے دیکھ لیتی تو کومل کو بھی نظر آنے لگتیں۔

''یہ ہیں کیا؟'' ہم دھیرے سے، دھیمی سی آواز میں بات کرتے تاکہ طشتریوں میں چھپے لوگ ہماری بات نہ سُن لیں۔

''خلائی اُڑن طشتریاں۔ ان اربوں ستاروں میں سے کسی ستارے کے ہوائی جہاز! ان کے اندر عجیب و غریب لوگ ہوں گے، اڑتے ہوئے، سفر کرتے، ہماری دھرتی کو دُور سے دیکھتے اور حیران ہوتے ہوئے۔''

''جوان لڑکے ہوں گے! بوڑھے تو اتنی دُور تک سفر نہیں کر سکتے نا۔''

''ہاں، جوان لڑکے ہی ہوں گے۔''

''خوب صورت ہوں گے؟''

''کیا معلوم۔''

''معلوم کیوں نہیں؟ ستارے چمکتے نہیں؟ اتنے خوب صورت چمکتے ستاروں کے دیس سے آنے والے لوگ خوب صورت کیوں نہیں ہوں گے؟'' وہ تنک کر کہتی۔

''ہاں، اتنی خوب صورت، نیلی پیلی سبز، سرخ طشتریوں میں سفر کرنے والے جوان لڑکے خوب صورت کیوں نہیں ہوں گے؟'' اور اسی طرح ہر بات پر ہمارا سمجھوتا ہو جاتا۔

ہر خوب صورت ٹیچر جو میٹھی بولی بولتی تھی، سزا نہیں دیتی تھی، وہ سرخ طشتری والی ہوتی تھی، خلا سے آئی ہوئی۔ اور ہر ٹیچر جس کی ساڑھی کے نیچے سے ٹخنے ننگے ہوتے، جس کے زور لگا کر باندھے ہوئے جوڑے میں سے سوئیں باہر جھانکتیں اور جس کا چہرہ مہرہ ہمیں پسند نہ ہوتا، وہ پاتال میں سے آئی ہوتی... دھرتی کے نیچے سے، پاتال کی گہرائیوں سے، جنوں اور چڑیلوں اور بھوتنیوں کی دنیا سے۔

لیکن خلا کے لوگوں کے ساتھ آنے والا پیار اور پاتال سے نکل کر آئے ہوئے لوگوں کے ساتھ آنے والی نفرت،

ہماری خالی زندگیوں کے بہ مشکل آدھے پونے گھنٹے کو ہی بھر سکتی۔ باقی تمام وقت خوف ناک بھنوروں میں گھرا رہتا۔ بھنور، جو ہمارے سینے میں مچلتے، اور ہمارے خیالوں میں بھی۔ پاگل جنگلی گھوڑوں کی طرح ہماری سوچیں سرپٹ دوڑتیں، ٹپاٹپ، ٹپاٹپ۔ ان دوڑتی بھاگتی سوچوں کو تھام کر رکھنے کی کوئی تدبیر ہم نہیں کر سکتے تھے۔ ایک عجیب وحشی سا نشہ تھا، ان جنگلی گھوڑوں کے بے دم، پسینے سے تر ہوا اور چربی کی بھاپیں چھوڑتے ہوئے، پھنکارتے، تیز رفتار کمان کے مانند تنے ہوئے جسموں کے ساتھ چپک کر، وقت اور زمانے میں سے طوفان کی طرح گزرنا۔ گھوڑوں کے اڑتے ہوئے ایال ہمارے اپنے بالوں میں گڈمڈ ہوتے رہتے، اور ان کے پاؤں کی ٹاپ اور دھمک ہماری رگوں میں بہتے لہو، میں ایک بوکھلائی دھمک کے ساتھ بجتی رہتی... ٹپاٹپ، ٹپاٹپ۔

ایسے وقت میں کومل اپنی چھوٹی انگلی کا ناخن دانتوں کے ساتھ کترتی رہتی، گلہری کی طرح۔ اور میں جب اسے ڈانٹ کر کہتی۔ ''اسٹوپڈ! تیری انگلی گھس جائے گی۔'' تو سرپٹ دوڑتے ہوئے پاگل گھوڑے تھوڑا سا آہستہ ہو جاتے اور ہونٹوں میں سے بہتی جھاگ کے پھراٹے مارنے لگتے۔

ایک روز اس نے مجھے عجیب شکستہ حال اور بدحواسی سے کہا۔ ''کل مجھے ڈیڈی کے لاکر میں سے ایک ڈائری ملی۔ رات کو میں نے چوری چوری پڑھی ہے۔ کسی مرتی ہوئی لڑکی کی تھی... اسپتال میں لکھی ہوئی۔ میں... اس لڑکی کی ناجائز اولاد ہوں۔''

میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''کیا؟'' اتنی بھیانک اور سنسنی خیز خبر۔ اے بھگوان!

میں اس قدر حیران ہوئی کہ بولا ہی نہ گیا۔ اس کا ہاتھ میں نے یوں زور سے تھام لیا جیسے وہ کوئی خرگوش تھا، بھاگنے کو تیار!

اس وقت باقی لڑکیاں پرارتھنا کے بعد کلاسوں کی طرف جا رہی تھیں... قطاریں بنا کر۔ اور وہ مجھے یکا یک ہی اسکول کے لان کے اس کونے میں کھینچ لائی تھی۔ لیموں کے پودے تلے۔ اور بات کرتے ہوئے گھاس کے تنکوں کو اُکھیڑ اُکھیڑ کے پوروں میں مسل رہی تھی۔

شاید اس نے اپنے بم دھماکے کا اثر دیکھنے کے لیے میری جانب دیکھا۔ میں نے سوچا۔ 'مجھے بولنا چاہیے، کچھ۔' سو میں نے کہا۔ ''وہ لڑکی یعنی وہ... جس نے تجھے جنم دیا تھا، یعنی تیرے ڈیڈی...''

''ظاہر ہے کہ وہ ضرور ڈیڈی کی مسٹریس ہوگی، تبھی تو مجھے گھر لے آئے۔''

''لیکن یہ تجھے کیسے معلوم ہے کہ تیری ماں مر گئی ہے؟''

اس کے چہرے پر زرد پرچھائیاں کانپ گئیں۔ لیکن پھر وہ سنبھل کر کہنے لگی۔ ''آخری صفحے پر ڈیڈی نے ہی لکھا ہوا ہے کہ اگر میں مر گیا تو یہ نہ سمجھنا، کومل کو لاوارث سمجھ کر اسپتال سے اٹھا لایا تھا۔ یہ اس کی ماں کی ڈائری ہے، یہ پڑھ لینا۔ وہ بڑی اچھی تھی۔ میں اسے پیار کرتا تھا لیکن بچا نہیں سکا۔ مر گئی۔ کومل ہمارے پیار کی نشانی ہے، کومل میری بیٹی ہے۔''

''یور ڈیڈ از گریٹ!''

''گریٹ، مائی فٹ! ایک اچھی بھلی، بے سہارا لڑکی کو حاملہ کر دیا اور پھر وہ باسٹرڈ بچہ گھر اٹھا لائے۔ لوگوں سے کہا ہوگا، اپنی بیوی سے بھی یہی کہا ہوگا کہ بے چارہ لاوارث بچہ تھا، گھر لے آیا ہوں۔ اور گھر کے لوگوں نے بھی اسے اٹھا کر لائے ہوئے پلّے کی طرح پال لیا تھا۔ سب جھوٹ بول دے کر عظیم بن گئے ہوں گے۔ دیٹس وائے ڈیڈز آر ہیٹس می!'' اور وہ رو دی۔

''ڈیڈز وائف...؟'' مجھے پل بھر کے لیے تو سمجھ ہی نہ آیا۔ پھر یک دم ٹھٹک کر، سمجھ میں آ گیا کہ کومل اپنی ماں کی ہی بات کر رہی تھی۔ جو ڈائری پڑھنے کے بعد ''ڈیڈز وائف'' رہ گئی تھی۔ میرا دل پگھل کر اس کی اور پہلے لگا۔ اس نے مجھے بانہوں میں کھینچ لیا۔

لیموں کے پودے میں اچانک بہت سی چڑیاں آ کر دبک گئیں اور چہچہانے لگیں۔ میں اب بھی یاد کرتی ہوں، اتنے برسوں بعد، اور وہ پل جوں کا توں میرے پاس چلا آتا ہے... لیموں کے چھوٹے سے قد والے پودے کے نیچے بیٹھی ہوئی دو لڑکیاں، سنسنی خیز خبر کے ساتھ بالکل سن اور لیموں کے پودے میں اچانک پیدا ہونے والا چڑیوں کا شور۔

''اسی لیے مجھے کوئی پیار نہیں کرتا۔ ماں تو خیر میری ماں ہی نہیں، پیار کیوں کرے گی؟ اور ڈیڈ... ڈیٹ باسٹرڈ... وہ کبھی میری طرف دیکھتے بھی نہیں۔ شاید مجھے دیکھ کر انھیں شرم آ جاتی ہو۔'' وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ اور اس کا سر میرے کندھے پر جھک گیا۔

''میں کروں گی تجھے پیار۔ میں پیار کروں گی اپنی کومل کو۔'' میں نے اسے اپنی بانہوں میں دھیرے دھیرے ہلاسا

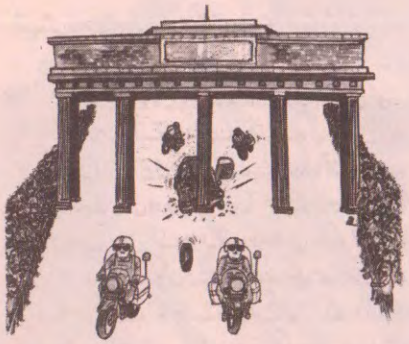

ہے صحت بنانے کا۔ نہیں تو اگلے کہیں گے، ماں باپ کے گھر کھانے کو تمھیں کچھ نہیں ملتا تھا۔''

اور کومل کو وہ بڑے لاڈ سے کہہ رہی تھی۔ ''آج تو اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر ایک پوری اور کھالے۔ پتا نہیں اس لڑکی کا ایک ہی روٹی سے پیٹ کیسے بھر جاتا ہے! ہم تمھاری عمر میں دو چار پراٹھے تو آتے جاتے ہی کھا لیتے تھے۔ تیری نانی آ رہی ہیں کل شملہ سے، بے شک ان سے خود ہی پوچھ لینا۔''

کھانا کھا چکے تو کومل کی ماں نے کہا۔ ''لڑکیو! ابھی اٹھنا نہیں، میں کھیر لے کر آتی ہوں۔'' اور وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

وہ کھیر کے برتن کے آگے کھڑی تھی، اداس اور اپنی چھوٹی انگلی کا ناخن کتر رہی تھی۔ پتا نہیں اسے دیکھ کر مجھے جھٹکا سا کیوں لگا۔ مجھے لگا کومل ہی تھی، وہ ذرا سی موٹی، بس، چھوٹی انگلی کا ناخن کترتی ہوئی۔ میں اسے کہنے ہی والی تھی۔ ''خالہ جی! آپ کی انگلی گھس جائے گی...'' کہ اچانک ٹھٹک کر رُک گئی۔ یاد آیا، یہ محض اتفاق ہی تھا شاید، چھوٹی انگلی کترنا۔ ورنہ یہ عورت تو کومل کی ماں ہی نہیں تھی۔

کہنے لگی۔ ''یہ کھیر تو لگ گئی ہے یہ رامو پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے!''

میں نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں خالہ جی۔ ہم نے تو پوریاں ہی اتنی کھالی ہیں کہ...''

وہ جلدی سے بولی۔ ''نہیں نہیں، دیوالی کی دعوت اور مُنہ میٹھا نہ کیا جائے؟ ابھی آئس کریم منگواتی ہوں، ڈرائیور کو بھیج کر۔'' اور وہ ڈرائیور کو بھیجنے کے لیے تیزی سے باہر چلی گئی۔

لیکن اس کے بعد میرا آئس کریم میں دل لگا، نہ لڑکیوں کی گپ لگی جیسے روتے بچے کو بہل بہل کر جھلایا جاتا ہے، چپ کرانے کے لیے۔

اب کومل کی زندگی کے بالکل ذاتی دائرے میں سرخ، نیلی، پیلی، سبز مشترتیوں کے مسافر اور جگنوؤں کی طرح چمکتے ستاروں کے دیس سے آنے والے چمک دار لوگ صرف دو ہی تھے... اور میں اس کی وہ ماں جو اسے جنم دے کر اسپتال میں مر گئی۔ باقی سب پاتال کے لوگ تھے... جن، بھوت، چڑیلیں۔

یوں تو اسے اور مجھے بڑا اطمینان سا تھا کہ ہماری زندگیاں بڑی انوکھی ہیں۔ کومل کی ماں جیسی بن بیاہی ماں، اور پھر اسپتال میں ہی مر جانے والی ماں اور کسی کی نہیں تھی۔ کومل کی طرح ڈرامائی زندگی بھی کسی کی نہیں تھی۔ سربستہ راز! بالکل اگاتھا کرسٹی کے مسٹری ناولوں جیسی۔ الفریڈ ہچکاک کی فلموں جیسی اور کومل جیسی پُراسرار کہانیوں کے ڈرامائی ہیرو جیسی لڑکی بھی کسی اور لڑکی کی دوست نہیں تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ محسوس ہونے لگا کہ ہم بہت سوں سے بہتر ہیں اور خاص بھی۔

عجیب بات ہے کہ اس واقعے کے بعد ہماری سوچوں کے پاگل گھوڑے گھنے جنگلوں کی طرف نہیں بھاگتے تھے۔ چلتے بھی ٹپاٹپ، ٹپاٹپ، تو رسّے کے ساتھ بندھے ہوئے اپنے ہی گرد چکر کاٹتے رہتے تھے، پھنکارتے نتھنوں میں سے سنسنی خیز سانس نکالتے اور اسی کھونٹے کے گرد گول دائرے میں گھومتے رہتے تھے۔ اور کھونٹا تھا کومل کی کنواری ماں، جو اسپتال میں دم توڑ گئی تھی۔ کومل کے ڈیڈی جنھوں نے اسے بھی دھوکا دیا تھا اور ساری دنیا کو بھی۔

دیوالی تھی۔ کومل کی ماں نے میری ماں کو ٹیلی فون کیا کہ کومل اور گھر کی تمام لڑکیوں کی سہیلیوں کی، ان کے گھر دعوت ہے، سو مجھے لینے کے لیے ان کی کار آئے گی۔ اور یہ بھی کہا کہ اگر جی! آپ بھی کیوں نہیں آ جاتیں؟ یہ لڑکیاں تو اٹھتی سانس لیتی ہیں۔ ہمیں بھی تو ملنا جلنا چاہیے۔

خیر، کھانے کی میز پر بہت سی لڑکیوں کا جھرمٹ بیٹھا ہوا تھا اور کھانا کھایا جا رہا تھا۔ کومل، میں، کومل کے چچوں اور تایوں کی لڑکیاں، اور ان کی سہیلیاں، سب۔

کومل کی ماں سب کو خود اصرار کر کے کھلا رہی تھی۔ کومل کی پلیٹ کا وہ خصوصی خیال رکھ رہی تھی۔ ''کیا بات ہے لڑکیو؟ کھایا پیا کرو۔ سارا سارا دن کمریں ہی ماپتی رہتی ہو، یہی تو وقت

شپ میں۔ سب میوزک سن رہی تھیں، جب میں گھر چلی آئی۔

دسمبر کا نصف تھا۔ تیرہ تاریخ۔ اور کومل کی سال گرہ تھی۔

دسمبر شروع ہوتے ہی میں نے اُس سے کئی مرتبہ پوچھنے کی کوشش کی کہ کومل، تیری سال گرہ کے لیے کون سا تحفہ خریدوں۔ ہر مرتبہ وہ بہت اداس ہو جاتی اور کہتی۔ ''ہم جیسے بدنصیب لوگوں کی کیسی سال گرہ!'' ایک مرتبہ تو وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ''جیت، یو آر کروئل! تجھے تو پتا ہے، یہی میری ماں کے مرنے کا دن بھی ہے! پھر وائے ڈو یو ٹارچر می؟'' مجھے واقعی شرم آ گئی۔ اس کے بعد میں نے اس سے سال گرہ کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔

لیکن تیرہ دسمبر کو میری ماتا جی جنھیں دنیا کے ساتھ اور تو کوئی زیادہ سروکار نہیں تھا لیکن دنیا بھر کی سال گرہ اور شادی کی اپنی ورپر بزاور شتے داروں کے سب بزرگوں کی برسیاں سب یاد رہتی تھیں، کہنے لگیں۔ ''آج تمھاری سہیلی کومل کی سال گرہ ہے۔ تم نے شام کو پارٹی پر جانا ہوگا۔''

''نہیں، وہ اپنی سال گرہ نہیں منا رہی۔'' میں نے اداس ہو کر کہا۔

''کیوں نہیں منا رہی؟''

''یونی۔ کہتی تھی کہ اس بار دل نہیں چاہ رہا۔''

''اگر سال گرہ نہیں منا رہی پھر بھی تمھیں اس کے لیے تحفہ لے کر جانا ہی چاہیے۔ میں نے تو اس کے لیے ایک کارڈ یگن لا کر رکھا ہوا ہے۔''

میں خاموش رہی۔ سوچتی رہی۔

ماتا جی کہنے لگیں۔ ''میں نے شام کو ڈینٹسٹ کے پاس جانا ہے، اسی طرف۔ تم ساتھ چلنا، تمھیں میں کومل کے گھر اتار دوں گی اور آتے ہوئے لے لوں گی۔''

اس قسم کے ریڈی میڈ پروگرام میں تو عذر کی گنجائش ہی نہیں ہوتی، سو چپ رہی۔

شام کو جب میں کومل کے گھر پہنچی، دعوت ہو رہی تھی۔ کومل نے راجستھانی لہنگا پہنا ہوا تھا، نیا نکور، گوٹے والا۔ اور اوپر پیلی اوڑھنی لی ہوئی تھی جسے سبز کناری لگی ہوئی تھی۔ بہت ساری لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔ کومل کی ماں بھی تھی، ڈیڈی بھی چچے اور چچیاں بھی، گھر کے سب بچے بھی۔ اچھی خاصی رونق تھی۔

صوفے پہ ایک بزرگ عورت بیٹھی تھی جس کی صورت میرے خیال میں کومل اور اس کی ماں سے ملتی تھی۔ لیکن یہ سوچتے ہی میں نے خود کو پاد دلایا کہ یہ تو ممکن ہی نہیں۔

اس ساری ہنستی گاتی تقریب کو دیکھ کر میں بھی گھبرا گئی اور کومل بھی۔ اس کی ہنسی کانوں کی لوؤں کے پیچھے جا چھپی۔ وہ حیرت سے میری جانب دیکھنے لگی۔ پھر سنبھلی، کہنے لگی۔ ''مائی گریٹ مدر انسٹنڈ، یو نو...'' اور اس نے اس بزرگ عورت کی جانب دیکھا۔

میں نے کارڈ یگن کا پیکٹ پکڑایا اور نارمل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے اسے گلے لگا کر اس کی گردن چوم کر کہا۔ ''مینی ہیپی ریٹرنز آف دی ڈے۔''

''یہی ہے تمھاری خاص سہیلی؟ جیت؟'' اس بزرگ عورت نے ہنس کر کومل سے پوچھا۔

''ہاں، نانی!'' کومل نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

''تُو تو کہتی تھی اسے آج کوئی کام ہے، آئے گی نہیں... لیکن مجھے علم تھا، تیری اتنی پکی سہیلی سو کام چھوڑ کر بھی آ جائے گی۔'' نانی ہنس رہی تھیں۔

''آ بیٹی، تُو میرے پاس بیٹھ!'' نانی نے اپنے نزدیک صوفے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

میں نانی کے پاس جا بیٹھی۔

''شیل نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ شیل کو جانتی ہو نا؟ کومل کی ماں... کہ تم دونوں بہت پکی سہیلیاں ہو۔'' اور میں جھینپ کر مسکرانے لگی۔

اتنے میں کومل کی ماں نے کیک کی پلیٹ لا کر میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔

''نانی، آپ؟'' میں نے پلیٹ نانی کی طرف بڑھائی۔

''نہیں بیٹی، میں نہیں کھاتی... تُو کھا!''

میں کیک کا ٹکڑا آہستہ آہستہ کترنے لگی۔

اور نانی لڑکیوں کی جھرمٹ کی طرف دیکھتی ہوئی نہ جانے کہاں کھو سی گئیں۔ مجھے لگا، وہ دراصل کسی کی طرف بھی نہیں دیکھ رہی تھیں جیسے کسی اور اجنبی سی، خیالی دنیا میں چلی گئی تھیں۔ بزرگوں کی ایسی خیالی دنیا ہوتی ہی ہے... دلوں کی خاموشی، جس میں وہ چپ چاپ چلے جاتے ہیں۔

میں نظریں جھکائے کیک کھانے لگی۔ کیک کھا کر جب میں نے نانی کی طرف دیکھا تو وہ اپنی سب سے چھوٹی انگلی کا ناخن دانتوں کے ساتھ کتر رہی تھیں۔

میں نے پلیٹ کو گرتے گرتے جھپٹ لیا۔

خواتین ہفت رنگ، چوتھا رنگ ● ملیالم کہانی

لڑائی

کرشنا کروٹی / یعقوب جمیل

ایک غریب کے لیے پریشانی، دوسرے غریب کے احساسات
وہ یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ کوئی کسی کے لیے کیا کر سکتا ہے

تباہی و بربادی کے گہرے سیاہ بادل چھٹ چکے تھے۔ سیکڑوں انسانوں کا لہو پی کر دھرتی اپنی پیاس بجھا چکی تھی۔ آہ و بکا بند ہو چکی تھی۔ زندہ بچ جانے والے فوجیوں کو اپنے اپنے گھروں کو جانے کی اجازت بھی مل چکی تھی۔

تھکے ماندے فوجی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں روانہ ہونے لگے۔ ان کے کندھوں پر لٹکے ہوئے تھیلے تقریباً خالی ہی تھے مگر دل وہ میدانِ جنگ کی اذیت ناک یادوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان یادوں کی ایسی ہی بھاری گٹھڑی ہر فوجی اپنے ساتھ لیے جا رہا تھا۔

ان فوجیوں میں کوچی وردا بھی تھا۔ سامان کے نام پر اس کے پاس گنی چنی چند چھوٹی چھوٹی چیزیں ہی تھیں۔ اس کی کمر کے پیچھے کا ایک پیکٹ بندھا ہوا تھا جس میں بہت تھوڑے سے کپڑے تھے۔ جسم پر تیلی خاکی وردی تھی اور پاؤں میں وزنی فوجی بوٹ۔ کندھے پر خاکی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا تھیلا اور چہرے پر موٹی موٹی کالی مونچھیں۔ بس یہی تھا اس کا کل ساز و سامان تھا۔ ان سب چیزوں کو اگر اس کی زندگی کی کمائی کہا جائے تو یہ بھی نامناسب نہیں ہوگا۔ انھی سب چیزوں کو ساتھ لے کر کوچی وردا مورچے سے اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔

وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔ اب اُسے گھر واپس آئے کئی ماہ گزر چکے تھے... اور موٹی موٹی مونچھوں کے سوا کچھ اب اُس کے پاس کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

ہفتے بھر کے اناج اور بیوی کے لیے ایک رنگین ساڑھی کی خریداری نے اس کی جیب بالکل ہی خالی کر دی تھی... پھر اگلے ہفتے میں گھر میں پڑی ہوئی ٹین کی پیٹی اور اس کے فوجی بوٹ

بھی یک گئے۔ خالی وردی جوابھی تک کہیں سے پھٹی نہیں تھی، اس کے لیے بھی ایک گاہک مل گیا تھا۔ اس کے بعد تو اس کے پاس وہ خود، اس کی بیوی میرا اور نیچے بچے ہی رہ گئے تھے۔

فوج میں بھرتی ہونے کے بعد تھوڑے دنوں تک تو اسے بہت مزہ آیا مگر وہ سارے اچھے دن بہت تیزی سے گزر بھی گئے۔ لیکن پھر اچانک ہی اس کے بزنس اکمر کو وطن واپس جانا پڑا جس کی وجہ سے کوپی دورا کو بھی اپنے گھر لوٹنا پڑگیا۔

کوپی دورا کو اس کے لیے کچھ کم تکلیف نہیں تھا۔ حقیقت میں تو وہ لڑائی کے شروع ہوتے ہی دنوں میں فوج میں بھرتی ہوا تھا اور وہ بھی بے روزگاری اور تنگی کی وجہ سے... اور اب جب کہ وہ جنگ سے واپس آچکا تھا تو تب بھی وہی تنگی اور تکلیف اس کے سامنے کھڑی تھی۔ کتنے دن گزرے لیکن اس کے حالات وہی کے وہی تھے۔ لیکن تمام تکلیفوں کے باوجود کوپی دورا کو یقین تھا کہ یہ دن ہمیشہ نہیں رہیں گے۔

وہ ہر روز چرچ جاتا اور یسوع مسیح کی تصویر کے سامنے سر جھکاتا۔ کوپی دورا کو اس بات پر بھی یقین تھا کہ اگر انسان کی لگن سچی ہو تو پہاڑوں کو بھی ٹھکانے دی جاسکتی ہے۔ اس کی بیوی کو بھی اپنے پیار کرنے والے اور اپنی دعاؤں پر پورا بھروسا تھا۔

کوپی دورا اکثر میرے پاس آکر اپنی دکھ بھری داستان سنایا کرتا۔ وہ کسی ملازمت کی تلاش میں تھا۔ خود میں نے بھی کئی جگہ اپنے تعلقات آزمائے تھے۔ لیکن سرمایہ دار اور بڑے بڑے کاروباری لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ جہاں جیسے ایک غریب آدمی کی سفارش پر دھیان نہ دینے پر ان کی عزت اور ان کے رتبے میں کوئی کمی نہیں آجائے گی۔ وہ ہر وقت سرمایہ کریں کہتے ''کیا کیا جائے؟ مجبوری ہے، کہیں ایک جگہ بھی خالی نہیں ہے، اور کوئی جگہ خالی ہوگی تو تمہارے لیے...''

اور مجھے یہ بری خبر ہر بار کوپی دورا کو بڑے دکھ سے سنانا پڑتی تھی۔ ایک دن میں نے کوپی دورا سے پوچھا: ''تمھارے پاس بائیبل کی کوئی کتاب ہے؟''

میرا سوال سن کر اس نے اثبات میں سر ہلا کر پوچھا۔ ''کیوں؟''

''وقت مجھے کچھ دنوں کے لیے دے دو، میں اسے زیادہ دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے بھی آج کل میرے پاس لکھنے لکھانے کا کوئی خاص کام نہیں ہے۔ اس لیے سوچا کہ...''

''ضرور... ضرور۔'' وہ درمیان میں ہی بول پڑا۔ ''میرے پاس بائبل ہے، باپ دادا کے زمانے کی۔ اس زمانے میں انھوں نے اسے بیس روپے میں خریدا تھا۔''

وہ اسی وقت دوڑتا ہوا اپنے گھر گیا اور فوراً ہی بائبل لے کر آگیا۔ میں اس موٹی پرانی کتاب کے یسوسیہ صفحات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ کوپی دورا ذرا دیر تک دھیان سے میری طرف دیکھتا رہا پھر پوچھ بیٹھا۔ ''آپ کو ہماری اس مذہبی کتاب میں اتنی دل چسپی کیوں ہوئی؟''

خود اپنے ہی مذہب کی کتابوں پر پختہ ایمان نہ رکھنے والا شخص اس کی مذہبی کتاب کی ورق گردانی کیوں کر رہا ہے؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ لیکن یہ بات میں اسے کس طرح سمجھاتا کہ پہلے کے دنوں میں اور اب کے زمانے میں بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ اور یہ سمجھایا بھی کس طرح جائے؟ آخر میں ہنستے ہوئے صرف اتنا ہی کہا۔

''کسی بھی مذہب کی کتاب ہو، ہر کتاب میں انسان کی زندگی کا ذکر ہوتا ہے اور اسی کتاب کے پڑھنے سے انسان کو سکون اور خوشی کی لہری دوڑنے لگتی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں دونوں کے اتفاقات کھوجنے آتے رہے کہ تو دیکھ سکا۔''

وہ بائبل میری میز پر چھوڑ کر چلا گیا۔ پھر ایک ہفتے میں میں نے پوری بائبل پڑھ لی۔ مجھے یہ بھی خبر نہیں ہوئی کہ بائبل کے واقعات پڑھتے وقت میرے سامنے کوپی دورا کا چہرہ کیوں بار بار نمودار ہو جاتا ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ایک دن میں نے بائبل اسے واپس کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم اسے کیا ملاوت کرتے ہو؟''

''جیس صاحب۔'' وہ سر جھکا کر بولا۔

''جیس؟'' میں نے تعاجب سے پوچھا۔

وہ ذرا دیر تک تو چپ رہا پھر ذرا شرم سار سے لہجے میں دھیرے سے بولا۔ ''میں پڑھ نہیں سکتا... اس لیے...''

''اور تمھاری بیوی، بچے؟''

''نہیں، وہ بھی پڑھ نہیں سکتے۔'' کوپی دورا نے کہا۔ ''مگر وہ چرچ روزانہ جاتی ہے۔ اسے یسوع کی ذات سے یقین ہے کہ ہمارے دن ضرور بدلیں گے۔ لیکن...'' وہ بولتے بولتے رُک گیا۔

''لیکن کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''لیکن صاحب، ہماری مشکلیں تو بڑھتی ہی جاتی ہیں۔'' اس نے روہانسی آواز میں کہا اور پھر جلدی سے آگے بولا۔ ''مگر صاحب، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم بہت جلد بائبل کو سمجھ لیں گے۔ میری بیوی کو چرچ میں اسکول جانے لگی ہے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد وہ بائبل بھی پڑھنے لگے گی اور ہم اس کے پاس بیٹھ کر سنا

سنبھالا اور دل ہی دل میں کوپی دورا کے دونوں بچوں کے لیے دعا کرنے لگا۔ لیکن چار دن بعد مجھے یہ خبر ملی کہ کوپی دورا کے جڑواں بچے موت کی گود میں سو چکے ہیں۔ دونوں معصوم بچے اپنی ماں کے آنگن میں صرف سات روز ہی زندہ رہے۔ اس کے بعد دونوں کا ایک ہی دھرتی پر ساتھ ہی اس طرح رخصت ہو گئے جیسے کوئی مسافر کچھ دیر کسی اور کے مکان میں آگیا تھا اور بھول کا احساس ہوتے ہی اپنی منزل کی جانب بڑھ گیا ہو۔ لیکن ایک ماں کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟ میں بہت دیر تک یہ بات سوچتا رہا۔

میں تو اپنے آپ کو کسی حد تک دلاسے کے لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ میری کوئی ہوئی چیز جو آخر تھی جو آخر ہی میں مل گئی۔ لیکن ان معصوم بچوں کے اس رنگین دنیا سے رخصت ہوتے وقت کیا سوچا ہوگا؟ کیا انھیں دنیا سے جانے کا کوئی دکھ نہیں ہوا ہوگا؟

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرا اس صدمے کو کیسے برداشت کر سکتی کہ میری بیوی نے بڑے دکھ سے کہا۔

وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میرا کے لیے اپنے دونوں بچوں کی موت کا صدمہ برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ لیکن ان تو کچھ بھی بول نہیں سکا۔ میں کافی دیر تک کوپی دورا کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس بے چارے کے پاس تو رونے کے لیے بھی وقت نہیں تھا۔ ابھی تو اسے بچوں کے کفن دفن کا انتظام بھی کرنا تھا۔

بچوں کی آخری رسم ادا کرنے کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت تھی، وہ سب کوپی دورا قرض مانگ مانگ کر لے آیا تھا۔ اس کے پڑوسی بیل گاڑی والے نے اسے ڈیڑھ روپیہ دیا اور ایک پڑوسن آرھا نے اپنے دامن کے اندر سے ڈھیڑ آنھ نکال کر اسے دے دیا۔ میری بیوی نے بھی مجھ سے چھپا کر اسے پانچ روپے دیے تھے۔

کوپی دورا نے خود دوڑ بھاگ کے بعد جمع شدہ تیس پچیس تیس روپے اکٹھے کر لیے اور پھر اپنے دونوں بچوں کے ننھے منے جانِ جسموں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں رکھ کر قبرستان لے گیا۔ دونوں لاشوں کو ایک جگہ رکھ کر سسکیاں بھرتے ہوئے اس نے پچیس روپے پادری کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

پادری نے پہلے تو پچیس روپے کے سکوں کو گنا اور پھر بولا۔ ''یہ تو ایک بچے کے لیے ہے، دوسرے کے لیے اور پھیس؟''

''لیکن فادر...'' یہ تو جڑواں ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب...؟'' پادری سخت لہجے میں چیخ کر بولا۔ ''کیا تم دونوں کو یہاں ایک ہی قبر میں ایک ساتھ دفنانا چاہتے ہو؟''

کوپی دورا کے لیے تو دو بچوں کی موت سے زیادہ یہ بات دکھ کا باعث بن گئی تھی کہ وہ آخر کرے تو کیا کرے؟ اب کہیں

سے بھی اسے ایک روپیا بھی ملنے کی امید نہیں تھی۔ ایک بھیانک خوف نے اسے اندر سے جکڑ لیا تھا۔ وہ جہاں کھڑا تھا وہیں پتھر کی مورتی کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔

"دیکھو کوچی وردا، تم باقی کے روپے لے آؤ۔ ورنہ تمھارے بچوں کی تدفین یہاں نہیں ہو سکے گی۔" پادری نے سخت اور کھردرے لہجے میں کہا۔

وہ نیچے سے اوپر تک کانپ کر رہ گیا۔ ذرا دیر بعد اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور پھر گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ "مگر فادر، میرے پاس تو اب ایک پائی بھی نہیں ہے..."

یہ سن کر پادری کے سر کے بال کھڑے ہو گئے اور وہ آنکھیں نکال کر غصے میں بولا۔ "سن لو کوچی وردا، ان دونوں بچوں کو ایک ہی قبر میں دفنا کر میں قدرت کے قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک بڑا گناہ ہے، اور یہ گناہ میں جان بوجھ کر کیسے کر لوں؟ اب تم جاؤ اور بقیہ رقم لے کر ہی آنا۔" یہ کہہ کر پادری اپنے حجرے میں چلا گیا۔

مٹی کے ایک چھوٹے سے ڈھیر پر دونوں بچوں کے بے جان جسم ساتھ ساتھ پڑے تھے جن پر ایک میلی سی چادر پڑی ہوئی تھی۔ کوچی وردا نے ایک نظر ان پر ڈالی پھر اپنی سات سالہ بیٹی کو چومیری کو ان کے پاس بیٹھنے کا کہہ کر لڑکھڑاتے قدموں سے چل پڑا۔ بچوں کو تو دفنانا ہی تھا... لیکن کیسے؟ باقی کے روپے وہ کہاں سے لاتا؟

پھر تھوڑی دیر بعد وہ سہما سہما اور گھبرایا گھبرایا میرے پاس آیا اور دروازے پر ہی کھڑے کھڑے ہانپتا رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت دُور سے دوڑتا ہُوا یہاں تک آیا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں وہی پرانی موٹی سی بائبل تھی۔ ذرا دیر تک تو وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس سے پہلے کہ میں اسے اندر آ کر بیٹھنے کے لیے کہتا، وہ خود ہی پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔ "آپ نے کہا تھا نا کہ آپ کو ایک بائبل خریدنا ہے؟ میں آپ کو یہ بائبل صرف پچیس روپے میں دے دینا چاہتا ہوں۔" اس کا گلا بھر آیا تھا اور لفظ اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ وہ صاف طور پر بول ہی نہیں پا رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بے حد پریشان اور بہت ہی ضرورت مند ہے۔ اسی لیے میں نے اس سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اندر گیا اور پچیس روپے لا کر اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیے اور زبردستی بائبل اس کے دوسرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔ "اس بائبل کو بھی تم اپنے پاس رکھو۔"

لیکن اس نے کچھ کہے بغیر بائبل میرے ہاتھ میں تھمائی اور بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد گاؤں کے چھوٹے سے قبرستان میں لکڑی کے دو چھوٹے چھوٹے نئے "کراس" کھڑے ہو گئے۔

ایک دن وہ پھر میرے پاس آیا۔ میری بیوی ہم دونوں کے لیے چائے لے آئی اور کوچی وردا سے اس کے بیوی بچوں کی خیریت پوچھ کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

"کوچی وردا، ہمارے ملک کے حالات تو پھر خراب ہو رہے جا رہے ہیں..." میں نے چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہو کہا۔ "لگتا ہے، جنگ کے بادل پھر منڈلانے لگے ہیں۔"

"مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"اگر سچ مچ جنگ چھڑ گئی تو کیا تم پھر محاذ پر جا کر لڑو گے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے لیے تو ہر جگہ ہی محاذِ جنگ ہے..." کوچی وردا بہت اُداس لہجے میں بولا۔ "میں ایک اکیلا آدمی کس کس محاذ پر جا کر لڑوں گا؟"

"کیا مطلب؟" میں نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ میں تو برسوں سے حالتِ جنگ میں ہوں۔" وہ پھر اسی اداس لہجے میں بولا۔ "جس کے گھر میں، بھوک، افلاس، تنگ دستی، بیماری، لاچاری اور مجبوریوں نے اپنے اپنے مورچے رکھے ہوں، وہ آدمی تو سرحدی مورچے پر کھڑا بھی نہیں رہ سکتا۔ اس لیے میں نے چاہا کہ میں اب صرف اپنی اور اپنے بچوں کی بقا کے لیے ہی لڑوں گا۔ اس کے لیے چاہے مجھے اپنے ہی کے خلاف بھی کام کرنا پڑے تو کروں گا۔"

اس کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا اور پھر میں نے سنا کہ ہوتے ہی وہ گاؤں سے نکل کر کہیں شہر کی طرف چلا جاتا ہے رات گئے گھر لوٹتا ہے۔ شاید کہیں محنت مزدوری کرتا ہو۔

آج تین مہینے ہو گئے ہیں۔ بائبل کی وہ کتاب اب میری میز پر پڑی ہے۔ اس درمیان میں میں نے دو بار کوچی وردا سے کہا کہ وہ بائبل اپنے گھر لے جائے۔ لیکن وہ شرم سے سر جھکائے چلا جاتا ہے اور میں اس کی خاموشی اداس ہو جاتا ہوں۔

ایک دن میں کرسی پر بیٹھا یونہی بائبل کی ورق گردانی کر تو اچانک میری نظر ایک سطر پر اٹک گئی۔ لکھا تھا: کسی بھی لیے آپ جتنا کریں گے تو آخرت میں آپ کو اس کا ڈگنا اجر لیکن کون کس کے لیے کیا کرتا ہے؟ یہ بات ابھی تک سمجھ نہیں پایا ہوں۔

خواتین ہفت رنگ، پانچواں رنگ ❁ سندھی کہانی

مورکھی

غ غ سندھی / طاہر اصغر

ایک محبت پیشہ انسان کی داستان، وہ ایک گھوڑی کی محبت میں مبتلا تھا...
مگر اس گھوڑی کی جان ایک گھوڑے میں اٹکی تھی
محبتوں کی سرزمین، سندھ رہے، انمول محبت کی بے مثل کہانی

میرا بھتیجا جانوروں کا ڈاکٹر ہے۔ اس نے بھی مجھے ایک بتایا تھا۔ مجھے وہ واقعہ سنے ایک مدت ہو چکی ہے مگر میں آج تک نہیں بھول سکا۔ اور زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔ بھی اسے میرے بھتیجے کی زبانی ہی سنیے۔

میں ایک انسان ہوں لیکن جانوروں کا ڈاکٹر۔ میرے میں کون ہیں، بھینسیں، گائیں، بھیڑیں، بکریاں، اونٹ، اور گدھے وغیرہ۔ یہ اگر بیمار ہو جائیں تو میں انھیں دیتا ہوں، کیپ سول کھلاتا ہوں، مکسچر دیتا ہوں اور ٹیکے ہوں۔ میرے علاج سے یہ اگر تن درست ہو جائیں تو الفاظ بھی نہیں بولتے اور مر جائیں تو بھنگی انھیں اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

ایک رات کا قصہ ہے کہ میں ایک گدھے کی مرہم پٹی کر کے گھر میں آ کر لیٹا ہی تھا کہ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے زور سے پوچھا۔

"کون ہے؟"

جواب آیا۔ "سائیں! میں ہوں مہینوال۔"

"ارے کون سی سوہنی گم ہو گئی ہے اس وقت۔" میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔

مہینوال میرے گاؤں کے وڈیرے علن کا نوکر تھا۔ علن سے میری دوستی تھی۔ مہینوال نے بتایا۔ "سائیں! وڈیرے کی

گھوڑی پر کپکپی طاری ہوگئی ہے۔ پتا نہیں اس نے ایسی کیا چیز کھالی۔ وہ بری طرح کانپ رہی ہے۔ وڈیرے نے بھیجا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو بلالا۔''

وڈیرے علن کی گھوڑی اس کی گھوڑی نہیں تھی، بلکہ اس کی محبوبہ تھی، معشوقہ تھی۔ وہ اپنے بال بچوں اور اپنی پوری دولت و جائیداد سے زیادہ اپنی گھوڑی کو چاہتا تھا۔ وہ جب تک اسے اپنے ہاتھوں سے دانہ وغیرہ نہ کھلاتا، اس وقت تک خود بھی نہ کھاتا۔ گھوڑی تھی بھی بہت خوب صورت۔ پوری کی پوری سرخ۔ پیشانی پر سفید ٹیکا، پھرتیلی اور طرح دار۔ چلتی تو ہوا سے باتیں کرتی۔ خصوصاً جب وڈیرا علن اس کی پیٹھ پر سوار ہوتا تو وہ بڑے ناز و انداز سے چلتی تھی۔ کسی دوسرے کو اپنی پیٹھ پر بٹھانا تو کجا، ہاتھ بھی نہ رکھنے دیتی۔ علن نے اپنی اس محبوبہ کا نام ''مورکھی'' رکھا تھا۔

میں اپنا بیگ اٹھا کر مہینوال کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، فاصلہ کم ہوتا رہا۔ ابھی ہم نے مشکل سے آدھا فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک سامنے سے ہمیں ٹاپیں سنائی دیں۔ پھر چند لمحوں بعد اندھیرے میں ایک سایہ اُبھرا۔ کوئی گھوڑا نہایت تیزی سے بھاگا آرہا تھا۔ اس سے بچنے کے لیے ہم نے خود کو مشکل سے سنبھالا۔ گھوڑا ہم دونوں کے بیچ سے بجلی کی طرح نکل گیا۔ مہینوال نے کہا۔ ''سائیں، یہ مورکھی تھی۔''

''مورکھی؟ وڈیرے علن کی گھوڑی؟'' میں نے اندھیرے میں کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ گھوڑی کی تیز رفتاری کے باعث میں زمین پر گر پڑا تھا۔

''جی ہاں۔'' مہینوال نے وثوق سے کہا۔ ''یہ انھی کی گھوڑی تھی۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تم تو کہتے ہو کہ مورکھی تھان پر کھڑی ہے اور اس پر کپکپی طاری ہے۔ یہ تو کوئی گھوڑی نہیں، چھلاوا ہے۔ کوئی روح تھی، ہمیں متنبہ کرکے چلی گئی۔ اب واپس آکر حملہ کرے گی۔ مدد کرو یار، مہینوال!''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ تیز تیز، بھاری آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ کچھ لوگ غالباً دوڑے آرہے تھے۔ ہم نے ان کا شور سنا۔ ''پکڑو پکڑو۔ وڈیرے کی گھوڑی ہے، مورکھی... مورکھی۔'' چند آدمی دوڑتے ہوئے ہمارے پاس آپہنچے۔ ان کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ ایک شخص نے اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ ''سائیں! کیا آپ ڈاکٹر صاحب ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں... یہ گھوڑی کیا مورکھی تھی؟''

''ہاں سائیں۔ خدا کی قدرت ہے۔ مورکھی شام وقت سے لرزنے لگی تھی۔ پھر عشا کے وقت بے دم ہوکر گر گرنے کے بعد بھی اس کا جسم کانپ رہا تھا اور آنکھوں سے بہہ رہا تھا جیسے رو رہی ہو۔ ہم سمجھے، اب گئی۔ فوراً مہینوال کی طرف دوڑایا۔ گھوڑی کے علاج کے طور پر ہم کھلا پلا سکتے تھے وہ ہم نے کھلا پلا دیا۔ مگر اس کی حالت بہ ہوئی۔ وہ کسی ایسے آدمی کی طرح بے قابو ہوئی جارہی تھی جن نے پکڑ لیا ہو۔ کبھی ٹانگیں ہلاتی، کبھی لمبی لمبی سانسیں پھر وہ یک دم اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ ہمیں خبر ہی نہ ہوسکی کہ اگلی ٹانگوں کی رسّی کہاں گئی اور پچھلے کی ٹانگوں کی رسّی کا مورکھی ایک ہی چھلانگ میں دیوار پھلانگ کر باہر جا چکی کے بعد اسے نہ ہم نے دیکھا، نہ کسی اور نے۔ برسات طوفان کی طرح اُڑ گئی۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑے تھوڑی ہی دیر میں ٹاپیں سنائی دینا بند ہوگئیں۔ شاید دُور نکل چکی ہے۔'' وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔

''اب کیا ہوگا؟'' کسی نے پوچھا۔

''اب کیا ہوسکتا ہے...'' میں نے کہا۔ ''چلو گاؤں اب کل اسے تلاش کریں گے۔ لوگوں سے پوچھیں نے مورکھی دیکھی ہو تو بتائے۔ یہیں کہیں ہوگی۔ مل جا

ہم لوگ مورکھی کی باتیں کرتے ہوئے گاؤں کی چلے۔ وڈیرا علن مورکھی کی تلاش میں گاؤں سے تھا۔ میری اس سے راستے میں بھیڑ ہوگئی۔ دوسرے لوگوں کو اپنے گھر بھیج کر اور مورکھی کے متعلق کرنے لگا۔ آدھی رات تک مجھ پر جانوروں کا ڈاکٹر وجہ سے مختلف سوالات کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔ مورکھی تھا؟ کیوں ہوا تھا؟ کیوں گئی؟ جواباً میں بھی انسانوں اور اپنی تمام معلومات کا نچوڑ ان کے کانوں میں گھول رہا تھا۔ رہ گئے۔ میں نے انسانی زندگی کی ابتدا اور اس کے ذکر کرتے ہوئے کہا کہ گھوڑے اور بندر کی عادتیں انسان سے ملتی جلتی ہیں۔ ہوسکتا ہے، مورکھی نے کوئی نشہ آور ہو تو اس کے اثر سے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی ہو۔''

میری باتیں سُن کر سب لوگ گونگے بہرے ہو مجھے نیند آرہی تھی۔ میں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا سوا دوسرے لوگ بھی شاید اسی فکر میں تھے۔ اچانک سے مورکھی کی ہنہناہٹ سنی۔ نیند کی جگہ بیداری

کو پھر ہوش آگیا۔ ہر شخص دوڑا کہ مورکھی آگئی۔ چاند نکل چکا تھا۔ چاروں طرف روشنی پھیل گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ مورکھی سر اٹھائے سامنے کھڑی ہے۔ اس کا انداز ایک مست دوشیزہ جیسا تھا۔ آنکھیں نشیلی ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنے کھڑے ہوئے آدمیوں پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ پھر ناز سے اپنے مالک علن پر آنکھیں جمائے کھڑی رہی۔ چاندنی میں دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے روشنی سی رہی تھی۔ چاہت اور پیار کی روشنی! علن اپنے آپ کو سکا۔ وہ آگے بڑھ کر مورکھی کے پاس گیا اور اس کی بانہیں ڈالنے لگا۔ ''کہاں گئی تھی تھی؟ تجھے کیا ہوا تھا؟'' یہ کہتے ہوئے وہ پاگلوں کی اس کی گردن اور چہرہ چومنے لگا۔ مورکھی بھی اس کی محبت ہوئی جارہی تھی۔ وہ اپنے ہونٹوں سے علن کے کندھے چومنے لگی اور میٹھی میٹھی ہلکی ہلکی سے ہنہنانے لگی۔ چاہنے والوں کے یہ راز و نیاز دم بہ خود دیکھ رہے جانے کتنی دیر بعد علن کی آواز نے ہماری محویت وکروں سے کہہ رہا تھا۔ ''جاؤ میری مورکھی کے لیے کر لاؤ۔''

گلے میں چمڑے کا پٹا بندھا ہوا تھا۔ علن پٹا تھان پر لے آیا اور پھر اس سے باتیں کرنے لگا۔ کی جانی۔ مجھے تو مار ہی گئی تھی۔ یہ دیکھ کہ میں نے ڈاکٹروں کو بھی بلایا تھا۔ یہ میرا دوست ڈاکٹر رسول تو جانتی ہے نا اسے، ارے یہ وہی ہے جس کے پاس جاتے ہیں...'' مورکھی نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا ہلانے لگی۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتی تھی۔ علن نے لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''بتا، تیرے کہاں درد ہے؟'' کے ایک ایک عضو پر ہاتھ رکھنے لگا۔ ''یہاں ہے درد؟ یا'' مورکھی سر ہلا کر انکار کرتی رہی۔

کہہ گیا تھا کہ اس وقت اسے کوئی درد نہیں ہے۔ وہ گاؤں الہ مینہ کی طرح مُنہ زور جوانی کے نشے میں چور معلوم اس کی گردن کے لمبے بال دونوں سمت سے پیشانی پر ۔ اس کا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ میٹھے میٹھے خواب ناک لہجے میں ہنہنا رہی ہم ڈول رہا تھا اور ٹانگیں ڈگمگا رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ ''علن! تیری یہ مورکھی سچ کہتی ہے۔ اسے اب ہے، کوئی بیماری نہیں ہے۔''

کچھ دیر بعد دوسرے لوگ چلے گئے۔ علن اور اس کا ایک نوکر مورکھی کے پاس بیٹھ کر اسے حلوے کے لڈو بنا بنا کر کھلاتے رہے۔ نوکر لڈو لاتا گیا اور علن ہاتھوں سے مورکھی کے مُنہ میں ڈالتا رہا۔ میں حیرت و مسرت سے یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔ مگر جلد ہی مجھے نیند نے سخت پریشان کردیا۔ میں وہیں علن کے ہاں سو گیا۔ علن نہ جانے کس وقت سویا ہوگا۔

سورج طلوع ہُوا تو علن مجھے اٹھا کر پھر مورکھی کے پاس لے آیا تاکہ اس کا معائنہ کرسکوں۔ لیکن اسے کوئی مرض ہوتا تو میں دیکھتا۔ وہ تو بڑی مست تھی۔ اس نے مجھے دواؤں کا بیگ لے کر اپنی طرف آتے دیکھا تو اپنی اگلی ٹانگوں سے زمین روندتی ہوئی شریر آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں ابھی اس کی آنکھوں میں شرارت پوری طرح پڑھ بھی نہ سکا تھا کہ اس نے ایکا ایکی اپنے مُنہ سے میرا بیگ چھینا اور گردن پھرا کر زور سے اسے دُور پھینک دیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ وہ دانت نکال کر ہنہنانے لگی۔ مجھے ہنسی آگئی۔ علن اور اس کے ساتھ کے آدمی بھی ہنسنے لگے۔ ''بس کرو یار! گھوڑی تو مجھ سے ٹھٹول کر رہی ہے، تم لوگ بھی انسان ہو کے میرا مذاق اُڑا رہے ہو۔'' میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔ مورکھی شوخی سے میری طرف دیکھتی رہی۔

میں نے ناشتا کیا اور علن کی بیل گاڑی میں بیٹھ کر گھر آگیا۔ میں آتے وقت علن کو مورکھی کے لیے کچھ گولیاں دے آیا تھا کہ اگر تکلیف پھر ہو جائے تو یہ گولیاں کھلا دینا۔

چوتھا دن ہوگا۔ میں اسپتال میں تھا۔ علن میرے پاس پہنچا۔ اس نے بتایا۔ ''یار ڈاکٹر! میں مورکھی کو ہمیشہ کی طرح تمھارے گھر کے پاس نیم کے درخت سے باندھ کر آیا ہوں۔ اس کی خدمت کے لیے نوکر وہاں چھوڑ دیا ہے۔''

بارہ بجے تھے، میں ایک کتیا کی مرہم پٹی کررہا تھا۔ یہ کتیا شکار میں زخمی ہوگئی تھی۔ کتیا کی مرہم پٹی سے فارغ ہوکر میں نے علن اور اس کی گھوڑی کا حال چال پوچھا۔ علن پہلے ہنسا پھر کہنے لگا۔ ''وہ ہر رات کہیں جاتی ہے۔ نہ جانے کہاں! تقریباً بارہ بجے دیوار پھلانگ کر نکلتی ہے۔ پھر چار بجے تک لوٹتی ہے۔ میں نے دوسری رات اسے مضبوطی سے باندھ دیا تھا اور سمجھایا بجھایا تھا۔ لیکن مورکھی نہ مانی، رسّی تڑا کر دیوار کود کر چلی گئی۔''

''جاتی کہاں ہے؟''

''یہ تو پتا نہیں لیکن جب آتی ہے تو پسینے میں شرابور ہوتی ہے جیسے کسی لمبے سفر سے لوٹی ہو۔''

میں نے دریافت کیا۔ ''پہلے دن والی کپکپی اسے پھر ہوئی؟''

"نہیں، کپکپی اب نہیں ہوتی۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی جوانی اُمڈ پڑ رہی ہے۔ وہ گردن اٹھا کر شوخی سے دیکھتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا قتل کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔" مجھے ہنسی آ گئی۔ علن مورکھی کی محبت میں کس قدر گرفتار تھا۔ کہنے لگا۔ "رات کے وقت اس کا کہیں جانا میرے لیے سخت اُلجھن کی بات ہے۔ کل کلاں وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا نہ ہو جائے۔ میرا خیال ہے، پتا لگانا چاہیے کہ وہ جاتی کہاں ہے؟"

اس رات علن نے وڈیرے گل محمد سے اس کی جیپ مانگی۔ بارہ بجے سے کچھ پہلے اس نے مجھے، اپنے ڈرائیور اور نوکر کو جیپ میں بٹھا دیا اور جیپ کچی سڑک کے اختتام پر پہنچ کر روک دی۔ آدھے گھنٹے بعد ٹاپوں کا طبلہ بجنے لگا۔ چند ثانیوں میں مورکھی کچی سڑک پر نمودار ہوئی۔ اور ہمارے سامنے سے بجلی کی طرح پکی سڑک پر پہنچ کر آگے دوڑتی چلی گئی۔ علن نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی۔ اتنی دیر میں مورکھی کوئی آدھے میل دُور نکل گئی تھی۔ ابھی چاند طلوع نہیں ہُوا تھا۔ جیپ کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ مورکھی پکی سڑک کے کنارے کنارے مٹی کا طوفان بن کر اُڑ رہی ہے۔ جیپ بھی چالیس اور ساٹھ میل کی رفتار سے پکی سڑک پر دوڑنے لگی۔ لیکن ہمارے اور مورکھی کے درمیان آدھے میل کا فاصلہ کم نہ ہُوا۔ ایک میل، دو میل، آٹھ میل تک مورکھی پکی سڑک کے ساتھ یکساں رفتار سے سرپٹ دوڑتی رہی۔ اس کے بعد ایک نہر آئی۔ وہ نہر پر مُڑ کر اس کے کنارے کنارے آگے بڑھتی رہی۔ جیپ کو بھی یہی راستہ اختیار کرنا پڑا۔ علن نے بلند آواز سے کہا۔ "اوہ، وڈیرے پچو کے سُرخے کی طرف۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے نوکر سے بندوق لی اور اس میں کارتوس بھرنے لگا۔

"کیا کرتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ میں اس کے ادھورے جملے کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق مورکھی پچو نامی ایک وڈیرے کے علاقے کی طرف جا رہی تھی۔ پچو کے پاس ایک گھوڑا تھا، اس کا نام سُرخا تھا۔ گویا مورکھی سُرخے کے عشق میں گرفتار تھی۔

"اگر مورکھی واقعی اس کی طرف جاتی ہے تو میں دونوں کو مار دوں گا۔ سُرخے اور مورکھی کو... اور اگر پچو بیچ میں آیا تو اسے بھی۔" علن نے گویا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ وہ شدید غصے میں تھا۔

"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے تمھارا؟ کہیں بے زبان جانور کو بے قصور مارا جاتا ہے...؟" میں نے تیز ہو کر کہا۔ "اور پرطرہ یہ کہ اس معمولی بات پر انسانی خون بھی بہایا جائے گا۔"

"یہ معمولی بات ہے ڈاکٹر! یہ میری غیرت کا سوال ہے۔ کیا مورکھی کو معلوم نہیں کہ پچو میرا دشمن ہے۔ ابھی پانچ دن میرا اور اس کا جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ اس وقت مورکھی وہاں موجود تھی۔ اس نے دیکھا نہیں تھا کیا؟ اندھی ہو گئی تھی ذرا بے حیائی تو دیکھو، میرے دشمن کے گھوڑے سے عشق لڑا چلی ہے۔ اگر جوانی نے اتنا ہی زور کیا تو دنیا میں دوسرے گھوڑے بھی تو تھے۔"

"صرف جوانی کی بات نہیں ہوتی..." میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "دل بھی تو کوئی چیز ہے اور پھر مورکھی بے چاری جانور ہے، انسان تو نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے خون خرابا کیا جائے۔"

"نہیں ڈاکٹر! ہم زمین اور عورت کی خاطر سر کٹا دیتے ہیں، مورکھی جانور نہیں، میری دل دار ہے۔ میری جان ہے۔" معاملے کی نزاکت کو بھانپ کر میں خاموش ہو گیا۔

کوئی دو میل تک ہم نہر کے ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایک گھاٹ سے نہر کے اس پار جانے لگی۔ نہر میں سے پانی کی آواز آنے لگی۔ وڈیرے پچو کا گاؤں نہر فرلانگ دُور تھا۔ مورکھی نے اسی طرف رخ کیا۔ ہم نے گھاٹ کے پاس گاڑی کھڑی کی۔ علن بندوق سمیت اُترا۔ میں بھی اس کی تقلید میں علن نہر میں کود گیا۔ میں اسے اکیلا نہیں جانے دینا چاہتا تھا اس لیے میں نے بھی چھلانگ لگائی اور اس کے ساتھ جیسے تیسے نہر پار کر لی۔

مورکھی پچو کے مکان کے پاس کھڑی تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ پورا گاؤں نیند کی آغوش میں تھا۔ محبت کی ماری مورکھی ایک طویل راستہ طے کر کے یہاں پہنچی تھی۔ چاند ابھی ڈوبا نہیں تھا لیکن رات اندھیری بھی نہیں تھی۔ آسمان میں ستارے جگمگا رہے تھے۔ کھیتوں سے مینڈکوں کی ٹرٹر اور دوسری ہلکی ہلکی سی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم آگے بڑھ کر درختوں کے جھنڈ میں کھڑے ہو گئے۔ پچو کے اصطبل کی دیوار تقریباً ڈیڑھ فٹ تھی۔ مورکھی اگر چاہتی تو یہ دیوار آسانی سے پھلانگ سکتی تھی۔ اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ گردن اٹھا کر اپنا مُنہ دیوار کے اوپر کر لیا۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ دوسری جانب سے ایک گھوڑا سر اُبھرا۔ اب دونوں کی آدھی آدھی گردنیں دیوار کے اوپر تھیں۔ ان کے مُنہ آپس میں مس ہوتے رہے۔ وہ دھیرے دھیرے ایک دوسرے کو پیار سے کاٹتے اور ایک دوسرے کے

اِدھر اُدھر سے

ایک باغ میں کچھ لوگ پکنک منانے آئے ہوئے تھے۔ دفعتاً ایک بیل بھاگا بھاگا آیا جس کے تعاقب میں ایک بوڑھا لگا ہوا تھا۔ باغیچے کو دیکھ کر تھکا ہوا بوڑھا ایک طرف بیٹھ کر پسینا پونچھنے لگا اور بیل نے اگلے قطعے میں گھاس چرنا شروع کر دی۔ لوگوں نے بوڑھے سے علیک سلیک کی کوشش کی لیکن اس نے منہ پھیر لیا۔ پھر کھانے کی دعوت دی۔ اس پر بھی خاموش رہا۔ آخر انہوں نے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ اس نے بسورتے ہوئے جواب دیا کہ اس کی کہانی اس قدر غم ناک ہے کہ خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ سب نے اصرار کیا تو بوڑھے نے بتایا کہ ایک بادشاہ کے تین بیٹے تھے۔ تینوں وزیر کی حسین و جمیل لڑکی پر عاشق تھے لیکن لڑکی اتنی رحم دل تھی کہ کسی ایک سے شادی کر کے بقیہ دو شہزادوں کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ تینوں لگاتار شادی کے طلب گار رہے اور لڑکی خاموش رہی۔ اتفاق سے تینوں شہزادے وجاہت، تعلیمی قابلیت، توانائی، شہ سواری، تیر اندازی اور فنون سپہ گری میں ایک دوسرے کے ہمسر تھے۔ جب انہوں نے کام کاج چھوڑ کر آہ و بکا میں وقت ضائع کرنا شروع کر دیا تو بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ اب شادی کا فیصلہ فوراً ہونا چاہیے۔ لیکن لڑکی بہ دستور خاموش رہی۔ ادھر شہزادوں کی حالت خستہ ہوتی گئی۔ آخر بادشاہ کو طیش آیا اور اس نے وزیر کو خبردار کیا کہ اگر کل شام تک فیصلہ نہیں ہوا تو ایک نیا وزیر اس سے چارج لے لے گا۔ وزیر شہزادوں کو شہر سے باہر لے گیا۔ ان کا تحریری اور زبانی امتحان لیا۔ تینوں برابر نکلے۔ پھر نیزہ بازی کرائی، چھلانگیں لگوائیں، دریا میں تیرایا، سارے جتن کیے لیکن اگلے سہ پہر تک تینوں کے نمبر یکساں تھے۔ کچھ ٹیسٹ سے گئے مگر معاملہ وہیں کا وہیں رہا۔ جب سورج ڈوبنے لگا تو وزیر بہت گھبرایا۔ پریشانی میں اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک بچھڑا دکھائی دیا جو گھاس چر رہا تھا۔ وزیر نے بوکھلا کر نعرہ لگایا۔ "جو اس بچھڑے کو پکڑے گا، وہ جیت جائے گا" تینوں شہزادے سرپٹ بھاگے۔ ادھر بچھڑے نے ڈکر زقند بھری اور تعاقب شروع ہو گیا۔ آگے گیلا کھیت تھا جس میں ایک کا پاؤں پھسلا اور پیچھے رہ گیا۔ پھر جنگل آیا۔ اس میں بچھڑے نے دونوں شہزادوں کو خوب چکر دیے۔ اونچی اونچی جھاڑیوں میں ایک شہزادہ کسی اور رخ میں نکل گیا۔ اب ایک شہزادہ رہ گیا جو پوری مستعدی سے تعاقب کر رہا تھا۔ ادھر بچھڑا تھا کہ قریب آنے نہ دیتا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن، مدتیں گزر چکی ہیں۔ وہ بچھڑا پورا بیل بن چکا ہے اور آپ کے سامنے گھاس چر رہا ہے۔ میری بھی عمر بڑھتی جا رہی ہے لیکن تعاقب جاری ہے۔

سب نے دیکھا کہ بیل گھاس چرنے کے بعد تازہ دم ہو کر بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا۔

"اچھا تو خدا حافظ!" بوڑھے نے نعرہ لگایا اور بیل کے پیچھے ہو لیا۔

تعاون ○ شفیق الرحمٰن، دجلہ

آخر ان دونوں نے جدا ہونے سے پہلے ایک دوسرے کو طویل بوسہ دیا۔ میں اسے بوسہ ہی کہوں گا۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی موزوں لفظ نہیں ہے۔ اب مورکھی کا رُخ ہماری طرف تھا۔ وہ واپسی کے لیے تیار تھی۔ اس نے سُرخے کو پیار بھری الوداعی نظر ڈالی اور جس راستے سے آئی تھی اسی پر چلنے لگی۔ اس کی رفتار میں اس بار تیزی نہیں تھی۔ شاید جدائی کا سفر اسے گراں گزر رہا تھا مگر مجبور تھی۔ ہم درختوں کے جھنڈ سے نکل آئے۔ درختوں کا سایہ ہم پر اب بھی پڑ رہا تھا۔ مورکھی ہمارے سامنے سے گزری تو علن نے زور سے کہا۔ "مورکھی!"

مورکھی کا جیسے دم نکل گیا۔ وہ چونک کر رُک گئی اور گردن موڑ کر ہمیں حیرت سے دیکھنے لگی۔ ہمارے اس کے درمیان بیس فٹ کا فاصلہ ہو گا۔ علن کا غصہ پتا نہیں کیوں پھر عود کر آیا۔ اس نے بندوق سیدھی کر لی۔ نال ٹھیک مورکھی کی پیشانی کی

طرف تھی۔ علن مورکھی سے اس طرح مخاطب ہُوا جیسے کسی انسان سے بات کر رہا ہو۔ ''مورکھی، تجھے شرم نہیں آئی۔ سُرکھا میرے جانی دشمن کی سواری کا گھوڑا ہے۔''

مورکھی بھی حیوان کہاں تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر علن کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر مُڑ کر اس کی طرف بالکل سیدھی ہوگئی۔ اب اس کی گردن ایک گناہ گار کی گردن کی طرح نیچی تھی جیسے وہ ندامت سے زمین میں گڑ جائے گی۔ اس نے اپنا مُنہ علن کے پیروں کے قریب زمین پر رکھ دیا۔ گویا زبان حال سے کہہ رہی ہو۔ ''سائیں! مجھے معاف کردو۔ اگر معاف نہیں کرتے تو مجھے مار دو۔ میرا سر حاضر ہے۔''

آہ، وہ لمحے۔ وقت جیسے ٹھیر گیا تھا۔ جلد ہی علن کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس سے گولی نہ چل سکی۔ بندوق ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے ایک چیخ مار کر اپنی بانہیں مورکھی کی گردن میں ڈال دیں اور بچوں کی طرح رونے لگا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور جھک کر زمین سے بندوق اٹھالی۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر دونوں کے گال تھپکے اور علن سے کہا۔ ''اب چلنا چاہیے۔ ہمارے یہاں کھڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔''

ہم تینوں آہستہ آہستہ نہر کے کنارے تک آئے۔ مورکھی نے علن کو اور مجھے اپنی پیٹھ پر بٹھا کر نہر پار کرائی۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر علن مورکھی پر سوار رہا اور میں جیپ میں جا بیٹھا۔ قافلہ روانہ ہُوا۔ مورکھی اور علن آگے آگے، جیپ پیچھے پیچھے۔ تقریباً ایک گھنٹے میں ہم گاؤں پہنچے۔

پانچ دن بعد علن میرے پاس آیا۔ مورکھی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ علن بہت پریشان نظر آرہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''سائیں، خیر تو ہے؟ مورکھی نہیں آئی؟ مورکھی نہیں ہے تمہارے ساتھ؟''

''میں نے اسے کوٹھری میں بند کردیا ہے۔ وہ پانچ راتوں سے سُرکھے کے پاس نہیں گئی ہے۔ جاتی کیسے؟ میں نے اس کا پورا جسم زنجیروں سے جکڑ دیا ہے۔ ایک کونے میں پڑی ہے۔ سوکھ کر لکڑی ہوگئی ہے... نہ کھاتی ہے، نہ پیتی ہے۔ تم چل کر ذرا اسے دیکھ تو لو۔''

''بڑے ظالم ہو علن۔''

''ڈاکٹر، تم ہی بتاؤ۔ سچ اور اس کے گاؤں والے مورکھی کو سُرکھے کے ساتھ اس حالت میں دیکھیں گے تو میرا کیا مذاق اُڑے گا۔ پگڑی اتر جائے گی میری۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں، بے عزتی کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتا۔''

''مگر تم یہ برداشت کرسکتے ہو کہ تمہاری مورکھی ایک کو... میں بندھی پڑی رہے۔ اس کا انگ انگ زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے۔ نہ کچھ کھاتی ہے، نہ پیتی ہے۔''

''آہ!'' علن نے دکھ سے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔ ''میں یہ بھی برداشت نہیں کرسکتا...'' چند لمحے خاموش رہ کر اس نے کہا۔ ''اسی لیے تو تمہارے پاس آیا ہوں۔'' اس نے پانچ ہزار روپوں کی ایک گڈی میرے سامنے رکھ دی۔

''یہ کس لیے؟'' میں نے پوچھا۔

''سُرکھے کی قیمت! سچو اگر اس سے زیادہ مانگے تو وہ بھی دوں گا۔'' اس نے کہا۔

علن نہایت پریشان تھا۔ اس کی مسکین صورت دیکھ کر اس پر ترس آنے لگا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''علن گھبراؤ نہیں، یہ پیسے اپنے پاس رکھو۔ سُرکھا آج شام تک تمہارے دروازے پر بندھا ہوگا اور اس کا سر مورکھی کے قدموں میں ہوگا۔ اس کی جو بھی قیمت لگے گی، میں اپنے پاس سے دوں گا۔ تم مجھے بعد میں دے دینا۔''

''لیکن سچو کو پتا نہ چلے کہ سُرکھے کو میں خرید رہا ہوں۔ وہ کبھی گھوڑا نہیں بیچے گا۔ اور مورکھی اس کی جدائی کے... مرجائے گی اور میں... میں بھی۔''

''تم فکر نہ کرو۔ یہ سودا میں اپنے نام سے کروں گا۔ ایک شرط ہے۔'' میں نے مزاحاً کہا۔ ''تمہیں مجھ سے وعدہ کرنا پڑے گا۔''

''کیا؟'' علن نے بے صبری سے سوال کیا۔

''تمہیں سُرکھے اور مورکھی کی باقاعدہ شادی کرنی ہوگی۔ شادی کے بغیر انھیں محبت کی اجازت نہیں ہوگی۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو...'' علن میرا مذاق سچ سمجھا۔ ''میں ان کی شادی ضرور کروں گا اور ایسی دھوم دھام سے کروں گا کہ دیکھے گی۔'' وہ خوش خوش مجھ سے رخصت ہُوا۔

میں ایک جیپ منگوا کر وڈیرے سچو کے گاؤں پہنچا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ اس سے بھی میری اچھی جان پہچان تھی۔ میں دو چار مرتبہ اس کے جانوروں کا علاج کرچکا تھا۔ اس سُرکھے کے لیے میں نے اسے دوا دی تھی۔ سُرکھا اس میں مبتلا تھا۔ میں نے سچو سے کہا کہ مجھے سواری کے لیے گھوڑے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سُرکھا... گا۔ مجھے دیہات کے دور دراز مقامات پر جانا پڑتا ہے... کہیں موٹر جیپ کا راستہ نہیں ملتا، سخت تکلیف ہوتی ہے...

گھوڑا دینے پر رضامند ہوگیا۔ اس نے زور دیا کہ گھوڑا ایسے ہی لے جاؤ، پیسے دینے کی ضرورت نہیں۔ مگر میں نے پیسے دینے پر اصرار کیا۔ آخر پندرہ سو روپے کے عوض اس نے سُرکھا میرے نام لکھ دیا۔ میں واپسی کے لیے جیپ کے بجائے گھوڑے پر سوار ہُوا۔ گھوڑے نے پہلے تو ٹال مٹول کی لیکن رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ اس نے مجھے برداشت کرلیا اور چلنے لگا۔

گھوڑا بہت اچھا تھا۔ مجھے علن تک پہنچنے میں توقع سے کم وقت لگا۔ شام ہورہی تھی، علن میرے انتظار میں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں گھوڑے سے اُترتا، سُرکھا مسرت سے ہنہنایا۔ جانوروں میں بھی کوئی خاص حس ہوتی ہے۔ سُرکھے کی ہنہناہٹ سُن کر مورکھی نے فوراً جواب دیا۔ بس پھر میری کیا مجال تھی کہ میں سُرکھے کو قابو میں رکھتا۔ میں نے اپنا پورا زور لگا دیا مگر وہ میرے ہاتھ سے لگام چھڑا کر ایک ہی جست میں مورکھی کی کوٹھری میں پہنچ گیا۔ مورکھی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ایک کونے میں بے حال پڑی تھی۔ سُرکھے نے ایک دم اپنے منہ سے اس کی زنجیریں کاٹنی شروع کردیں۔ اس کے حلق سے عجیب وغریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ علن اور اس کے آدمی دوڑ کر وہاں پہنچے۔ انھوں نے فوراً سُرکھے پر قابو پایا اور مورکھی کی زنجیریں کاٹیں۔ سُرکھے کی جان میں جان آئی۔ اسے بازو کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ مورکھی کے جسم میں جیسے کسی نے نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ شرمیلی نظروں سے سُرکھے کو دیکھ رہی تھی۔ سُرکھا بھی خوشی سے چہک رہا تھا۔ علن نے دونوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''انسان بنو، جانور پن مت کرو! کل تمہاری شادی کی رسم ادا کی جائے گی۔ پھر تم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک ہوجاؤ گے۔ تمہیں کوئی روک نہیں سکے گا۔ ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرو۔ یہی ہیں جس نے تم دونوں کو ملایا ہے۔ کل شادی ہوگی، نہایت دھوم دھام سے۔ پورا گاؤں شریک ہوگا۔ دوسرے علاقوں کے مہمان بھی بلائے جائیں گے۔''

شادی واقعی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ مورکھی اور سُرکھے کو خوش بودار صابن سے نہلایا گیا۔ میں دلھا کا باپ بنا، علن دلھن کا۔ ہم دونوں خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے۔ علن نے مورکھی کا اور میں نے سُرکھے کا سنگھار کیا۔ شہر سے پھول منگوائے گئے۔ لوگ اس قدر جمع ہوگئے کہ میلے کا سماں تھا۔ بھی مورکھی اور سُرکھے کی بلائیں لے رہے تھے، ان سے پیار کررہے تھے۔ کچھ لوگ دلھا دلھن کی گردنوں میں گجرے ڈالنے لگے۔ کچھ ان کے پیروں میں ریشم کے دھاگے سے بنائے ہوئے پھول باندھنے لگے۔ سُرکھے اور مورکھی کو اس طرح سجایا گیا کہ ان کے اصل جسم چھپ گئے۔ یہ ہار سنگھار ان پر بہت جچ رہا تھا۔ وہ بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔

شادی کے دوسرے انتظامات بھی نہایت اچھے تھے۔ چاولوں کی دیگیں پکائی گئی تھیں۔ گردونواح کے مہمانوں، مقامی لوگوں اور فقرا کا بہت بڑا اجتماع تھا۔ انھیں فیاضی سے کھانا کھلایا گیا۔ ڈھول باجے اور شہنائی بھی کچھ تھا۔ اس اہتمام کے ساتھ دلھا دُلھن کو گاؤں بھر میں گھمایا گیا۔ سب سے آگے شہنائی اور ڈھول باجے والے تھے۔ ان کے پیچھے علن مورکھی کے ساتھ اور میں سُرکھے کے ساتھ تھا۔ ہمارے پیچھے براتی تھے۔ ہمارے ڈھول والوں کے درمیان کچھ زندہ دل ایک مخصوص سندھی رقص کررہے تھے۔ براتیوں میں مردوں، عورتوں اور بچوں کا ہنستا گاتا دھوم مچاتا ہجوم تھا۔ عورتیں شادی بیاہ کے گیت گارہی تھیں۔ وہ تمام لوازم مہیا تھے جو کسی بڑی اور اچھی شادی میں ہوتے ہیں۔ سندھ میں شادی کے وقت دلھا آگے ہوتا ہے، دُلھن پیچھے۔ دلھا کے کندھے پر جوشال ہوتی ہے اس کا ایک کونا دُلھن کے دُپٹے سے باندھا جاتا ہے، لہٰذا سُرکھے کی پوشاک کا ایک سرا مورکھی کی پوشاک سے بندھا ہُوا تھا، دونوں کے چہروں سے خوشی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ کبھی کبھی دونوں محبت سے ایک دوسرے کو کاٹنے لگتے۔ ہم جھوٹی شرم کے قیدی ان معصوم جانوروں کے سچے پیار کی معیت میں ہنستے بولتے چلے جارہے تھے۔

آخر سہ پہر کو یہ جشن ختم ہُوا۔ دلھا دُلھن جلۂ عرسی میں لے جائے گئے۔ ہم نے انھیں کپڑوں کے بوجھ سے آزاد کردیا۔ صرف سہرے اور گجرے وغیرہ رہنے دیے۔ علن نے مورکھی کی گردن میں بانہیں ڈال کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ سامنے درختوں کا ایک جُھنڈ تھا۔ مورکھی ناز وانداز سے کودتی پھاندتی جُھنڈ کی اوٹ میں چلی گئی۔ سُرکھا بھی اس کے پیچھے تھا۔ دونوں لوگوں کی نظروں سے غائب ہوگئے۔

یہ علاقے کی ایک عجیب وغریب شادی تھی۔ شادی کے بعد دلھا دُلھن ایک ہی تھان پر رہتے۔ ایک ساتھ کھاتے پیتے اور ایک ساتھ سوتے جاگتے۔ ان کی ازدواجی زندگی ہنسی خوشی گزرنے لگی۔

مگر جاہے انسان ہو یا جانور، غموں سے کسی کو چھٹکارا نہیں۔ مورکھی اور سُرکھے کی شادی کو مشکل سے ایک مہینا گزرا تھا۔ اس دوران علن سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ کبھی مورکھی کے ساتھ آتا، کبھی سُرکھے کے ساتھ۔ سُرکھا

اور مورکھی بہت خوش تھے۔ انھیں خوش دیکھ کر علن بھی بہت خوش تھا۔ ایک رات تقریباً دو بجے ہوں گے، میں اپنے گھر میں سو رہا تھا۔ اچانک دروازہ بہت زور سے بجا جیسے دروازے پر بار بار کوئی وزنی چیز ماری جا رہی ہو۔ میری بیوی نے مجھے اٹھایا۔ میں نے باہر سے ایک ہنہناہٹ کی آواز سنی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ مورکھی کی ہنہناہٹ ہے۔ میں نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ دروازے کے پاس واقعی مورکھی کھڑی تھی۔ وہ اپنی اگلی ٹانگیں زور زور سے زمین پر پٹخنے لگی۔ اس کا سارا جسم پسینے پسینے تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پوری قوت سے ہنہنائی اور گردن موڑ کر اپنی پیٹھ کی طرف اشارہ کرنے لگی۔ میں کچھ دیر اسے یونہی حیرانی سے دیکھتا رہا۔ لیکن بعد میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کہہ رہی ہے ڈاکٹر صاحب! میری پیٹھ پر سوار ہو جائیں۔ جلدی کیجیے۔ آدھی رات کو اس کا آنا بے وجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یقیناً کوئی پریشان کن بات تھی۔ وہ مسلسل ہنہنا رہی تھی جیسے کسی سخت تکلیف میں مبتلا ہو۔ دفعتاً اس نے میری قمیص پکڑ لی اور مجھے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”ٹھیرو، میں دواؤں کا بکس لے آؤں۔“ اس نے قمیص چھوڑ دی۔ میں نے اندر سے دواؤں کا بکس لا کر اس کی گردن میں لٹکا دیا اور اس کی پیٹھ پر سوار ہونا تھا کہ وہ بجلی بن گئی۔ میں خود کو سنبھال نہ سکا، مجھے جھک کر اپنی دونوں بانہیں اس کی گردن میں ڈالنی پڑیں۔ فاصلہ کب طے ہُوا، مجھے خبر نہ ہوئی۔ صرف چند منٹ بعد وہ اپنے تھان کے سامنے کھڑی تھی۔ بڑا دروازہ کھلا تھا، وہ مجھے لے کر اندر گئی۔ میں کود کر اُترا، وہاں علن اور دوسرے دو تین آدمی کھڑے تھے۔ ان کے سامنے سُرکھا زمین پر لیٹا لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیا ہُوا؟ کیا ہُوا؟“

”سانپ نے اس کی پچھلی ٹانگ میں ڈس لیا ہے۔ جلدی کرو۔“ علن نے وحشت سے کہا۔ اس کے ہاتھ میں موم بتی تھی۔ میں نے سُرکھے کی پچھلی ٹانگ دیکھی۔ موم بتی کی روشنی میں مَیں نے دیکھا کہ زخم پر نمک کے ساتھ پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ پھر بھی خون بہہ رہا ہے۔ میں نے پٹیاں ہٹا کر ایک ٹیکا لگایا اور ٹانگ کو دو بڑے بڑے جھٹکے دیے، خون بہت کم نکلا۔ میں سمجھ گیا کہ سُرکھا اب اپنے جسم سے سانس چھوڑ رہا ہے۔ میں نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ پھر دو ٹیکے اور لگائے۔ اس کے باوجود سُرکھا سست پڑتا گیا۔ آخر اس کے جسم نے ایک زور کا جھٹکا لیا اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ مورکھی اس کے مُنہ سے مُنہ ملائے کھڑی تھی۔ ان کے مُنہ آپس میں لگ گئے۔ پھر چند ثانیے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ سُرکھے کی گردن ڈھلک گئی اور وہ مر گیا۔ مورکھی بیوہ ہو گئی!

بیوہ نے ہنہنا کر ایک جگر خراش چیخ ماری اور سُرکھے کے اوپر گر گئی۔ وڈیرا علن عورتوں کی طرح رونے لگا اور مورکھی سے لپٹ گیا۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ سب کیسے ہُوا۔ اس نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا، وہاں ایک مرا ہُوا سانپ پڑا تھا۔ وہ پھن سے دُم تک زخمی تھا۔ معلوم ہُوا کہ تقریباً ایک بجے لوگوں نے سُرکھے اور مورکھی کی دہشت بھری ہنہناہٹیں سنیں۔ پھر جب تک وہ پہنچے، سانپ سُرکھے کو ڈس چکا تھا۔ مورکھی نے سانپ کو بھاگنے نہیں دیا۔ سانپ بار بار بھاگنے کی کوشش کرتا مگر مورکھی پیچھے سے آتی اور اس کی دُم مُنہ میں پکڑ کر زور سے زمین پر مارتی۔ پھر اپنے پیروں سے اسے کچلنے لگی۔ میں نے زمین پر دیکھا کہ ایک سانپ کے جسم کے ٹکڑے پیروں سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! سانپ اور گھوڑے ہم نے زندگی میں پہلی بار دیکھی، سانپ غصے سے کھڑا ہو تھا۔ مورکھی بجلی جیسی پھرتی سے پلٹ کر پیچھے سے آتی اور مُنہ سے اس کی دُم پکڑ کر اوپر اٹھا کر پھر زمین پر دے مارتی۔ ایک دفعہ سانپ اس کی گردن کے مُنہ میں آ گئی۔ مورکھی دانت اتنے زور سے بھینچے کہ سانپ نے بلبلا کر دم توڑ دی۔ مورکھی کو پھر بھی چین نہ آیا۔ وہ اس پر اگلی ٹانگیں جما کر ناچنے لگی۔ سانپ کا چُورا بن گیا۔ اس کے بعد مورکھی باہر بھاگی۔ سب سمجھ تھے کہ کہاں گئی۔ اب معلوم ہُوا کہ وہ آپ کو لینے گئی تھی۔“

میں نے آگے بڑھ کر مورکھی کی پیٹھ پر تھپکیاں دیں۔ میری تھپکیوں سے بے نیاز روئے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھ سے پانی بہہ رہا تھا۔ میں کم زور دل کا آدمی ہوں، کسی کو روتا نہیں دیکھ سکتا۔ مورکھی سے اب مجھے بہت پیار ہو گیا تھا۔ میں لرزتے ہاتھوں سے دواؤں کا بکس اٹھایا اور آنسو پونچھتا وہاں سے چلا آیا۔ علن کو اتنا ہوش کہاں تھا کہ وہ مجھے میں نے چلتے وقت اس سے کوئی بات نہیں کی۔

دوسرے دن مجھے ایک کام سے حیدر آباد جانا پڑا۔ کولہو ٹتے ہی میں علن کے ہاں گیا۔ علن نے سُرکھے کی اٹھوا کر گاؤں کے قریب پھلیلی ندی میں ڈلوا دی تھی۔ شادی وقت سُرکھے اور مورکھی نے اسی ندی میں غسل کیا تھا۔ علن

پھر مورکھی کے ساتھ بیٹھا روتا رہتا۔ دونوں پر اس حادثے نے گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے تھے۔ میں نے پوچھا تو مورکھی کی غم زدہ نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے جیسے ہزاروں شکایتوں سے مجھے دیکھا۔ غالباً کہہ رہی تھی کہ ڈاکٹر! میرے سُرکھے کو تم نے کیوں نہیں بچایا؟ میں مورکھی کی نظروں کی تاب نہ لا سکا، زمین میں گڑ کر رہ گیا۔ پھر میں نے گردن پونچھ کر کہا۔ ”تیری قسم مورکھی، میرے بس میں نہیں تھا۔“

مورکھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے مجھ پر اور علن پر ایک نظر ڈالی پھر چاروں طرف بڑی حسرت سے دیکھا۔ بار بار وہ جگہ دیکھنے لگی جہاں سُرکھا ہوتا تھا۔ پھر اس نے رونے جیسی ایک آواز نکالی اور آہستہ آہستہ باہر نکلی۔ علن بھی دروازے تک اس کے ساتھ گیا۔ اس کی بانہیں مورکھی کی گردن میں تھیں۔

”جانی! کہاں چلی؟“ مورکھی رُک گئی اور گردن موڑ کر علن کو خالی خالی، ویران ویران نظروں سے تکنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے دو چمکتے ہوئے موتی نکلے اور زمین میں جذب ہو گئے۔ علن اپنا گال اس کے گال سے ملا کر رونے لگا۔ ”مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہے۔ میری مٹھڑی! میری مورکھی!“

گاؤں کے کئی مرد، عورتیں اور بچے وہاں جمع ہو گئے تھے۔ انسان اور ایک جانور کی یہ محبت دیکھ کر ان پر سکتہ طاری تھا۔ سب اس طرح چُپ سنے تھے جیسے ان پر کسی نے اسمِ اعظم پڑھ کر پھونک دیا ہو۔ محبت کے لفظ سے بڑا اسم کیا ہوگا۔ یہی اسم اعظم ہے جو دلوں کا خاموش حاکم ہے۔ یہ پتھر کو پانی اور پانی کو پتھر بنا دیتا ہے۔

خاموشی میں علن اور مورکھی کی آہ و زاری کے سوا کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ خاصی دیر تک یہی کیفیت رہی۔ پھر مورکھی نے علن کے بازوؤں سے اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کی اور آگے بڑھی۔ علن بھی اس کے ساتھ بڑھا۔ ”نہ جا مورکھی، نہ جا۔“ لیکن اب مورکھی کسی حالت میں ٹھیرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ گردن زور زور سے جھٹکنے لگی اور اپنے پیروں سے مٹی اڑانے لگی۔ ”سائیں، ہم رسیاں لے آئیں؟“ رسیوں کا ذکر سُن کر مورکھی چونکی۔

میں نے چیخ کر کہا۔ ”خبردار جو رسیاں لائے! اسے اور دکھ دے کر مارنا چاہتے ہو؟“

علن نے بھی کہا۔ ”نہیں نہیں، یہ میری بانہیں رسیاں ہیں میری محبت کی رسیاں۔ مورکھی جائے گی تو میرا جسم ٹکڑوں تلے روند کر جائے گی۔“

مورکھی کچھ تیز چلنے لگی۔ علن بھی کوئی دس قدم تک اس کے ساتھ گھسٹتا چلا گیا۔ میں نے دوڑ کر اسے پکڑا۔ مورکھی اگر تیز ہو جاتی تو اس کے پیر علن کو روند ڈالتے۔

”علن! علن! یہ کیا کر رہے ہو؟ جانے والوں کے پیچھے کہاں تک جاؤ گے؟“

”چھوڑو ڈاکٹر! مجھے چھوڑ دو۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے بغیر مجھے بھی نہیں جینا۔“

دوسرے لوگ بھی دوڑ کر آ گئے۔ سب نے مل کر علن کی بانہیں مورکھی کی گردن سے الگ کیں۔ مورکھی ہلکی چال سے اس راستے پر آگے بڑھتی رہی، جس سے سُرکھے کو گھسیٹ کر پھلیلی ندی میں ڈالا گیا تھا۔

پھلیلی ندی گاؤں کے بالکل ساتھ ہی تھی۔ جس پُل سے سُرکھے کی لاش پانی کے حوالے کی گئی تھی، وہ صرف سو قدم دُور تھا۔ مورکھی دیوانہ وار دوڑتی ہوئی پُل کے درمیان میں جا کھڑی ہوئی۔ پُل کی دیوار زمین سے دو فٹ اونچی تھی۔ نیچے پانی زور و شور سے بہہ رہا تھا۔ اس دن پھلیلی بھی پانی سے چھلک رہی تھی۔ دیکھتے ہوئے ڈرلگ رہا تھا۔ مورکھی نیچے دیکھنے لگی۔ پیچھے سے علن چیخوں پر چیخیں مار رہا تھا۔ ”مورکھی! مورکھی!“ ہم پانچ آدمی علن کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے ہاتھوں سے چھٹا چھٹا جا رہا تھا۔ ”چھوڑو، مجھے چھوڑو۔ مورکھی جان دے رہی ہے! دیکھتے نہیں۔“

مورکھی نے گردن موڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ علن ہمارے ہاتھوں میں تڑپ رہا تھا۔ مرد، عورتیں اور بچے دم بہ خود مورکھی کو تک رہے تھے۔ علن حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ ”مورکھی! مورکھی!“ مورکھی نے عجیب حسرت سے میری طرف دیکھا۔ پھر پھلیلی کی گہرائی سے گویا ایک ہنہناہٹ سی ابھری۔ سُرکھے کی ہنہناہٹ۔ مورکھی چونکی اور دوسرے ہی لمحے اس کی دہشت ناک ہنہناہٹ ہَوا میں گونجی۔ ساتھ ہی اس نے پُل سے ایک بڑی چھلانگ لگائی اور بیس فٹ نیچے، گہرے پانی میں جا پڑی۔ پانی میں ایک زور دار آواز پیدا ہوئی۔ لہریں دیر تک اوپر نیچے ہوتی رہیں پھر پانی پہلے کی طرح ہموار ہو گیا۔ مورکھی ڈوب گئی۔ ایک سوہنی پھر ڈوب گئی۔

علن کو شدید غم کی وجہ سے بخار چڑھ آیا۔ وہ دو دن تک بخار کی سختی جھیلتا رہا۔ پھر وہ بھی ہمیں چھوڑ کر مورکھی کے پاس چلا گیا!

خواتین ہفت رنگ، چھٹا رنگ ❁ گجراتی کہانی

تو...!

سروج تروید ی/جمیل احمد پال

ایک گھونسلے کی تعمیر اور آباد ی کے ہر ہر مرحلے کا مشاہدہ کرنے والے ننھے سے بچے کا اپنا آشیانہ طوفان کی زد پر تھا

آج کیلنڈر کا صفحہ نہیں بدلا، اس لیے معلوم نہیں آج کون سا دن اور کیا تاریخ ہے۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے کہ میں کیلنڈر کا صفحہ بدلنا بھول جاؤں۔ صبح اٹھتے ہی میں پہلا کام اس صفحے کو بدلنے ہی کا کرتا ہوں۔ ممی ڈیڈی کو تو صفحہ بدلنا یاد ہی نہیں رہتا۔ مہینوں تک صفحے بغیر بدلے رہ جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے صفحے بدلنے کا کام میں نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ مجھے یہ بہت اچھا لگتا ہے... صبح سویرے طلوع ہوتے سورج کے منظر کی طرح۔

نمی موڈ میں ہوں تو مجھے صبح اٹھتے ہی مزے دار ناشتا دودھ کے ساتھ ملتا ہے۔ مگر آج ناشتے میں دودھ کے ساتھ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے ممی سے پوچھا تو انھوں نے ڈانٹ کر چپ کرا دیا۔ میں نے چپ چاپ دودھ پی لیا۔ پہلے ممی کبھی ڈانٹتیں یا غصہ کرتیں تو میں حیران ہوتا تھا کہ ممی بھی کبھی غصہ کر سکتی ہیں مگر میں نے دیکھا کہ ممی آج کل اکثر ہی بات بات پر غصے میں آ جاتی ہیں۔ مگر کیا سب کی مائیں ایسے ہی بات بات پر ڈانٹتی ہیں؟

پھر میں دیر تک کھڑکی کے باہر باغیچے میں موگرا کے پودے کی شاخوں پر کھلے کھلے سفید پھولوں پر چونچ مارتے پھر سے اُڑتے اور ٹوئنک... ٹوئنک... گیت گاتے چمکیلے کالے بادل کے رنگ کے ہمنگ برڈ کو دیکھتا رہا۔ ڈیڈی میرے پنچھیوں کی رنگ بہ رنگی تصویروں والی کتاب لائے ہیں، اس میں ایسے ہی ہمنگ برڈ ہیں اسی لیے میں انھیں پہچانتا ہوں۔ ہماری کھڑکی کے باہر باغیچے میں بھانت بھانت کے پنچھی آتے ہیں... ہمنگ برڈ، بلبل، مینا، توتا، کبوتر، دیوالی کا گھوڑا۔ کبھی کبھی کوّے کے پیچھے لگا کالا کوسی بھی آ جاتا ہے۔ ڈیڈی کتاب کی تصویروں کے ذریعے مجھے ان سب کی پہچان کراتے ہیں۔ مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر اتوار کے سوا ڈیڈی بھی کم ہی ہوتے ہیں۔ میرا ان پنچھیوں کو دیکھتے ہی رہنے کا من ہوتا ہے مگر دل میں ڈر رہتا ہے کہ ابھی ممی کی آواز آئے گی۔ ''نیلو، پڑھنے کو دیر ہو رہی ہے۔'' ڈیڈی کبھی بھی ایسے نہیں کہتے۔ پھر بھی ممی جانے مجھے کیوں پیاری لگتی ہیں۔

پھر سبق یاد کرتا ہوں، اسکول جاتا ہوں، کئی گھنٹے تک بیٹھے بیٹھے جمائیاں لینا اور سسٹر سے آنکھیں چرا کر ساتھ بیٹھے لڑکوں سے باتیں کرنا اور شام کو واپس آ کر سبق یاد کرنے کا حکم سننا۔ اسی طرح یہ سب چلتا ہے۔

ڈیڈی آفس سے گھر آئے اور سوفے پر بیٹھ کر چپ چاپ کچھ پڑھنے لگے۔ آج تو ممی نے ڈیڈی کی جوتیاں بھی نہیں اتاریں۔ ممی چپ چاپ تھیں، گھر میں ایسی خاموشی دیکھ کر میں بھی چپ ہو جاتا ہوں۔

رات کو نائٹ لیمپ جلنے سے پہلے مجھے نیند آ گئی تھی۔

دو جنوری

آج اتوار ہے۔ کیوں کہ ڈیڈی ابھی تک سو رہے ہیں۔ میری جلدی اٹھنے کی عادت ہے۔ اس لیے ممی ڈیڈی بھی مجھ سے پہلے ہی اٹھ جاتے ہیں۔ کبھی کبھار وہ نہ جاگے ہوں اور میں جاگ جاؤں تو ڈیڈی ہمارے پلنگ پر ہی سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ آج جاگا تو دیکھا کہ ڈیڈی علاحدہ پلنگ پر سوئے ہیں۔ ممی سوئے ہوئے وہیں نیند آ گئی ہو... یا... پھر...

صبح اٹھتے ہی مجھے دانت صاف کرنے کے لیے جانا پڑتا ہے۔ مگر ممی ابھی تک نہیں جاگی تھیں اور سورج بھی نہیں طلوع ہوا تھا اس لیے ابھی سے کون برش کو مُنہ میں ڈالے۔ میں کھڑکی کے پاس پڑی میز پر بیٹھ کر بوگن ولیا کے لال گلابی پھولوں پر اڑتی کالی لال تتلیاں دیکھنے لگا۔ آج ہی تو تتلیاں دیکھنے کو من چاہا ہے مگر تتلیاں بھی تو سورج نکلنے کے بعد آتی ہیں۔ مگر آج تو وہ کالی والی بلبل بھی ہے... واہ! کتنا مدھر گاتی ہے۔ میں ممی کے کمرے کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ ابھی تک سو رہی ہیں۔ ٹھیک ہی ہے نہیں تو... پھر بلبل گیت گاتی اُڑ گئی تھی۔

چوبیس فروری

آج صبح میں اٹھ کر کھڑکی میں سے دیکھتا ہوں کہ ڈیڈی والی رنگ بہ رنگے پنچھیوں والی کتاب میں بنائے گئے بالکل ویسے ہی دو کالے چمکیلے ہمنگ برڈ اُڑ اُڑ کر واپس آ کر ایک انار کے درخت کی ٹہنی پر گھونسلا بنا رہے ہیں۔ میرا جی چاہا کہ دیکھتا رہوں مگر ممی کروٹ بدل رہی ہیں۔

اٹھیس جنوری

آج صبح صبح اٹھ کر دیکھتا ہوں کہ پتلے پتلے تنکوں اور دھاگوں سے گھونسلا بن چکا ہے۔ اسے اندر سے دیکھنے کو جی چاہا۔ کہیں ممی ڈیڈی نہ جاگ جائیں، اس ڈر سے میں آہستہ آہستہ کمرے میں سے نکل کر باہر باغیچے میں گیا۔ وہ دونوں پنچھی کہیں اُڑ کر گئے ہوئے تھے۔ میں نے گردن نیچے کر کے گھونسلے کو دیکھا۔ کتنا سندر گھونسلا تھا۔ اندر دو چھوٹے چھوٹے بڑے پیارے انڈے تھے۔ مجھے تھوڑ اتھوڑا ڈر بھی لگا۔ پھر میں چپ چاپ کھڑکی کے پاس آ گیا لیکن ممی ڈیڈی جاگ گئے تھے۔ ڈیڈی غسل خانے میں برش کر رہے تھے اور ممی باورچی خانے میں چائے بنا رہی تھیں۔ شاید انھوں نے مجھے گھونسلا دیکھتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ پھر بھی ممی ڈیڈی نے کچھ نہیں کہا... پتا نہیں کیوں؟

دس فروری

اب تو اس ہمنگ برڈ کے بچے گھونسلے میں سے چونچ باہر نکال کر آہستہ آہستہ ٹوئنک... ٹوئنک... بھی بولتے ہیں اور اپنے ممی ڈیڈی کی چونچ سے دانا بھی مُنہ میں لیتے ہیں۔ میرے ممی ڈیڈی ایسا کیوں نہیں کرتے؟

ممی جانے کیوں اب بہت کم بولتی ہیں۔ سارا دن مُنہ بنا کر کام کرتی ہیں۔ میں نے انھیں مُنہ بنانے والی ایسی کوئی بات بھی نہیں کہی۔ ڈیڈی کے ساتھ تو ٹھیک ہے مگر انھوں نے میرے ساتھ بولنا بھی کم کر دیا ہے۔ پہلے تو ممی اسکول کے دروازے تک پہنچانے آتیں تو مجھے چوم لیتی تھیں... مگر اب تو جیسے بھول ہی گئی ہیں۔ میں پیار سے ان کی گود میں بیٹھنے جاتا ہوں تو کہتی ہیں۔ ''اب تم بڑے ہو گئے ہو۔'' مجھے بڑے ہونے والی بات ذرا بھی اچھی نہیں لگتی۔ لیکن ممی کہتی ہیں تو... شاید... میں...

لیکن اس پنچھی کے بچے کب بڑے ہوں گے۔ اس کے ممی ڈیڈی کو تو میں نے کبھی جھنجلا کر اپنے بچوں کو چونچ مارتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ڈیڈی کو بھی اب میں کوئی کتاب پڑھانے کے لیے یا کہانی سنانے کے لیے کہوں تو مجھے ''میرا سر مت کھاؤ'' کہہ کر ڈھتکار دیتے ہیں۔ پہلے اور اب والے ممی ڈیڈی میں کتنا فرق ہے، وہ ایسا کیوں کرتے ہیں، یہی تو میں سمجھ نہیں سکتا۔ ان پنچھیوں کو غصے ہونا نہیں آتا اسی لیے وہ سارا دن گاتے ہی رہتے ہیں۔ ان کے بچوں کی بھی کتنی موج ہے، نہ برش کرنا، نہ صبح صبح غسل کرنا، نہ ہی سبق یاد کرنے کے لیے مغز ماری کرنا۔ اسکول بھی نہیں جانا پڑتا۔ میرے بھی ان جیسے پَر ہوتے تو... ٹوئنک... ٹوئنک... کرتا اُڑ جاتا... مگر...

تیرہ فروری

آج بھی ڈیڈی علیحدہ پلنگ پر سوئے ہوئے تھے۔ ویسے یہ پورا ہفتہ ایسے ہی گزرا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پیئے پی اور اخبار پڑھتے ہوئے ممی سے کہا۔
ٹے ٹکٹ لے آیا ہوں، تم اور نیلو تیار ہو جاؤ۔''
ب ممی نے کہا۔ ''میں نے نہیں دیکھنی فلم ولم، تم دیکھ آؤ۔''
ڈیڈی عینک کے صاف شیشے میں سے ممی کو کتنی ہی دیر تک دیکھتے رہے۔ اور پھر انھوں نے فلم کے ٹکٹوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھڑکی سے باہر اُڑا دیا۔

بیس فروری

میں دو تین دن پہلے کی بات لکھنا تو بھول ہی گیا۔ اس رات ٹیبل لیمپ کی ٹرچ... آواز ہونے کے بعد مجھے نیند نہیں آئی تھی۔ میں تو رضائی میں مُنہ لپیٹے چپ چاپ پڑا تھا۔ ممی ڈیڈی کو لگا کہ جیسے میں سو چکا ہوں اس لیے انھوں نے باتیں کرنا شروع کیں۔ مجھے تو کچھ بھی سمجھ نہیں آیا مگر کبھی غصے نہ ہونے والے ڈیڈی بھی آج غصے ہو رہے تھے۔ ایسا ان کی آواز سے لگ رہا تھا۔ پھر بھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، البتہ جب ڈیڈی نے ممی کو غصے ہو کر ''یہ گھر میرا ہے سمجھی!'' ایسا کچھ کہا تو مجھے سُن کر بڑا عجیب لگا۔ یہ گھر اکیلے ڈیڈی کا کیسے ہو سکتا ہے؟ ڈیڈی شام کو گھر آتے ہیں اور صبح سویرے چلے جاتے ہیں۔ ممی سارا دن اس گھر میں رہتی ہیں۔ میرے لیے ناشتا بنانا، ڈیڈی کے لیے ٹفن، میرے اور ڈیڈی کے کپڑے دھونا اور استری کرنا۔ مجھے اسکول پہنچا کر آنا اور ڈیڈی کے آفس جانے سے پہلے ان کا پین، رومال، عینک، بٹوا سنبھال کر بریف کیس میں رکھنا۔ یہ سب کام وہ بغیر بولے کرتی ہیں... تو پھر یہ گھر اکیلے ڈیڈی کا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔

میں پھر دو تین دن سے کیلنڈر کا صفحہ بدلنا بھول گیا ہوں۔ اب روز رات ممی ڈیڈی مجھے سوتا سمجھ کر جھگڑا کرتے ہیں۔ ممی ڈیڈی نے ٹی وی دیکھنا تو کتنے ہی دن سے چھوڑ دیا ہے۔ پہلے ہم اکٹھے بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے تھے لیکن اب تو مجھے بھی نہیں دیکھنے دیتے۔

آج ممی مجھ سے بھی پہلے جاگ گئی ہیں اور اپنے کپڑے چپ چاپ سوٹ کیس میں رکھ رہی ہیں۔ ڈیڈی سوفے پر بیٹھے چپ چاپ انھیں دیکھ رہے ہیں۔ ممی سوٹ کیس میں کپڑے رکھتے ہوئے بار بار ساڑھی کے پلّو سے اپنی آنکھیں پونچھ رہی ہیں۔ جانے رات دیر تک جاگی ہیں اسی لیے ان کی آنکھیں جلتی ہوں گی۔ مگر ڈیڈی بھی بار بار عینک اُتار کر آنکھیں کیوں پونچھتے ہیں؟ میں کھڑکی میں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں... لیکن جانے کیوں آج مجھے بلبل ہنگ برڈ وغیرہ کو دیکھتے رہنا اچھا نہیں لگ رہا۔

پھر ممی نے میرے کپڑے بھی سوٹ کیس میں رکھنے شروع کیے تو مجھے لگا کہ مجھے بھی ممی کے ساتھ ماما کے گھر جانا ہوگا۔ مگر یہ دیکھ کر ڈیڈی نے پوچھا۔ ''نیلو کے کپڑے کیوں لے رہی ہو؟''

پھر بھی ممی نے میرے کپڑے رکھتے ہوئے کہا۔ ''نیلو میرا ہے... میرا سہارا ہے جینے کا، میں اِسے اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔''

مگر ممی کی کہی ہوئی بات ''جینوں کا سہارا ہے...'' میری سمجھ میں نہ آئی۔ مگر یہ سُن کر ڈیڈی نے جب کہا۔ ''میں بھی اس کا ڈیڈی ہوں، نیلو میرے ہی ساتھ رہے گا۔'' اور پھر انھوں نے کھڑے ہو کر ممی کے سوٹ کیس میں سے میرے کپڑے نکال کر پلنگ پر پھینک دیے اور بولے۔ ''میں تمھیں نہیں روک سکتا، تم نے جانا ہو تو تمھاری مرضی ہے...''

تب مجھے پتا چلا کہ مجھے ممی کے ساتھ نہیں جانا ہے۔ ڈیڈی یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ممی کے بغیر بھلا میں کیسے رہ سکتا ہوں۔

میں نے دیکھا کہ ممی بھی میری طرح رو سکتی ہیں۔ اتنی بڑی ممی کو کیوں رونا پڑتا ہے؟

میں کھڑکی میں سے اس ہمنگ برڈ کو دیکھنے کا بہانا کرتا ہوں۔ مجھے تھوڑی دیر بعد ممی کا سوٹ کیس بند ہونے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

ممی ڈیڈی دونوں میں سے کوئی کچھ بھی نہیں بولتا۔ ممی نے اپنے رومال کو مُنہ پر رکھا ہوا ہے مگر ان کی آنکھوں سے آنسو گر رہے ہیں۔

بڑے آدمی میری طرح رو سکتے ہیں!

ممی میری طرف دیکھ رہی ہیں۔ اس لیے میں کھڑکی کے باہر دیکھتا ہوں۔ کیوں کہ میں نے ممی کو کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا، اس لیے میں انھیں روتے نہیں دیکھ سکتا اور شاید مجھے بھی...

باہر وہی ہمنگ برڈ اپنے بچوں کی گلابی چونچ میں چونا ڈال کر کچھ کھلا رہا ہے۔ دوسرا پنچھی گھونسلے کے دروازے کے دوسرے کونے سے چپکا ہُوا یہ سب دیکھ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں کئی سوال اٹھتے ہیں... یہ ہمنگ برڈ میرے ڈیڈی کی طرح... ''یہ میرا گھونسلا ہے، تم اُڑ جاؤ۔'' کہہ کر کیوں نہیں اُڑا دیتا؟ ایسے کئی سوال مجھے الجھا دیتے ہیں۔ مجھے ان سوالوں کا جواب نہیں آتا اس لیے مجھے رونا آ جاتا ہے اور ہر میں بھی کھڑکی کی سلاخوں کے درمیان مُنہ رکھ کر ممی ڈیڈی کی طرح چُپ چاپ رونے لگ جاتا ہوں۔

روتے روتے میری خواہش ہوتی ہے کہ ممی کی طرف دیکھوں۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ... شاید... ممی وہاں نہ ہوں تو...

تشنہ ساحل

وینا پانی مہانتی/ مُظفر حنفی

ایک اَن جانے... مگر بے حد جانے پہچانے اور مضبوط بندھن میں بندھے دو افراد کی کتھا وہ مُدت کے بعد دوبارہ ملے تو بہت کچھ بدل چکا تھا... اور بہت کچھ جوں کا توں تھا!

معلوم ہوتا ہے، وہ بھی بے انتہا حسین رہی ہوں گی۔ اُن کے سنہری عارضوں پر کبھی گلابی شفق کھلی ہوگی اور اُن کی شوخ آنکھوں میں کبھی نیل گوں آسمان سمٹ آیا ہوگا۔

اُن کا نام رُوچی ہے۔ بہت عرصہ قبل وہ بے انتہا شہرت کی حامل تھیں۔

رُوچی! جن کے اصل یا پیار کے نام کے ساتھ چمے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

سورج غروب ہونے کو ہے، رُوچی غالباً نصف گھنٹے سے انتظار کر رہی ہے، ٹرین کی آمد میں نصف گھنٹے سے زائد تاخیر ہو گئی ہے۔

اسٹیشن آ گیا، رُوچی کھڑی ہے پندرہ سالوں کے وقفے میں ہونا شدہ متعدد تغیرات کے باوجود وہ چہرہ صاف صاف شناخت کیا جا سکتا ہے؛ بے ترتیب بکھری ہوئی زلفوں کے درمیان اُس کی چنچل آنکھیں چمے کے انتظار میں اَور زیادہ شوخ و چنچل ہو گئی ہیں۔

کاش! پندرہ سال پیش تر کا ماضی، حال میں بدل جاتا۔ نہیں نہیں، وہ اِس انداز میں نہیں سوچیں گے، وہ خود کو کم زور نہیں بنائیں گے۔

رُوچی پاس آ گئی۔ خفیف سے تبسّم سے اُس نے کہا، ''اِتنی زحمتیں برداشت کر کے تم آ گئے چمے! لیکن ٹرین آج بے حد لیٹ آئی۔ زندگی بھر تم کبھی وقت پر نہ آ سکے!''

چمے نے جواب دیا۔ رُوچی کی گفتگو کا رمزوہ سمجھ گئے۔ پندرہ سال قبل کی یادوں نے اُن کے غنچۂ دل کو مسل ڈالا۔ ایک لحظہ کے لیے وہ قوتِ گویائی سے محروم ہو گئے۔

کار میں بیٹھ کر رُوچی نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ چمے نے یہ سوچ کر کہ کچھ بولنا چاہیے، کہا، ''تم بیٹھو رُوچی! میں ڈرائیو کرتا ہوں۔''

''کیا تمھیں شرم آ رہی ہے چمے! یہاں سب جانتے

ہیں کہ میں ڈرائیو کرتی ہوں، شراب پیتی ہوں، کلب جاتی ہوں اور اِس طرح بہت سے دوستوں کی برائی کرتی ہوں۔ یہی میرا واحد مشغلہ ہے۔ علاوہ ازیں تم تھکے ہوئے ہو، میرے مہمان ہو۔ تم بیٹھو۔"

چمے کچھ تشویش میں مبتلا ہوگئے۔ کہیں رُوچی اُن کا تمسخر تو نہیں اڑا رہی ہے۔

رُوچی نے کار آگے بڑھاتے ہوئے کہا، "تم ہمیشہ سے نہایت کم زور رہے ہو۔ میری اِس آزاد مزاجی کو تم نے کبھی پسند نہیں کیا۔ آج بھی ناپسند کرتے ہو۔ آج تم میرے مہمان ہو، میں تم سے وعدہ کرتی ہوں تمھارے قیام کے دوران میں شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاؤں گی۔" ہونٹ سے ہونٹ دبا کر اُس نے جیسے اپنے گلے کی بھڑاہٹ پر قابو پالیا۔

"میرے بارے میں تمھیں ایک غلط فہمی ہے رُوچی! تم غالباً پردوش کی بات کا اعتبار کرتی ہو؟"

رُوچی نے کہا، "میں اپنے مشاہدے پر زیادہ اعتماد کرتی ہوں چمے! میری اِس خود پسندی کو تم برداشت نہیں کر سکے، تم ہی کیا، خود میں کبھی کبھی اِس وجہ سے کم زوری محسوس کرتی ہوں، چھوڑو بھی پردوش کی باتوں کو، میں نے کبھی اہمیت نہیں دی، پھر آج؟"

رُوچی ہنس رہی تھی، ہلکی روشنی میں پردوش کی تضحیک کے لیے اُس کی طنز آلود ہنسی کی مدھم لکیر جیسے چمے کے اندر خلش پیدا کر رہی تھی۔

یہ وہی رُوچی ہے؛ ایک مشہور، دولت مند باپ کی بیٹی۔ لامحدود عیش وعشرت کے درمیان زندگی کو نظر انداز کرتے رہنا تو جیسے اِس کا محبوب مشغلہ ہو، لیکن اِس کے باوجود اُس کا سلوک کتنا کھلا ڈلا ہوتا تھا۔ اُس کی شخصیت اور عظیم انسانیت کے درمیان چمے تو جیسے اپنی خود اعتمادی کھو بیٹھے تھے۔

شہر کا راستہ چھوڑ کر گاڑی کسی دوسری راہ پر چلنے لگی۔ چمے نے زور سے کہا، "ارے، یہ کیا کر رہی ہو رُوچی؟ ہم راستے سے الگ آپڑے۔"

"خوف زدہ ہونے کی کوئی بات نہیں، ساری رات ہمیں بے راہ روی میں گزارنی ہے۔ میں یہاں نہیں رہتی۔ کچھ دن سے تو جیسے کچھ اچھا ہی نہیں لگتا، اِس لیے شہر چھوڑ کر دو سو میل کی دوری پر آبسی ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ اِسے بھی شہر کہا جاسکتا ہے، لیکن یہ میرے لیے ایک اجنبی شہر ہے، اگرچہ مجھے وہاں بھی خوف محسوس ہوتا ہے چمے! میں وہاں زیادہ دن نہیں رہ سکوں گی۔ نہ جانے کب اور کس وقت میں اس عارضی قیام گاہ کو چلی جاؤں۔"

"زندگی کو اِس طرح گزار دیا تم نے رُوچی!"

"گزار کہاں دیا؟ زندگی تو مجھ پر ایک بوجھ بن کر رہ گئی ہے، سچ تو یہ ہے کہ آج زندگی مجھے گزار دینا چاہتی ہے۔"

چمے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گذشتہ پندرہ سال سے سالِ نو کے لیے نیک خواہشات کے کارڈ اور سال گرہ پر مبارک بادی کے علاوہ رُوچی کے ساتھ اُن کا کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا۔ حد درجہ قریبی شناسا اُس عورت کو اِس طویل مدتی وقفے میں نہ جانے کتنے واقعات پیش آئے ہوں گے، جن کا اُنھیں خیال نہیں تھا۔

گاڑی ساٹھ میل کی رفتار سے دوڑ رہی ہے، دونوں جانب ہرے ہرے کھیت ہیں، آسمان پر سفید بادلوں کے لچھے اور بیچ بیچ میں ہلکی ٹھنڈی ہَوا کا لمس چمے کو محسوس ہو رہا تھا، جیسے جنّت کی حوراُنھیں اُڑا کر لے جارہی ہو۔

یکا یک گاڑی روک کر رُوچی نے کہا، "یقیناً تمھیں بھوک محسوس ہو رہی ہوگی۔ چمے! ٹفن کیریئر کھول کر تم کھالو۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

"تم کچھ نہیں کھاؤ گی رُوچی؟"

"نہیں، مجھے بالکل خواہش نہیں ہے۔ آج کل نہ جانے کیوں کھانے سے بالکل رغبت نہیں رہی، کبھی کبھی ڈر لگتا ہے کہیں فاقہ کشی کی وجہ سے میری جان نہ نکل جائے۔" کہتے کہتے اُس نے فرطِ جذبات سے چمے کی ہتھیلیوں کو اپنی مٹھی میں بھرلیا۔

تاریکی... چاروں جانب گھٹاٹوپ اندھیرا۔ اُس کے باوجود وہ رُوچی کو صاف دیکھ رہے ہیں، کتنی نزدیک کبھی اپنائیت سے، اُن کے پاس کھڑی ہے، لیکن پندرہ سال قبل ایک بات کہنے کے لیے جا کر وہ بار بار لوٹ آئے تھے۔ رُوچی کے تعلق سے اُن میں جو بڑی کم زوری تھی کیا وہ اُسے فراموش کر سکے تھے۔ رُوچی کی شادی کے بعد چمے نے مرنا چاہا تھا، لیکن موت بھی نہ آئی۔

آج جیسے پوس کے پیلے پتوں میں بسنت رُت کی آمیزش نے بے موسم آگ سی سلگا دی ہو۔ جینے کے لیے ایک بار پھر خواہش پیدا ہوگئی ہے۔

"ارے، ارے چمے! آئی ایڈمٹ یو آر اے (I admit you are a) بوائے۔ اوسلی۔ دیکھو، چمے اندھیرے کے بعد روشنی ہوتی ہے... تم دوبارہ۔"

رُوچی ہنس پڑی۔ چمے چونک کر ہٹ گئے۔ اُس ہنسی کے باطن میں جیسے لاتعداد المیہ ترنگیں لہرا گئی ہوں۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے رُوچی نے کہا، "میری بات سے تمھیں تکلیف پہنچی نا؟ چپ کیوں ہوگئے؟"

چمے نے مسکرا کر سگریٹ سلگالی۔ بات گھما کر اُنھوں نے دریافت کیا، "تمھارا اِس طرح پردوش کو چھوڑ دینا، مجھے پسند نہیں آرہا ہے رُوچی! وہ دار جلنگ میں ہے اور تم ایک بالکل دیہاتی گانو میں، میں اِس کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"تم ہمارے بیچ میں نہیں آسکے گا چمے! جس طرح امیروں میں ایگو، ڈھنڈ اور سرکش کا جذبہ ہوتا ہے اُسی طرح غریبوں میں بے چارگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ دونوں احساسات آدمی کو نارمل نہیں ہونے دیتے۔ ایک ساتھ رہ کر زندگی بسر کرنے کے لیے قدر سمجھوتا کی ضرورت ہوتی ہے، جو فراہم نہ ہوسکی۔ میری سرکشی جیسے جیسے اُن پر حاوی ہوتی گئی، اُن کی بے چارگی میں اِسی نسبت سے میرا دَم گھٹتا رہا۔ پردوش میں بہت سے اسفل جذبات موروثی ہیں۔ تمھیں معلوم ہے چمے! کہ میں کسی مرد کی بے چارگی کو برداشت نہیں کر سکتی، میں بہت انا پسند ہوں اور میں نے چاہا تھا کہ پردوش مجھ سے زیادہ خود پسند ہوں، لیکن وہ روز بہ روز زیادہ بزدل ہوتے گئے اور اِسی لیے مجھ سے دُور ہوتے گئے۔ تجارت کے حیلے سے وہ مہینوں اِدھر اُدھر گھومتے رہتے ہیں۔ میں اِس سلسلے میں فکر مند بھی نہیں ہوتی۔ مجھے تشویش صرف یہ ہے کہ زندگی مجھ پر بوجھ بنتی جارہی ہے۔"

"تمھاری لڑکی کہاں ہے؟"

"یہ اَور بھی حیرت کی بات ہے، پردوش اُسے اپنے سے الگ نہیں کرتے، کیوں کہ لڑکی میرے ساتھ رہ کر خراب ہوجائے گی۔ پردوش اُس کی تربیت مختلف انداز سے کر رہے ہیں۔ وہ ہندو دھرم کے مختلف رسوم ورواج، اخلاقیات وغیرہ کی مشق کر رہی ہے۔ میں نے بھی کی تھی، عبرت وغیرہ کرنا، دادی ماں کے پاس بیٹھ کر پُران سننا مجھے بے حد اچھا لگتا تھا۔ تم جانتے ہی ہو چمے کہ میں کتنی معصوم تھی۔ جھوٹ بولو تو ملکِ عدم میں بیل کے پیر کی لیلوں سے ٹھونک دیے جانے اور اِسی حالت میں جان لے لینے کی بات پڑھ کر بے فکری سے سو نہیں سکتی تھی۔ صبح سے شام تک پرارتھنا کرتے کرتے میں تھک جاتی تھی، اُن ساری باتوں کی یاد آنے پر مجھے اُن دنوں کی لڑکی رُوچی پر ترس آتا ہے، اور میری لڑکی شکلا... جس کی تخلیق بیسوی صدی کی لاتعداد مخلوق اور کشاکش کے درمیان ہوئی ہے..."

چمے کہیں کھو سے گئے تھے۔ ماضی بعید کی کسی رُوچی کی باتیں اُنھیں یاد آرہی تھیں۔ اصلی رُوچی عجیب وغریب ملائم مزاج اور خود اعتمادی کی حامل حسینہ تھی۔ اُس کی آنکھوں اور چہرے میں نہ جانے کیا تھا۔ کتنی بار کچھ کہنے کا ارادہ کر کے وہ کہہ نہ سکے تھے۔ پردوش سے شادی کرنے کا جنہیں رُوچی اِس طرح کرے گی، کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا، لیکن شادی کے بعد وہ پردوش سے کئی بار ملے تھے۔ رُوچی کے روبہ رو آنے سے وہ ہمیشہ پہلوتہی کرتے رہے۔ کئی بار پردوش نے مدعو بھی کیا، کتنی مرتبہ رُوچی نے فاخرانہ انداز میں خطوط لکھے، لیکن چمے نے اُنھیں نذرِ آتش کر دیا تھا۔

سچّی بات

علاء الدّین شاہ بہمنی دوم جب تقریر کرتا تھا تو فصاحت وبلاغت کے دریا بہا دیتا تھا۔ بعض اوقات جمعے کے روز جامع مسجد کے منبر پر چڑھ کر خطبہ بھی پڑھتا تھا اور خطبے میں اپنے آپ کو عادل، رحم دل، متحمل مزاج اور فیاض بادشاہ کہتا تھا۔ ایک دن بادشاہ خطبے کے دوران اپنی تعریف کر رہا تھا۔ مسجد میں ایک عرب تاجر بھی موجود تھا۔ اُس تاجر نے بادشاہ کے ہاتھ کچھ گھوڑے فروخت کیے تھے لیکن اُن کی قیمت اُسے ابھی تک نہ ملی تھی۔ جب اُس نے بادشاہ کو اپنے مُنہ میاں مٹھو بنتے سنا تو اُسے سخت غصہ آیا، ساتھ ہی اُسے بادشاہ کے حکم سے بے گناہ سیّدوں کے قتلِ عام کا واقعہ بھی یاد آگیا جو اُنھی دنوں ہوا تھا۔ عرب تاجر نے چلا کر کہا، "تم نہ عادل ہو، نہ رحم دل ہو، نہ متحمل مزاج ہو اور نہ فیاض طبع ہو۔ تم ظالم اور جھوٹے ہو۔ مسجد کے منبر پر بیٹھ کر غلط باتیں کہتے ہو!"

بادشاہ سخت پشیمان ہوا۔ اُس نے تاجر کو اُس کے گھوڑوں کی قیمت فوراً ادا کرنے کا حکم دیا۔ اِس کے بعد وہ کبھی مسجد میں نہیں آیا۔

"تاریخ فرشتہ" مطالعہ ✪ علی زبیر

شب وروز خود کو کمرے میں بند رکھ کر چمے نے رُوچی کو خوش رکھنے کی آرزو کی تھی، لیکن کیا اُن کا یہ ایثار اور قربانی اکارت گئی؟ پردوش سے ملاقات ہوئی تو وہ کہیں گے کہ اگر وہ رُوچی کو مسرّت اور سکون عطا نہیں کرسکتا تو نہ سہی، لیکن عورت کی پاکیزگی کا لحاظ تو شوہر ہونے کی حیثیت سے اُسے رکھنا چاہیے۔

تھوڑی دیر مکمّل خاموشی طاری رہی۔ آسمان پر بکھرے بادل اور دل میں ہزاروں یادوں کی آنکھ مچولیاں۔

خاموشی کو قطع کرتے ہوئے رُوچی نے دریافت کیا،

''تم پرشانت چودھری کو جانتے ہو؟ وہی جس نے بلیرڈ کے کھیل میں خاصی شہرت حاصل کی تھی۔''

چمے چونک پڑے۔ پردوش رُوچی کے ساتھ پرشانت کی دوستی کو ناپسند کرتا تھا، اُس دن کی باتوں سے چمے نے ایک خفیف سا اندازہ کیا تھا، تو کیا رُوچی؟...

رُوچی نے ہنستے ہوئے کہا، ''میری اُس برائی کا شہرہ یقیناً تمھارے کانوں تک بھی پہنچا ہوگا، لیکن یہ سچ ہے کہ پرشانت کے ساتھ میری گہری دوستی تھی۔ زبان سے ہزاروں طرح کی باتیں پھیلیں۔ میں بے وفا کہلائی، آوارہ کہلائی۔ میں نے اِس طرف کان ہی نہیں دھرے۔ دنیا میں جس کا کوئی دوست نہ ہو اُس کی حیثیت ہی کیا؟ میں دوستی کرتے ہوئے جنس کا لحاظ نہیں کرتی چمے۔ میں اُس کے ساتھ مخلص تھی۔ میں نے اُسے سمجھا کر مجھ سے منع کیا، لیکن اُس بدمعاش نے کیا کیا؟ جانتے ہو؟ اُس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا، 'پرشانت کھلاڑی ہوتے ہوئے ناذلیل نہیں ہے، رُوچی دیوی! میں تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں، چلو بھاگ چلیں۔'

''میں اُسے دیکھ کر چونک پڑی۔ وہ مجھ سے چھ سال چھوٹا ہے۔ میری کنپٹی کے بال تقریباً پک چکے ہیں۔ میرے سر پر ایسا بھوت سوار ہوا چمے کہ میں نے پیر سے چپل اُتار کر اُس کی خبر لی۔ کیوں، معلوم ہے؟ تاکہ وہ مستقبل میں ایسی حرکت کا اعادہ نہ کرے۔ اُس دن کے بعد سے میں نے اُس کی صورت نہیں دیکھی۔ کسی مرد کا غیر ضروری جبر مجھے پسند نہیں، بڑا بدمعاش ہے۔''

چمے بہت توجہ سے سن رہے تھے۔ رُوچی کی زندگی میں پرشانت چودھری کی یہ مختصر داستان خاصی دل چسپ تھی۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے، کیوں کہ رُوچی کا رروک کر کہنے لگی،

''باہر آؤ چمے! ذرا جسم کو کھلی ہوا لگے۔''

چمے اُٹھ کر باہر آگئے۔ چاروں طرف رات کی گہری تاریکی، سامنے صرف ایک پتلی سی ندی بہے جارہی ہے، مکمّل سکوت، بے حد مانوس لگ رہا تھا۔

''جانتے ہو چمے! بعض اوقات اِس طرح نیم شب میں کھلے میدان میں کھڑے ہوکر آسمان پر ستاروں کو دیکھنے کی شدید خواہش ہوتی ہے۔ تاعمر زندہ رہنے کی ذرا سی حاجت تلاش کرتے کرتے میں مضمحل ہوگئی ہوں، لیکن دن بھر کی ساری عیاریاں جیسے مجھے گھیرے میں لیے ہوں۔ اب تو کچھ اچھا ہی نہیں لگتا چمے!''

''پندرہ سال پہلے کی رُوچی اور آج کی رُوچی میں کتنا فرق ہے، میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میں تمھیں کس طرح سمجھاؤں خود میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔''

''مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کرنا۔ تمھیں یاد ہوگا چمے، میری لائبریری میں تمام شہرۂ آفاق مصنفین کی کتابیں تھیں، انواع واقسام کی کتابیں۔ ہر طرح کے پند ونصائح اور تجربات کی داستانیں۔ وہ کتابیں ہی میری قریب ترین ساتھی تھیں۔ کتابی کیڑے کی طرح میں اُس لائبریری میں برسوں بیٹھی رہی۔ پھر ایک دن اچانک اُس میں آگ لگ گئی۔ شدید کرب کے عالم میں جب میں نے پردوش سے اُن کی حفاظت کے لیے کہا تو معلوم ہے اُنھوں نے کیا کہا؟ بار بار ہونے والی چیز کو تم محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔ میں خاموش ہوگئی، میرے پاس بے انتہا دولت ہے، لیکن لائبریری سے میری رغبت ختم سی ہوگئی ہے۔ دوبارہ لائبریری کی تشکیل کرنے کی خواہش ہی نہیں رہ گئی۔ کتابوں کی دوستی کی شکست خوردہ بازی کو دوبارہ سمیٹنے کو جی نہیں چاہتا۔

''اچانک ایک بار آرٹسٹ سُنیل سے ملاقات ہوگئی۔ آرٹ سے قطع تعلق کرکے وہ اب فلسفی ہوگئے ہیں، لیکن مجھے دیکھ کر اُنھیں مصوّری کی خواہش پیدا ہوگئی۔ پھر اُنھوں نے کیا کیا چمے! جانتے ہو؟ اُنھوں نے جو تصویر بنائی اُس میں ایک بھرے پُرے باغ میں کھڑی ہوئی میں ایک گلاب کے پتّے کو دیکھ کر ہنس رہی ہوں، میرے لبوں کی مسکراہٹ ریزۂ الماس بن کر پتّے پر گر کر نیچے پھسلتی جارہی ہے، اور اُس کے نیچے سُنیل نے لکھا ہے:

زندگی کو تم نظر انداز کرسکتے ہو، مگر موت کو نہیں۔ موت اٹل حقیقت ہے۔

''وہ تصویر سال نو کی نیک خواہشات کے ساتھ جس میرے پاس پہنچائی گئی، اُس دن مجھے ایسا محسوس ہوا

میری قوتِ حیات کو کسی نے میرے خون سے نچوڑ لیا ہو۔ میں اچانک تھک گئی، مجھے ایسا لگا جیسے دنیا کے کسی بھی فرد کے لیے میں قابلِ قبول نہیں ہوں۔

"چمے! میں نقاہت کا احساس کرتی ہوں، لمحہ لمحہ، ریزہ ریزہ گھٹتی جارہی ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں بھرپور خوش حالی کے درمیان زندہ رہنے کا میرے پاس ثمنہ برابر بھی جواز نہیں ہے۔ بولو چمے! کیا میں سراب کے پیچھے دوڑ رہی ہوں؟ کیا میں صحرا میں باغبانی کررہی ہوں؟"

چمے نے جواب نہیں دیا۔ وہ دن رات اسی تحقیق میں مصروف رہتے ہیں کہ انسان اشیائے خوردنی سے بے نیاز ہوکر کس طرح ایک ٹیبلٹ کھا کر زندہ رہ سکتا ہے، انھیں معلوم نہ تھا کہ اس ٹیبلٹ کے علاوہ بھی انسان کسی چیز کے لیے آرزومند ہوسکتا ہے۔ رُوچی کے سوالات کے تیر کھا کر وہ خود کو سطحی سا محسوس کرنے لگے۔

رُوچی نے انھیں ہلاتے ہوئے دوبارہ کہا، "میں جانتی ہوں چمے! کسی عورت کے مُنہ سے یہ باتیں مناسب نہیں معلوم ہوتیں، اچھی بھی نہیں لگتیں۔

"تم نہیں سمجھ سکو گے، تمھارے احباب، تمھارا معاشرہ، تمھاری مردانگی، کوئی اس بات کی قیمت ادا نہیں کرے گا۔ میں اگر ناوقت انتقال کرجاؤں تو تم بھی میرے لیے کچھ غم گین ہولو گے، تم یہ سمجھ ہی نہ سکو گے کہ تمھاری، تمھارے سماج اور دنیا کی عیاریوں کے مابین عام عورت زندہ رہنے کے رمق بھر جواز کے قحط میں... ناوقت؟..."

چمے چیخ پڑے، "خاموش ہوجاؤ رُوچی! پاگل ہوگئی ہو کیا؟"

"میں پاگل نہیں ہوں۔ بہت سی حقیقت آمیز باتیں خاموش رات میں سن کر تم مجھے نارمل نہ سمجھتے ہوئے مخبوط الحواس سمجھ رہے ہو، میں جانتی ہوں، میں تو کہتی ہوں تم بزدل ہو، تم کم زور ہو۔"

"اور رُوچی! تم اب تک مجھے نہیں سمجھ سکیں۔"

"میں اور تمھیں نہ سمجھوں؟ سمجھتی ہوں، تبھی تو اتنی جرأت سے کہہ رہی ہوں۔ میں نہیں جانتی کیا کہ تم نے رُوچی کی خاطر تا عمر تنہائی کی زندگی گزاری ہے، لیکن پندرہ سال پہلے والی رُوچی آج کی رُوچی نہیں ہے۔ تمھاری زندگی کے ایثار کی مثالیں دنیا میں کم یاب ہیں، تم عظیم عاشق ہو، یہ سچ ہے، لیکن تم مرد نہیں بن سکے۔" اِس بار رُوچی اونچی آواز میں رونے لگی، دونوں ہتھیلیوں میں مُنہ بھر لیا۔

چمے نے اُس کے ہاتھوں کو تھام لیا، لیکن رُوچی علیحدہ ہوتے ہوئے زور سے بولی، "تم میرے پاس سے ہٹ جاؤ چمے! میں آج رونے کے لیے کوئی سہارا نہیں چاہتی۔ میں تنہا گریہ وزاری کروں گی۔ اُس میں کسی کی شرکت مجھے پسند نہیں۔ تم دور کھڑے رہو۔ میرے آنسوؤں میں لاتعداد بدنما میاں ہیں، ان سیاہ داغوں سے میرے تئیں اپنی محبت کو برباد نہ ہونے دو۔"

باہر تو جیسے ظلمت کی کوئی حد نہ ہو۔ رُوچی کی آہ و بکا اور سسکیوں سے ندی کی قلقل کے ساتھ بہنے کی آواز مل کر ایک تیسری آواز کی تخلیق کررہی تھی، اور اُس آواز کا مفہوم سمجھنا چمے کے بس میں نہ تھا۔

چمے تو گنگ سے ہوگئے تھے۔ تمام عمر وہ عورت کو نہ سمجھ سکے۔ پردوش کہتا تھا کہ چمے صنفِ نازک سے خائف ہے۔ عورت کے مختلف روپ کبھی کبھی اُس کے ہوش وحواس تک سلب کرلیتے تھے۔

چمے کی محویت دور ہوئی۔ رُوچی نے رونا بند کرکے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ اُنھوں نے نزدیک پہنچ کر کہا، "تم ذرا آرام کرلو رُوچی، میں ڈرائیو کرتا ہوں۔"

"نہیں نہیں، تم بیٹھو۔ تم میرے مہمان ہو چمے! تمھیں آرام پہنچانا میرا فرض ہے، لیکن آج میں نے تمھیں بڑی زحمت دی۔ یہ تکلیف میری خاطر گوارا کرلینا۔ بس دیر ہورہی ہے۔"

چمے مجبوراً بیٹھ گئے۔ آنکھوں میں خشک آنسوؤں کی دھار ہے۔ رُوچی بہت بے رونق سی لگ رہی ہے، لیکن اِس کے باوجود دل کش تھا وہ چہرہ۔ بار بار دیکھنے کے باوجود اُنھیں سیرابی نہ ہورہی تھی۔

لیبارٹری میں تحقیق کرتے ہوئے کئی بار ان کی آنکھوں کے سامنے یہ دل ربا پیکر رقص کرنے لگتا تھا۔ تحقیق کا کام رک جاتا، فارمولا مکمل ہوتا، اور وہ کتابوں کی ورق گردانی کرنا بھی فراموش کردیتے۔ پندرہ سال تک ایک معمولی سے رابطے کے علاوہ اُنھوں نے کوئی تعلق نہ رکھا تھا، کیوں کہ اِس طرح رُوچی کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ تھا، اِسی لیے وہ خود کو خاک میں ملا کر اُسے مُسرت پہنچانے کی سعی ابتدا سے کرتے آئے تھے، لیکن یہ کیا؟

چمے کی پلکیں بند ہوتی جارہی ہیں۔ شاید کھڑکی میں چار بجنے والے ہیں۔ اِتنی دیر تک ڈرائیو کرنے کے باوجود اُنھیں تکان محسوس نہیں ہورہی، شاید خیالات میں غرق ہے۔

نہیں جانے دو، وہ اُس سے کچھ نہ پوچھیں گے، لیکن رُوچی نے تو اُنھیں کچھ کہنے کے لیے بلایا تھا، جواب تک ناگفتہ ہے۔ پوچھ لیں کیا؟ نہیں رہنے دو۔

دل میں از حد اضطراب ہے۔ چہار جانب خلا، ویرانی اور تنہائی۔ دل سائیں سائیں کررہا ہے۔ رُوچی کی شادی کے دن جس بے نام خلش کا احساس اُنھیں ہوا تھا وہی خلش جیسے آج اُن کے ادراک، حافظے اور انا کو چکنا چور کردے گی۔

لیکن رُوچی خاموش ہے، ہول ناک طوفان کے بعد جیسے سرسبز جنگل ساکن ہوگیا ہو۔ چمے نے آنکھیں بند کرلیں۔ اُنھیں پتا نہ چلا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ گاڑی رکنے کی وجہ سے وہ بیدار ہوگئے، لیکن یہ کیا! یہ تو اسٹیشن ہے جہاں وہ شام کو اترے تھے۔ غالباً رُوچی راستہ بھول کر غلط راہ پر نکل آئی ہے۔

"یہ کیا ہے ہوگئے کہ راستہ بھول گئی ہوں۔ ہے نا؟ یہ بات نہیں ہے، ندی کے ساحل سے میں نے گاڑی اسٹیشن کی طرف موڑ دی تھی۔ تم اتر جاؤ۔ گھر لے جاکر میں تمھاری توہین نہیں کرنا چاہتی۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو رُوچی تم! اِتنے دنوں کے بعد میں آیا ہوں، اور تم۔"

"اِسی لیے تو کہہ رہی ہوں چمے! اِتنے دنوں کے بعد رسوائی کے داغوں سے میں تمھیں داغ دار نہیں کرنا چاہتی۔ جس رُوچی کے لیے سماج میں کوئی جگہ نہیں، گھر میں کوئی جگہ نہیں اور نہ ہی کسی عزیز کے دل میں جگہ ہے، وہ تمھیں کہاں جگہ دے گی؟ جینے کے ثمنہ برابر جواز کی عدم موجودگی میں جو ایک طویل عرصے سے بھوکی ہے، وہ تمھاری عزّت کا لحاظ نہیں کرسکے گی۔ تم لوٹ جاؤ چمے! لوٹ جاؤ۔"

"رُوچی سنو، ذرا میری بات تو سنو۔"

"آہ... اب قبول کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں تم سے عقیدت رکھتی ہوں، اِس لیے تمھیں رخصت کررہی ہوں۔ رُوچی کو اِس بے التفاتی کے لیے معاف کردینا چمے! لیکن لوٹ جاؤ مجھے کرب وکوفت سے نجات دو۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا کہ تم برباد ہوجاؤ۔"

اُس لہجے میں نہ جانے کیسا حکم تھا کہ چمے گاڑی سے اتر کر دھیرے دھیرے پلیٹ فارم کی طرف چلنے لگے۔ عقب میں رُوچی چل رہی تھی۔ صبح ہونے کو ہے۔

کمپارٹمنٹ کی ریلنگ پکڑ کر چمے رُوچی کو دیکھ رہے تھے۔ کتنی اُداسی تھی۔ ٹرین نے سگنل دیا۔

چمے نے جھک کر کہا، "معاف کرنا رُوچی! میں تمھیں سمجھ نہ سکا، لیکن تم نے کیا کہنے کے لیے مجھے اِتنے اصرار کے ساتھ بلایا تھا، وہ تو کہا ہی نہیں؟"

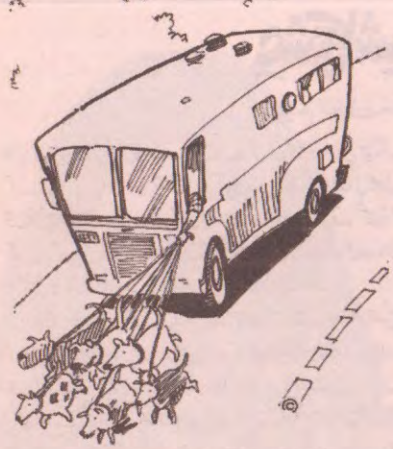

"ڈیئر، اس طرح ہم ایندھن تو بچا لیتے ہیں مگر میں روزانہ باڑے میں سوتے سوتے تنگ آ گیا ہوں۔"

رُوچی نے جیسے چونک کر دیکھا ہو۔ پُرجوش لہجے میں پوچھا، "تم کرسکو گے چمے؟ ایک کام کرسکو گے؟ میں اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے کہہ رہی ہوں۔"

"جلدی کہو رُوچی! ٹرین نہ چھوٹ جائے۔"

رُوچی رو کھی ہنسی ہنس کر بولی، "تم سائنس داں ہو۔ انسانی جسم کو غذا کے بغیر زندہ رکھنے کے لیے تم تحقیقات میں مصروف ہو، مجھے نہیں معلوم، لیکن انسان کے دل کو مردہ ہونے سے بچانے کے لیے تم کیا کررہے ہو؟ کرسکو گے کسی چیز کی ایجاد؟ جدید انسان کی باطنی تنہائی کو تم دور کرسکو گے چمے؟ آج کے انسان کو شدید احساسِ تنہائی اور بے چارگی سے نجات دلانے کے لیے نئی ایجاد ہونی چاہیے، نہیں تو وہ مرجائے گا اور دنیا چند جان وَروں کی قیام گاہ بن کر رہ جائے گی۔"

ٹرین کی سیٹی کی خوف ناک آواز سے چمے کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور کانچ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کی پُرشور جھنکار نے اُن کی قوتِ سامعہ کو معطّل سا کردیا۔

ایسا محسوس ہوا جیسے اُن کی تجربہ گاہ کے تمام آلات اور سائنسی طریقۂ کار دفعتاً گر کر چکنا چور ہوگئے ہوں۔

ٹرین کی رفتار سے ہم آہنگ ہوکر جیسے رُوچی کی رُندھی ہوئی آواز بھی دوڑ رہی ہو۔

عشق کا شین

علیم الحق حقی

عزیز قارئین! اس تحریر کا مطالعہ کرنے سے قبل خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیجیے کہ آپ ایک غیر معمولی اور طویل داستان کا آغاز کر رہے ہیں۔ یہ کوئی روایتی سلسلے وار کہانی نہیں ہے۔ تصوف کی بھول بھلیاں میں عشق کی متلاشی نگاہ کے 'معرفت کی روشنی تک پہنچنے کی داستان ہے۔ یہ عشق کی ابجد کے دوسرے حرف 'شین' کا ابتدائیہ ہے جو آپ ان شاء اللہ ہر ماہ قسط وار مطالعہ کریں گے۔ یہی نہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ مصنف کو صحت و عافیت والی دراز عمر عطا کرے، آپ عشق کا شین کا اختتامیہ اور پھر عشق کا قاف بھی سب رنگ ہی میں ملاحظہ کریں گے۔

اس ابجد کا حرفِ اوّل یعنی عشق کا عین 1995ء میں شائع ہوا۔ اور قارئین کے قلب و ذہن پر ان مٹ نقوش چھوڑ گیا۔ ڈائجسٹ میں چھپنے کے بعد، کتابی صورت میں اس کے متعدد ایڈیشنز شائع ہوئے اور ٹی وی سیریل بھی بنائی گئی۔ اس کی تاثر انگیزی کے تسلسل کا یہ عالم ہے کہ موقع پرست پبلشرز نے انہی ناموں اور ملتے جلتے ناموں سے کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ کسی اور سے عشق کا شین کا دوسرا حصہ لکھوا کر اس عظیم داستان کو مضحکہ خیز انجام تک دے دیا گیا۔ یہ اس کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔

لیکن قارئین کو دھوکا ایک حد تک ہی دیا جا سکتا تھا۔ باذوق اور رمز شناس قارئین کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ محض نام کے بل پر، لایعنی اور بے روح الفاظ کا ہجوم ہے جسے بیچنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہر قلم میں وہ سحر نہیں ہوتا جو الفاظ میں معانی اور تاثیر کی روح پھونک دے۔ لکھنے والے بے شمار ہیں، نقال بھی بہت ہیں... لیکن علیم الحق حقی ایک ہی ہیں... جو اپنا کام محنت، جاں فشانی اور سچائی سے کرتے ہیں اور عاجزی کا دامن نہیں چھوڑتے۔ یعنی ان کے کام کو واہیانہ سراہا جاتا ہے۔ ایسی تحریریں برسوں میں لکھی جاتی ہیں۔ اور پڑھنے والے بھی بڑے صبر و تحمل سے ان کا انتظار کرتے ہیں۔ عشق کا شین کے تحریری سفر میں علیم الحق حقی کی زندگی کے دس برس گزر چکے ہیں۔ اب یہ سفر منزل کے قریب پہنچ چکا ہے۔

غیر معمولی قبولیت عام اور سندِ اعتبار کی حامل یہ داستان، خود مصنف کو بھی اپنی تحریروں میں بہت پسند ہے۔ سب رنگ کے قارئین کے لیے بہ طور خاص اس کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ پڑھیے اور مصنف کو... اور ساتھ ہی ہمیں بھی اپنی دعاؤں سے نوازیے۔

مُشرکوں کے گھر پیدا ہونے والے ٹھاکر اوتار سنگھ کی کہانی
اُس کے مَن میں ایک چنگاری تھی جو شعلہ بننے کے لیے بے تاب تھی
اُسے عشق ہُوا تو ایک خوبصورت آواز سے، جب وہ کلام الٰہی کی قرأت کر رہی تھی
اَب یہ آواز اُس جویائے حق کے لیے راہ نُما تھی

گھور اندھیرے میں جنم لینے والی ہستی کی رُوداد، اس کے وجود میں خیرہ کُن روشنی موج زن تھی

ٹھاکر انی کا جی چاہا کہ بچّے کو اپنی گود میں اٹھالے اور حمیدہ کو دھکے دے کر کمرے سے نکال دے۔ مگر فوراً ہی یہ خیال آ گیا کہ بچّے کی زندگی خطرے میں ہے۔ مگر اس لمحے اُسے حمیدہ سے نفرت... شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی اور اس نفرت کے اظہار کی ضرورت بھی تھی۔ ورنہ ٹھاکرانی کو کچھ ہو جاتا۔ چناں چہ اُس نے اس نفرت کو کسی اور طریقے سے نکالا۔ ''میں نے بچّے کو تیری گود میں اس کا مُنہ دیکھنے کے لیے نہیں دیا ہے حمیدہ۔ دودھ کیوں نہیں پلاتی اسے!'' اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

حمیدہ اس کی منتظر تھی۔ نفرت سے سہی مگر حکم تو ہُوا!

شاید کوئی بھی انسان دو متضاد کیفیات کے درمیان اس قدر برابر سے کبھی تقسیم نہیں ہُوا ہو گا جیسا اس وقت ٹھاکرانی ہوئی تھی۔ اس کے منقسم وجود کا ایک حصّہ اس پر مُصر تھا کہ وہ دودھ پیتے بچّے کو چھوڑ کر کمرے سے نکل جائے۔ کیوں کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ اسے دیکھنا... بلکہ سُننا بھی نہیں چاہتی تھی اور منقسم وجود کا دوسرا حصہ وہی سب کچھ دیکھنے اور سُننے پر اصرار کر رہا تھا۔ پہلا حصہ اس کے اندر کی عورت کے قبضے میں تھا اور دوسرا اس کے اندر کی ماں کے تصرّف میں تھا۔ رقابت کی آگ میں جلتی ہوئی عورت کے لیے بچّہ اس کا محبوب تھا جو اُس سے بے وفائی کر رہا تھا۔ وہ اس کی مسرت بھری چیخیں سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کی بے تابیاں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ جب کہ ماں اسے بچّے کی پہلی سچی خوشی کے اظہار کے ایک ایک لمحے کو اپنی یادداشت پر نقش کر لینا چاہتی تھی۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

اس جنگ میں ماں کو ہی جیتنا تھا... اور وہ جیت گئی۔

ٹھاکرانی رنجیتا جو کر نہیں سکتی تھی، اسے محسوس تو کر سکتی تھی۔

چناں چہ اس وقت وہ ٹھاکرانی نہ رہی، حمیدہ بن گئی۔ اب وہ اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اور وہ محبت ہی محبت تھی... مامتا ہی مامتا! رقابت کی آگ سرد پڑ گئی۔ خود سے بھی کوئی رقابت کرتا ہے!

ننھا ٹھاکر بے سُدھ ہو کر سو گیا۔ پیٹ بھرنے کی لذت اسے پہلی بار ملی تھی۔

سکون صرف ننھے بچے کو نہیں ہُوا تھا۔ سکون تو شاید اس کمرے میں مینہ کی طرح برسا تھا۔ وہاں موجود دونوں عورتیں بھی شرابور ہو گئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں۔ ان کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ ان کے مذہب جدا تھے۔ ان کی حیثیتیں جدا تھیں تو ان کا سکون بھی الگ الگ تھا۔ حمیدہ کا حال اس بستی کا سا تھا جس کے پاس بہتا ہُوا دریا چڑھ گیا ہو اور حفاظتی پشتے کو خطرہ ہو کہ کسی بھی لمحے پانی کا بہاؤ اسے توڑ دے گا۔ اور پھر چڑھا ہُوا دریا پشتے کو توڑ کر بستی پر سے گزر گیا ہو... لیکن معجزاتی طور پر بستی کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر۔ ایک فرض تھا جو اُسے پورا کرنا تھا... اور وہ اس کے اختیار میں بھی نہیں تھا۔ اور وہ اتنا سنگین تھا کہ اسے پورا کرنا آگ کے دریا کو پار کرنے کے برابر تھا۔ فرض پورا کر کے وہ صرف پُرسکون نہیں ہوئی، ڈھیر ہو گئی۔ دو دن کے تنے، چٹختے ہوئے اعصاب جیسے سو گئے۔ اس میں سکت ہی نہیں رہی۔ بھوکے ننھے بچے نے دودھ کیا، اسے نچوڑ ڈالا۔ اب وہ صرف سو جانا چاہتی تھی۔

اُدھر ٹھاکرانی کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس پر کیا گزرتی رہی ہے۔ نیند اور آرام کجا، وہ تو سکون کو بھی ترستی رہی تھی۔ اتنے برسوں کے بعد خزاں میں کھلنے والا پھول، کھلنے سے پہلے مرجھا جانے کے خطرے سے دوچار تھا۔ اس کا بچہ اب تک صحیح معنوں میں سویا بھی نہیں تھا۔ اس کی تو جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔

وہ دودھ پیتے بچے کو دیکھتی، اس کی مسرّت بھری آوازیں سنتی رہی تھی۔ وہ دیدۂ اس کی آنکھوں میں، وہ آوازیں اس کی سماعت میں بس گئی تھیں۔ خاصی دیر بعد اسے احساس ہُوا کہ بچے کی آواز معدوم ہو گئی ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ بچہ دودھ پیتے پیتے سو گیا ہے۔ اس کے ہونٹ اب ہل نہیں رہے ہیں۔

اس نے بڑی نرمی، بڑی آہستگی سے بچے کو حمیدہ کی گود سے اٹھایا۔ حالاں کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بچہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ کسمسایا تک نہیں۔ ٹھاکرانی نے اسے سینے سے بھینچ لیا۔ چھاتیوں میں ابلتا ہُوا دودھ جو کہ آتش فشاں بن چکا تھا، ایک پل میں سرد ہو گیا اور لاوا بہہ نکلا۔ پہلی بار ٹھاکرانی نے سکون کی سانس لی۔ اس کا بچہ زندہ رہے گا۔ اس کا پیٹ بھر گیا ہے اور وہ سو رہا ہے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی اپنی آنکھیں مُند نے لگیں۔ ادھر حمیدہ کو ایسا لگ رہا تھا کہ جسم بے جان ہو گیا ہے۔ ہلنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ لیکن اسے احساس تھا کہ وہ ٹھاکرانی کی مسہری پر بیٹھی ہے... اور یہ بے ادبی ہے۔ ٹھاکرانی کو جلال آ گیا تو خیر نہیں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ٹھاکرانی کو اس کا احساس تک نہیں ہے۔

جیسے تیسے وہ مسہری سے اتری۔ ''چٹخنی کھول دوں مالکن؟'' اس نے ٹھاکرانی سے پوچھا۔

ٹھاکرانی نے بڑی مشکل سے اثبات میں سر ہلایا... اور نڈھال آواز میں بولی۔ ''کھول دے حمیدہ۔'' اور یہ کہتے ہی سو گئی۔

حمیدہ نے چٹخنی گرائی پھر وہ آ کر فرش پر، دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

جمال دین نے ٹھاکر کی خواب گاہ جیسی شاندار جگہ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اور وہ مسہری اتنی بڑی تھی کہ اس پر کئی آدھے لوگ سو سکتے تھے۔

''اپنے بیٹے کو یہاں لِٹا دے جمال دین۔'' ٹھاکر نے مسہری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جمال دین کے ہاتھ پیر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ''یہ... کیسے ہو سکتا ہے ٹھاکر جی؟''

''کیوں نہیں ہو سکتا؟''

''یہ سوتے میں پیشاب بھی کر سکتا ہے ٹھاکر جی۔''

ایک لمحے کو ٹھاکر کو اس خیال سے جھرجھری آئی۔ مگر فوراً ہی اس کے اندر سے کسی نے للکار کر کہا... اس بچے کے حصے کا دودھ جیون بن کر تیرے پُتر کو مل سکتا ہے ٹھاکر۔ لیکن یہ تیرے بستر کو گندہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

ٹھاکر نے جھرجھری سی لی اور تحکمانہ لہجے میں جمال دین سے کہا۔ ''جیسا میں کہتا ہوں، ویسا کر جمال دین۔ اسے یہاں لِٹا دے۔''

جمال دین میں انکار کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے بچے کو لٹا دیا۔ لیکن اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔

وہ نیچے بیٹھنے لگا تو ٹھاکر نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تو بھی یہاں پاؤں پھیلا کر لیٹ جا بچے کے ساتھ۔''

جمال دین کی تو جان پر بن آئی۔ ''مجھے اس پر مجبور نہ کریں ٹھاکر جی۔ میں اپنی جگہ پر ٹھیک ہوں۔''

''اب یہ نہیں ہو سکتا۔ تجھے میری بات ماننا ہو گی۔'' ٹھاکر کے لہجے میں قطعیت تھی۔

جمال دین نے تعمیل کی۔ لیکن اس کی کوشش تھی کہ اس کا جسم گدّے سے نہ لگنے پائے۔

ٹھاکر نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ ''نیند آ رہی ہے جمال دین تو سو جا۔'' اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''نہیں ٹھاکر جی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔''

ٹھاکر کو اس پر ترس آنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لحاظ میں جھوٹ بول رہا ہے۔ ''جھوٹ مت بول جمال دین۔ نیند تیری آنکھوں میں بھری ہوئی ہے۔'' ٹھاکر اس کے معمولات سے واقف تھا۔ صبح سویرے اٹھنے والے تو جلدی سوتے ہیں اور یہاں تو رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ''سو جا۔ یہ میرا حکم ہے۔'' اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''کیسے سو جاؤں ٹھاکر جی۔ کوئی آ گیا تو؟''

ٹھاکر کو ہنسی آ گئی۔ ''یہ میرا خاص کمرا ہے۔ سوائے ٹھاکرانی کے یہاں کوئی نہیں آ سکتا۔ بس تُو سو جا۔''

جمال دین نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔ ٹھاکر کو اندازہ ہو گیا۔ ''تُو سوتا کیوں نہیں؟'' اس نے ڈپٹ کر کہا۔

''یہاں نیند نہیں آئے گی ٹھاکر جی۔'' جمال دین نے بے بسی سے کہا۔

''کیوں نہیں آئے گی؟''

''میں اپنی کھاٹ پر سونے کا عادی ہوں مالک۔ یہاں تو لگتا ہے کہ میں ڈوب رہا ہوں۔''

یہ بات ٹھاکر کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ آرام دہ بستر پر تو اور گہری نیند آنی چاہیے۔ تاہم اس نے اتمامِ حجت کے طور پر کہا۔ ''اچھا... تو کہاں نیند آئے گی تجھے؟''

''نیچے شاید آ جائے۔'' جمال دین کے لہجے میں یقین نہیں تھا۔

''تو چل۔ نیچے آ جا۔''

جمال دین نیچے آ گیا۔ لیٹنے لگا تو ٹھاکر نے مسہری سے تکیہ اٹھا کر اسے دیا۔ اب جمال دین میں انکار کی جرأت نہیں تھی۔ اس نے تکیہ سر کے نیچے رکھا اور قالین پر لیٹ گیا۔ لیکن نیند آنے کے باوجود سو نہیں سکا۔

ٹھاکر بھی نیچے بیٹھ گیا۔ جمال دین کی وجہ سے اسے اوپر اکیلا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد وہ اٹھا اور بچے کے کمرے کی طرف گیا۔ دروازے پر چند لمحے وہ ہچکچاتا رہا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ مداخلتِ بے جا کا مرتکب ہو رہا ہے۔ کہیں حمیدہ بچے کو دودھ نہ پلا رہی ہو۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس صورت میں دروازہ اندر سے بند ہو گا۔ ٹھاکرانی یہ خطرہ کبھی مول نہیں لے گی کہ کوئی اتفاقاً بھی حمیدہ کو چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلاتے دیکھ لے۔

اس نے ہلکے سے دھکیلا تو دروازہ کھل گیا۔ اور وہاں سچ مچ رات کا تیسرا پہر تھا۔ صرف بچہ ہی نہیں، دونوں عورتیں بھی بے خبر سو رہی تھیں۔ حمیدہ تو دیوار سے ٹکے ٹکے ہی فرش پر نیم دراز ہو کر سو گئی تھی۔ اس نے اندر جا کر بچے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا اور وہ بے خبر سو رہا تھا۔ ٹھاکر مطمئن ہو گیا۔

اس لمحے حمیدہ کو دیکھ کر ٹھاکر نے بہت کچھ سوچا۔ پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ راجا کون ہوتا ہے اور بھکاری کون۔ دینے والا ہاتھ راجا کا ہوتا ہے اور لینے والا ہاتھ بھکاری کا۔ اور دینے والا ایسا کچھ دے کہ جو کہیں اور سے نہ مل سکتا ہو تو وہ تو مہاراجا ہُوا۔ تو یہ حمیدہ مہارانی ہے... اور بھکاریوں کی طرح فرش پر سو رہی ہے۔ اس کا دل کٹنے لگا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں اس سلسلے میں کچھ کرے گا۔

اس وقت مخل ہونا مناسب نہیں تھا۔ وہ باہر نکلا، دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ وہاں جمال دین بھی سو چکا تھا۔ شاید ٹھاکر کی موجودگی ہی اس کی نیند میں حارج تھی۔ وہ کمرے سے گیا تو فوراً ہی اسے نیند آ گئی۔

ٹھاکر وہیں نیچے لیٹ گیا... تکیے کے بغیر۔ وہ خود کو یاد دلا رہا تھا کہ اصل میں وہ بھکاری ہے۔ کبھی زندگی چپکے چپکے راستہ بدل لیتی ہے اور آدمی کو پتا بھی نہیں چلتا۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

یہ دودھ کا مسئلہ ٹھاکر کے لیے بہت بڑی اُلجھن بن گیا!

زندگی میں پہلی بار اس نے کسی کا احسان لیا تھا... اور اب وہ اس کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ اتنا تو اس کی سمجھ میں آتا تھا کہ احسان کا صلہ دینا ہے۔ مگر کتنا اور کیسے؟ یہ اندازہ وہ کیسے کرتا۔

راجپوتوں کے ہاں بچے کو کسی اور سے دودھ پلوانے کی کوئی روایت نہیں تھی۔ بلکہ ان کے نزدیک تو یہ بہت بڑی برائی ہی ہوتی۔ یہ تو خون کی طاقت کو کم کرنے کی بات تھی۔ تاہم ٹھاکر یہ سمجھتا تھا کہ دودھ انمول شے ہے۔ اس کا کوئی مول نہیں۔ اس کی قیمت چکائی نہیں جا سکتی۔ مگر پھر بھی کچھ کرنا تو تھا۔ وہ اس معاملے کو روایت کی روشنی میں دیکھنا اور سمجھنا چاہتا تھا۔

اب وہ وہاں گاؤں میں، قریب کے لوگوں سے تو کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے اُسے کسی مسلمان کی ضرورت... اور وہ بھی صاحبِ ثروت اور پڑھے لکھے مسلمان کی۔ وہ سوچتا رہا۔ آخر اسے امان اللہ کا خیال آیا۔ وہ دہلی کا رہنے والا تھا۔ کالج میں اس کے ساتھ پڑھا تھا اور اس کا گہرا دوست بھی تھا۔

چناں چہ ٹھاکر اُس سے ملنے کے لیے دہلی چلا گیا۔

امان اللہ اس سے پہلے جیسی گرم جوشی سے ملا۔ لیکن وہ حیران بھی بہت تھا۔ ''اتنے برسوں کے بعد میری یاد کیسے آ گئی پرتاپ سنگھ؟''

ٹھاکر تھوڑا سا کھسیایا پھر بولا۔ ''یاد کی بات نہیں امان۔ یاد تو میں نے تمھیں ہمیشہ رکھا۔ بس یہ ہے کہ جاگیر کے معاملات میں اُلجھا رہا۔ کبھی نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بس ایک کام سے دہلی آنا ہوگیا۔ سوچا تم سے مل کر پرانی یادیں بھی تازہ کرلی جائیں۔''

''اچھا کیا...'' امان اللہ نے بے حد خلوص سے کہا۔ ''پرانے دوستوں سے مل کر آدمی بڑھاپے میں بھی جوان ہوجاتا ہے۔''

''ہاں۔ بیس برس بعد مل رہے ہیں ہم۔ تمھیں تو میرا خیال کبھی نہیں آیا ہوگا۔'' ٹھاکر نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''خیر... ایسی بات بھی نہیں۔ لیکن تم تو جانتے ہو کہ نوکری میں آدمی کو فرصت کم ہی ملتی ہے۔''

دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پرانی یادوں سے کھیلتے رہے پھر ٹھاکر نے پوچھا۔ ''بچوں کا کیا حال ہے؟''

''سب مزے میں ہیں۔ تین بیٹوں اور ایک بیٹی کی شادی کردی۔ چھوٹا ابھی باقی ہے۔''

''واہ... تم تو دادا بھی بن گئے اور نانا بھی۔'' ٹھاکر کے لہجے میں رشک تھا۔

''ہاں۔ اللہ کا شکر ہے۔ تم سناؤ پرتاپ سنگھ۔''

ٹھاکر مسکرایا۔ ''ابھی چند دن پہلے ہی تو بھگوان نے دَیا کی ہے مجھ پر...'' اس نے کہا۔ ''بیٹا ہُوا ہے میرے ہاں۔''

امان اللہ حیران رہ گیا۔ ''پہلا بچہ! شادی کو تو تمھاری مجھے یاد پڑتا ہے، بائیس تئیس سال ہوگئے۔''

''ہاں امان۔ اب تو میں نراش ہی ہوگیا تھا۔ مگر بھگوان نے دَیا کردی۔''

''بہت بہت مبارک ہو میرے دوست...!'' امان اللہ نے گرم جوشی سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم تو ابھی جوان ہوئے ہو۔''

''مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔''

پھر باتوں باتوں میں ٹھاکر نے دودھ کی بات چھیڑ دی۔ ''تم لوگوں میں تو دودھ باہر سے بھی پلوا دیتے ہیں بچے کو۔'' اس نے کہا۔

''کوئی مجبوری آن پڑے تو اور بات ہے...'' امان اللہ نے کہا۔ ''ورنہ کون ماں اپنے بچے کو دودھ پلانا نہیں چاہے گی۔ میرے ہاں تو ایسا نہیں ہُوا۔ اللہ کا شکر ہے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا...'' ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔ ''میرا مطلب ہے، تم لوگوں میں ایسا ہوتا تو ہے نا؟''

''عرب میں یہ روایت عام ہے'' امان اللہ نے کہا ''ہمارے ہاں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ لیکن تمھیں یہ خیال کیسے آیا ٹھاکر؟''

''ایسے ہی۔ میں اکثر سوچتا ہوں اس پر۔ مجھے عجیب سا لگتا ہے۔ یہ تو خون میں ملاوٹ کرنا ہُوا۔''

ٹھاکر کی امید کے مطابق امان اللہ اپنے ہاں اس رواج کا دفاع کرنے پر اتر آیا۔ ''ایسا نہیں ہے...'' اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''عرب اس معاملے میں راجپوتوں سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ ایسے کسی کے ہاں نہیں بھیج دیتے اپنے بچوں کو۔ ان کی شرائط ہوتی ہیں کہ حسب نسب بھی دیکھتے ہیں۔ پھر عورت صحت مند ہو۔ یعنی اسے کوئی بیماری نہ ہو۔ اور وہ اعلا کردار کی پاکیزہ عورت ہو۔''

''تو اس عورت کو کیا فائدہ؟'' ٹھاکر نے کہا۔ اور دل میں سوچا، اسے تو بن مانگے ہی دودھ پلانے والی میں یہ خوبیاں مل گئیں۔

''بچے کا باپ اس عورت کو اپنی حیثیت کے مطابق طے شدہ معاوضہ دیتا ہے۔''

''نا بھئی۔ دودھ کا کوئی مول ہو ہی نہیں سکتا۔'' ٹھاکر نے حتمی لہجے میں کہا۔

''بے شک دودھ کا کوئی مول نہیں۔ ایسی عورتیں عام طور پر غریب ہوتی ہیں اور پرتاپ سنگھ، عورت اچھا کھائے پیے گی تو دودھ اُترے گا نا۔ بھوکی عورت بچے کو کیا دودھ پلائے گی! جو کسی کے بچے کو دودھ پلائے گی تو اسے خرچا بھی ملے اور دودھ ہوگا تو اس کا بچہ بھی دودھ پیے گا۔ ہُوا نا فائدہ!''

ٹھاکر کی معلومات میں اب اضافہ ہونا شروع ہُوا۔ مگر ابھی اسے اور کرید کرنی تھی۔

''مگر اس بے چاری کو کوئی حیثیت تو نہیں ملے گی۔'' اس نے کہا۔

''یہ کس نے کہہ دیا...'' امان اللہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اس بچے کے لیے اس کا مرتبہ ماں کا ہوتا ہے... اور محترمہ اپنی جگہ۔ دودھ پلانا اس کا احسان ہے جس کا بدلہ چکایا نہیں جاسکتا۔''

تو حمیدہ ننھے ٹھاکر اوتار سنگھ کے لیے ماتا سمان ہے۔ ٹھاکر نے سوچا پھر بولا۔ ''تو وہ دوسرا بچہ... دودھ پلانے والی کا بچہ؟''

''ایسے بچے دودھ شریک بہن بھائی ہوتے ہیں... سگوں کے جیسے۔''

تو وصال دین، ٹھاکر اوتار سنگھ کا بھائی ہے... دودھ شریک بھائی! ٹھاکر پر آگہی کے در کھل رہے تھے۔

''مگر پرتاپ سنگھ، تمھیں اس میں اتنی دل چسپی کیوں ہے؟''

امان اللہ کے لہجے میں تجسس تھا۔ اس لمحے اسے خیال آیا کہ ابھی ذرا دیر پہلے خود ٹھاکر نے ہی بتایا تھا کہ چند روز پہلے اس کے ہاں بیٹا ہُوا ہے۔ اور ٹھاکر کی عمر پچاس کے قریب تو ہے۔ تو ٹھاکرانی 45 سے کم تو نہیں ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ دودھ نہیں اُترا ہو۔ ''کہیں تمھارے ساتھ یہ مسئلہ تو نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں امان۔ میری پتنی کو تو بھگوان نے اتنا دودھ دیا ہے کہ سات بچے ہوتے تو بھی کمی نہ ہوتی۔'' ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔ جو بات اسے سب سے چھپانی تھی، اس میں وہ کسی کو راز دار کیسے بنا سکتا تھا۔

امان اللہ کے اصرار پر وہ رات وہاں رُکا اور اگلے روز واپس چلا گیا۔ معلومات تو اسے حاصل ہوچکی تھیں۔ اب ان کی روشنی میں اسے کیا کرنا تھا، اور سب سے اہم بات ٹھاکرانی کو سمجھانا تھا۔

ٹھاکر نے پہلے ہی اپنے بچے کے معمولات طے کرچکی تھی۔ شروع میں تو وہ ڈر رہی تھی کہ شیر خوار بچے تو بار بار دودھ پیتے ہیں۔ یوں راز کو راز رکھنا ممکن نہ ہوتا۔ بہ ہر حال، اب وہ اپنے چلتے پھرتے اور اپنے بچے کا خیال رکھنے کے قابل ہوگئی تھی۔ اور یہ تو اس کا جیون بھر کا ارمان بھی تھا۔ چناں چہ پہلے مرحلے میں اس نے دائی راجو سے چھٹکارا حاصل کیا۔ اسے کہہ دیا کہ جب کوئی ضرورت ہوگی تو اسے بلا لیا جائے گا۔ دوسرے مرحلے میں اس نے شانتا کو دن کی ڈیوٹی سے آزاد کردیا۔ وہ رات کو آتی اور صبح سویرے چلی جاتی۔ یوں حمیدہ کے لیے دن بھر کی گنجائش نکل آئی۔

ان معمولات کے ساتھ حمیدہ کے بھی نئے معمولات بن گئے۔ جمال دین کھیتوں پر جانے کے لیے نکلتا تو وہ وصال کو لے کر اُس کے ساتھ حویلی آجاتی۔ سات بجے وہ ننھے ٹھاکر کو دودھ پلاتی۔ ٹھاکرانی کے ساتھ رہتی اور ننھے ٹھاکر کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ دس بجے وہ پھر بچے کو دودھ پلاتی۔ اس کے بعد وہ گھر واپس آجاتی۔ کھانا پکاتی۔ جمال دین آتا تو اسے

غزوۂ سویق

یہ غزوہ 5 ذی الحجہ سنہ 2 ہجری میں وقوع پذیر ہُوا۔ ابوسفیان نے منّت مانی کہ جب تک وہ مقتولینِ بدر کا انتقام نہ لے گا، نہ تو غسل جنابت کرے گا، اور نہ سر میں تیل ڈالے گا، چناں چہ وہ دو سو شتر سواروں کے ساتھ مدینۂ منوّرہ کی طرف بڑھا۔ یہود کی نسبت اُسے معلوم تھا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں مدد دیں گے، لیکن اُنھوں نے انکار کردیا۔ ابوسفیان عریض پر حملہ آور ہُوا، جو مدینے سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ اُس نے ایک انصاری ابنِ عمروؓ کو شہید کردیا، اور چند مکانات اور گھاس کے انبار جلا دیے۔

آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپؐ نے مشرکین کا تعاقب کیا۔ ابوسفیان کے پاس رسد کا سامان صرف کھجور کے ستّو تھے، چناں چہ وہ گھبراہٹ میں ستّو کے بورے پھینکتا گیا، جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ عربی میں ستّو کو 'سویق' کہا جاتا ہے، اِس لیے یہ معرکہ 'غزوۂ سویق' کے نام سے مشہور ہُوا۔

مطالعہ ✿ اظہر عباس جعفری

کھانا دیتی۔ جمال دین ذرا دیر کے لیے کمر ٹکاتا۔ تب وہ پھر حویلی جاتی ایک بجے اور پھر چار بجے بچے کو دودھ پلاتی۔ پھر گھر واپس آکر رات کے کھانے کی فکر کرتی۔ شام سات بجے وہ ننھے ٹھاکر کو دن میں آخری بار دودھ پلانے کے لیے جاتی اور اس کے بعد گھر واپس آجاتی۔

پہلے دن ٹھاکرانی رنجیتا کو شام سات بجے سے صبح سات بجے تک کے وقفے سے بہت خوف آیا۔ رات کے وہ بارہ گھنٹے بڑی آزمائش کے تھے۔ اگر ضدی بچہ بھوک سے جاگ اٹھا اور اس نے دودھ مانگا تو کیا ہوگا۔ اس کی ضد سے وہ خوب واقف تھی۔

اس خوف سے اُس رات اسے نیند ہی نہیں آئی۔ نیند سے لڑتی ہوئی شانتا فرش پر پڑ کر سوگئی۔ مگر ٹھاکرانی جاگتی رہی۔ اُدھر ننھا ٹھاکر بے سُدھ سو رہا تھا۔ ٹھاکرانی کو بھی جھونک آ گئی۔

مگر وہ رات ٹھاکرانی کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی لانے والی رات تھی!

ٹھاکرانی کی آنکھ اس احساس سے کھلی کہ ننھے ننھے ہاتھ کسی جستجو میں اس کی چھاتیوں کو ٹٹول رہے ہیں۔ وہ گھبرا کر

اٹھی۔ یہ طے تھا کہ بچے کو بھوک لگی ہے۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ اب حمیدہ کو اس وقت تو نہیں بلایا جاسکتا تھا۔ ٹھاکرانی کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ خود کوشش کرے۔

اس سے پہلے اس طرح کی کوششوں کے نتیجے میں ممتا کی تذلیل کے سوا اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ تماشا بننے سے گھبراتی تھی۔ چناں چہ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شانتا سو رہی تھی۔ کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

اس نے بچے کو گود میں لٹاتے ہوئے کہا۔ ”اب تو ماں کی بھینٹ سویکار کرلو میرے ضدی بچے۔“

اگلے ہی لمحے اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ ننھا ٹھاکر بڑی رغبت سے اس کا دودھ پی رہا تھا۔

وہ ٹھاکرانی کی زندگی میں آنے والی سب سے بڑی، سب سے سچی خوشی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ ساری دنیا کو وہ منظر دکھائے۔ ڈھنڈورا پٹوائے کہ اس کے بچے نے اس کا دودھ قبول کرلیا ہے۔

بچے کے ماں کے دودھ کو رد کرنے کے تو بہت سے گواہ تھے۔ مگر اس کی قبولیت دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ شانتا تھی مگر وہ سو رہی تھی۔ ٹھاکرانی جھنجلا گئی۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ تو بہت اچھا موقع ہے۔ بچے کے دودھ کے معاملے میں تمام شکوک و شبہات ہمیشہ کے لیے دُھل سکتے ہیں۔

اس نے کرخت آواز میں شانتا کو پکارا۔ ”مُردار... یہاں سونے کے لیے آئی ہے تو!“

شانتا گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ”آنکھ لگ گئی تھی مالکن۔ چھوٹے ٹھاکر بھی تو سو رہے تھے۔“

”مگر اب اٹھ گئے ہیں۔ دودھ کا وقت ہوگیا ہے ان کے۔ روز پیتے ہیں۔ تبھی تو خوش رہتے ہیں...“ ٹھاکرانی نے بڑے ٹھسّے سے کہا۔ ”اور اپنی ماں کا دودھ کون سا بچّہ نہیں پیتا۔“

”پہلے تو نہیں پیتے تھے مالکن۔“ شانتا نے دبے لہجے میں کہا۔

”میرے دودھ میں کوئی خرابی تھی...“ ٹھاکرانی بولی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس وقت ہر بات نبھائی جاسکتی ہے۔ اس نے کہا۔ ”حمیدہ نے ایک بوٹی لاکر دی تھی مجھے... جس سے دودھ کی کڑواہٹ دُور ہوگئی، اسی لیے تو میں نے حمیدہ کو قریب کرلیا ہے۔“

اچانک ٹھاکرانی کو احساس ہُوا کہ ننھا ٹھاکر دودھ پیتے پیتے سو چکا ہے۔ اس نے شانتا کو پکارا۔ ”پنگھوڑے میں لِٹا دے شانتا۔“

چند منٹ میں ٹھاکرانی بہت پُراعتماد ہوگئی تھی۔ اس نے بچے کو اپنے پاس سلایا تھا تاکہ تماشا نہ بنے۔ اب اسے یقین تھا کہ بچہ اس کا دودھ بھی پی لے گا۔ شانتا نے چھوٹے ٹھاکر کو پنگھوڑے میں لٹا دیا۔ ٹھاکرانی بھی بستر پر دراز ہوگئی۔

لیکن خاصی دیر وہ سو نہ سکی۔ خوشی اور فتح کا احساس اسے ہیجان میں مبتلا کررہا تھا۔ اس دوران اس نے بہت کچھ سوچا بھی۔ اسے بہت سارے گواہ بنانے ہوں گے۔ پھر کوئی بھی حمیدہ پر دودھ پلانے کا شبہ بھی نہیں کرسکے گا۔ اس نے کہا۔ ”کل سے تیرے ساتھ یہاں کوئی اور بھی ہوگا۔ ایک سوئے تو ایک جاگے۔“

شانتا گھبرا گئی۔ ”اب ایسا نہیں ہوگا مالکن۔“

”میں غصے سے نہیں کہہ رہی ہوں...“ ٹھاکرانی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”تُو ہر روز ہوگی۔ باقی تو کراناں روز بدلتی رہیں گی۔“

”ٹھیک ہے مالکن۔“ شانتا نے شکر گزاری سے کہا۔

اس لمحے ٹھاکرانی کو ایک خیال اور آیا۔ اب جب کہ بچے نے اس کا دودھ قبول کرلیا ہے تو ممکن ہے کہ اس کے دودھ میں ہی کوئی خرابی رہی ہو، جو اَب دُور ہوگئی ہو۔ ایسا ہے تو حمیدہ سے دودھ پلوانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

یہ سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔

وہ جاگی تھی کہ ننھا ٹھاکر ٹھیک چھ بجے اٹھ جاتا ہے۔ اس کی بھی آنکھ کھل گئی۔ شانتا بچے کے کپڑے بدل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”شانتا چھوٹے ٹھاکر کو میرے پاس لِٹا دے اور تُو اب چلی جا۔“

شانتا کے جانے کے بعد ٹھاکرانی نے بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کی۔ اسے خوشی تھی کہ اس نے شانتا کے جانے کے بعد وہ کوشش کی تھی۔ ورنہ بھرم ٹوٹ جاتا۔ اب ننھا ٹھاکر پھر اس کے دودھ سے انکاری تھا۔

اور سات بجے حمیدہ کے آتے ہی وہ مشینی انداز میں بہت تیز ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ وہ اس سے دودھ مانگ رہا تھا۔ ٹھاکرانی نے سمجھ لیا کہ اس کے غیر معمولی طور پر سمجھ دار بچے نے اسے صرف رات کا اعزاز دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ دن میں اس کی ضد برقرار ہے۔ مگر اسے رنج نہیں ہُوا۔ یہ خوشی کم نہیں تھی کہ بچے نے اس کی ممتا کو بے عزّتی سے بچالیا تھا اور پردہ بھی رکھ لیا تھا۔

اگلے چند روز میں سب کو معلوم ہوگیا کہ چھوٹے ٹھاکر نے ٹھاکرانی کا دودھ سویکار کرلیا ہے!

ٹھاکر چند روز بہت مصروف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ رنجیتا سے بات کرنے سے پہلے کچھ ضروری کارروائیاں مکمل کرلے۔

کچہری کے کام لمبے ہوتے ہیں۔ ٹھاکر کی بڑی بات تھی۔ مگر رسمی کارروائی میں بھی وقت تو لگتا ہے۔

کاغذات مکمل ہوگئے تو اس رات اس نے ٹھاکرانی کو اپنے کمرے میں بلالیا۔ اب ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہ خود دن میں کئی بار ٹھاکرانی کے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ اس تبدیلی کی وجہ بیٹا تھا جسے دیکھے بغیر اسے چین نہیں آتا تھا اور اب وہ بیٹے کو دیکھ کر خوش بھی بہت ہوتا تھا۔ دودھ کا مسئلہ حل ہوجانے کے بعد ننھا ٹھاکر اوتار سنگھ بہت مختلف، بہت پیارا اور من موہنا بچہ ثابت ہورہا تھا۔ اس کی ادائیں دل جیتنے والی تھیں۔ وہ ابھی بہت چھوٹا تھا... بولنے کی منزل سے بہت دور۔ مگر اس کے اظہار کی غیر معمولی قدرت تھی۔ خوشی، غصّہ، محبت، خفگی... بچوں کے سب جذبے ہوتے ہیں۔ ننھا ٹھاکر ان کا بھرپور اظہار کرنا جانتا تھا۔

ٹھاکرانی خاص کمرے میں پہنچی تو ٹھاکر مسہری پر نیم دراز تھا۔ ٹھاکرانی اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی اور پیر چھوتے ہوئے بولی۔ ”کیا سیوا کروں سوامی جی؟ پیر دبادوں آپ کے؟“

”مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے رنجیتا۔“

”حکم کریں ناتھ۔“ ٹھاکرانی مسکرائی۔ ”ویسے مجھے اندازہ ہے کہ بات آپ کے پُوت سے متعلق ہی ہوگی۔“

ٹھاکر اوتار سنگھ بھی مسکرا دیا۔ ”اب اور کوئی بات تو جیسے ہم کر ہی نہیں سکتے۔“

”سو تو ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ آپ کمرے میں آتے ہیں تو اوتار سنگھ کے سوا کہیں نظر ہی نہیں پڑتی آپ کی۔“

”برسوں کی پیاس ہے نا...!“ ٹھاکر نے کہا۔ پھر بولا۔ ”جو میں کرنے والا ہوں، بات بہت بڑی ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرنا۔“

”سمجھ میں چاہے نہ آئے، مگر آپ کی بات ماننا میرا دھرم ہے۔“

ٹھاکر چند لمحے سوچتا رہا کہ بات کہاں سے شروع کرے، کس طرح کرے۔ بالآخر اس نے کہا۔ ”یہ دودھ والا جو معاملہ ہے، ہمارے لیے تو بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ ہمیں تو اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ مگر جاننا بھی ضروری ہے۔“

ٹھاکرانی مُنہ سے کچھ نہ بولی۔ بس مستفسرانہ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

”تم جانتی ہو کہ راجپوتوں کو اُپکار راس نہیں۔ سر کا جھکنا قبول نہیں ہوتا ہمیں۔ اور احسان سر جھکا دیتا ہے۔ راجپوت کے لیے سر جھکانا موت کے برابر ہے۔ مگر جیون بھی عجیب چیز ہے۔ منش کتنا ہی طاقت ور ہو، بھگوان کی اِچھا کے آگے بے بس ہوتا ہے۔ منش کا منش سے کام نکلتا ہے۔ مگر راجپوت تو کسی سے کچھ نہیں لیتا... جیون بھی نہیں۔ لینا پڑ جائے تو اس کا بڑھ چڑھ کر بدلہ دیتا ہے تاکہ سر تھوڑا سا اٹھانے کی گنجائش نکل آئے۔ بس یہ راجپوت کی آن کی بات ہے۔ ورنہ سر کسی کے آگے جھک جائے تو کبھی نہیں اٹھتا۔ تم سمجھ رہی ہو نا رنجیتا؟“

ٹھاکرانی رنجیتا خوب سمجھ رہی تھی۔ اس کی رگوں میں بھی تو راجپوت خون تھا۔ ”جی ناتھ۔“

”ہمارا یہی حال ہے۔ ہم پر کسی نے اُپکار کیا ہے۔ چھوٹا موٹا نہیں، جیون جیسی چیز دان کرنے کا اُپکار... اور وہ بھی ہمارے اس پوت کے لیے جو برسوں سے ہمارا سپنا تھا اور لگتا تھا، پورا کبھی نہیں ہوگا۔ اب اوتار سنگھ کے لیے تو ہم کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ ہے نا رنجیتا؟“

”اوش کرسکتے ہیں ناتھ۔“

”میں اس پر سوچتا رہا ہوں ٹھاکرانی۔ میں نے اس کے لیے جان کاری بھی کی ہے۔ مسلمانوں میں ایسے دودھ پلوایا جاتا ہے۔ اس کی اُجرت بھی دی جاتی ہے۔ ہر آدمی اپنی حیثیت کے مطابق اُجرت دیتا ہے۔ مگر دودھ پلانے کا احسان اپنی جگہ رہتا ہے۔ تو رنجیتا، ہم جمال دین اور حمیدہ کے سامنے سر کبھی نہیں اٹھا سکتے۔ ہمیں انھیں اپنے برابر کا مقام دینا ہے۔“

ٹھاکرانی کچھ دیر سوچتی رہی۔ یہ خیال کئی دن سے اسے بھی ستا رہا تھا۔ اور جو کچھ ٹھاکر کہہ رہا تھا، وہی اس نے بھی سوچا تھا۔ وہ تو ماں تھی۔ یہ کام اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ لیکن ٹھاکر کے لیے آسان نہیں تھا۔ اسے بس یہی فکر تھی۔ اب بھی وہ جو کچھ سوچ رہی تھی، ٹھاکر کے نکتۂ نظر سے سوچ رہی تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”مگر وہ تو ہماری رعیت ہیں نا ناتھ۔ انھیں برابری کیسے دے سکتے ہیں؟“

”ٹھیک کہتی ہو۔ یہی میں نے سوچا تھا۔“ ٹھاکر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ”میں نے اس کا اُپائے بھی سوچ لیا ہے۔“

”وہ کیا ہے ناتھ؟“

”ہم انھیں دودھ کی اُجرت دیں گے۔ اتنی کہ وہ ہماری رعیت نہیں رہیں گے۔ ہمارے برابر کے ہوجائیں گے۔“

ٹھاکرانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ بولی۔ ”میں مطلب نہیں سمجھی ناتھ۔“

”میں اپنی ساری زمین، جائیداد، نقدی، زیورات، سب آدھے سے کچھ زیادہ جمال دین کے نام کررہا ہوں۔ یہ اُن کا حق بھی ہے۔ پھر ان کے سامنے ہمیں کبھی بڑائی کا احساس بھی

نہیں ہوگا۔"

ٹھاکرانی تو حمیدہ کے سامنے اپنے احساسِ برتری کو پہلے ہی ہار چکی تھی۔ اسے فکر تھی تو بس ٹھاکر کی۔ یہ سُن کر اُس نے سکون کی سانس لی۔ ٹھاکر بڑے خلوص سے سر جھکانے کا سامان کر رہا تھا۔ مسئلہ حل ہوگیا تھا۔

ٹھاکر بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں رنجیتا؟" اس نے بہت نرم لہجے میں پوچھا۔

"یہ کیسی بات کی ہے ناتھ۔ میرے لیے تو آپ کے چرنوں کی دُھول ہی بہت ہے۔ رہے چھوٹے ٹھاکر، تو ان کی فکر آپ کو مجھ سے زیادہ ہوگی اور یہ تو میں جانتی ہوں کہ بھگوان کا دیا اتنا ہے کہ میرے چھوٹے ٹھاکر کی نسلوں کے لیے کافی ہے۔"

ٹھاکر نے اسے گلے سے لگالیا۔ "تم بہت اچھی پتنی ہو رنجو۔"

"یہ بتائیں، آپ نے کاغذات بنوالیے ہیں؟" ٹھاکرانی نے اچانک کہا۔

"ہاں اور نقدی اور زیورات تو گھر کی بات ہے۔"

ٹھاکرانی سوچ میں پڑ گئی۔ ٹھاکر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے بعد ٹھاکرانی نے سر اٹھایا اور دبے دبے لہجے میں بولی۔ "ابھی آپ نے یہ سب کچھ انھیں دیا تو نہیں؟"

"نہیں..." ٹھاکر نے کہا۔ "مگر یہ تو بتاؤ، بات کیا ہے؟"

"دیکھیں۔ ابھی یہ سب کچھ کریں گے تو سب کو خوج ہوگی کہ یہ کس بات کا انعام ہے۔ بہت سے لوگ سمجھ بھی جائیں گے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

ٹھاکر نے بھی ایک لمحے سوچا۔ "تم عقل والی ہو رنجو۔ بات تو ٹھیک ہے۔ مگر میں اب یہ کام کر کے رہوں گا۔"

"آپ کریں گے تو ٹھیک ہی ہوگا۔" ٹھاکرانی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں جمال دین سے کہہ دوں گا کہ تین چار سال تک کسی کو پتا نہ چلے۔"

"اپنی بڑائی کوئی نہیں چھپاتا ناتھ۔"

"میں آدمی کو پہچانتا ہوں رنجو۔ جمال دین تو شاید یہ بات کبھی بھی کسی کو نہیں بتائے گا۔ وہ یہ سب کچھ آسانی سے لے گا بھی نہیں۔"

"ٹھیک ہے ناتھ۔ میرے لیے کوئی اور حکم؟"

"حکم نہیں، بنتی ہے۔ تم حمیدہ کو کبھی خود سے کم نہ سمجھنا، ہمیشہ اس کی عزت کرنا اور اپنے بیٹے کو بھی یہی کچھ سکھانا۔ حمیدہ اس کے لیے ماتا سمان ہے اور وصال دین، بھائی جیسا ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا سوامی جی۔"

ٹھاکر کا یہ دوغلا نہیں تھا کہ اسے آدمی کی پہچان ہے!

اسی رات جب پورا گاؤں سو رہا تھا تو ٹھاکر، جمال دین کے گھر میں بیٹھا تھا۔ اس کے کہنے پر جمال دین نے حمیدہ کو بلایا۔ حمیدہ آئی تو ٹھاکر نے نقدی اور زیورات کی گٹھڑی اس کے قدموں میں ڈال دی۔

حمیدہ تو گنگ ہو کر رہ گئی۔ جمال دین نے گھبرا کر پوچھا۔ "یہ کیا ہے ٹھاکر جی؟"

"کھول کر دیکھو۔ یہ سب حمیدہ کا ہے۔"

حمیدہ بُت بنی بیٹھی تھی۔ جمال دین نیچے بیٹھا اور اس نے کانپتے ہاتھوں سے گٹھڑی کھولی۔ گٹھڑی کھلی تو ان دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"یہ... یہ سب...؟" جمال دین نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ حمیدہ اب بھی چُپ تھی۔

"یہ اس دودھ کا حق ہے جو حمیدہ نے میرے بچے کو پلایا ہے۔" ٹھاکر نے کہا۔

پھر حمیدہ پہلی بار بولی... اور اس کے لہجے میں اذیت تھی۔ "قیمت ادا کر رہے ہیں ٹھاکر جی؟"

ٹھاکر تڑپ گیا۔ "نہیں۔ یہ تمھارے ہی ہاں کے رواج کے مطابق ہے... میں نے مسلمان دوست سے جو کچھ سنا تھا، اسے استعمال کیا۔ "قیمت ادا ہو ہی نہیں سکتی..." اس نے آخر میں کہا۔ "یہ بات بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں میں۔"

"ٹھاکر جی، میں نے آپ کے بچے نہیں، اپنے دل کے کہنے پر دودھ پلایا ہے چھوٹے ٹھاکر کو۔ میں تو تڑپ رہی تھی، مر رہی تھی اس کے لیے۔ آپ نے تو اجازت دے کر احسان کیا ہے مجھ پر۔ اور میں اس کا صلہ نہیں دے سکتی۔ اس لیے میں یہ سب کچھ نہیں لے سکتی۔" حمیدہ نے کہا۔

"مگر اس کا صلہ تو تمھارے رواج کے مطابق تمھارا حق ہے۔"

"یہ دیسی بات نہیں مالک۔ میں سچ کہتی ہوں کہ اگر چھوٹے ٹھاکر کو دودھ نہ پلاتی تو مر جاتی شاید۔"

غیر عورت کی یہ اپنائیت... بلکہ محبت بھری بات سُن کر ٹھاکر کو کچھ ہوگیا۔ اس کے دل میں اس غیر عورت کے لیے عجیب طرح کی محبت پھوٹی۔ "تو حمیدہ، میرے بچے سے کوئی ناتا تو ہے نا تمھارا۔ کوئی کسی کے لیے یوں نہیں تڑپتا، یوں نہیں مرتا۔ اب میں تم سے کہتا ہوں حمیدہ کہ آج سے تم میری بہن اور... اور بہن ہونے کا حق تم پہلے ہی ادا کر چکی ہو۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں مالک؟"

"اب مجھے کبھی مالک نہ کہنا۔ میں بھائی ہوں تمھارا۔ ہم ٹھاکر کبھی کسی سے رشتہ نہیں جوڑتے۔ جوڑ لیں تو جیون بھر نبھاتے ہیں۔"

"ہم اس قابل نہیں مالک۔" اب کے جمال دین ہاتھ جوڑ کے گڑگڑایا۔

"اب تم کیا چاہتے ہو۔ یہ کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ لوں۔" ٹھاکر غرایا۔

جمال دین تھر تھر کانپنے لگا۔ حمیدہ سر جھکا کر بولی۔ "ٹھیک ہے دیر جی۔ تمھارا بوجھ ہم نہیں اٹھا سکتے۔" اس نے گٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تو اب تمھارا ہے۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی بہن کا حصہ۔ اور اس کے علاوہ بہت کچھ ہے..." ٹھاکر نے جیب سے کاغذات نکال کر زیورات پر رکھ دیے۔ "یہ زمین کے کاغذات ہیں۔"

حمیدہ رونے لگی۔ "یہ میں کیسے مان لوں..."

"تو بھائی کی ارتھی اٹھنے پر مانو گی۔" ٹھاکر نے کڑے لہجے میں کہا۔

جمال دین کا چہرہ فق ہوگیا۔ "چلو حمیدہ... اٹھاؤ اسے۔ آپ کوئی بات نہ کرنا..." اس نے حمیدہ کو ڈانٹا۔ پھر وہ ٹھاکر کی طرف مڑا۔ "آپ کوئی بُری بات مُنہ سے نہ نکالنا مالک۔ ہم ہاں نثار لوگ ہیں۔ یہ سب نہیں سُن سکتے۔"

"تم بھی آئندہ مجھے مالک نہ کہنا۔" ٹھاکر نے جمال دین سے کہا۔

"تت... تو... کیا...؟"

"تم کون ہو میرے؟"

"میں آپ کا وفادار غلام ہوں۔"

"نہیں۔ حمیدہ، بہن کے رشتے سے اب تم میرے جیجا ہو۔"

"تو میں کیا کہوں مالک؟"

ٹھاکر نے چند لمحے سوچا پھر بولا۔ "بس ٹھاکر جی کہہ لینا۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔"

"اب میں چلتا ہوں..." ٹھاکر نے کہا۔ مگر دروازے پر رکا وہ مُڑا۔ "سنو... اس رشتے سے میرے گھر، میرے گھر پر یوار پر تمھارا ادھیکار ہے۔ یہ بات کبھی نہ بھولنا اور میرے گھر میں کوئی بھی اس سے انکار نہیں کرے گا۔ یہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی زبان ہے۔" پھر وہ گھر سے نکل گیا۔

آنے والے وقت میں یہ ثابت ہوتا گیا کہ ننھے ٹھاکر اوتار سنگھ کو کسی کی تربیت کی ضرورت نہیں۔ وہ دودھ کے حق کو اور اس کے رشتوں کو خوب پہچانتا تھا۔ اس کی بے معنی غوں غاں بامعنی لفظوں سے قریب ہونے لگی تو کیا ٹھاکرانی اور کیا ملازم، سبھی اسے سکھانے پر تُل گئے۔ ٹھاکر کے لیے پتا جی اور ٹھاکرانی کے لیے ماتا جی بس انھی دو لفظوں کی تلقین کی جارہی تھی اسے۔ لیکن خود اس نے دودھ کا احترام ملحوظ رکھا۔ پہلا لفظ جو اس کی زبان سے ادا ہُوا، وہ اماں تھا... اور حمیدہ کے لیے تھا۔ اور پہلا لفظ ادا کرنے کے بعد وہ دو ماہ تک اور کچھ نہیں بولا۔ سکھانے والوں کو لگتا تھا کہ وہ دیوار سے سر پھوڑ رہے ہیں اور حمیدہ کو اماں کہتے ہوئے اس کی آواز میں لپک، لہجے میں مٹھاس اور آنکھوں میں وارفتگی ہوتی تھی۔

پھر دو ماہ بعد وہ بولا تو خوب بولا۔ ابتدا میں ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ بلا کا ذہین ہے۔ ایک بار سننے کے بعد کوئی لفظ بھی اس کے حافظے سے محو نہیں ہُوا۔ اس کی سیکھنے کی رفتار بہت تیز تھی۔

بچے کی بڑھوتری کا عمل اتنا خوب صورت ہوتا ہے کہ مائیں اس کے سحر میں گرفتار رہتی ہیں۔ اور ٹھاکرانی رنجیتا تو وہ ماں تھی جسے ناامیدی کی انتہا پر پہنچ کر معجزانہ طور پر بیٹا ملا تھا۔ وہ تو زندگی کا سب سے خوب صورت وقت گزار رہی تھی۔ اسے ہوش ہی نہیں تھا۔ وہ تو جب چھوٹا ٹھاکر پٹ پٹ بولنے لگا اور بولتا چلا گیا تو اچانک ایک دن اسے خیال آیا کہ اب وہ کسی دن، کسی کے بھی سامنے حمیدہ سے دودھ مانگ سکتا ہے۔ تب اس نے پہلی بار اسے سمجھایا۔ "پُتر... کبھی کسی کے سامنے اماں سے دودھ نہ مانگنا اور کبھی کسی کو بتانا بھی نہیں۔"

ننھا ٹھاکر ٹکر ٹکر ماں کو دیکھتا رہا۔ مُنہ سے کچھ نہیں بولا۔ اس نے وجہ بھی نہیں پوچھی۔

☆☆☆...کتابی سلسلہ...☆☆☆
دنیا زاد
تازہ شمارہ نمبر (25) شائع ہوگیا
پتا: بی-155، بلاک 5 گلشنِ اقبال۔ کراچی
ای میل asiffarrukhi@hotmail.com

وہ ٹھاکرانی کو بعد میں احساس ہُوا کہ چھوٹے ٹھاکر کی زبان چلے چھ ماہ ہو چکے ہیں اور وہ اب اسے یہ بات سمجھا رہی ہے۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ ان چھ ماہ میں اب تک چھوٹے ٹھاکر نے ایسا نہیں کیا ہے۔ ورنہ تو اس کی بے خبری میں بھانڈا پھوٹ چکا ہوتا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ کے دو سال کا ہوتے ہوتے بہت کچھ واضح ہو چکا تھا۔ وہ حمیدہ کو اپنی ماتا جی سے کم نہیں سمجھتا تھا، بلکہ شاید ماتا جی کی نسبت اس سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ دوسرے وہ وصال دین سے بہت قریب تھا۔ اتنا قریب کہ اس سے دُوری اسے گوارا نہیں تھی۔ وہی ایک اس کا ہم جولی تھا۔ اپنی ہر چیز، ہر کھلونے میں وہ اسے شریک کرتا تھا۔ اس کے بعد کھیلتا ہی نہیں تھا اور وہ اپنے سے دس ماہ بڑے وصال دین کو ویر جی کہتا تھا۔ لیکن حمیدہ اور وصال دین سے کہیں بڑھ کر اُس کا جمال دین سے تعلق تھا۔ جمال دین سے اس کا سامنا بہت کم ہوتا تھا۔ لیکن جب بھی ہوتا، وہ جمال دین سے بڑے احترام اور ادب سے ملتا اور کسی کے سمجھائے بغیر وہ خود سے اسے چاچا جی کہتا تھا۔ ہاں، ٹھاکر پرتاپ سنگھ سے اسے بے حد محبت تھی۔ اور وہ جانتا تھا کہ ان سے ناز برداری کرانا اس کا حق ہے۔ اور لطف یہ کہ اس کے خیال میں ان پر ویر جی... یعنی وصال دین کا بھی اتنا ہی حق تھا۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ ان دو برسوں میں بہت بدل گیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ حویلی سے باہر ہی نہ نکلتا۔ ہر وقت اپنے بیٹے کو دیکھتا رہتا۔ اپنے بچوں کو جسمانی محبت اور قربت دینا راجپوت کا مزاج نہیں۔ لیکن ٹھاکر مختلف تھا۔ وہ بیٹے کو گود میں اٹھاتا، زانو پر بٹھاتا، اسے چومتا، پیار کرتا اور ٹھاکرانی یہ دیکھ کر نہال ہوتی۔ یہ بیٹا اس کی زندگی میں بہار لایا تھا۔

ٹھاکر کی ایک بات عجیب تھی۔ وہ اپنے ننھے سے بیٹے سے بڑے احترام سے بات کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے آپ کہتا۔ اس نے کبھی اسے تم کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔ سچ یہ ہے کہ اتنی عزت اس نے کبھی کسی کو نہیں دی تھی۔ شاید اس کا سبب وہ واقعات تھے جو ننھے ٹھاکر کی پیدائش سے پہلے اور فوراً بعد پیش آئے تھے۔ ٹھاکر کے دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ اس کا بیٹا بہت خاص ہے... کوئی آسمانی چیز!

ٹھاکر نے بیٹے کے لیے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ کوئی کھلونا ایسا نہیں تھا جو وہ اس کے لیے نہیں لایا ہو۔ اور اسے خوشی تھی کہ اس کا بیٹا اپنے دودھ شریک بھائی کو اپنی ہر چیز میں شریک کرتا ہے۔ وہ بہت خوش، مطمئن اور آسودہ تھا۔

ننھے ٹھاکر کو لکڑی کا گھوڑا بہت پسند تھا۔ وہ اس پر بیٹھ کر جھولتا رہتا۔ آگے پیچھے، آگے پیچھے۔ پھر ایک دن اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس تحرک کے باوجود وہ اور اس کا گھوڑا وہیں کے وہیں رہتے ہیں، ذرا سا بھی آگے نہیں بڑھتے۔ شاید اس کا غیر شعوری احساس اسے ویر جی کو گھوڑے پر سواری کرتے دیکھ کر ہو گیا تھا۔ لیکن شعوری طور پر اس نے یہ بات اپنے ہی حوالے سے سمجھی اور پھر اُس نے اس گھوڑے کو چھوڑ دیا۔ وہ اس کے دل سے اتر گیا تھا۔

تب چھوٹے سے ٹھاکر اوتار سنگھ نے ایک بڑی بات سمجھی۔ لکڑی کا وہ گھوڑا اسے بہت محبوب تھا اور اب وہ دل سے اُترا تو جیسے اس کے اندر کوئی کمی ہو گئی۔ کوئی خلا پیدا ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں بہت کچھ ہُوا۔ وہ چڑچڑا اور اداس ہو گیا۔ اسے جھنجلاہٹ تھی کہ گھوڑا اس کی توقع پر پورا نہیں اُترا۔ وہ بے کیف اور ناخوش ہو گیا۔

یہ بات ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے محسوس کر لی۔ ”کیا بات ہے پُتر، آپ چپ چپ کیوں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”پتا نہیں پتا جی۔“ تین سالہ اوتار سنگھ نے جواب دیا۔

ٹھاکر نے متروک گھوڑے کو دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی کیوں کہ پچھلے کافی دنوں سے اس کے بیٹے کا محبوب ترین مشغلہ اس پر سواری کرنا تھا۔ ”اور آج آپ اس گھوڑے پر بیٹھ کر سیر کو بھی نہیں گئے۔“ اس نے کہا۔

”یہ گھوڑا بہت خراب ہے پتا جی۔“

”کیوں بھئی؟ کیا خرابی ہے اس میں؟“ ٹھاکر نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”یہ ایک جگہ کھڑا رہتا ہے۔ اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھتا۔“

”تو پھر؟“

”میں اس پر بیٹھ کر سیر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نہیں کر سکتا۔ اب میں اس پر نہیں بیٹھوں گا۔“

”تو پُتر، یہ اصلی گھوڑا تو نہیں ہے۔ یہ تو لکڑی کا گھوڑا ہے۔“

”آپ مجھے اصلی گھوڑا لا دیں۔ میں بیٹھوں گا۔“

”ابھی آپ بہت چھوٹے ہو پُتر۔ اس پر نہیں بیٹھ سکتے۔ بڑے ہوں گے تو میں خود آپ کو گھڑ سواری سکھاؤں گا۔“

”نہیں پتا جی۔ مجھے تو ابھی گھوڑے پر بیٹھنا ہے۔“

ٹھاکر پرتاپ سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اس کا بیٹا ضد کم کرتا ہے لیکن ضد کرے تو پھر پیچھے نہیں ہٹتا۔

ضد سمجھانے کا مطلب یہ تھا کہ اس کی ضد بڑھے گی۔ چناں چہ اس سے بچنا ضروری ہے۔ مگر اب اسے بہلایا کیسے جائے۔

اچانک وہ مسکرایا۔ وہ کسی بھی رنگ، نسل اور مذہب سے تعلق رکھتا ہو، ہر باپ کے اندر ایک گھوڑا چھپا ہوتا ہے۔ اس لیے ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے اندر بھی ایک گھوڑا ہنہنایا۔ ”میں آپ کو ابھی ایک ایسا گھوڑا لا کر دیتا ہوں پُتر۔“ اس نے کہا اور کمرے کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک لمبی ڈوری تھی۔ اس ڈوری کو اس نے درمیان میں سے اپنے دانتوں سے گزارا اور پھر گھٹنے ٹکا کر گھوڑا بن گیا۔ ”آؤ پُتر، بیٹھ جاؤ میرے اوپر۔“ اس نے ننھے سے کہا۔

ننھا ٹھاکر بڑے اشتیاق سے اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ وہ اصلی گھوڑے کے مسئلے کو بھول ہی گیا تھا۔ ”یہ لگامیں کس لیے ہوتا ہے پتا جی؟“ اس نے پوچھا۔

”انھیں سیدھے ہاتھ کی طرف جھٹکو گے تو گھوڑا داہنی طرف مڑے گا۔ اُلٹے ہاتھ کی طرف جھٹکو گے تو گھوڑا بائیں طرف مڑے گا اور لگام اپنی طرف کھینچو گے تو گھوڑا رُک جائے گا۔“ ٹھاکر نے اسے سمجھایا۔

”ٹھیک ہے، گھوڑے میاں، اب چلو۔“ ننھے ٹھاکر نے لگام کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

اور ٹھاکر نے اپنے لاڈلے بیٹے کو بٹھا کر گھوڑے کی طرح چلنا شروع کر دیا۔ بیٹا بھی اپنے اختیار کو چیک کرنے کے لیے کبھی لگام ایک طرف جھٹکتا، کبھی دوسری طرف جھٹکتا اور کبھی کھینچ لیتا۔ وہ بہت خوش تھا۔

وہ دونوں حویلی کے بہت بڑے دالان میں اسی طرح دوڑتے رہے۔ ٹھاکر کو حیرت ہوئی کہ اسے تھکن کیوں نہیں ہوئی۔ اسے احساس تھا کہ حویلی کے سارے نوکر یہ تماشا دیکھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔ سب خوش ہیں۔ ٹھاکرانی کے چہرے سے تو روشنی پھوٹ رہی تھی۔

”چھوٹے ٹھاکر، اب گھوڑا تھک گیا ہوگا۔ اسے آرام دو۔“ ٹھاکرانی نے پکار کر کہا۔

ننھے ٹھاکر نے لگام کھینچی اور گھوڑا رُک گیا۔ ننھے ٹھاکر نے نیچے سے پوچھا۔ ”پتا جی، گھوڑے تھک بھی جاتے ہیں؟“

”کیوں نہیں پُتر۔ محنت کرنے سے ہر جان دار تھکتا ہے۔ انسان بھی۔ اور بڈھے گھوڑے تو زیادہ جلدی تھک جاتے ہیں۔“ ننھا ٹھاکر باپ کی پیٹھ سے اُتر آیا۔ ”آپ بڈھے ہیں پتا جی؟“ اس نے پوچھا۔

”میں بڈھا تھا پُتر۔“ ٹھاکر نے بلا جھجک کہا۔ ”مگر آپ کے آنے کے بعد میں جوان ہو گیا ہوں۔“

ٹھاکرانی جلدی سے لسّی کا بڑا پیالہ لے کر پہنچی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں تولیا تھا۔ ”میرے چھوٹے ٹھاکر، تمھارے پتا جی تو تمھیں نہیں بتائیں گے۔ مجھے بتانا پڑے گا۔“ اس نے بیٹے سے کہا۔ ”گھوڑے کا کچھ حق بھی ہوتا ہے اپنے سوار پر۔ وہ ہمیشہ پورا کیا کرو۔“

ننھے ٹھاکر نے کچھ نہیں کہا۔ بس ماں کو استفسار طلب نظروں سے دیکھتا رہا۔

”گھوڑے کے رُکتے ہی اس کا پسینا خشک کرتے ہیں، اس کے جسم کی مالش کرتے ہیں اور اسے کھلاتے بھی ہیں۔“ یہ کہہ کر ٹھاکرانی نے ٹھاکر کے پسینے میں نہائے ہوئے جسم کو تولیے سے پونچھا۔ پھر لسّی کا پیالہ اس کی طرف بڑھایا۔ ”لو ناتھ، یہ پی لو۔“

ٹھاکر نے ممنونیت سے پتنی کو دیکھا۔ وہ پیالہ مُنہ سے لگا ہی رہا تھا کہ ننھے ٹھاکر نے اسے ٹوک دیا۔ ”پتا جی، گھوڑے تو گھاس کھاتے ہیں۔“

”یہ تو تمھارے پتا جی ہیں پُتر...!“ ٹھاکرانی نے جلدی سے کہا۔ ”تمھاری محبت میں تھوڑی دیر کے لیے گھوڑا بن گئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے ماتا جی۔“ ننھے ٹھاکر نے کہا اور دودھ کے پیالے کو بڑی محبت سے ہاتھ لگایا۔ ”پی لیں پتا جی۔“ اس کے لہجے میں بھی محبت تھی۔

ٹھاکر کے لیے وہ بڑی خوشی کا دن تھا۔ پہلی بار اس نے اپنے جسم و جاں سے بیٹے کے لیے کچھ کیا تھا۔

دوسرے دن بیٹے نے صبح سویرے ہی ٹھاکر سے گھوڑا بننے کی فرمائش کر دی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس نے باگیں کھینچ لیں۔ ”بس پتا جی۔“ اس نے کہا اور اس کی پیٹھ سے اُتر آیا۔

”کیوں پُتر... بس اتنی سی دیر؟ مجھے تو مزہ نہیں آیا۔“ ٹھاکر نے شکایت کی۔

”پتا جی، میں آپ کو بہت تھکانا نہیں چاہتا...“ ننھے ٹھاکر نے کہا۔ ”اور اب ویر جی کی باری ہے۔“

گھوڑے کی طرح بیٹھا ہُوا ٹھاکر صرف چند لمحوں کے لیے ہچکچایا۔ کوئی دیکھتا تو اس ہچکچاہٹ کا سبب کبھی نہ سمجھ پاتا۔ یہی سمجھتا کہ اپنے سے نیچے کسی شخص کے بچے کو پیٹھ پر بٹھانے سے جھجک رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں تھی۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے

ان چند لمحوں میں بہت کچھ سوچا۔ یہ تو اس نے پہلے ہی لمحے میں سمجھ لیا کہ یہ بھگوان نے اسے بہت اچھا موقع دیا ہے۔ پھر اس نے آگے غور کیا۔ جمال دین کے گھرانے پر اس کے پریوار کی عنایت پر سب لوگ سرگوشیوں میں بات کرتے ہوں گے۔ یہ اسے معاملات کو فطری رُخ پر لے جانے کا موقع ملا تھا۔ اب وہ وصال دین کا گھوڑا بنے گا تو سب ملازم دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے، ٹھاکر جی کو بیٹا ملا ہے تو وہ ایسے نرم ہوگئے ہیں کہ اپنے کارندوں کے بچوں کو بھی اپنا بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ تاثر ایک بار جم گیا تو آگے کے تمام معاملات کو بھی اسی روشنی میں دیکھا جائے گا۔ پھر کسی کو کبھی کوئی شبہ نہیں ہوگا۔

چناں چہ ٹھاکر نے سر اٹھا کر بڑی محبت سے وصال دین کو دیکھا اور بولا۔ ”آؤ وصال دین، گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔ گھوڑا چلانا آتا ہے تمھیں؟“

پونے چار سال کا وصال دین معصوم بچہ ہی تو تھا۔ اتنے چھوٹے بچوں کو کسی کے مقام اور مرتبے کا کہاں پتا ہوتا ہے اور پھر وہ اوتار سنگھ کے تمام کھلونوں سے کھیلتا رہا تھا۔ تو یہ کھلونا کیوں چھوڑتا۔ ”آتا ہے ٹھاکر جی۔“ اس نے گردن اکڑا کر بڑے فخر سے کہا اور ٹھاکر کی پیٹھ پر چڑھ گیا۔ ”چلو... گھوڑے میاں۔“ اس نے اوتار سنگھ کی طرح آواز لگائی۔

ادھر ٹھاکر نے دوڑ لگائی، ادھر پوری حویلی میں ہلچل مچ گئی۔ سب کو پتا چل گیا کہ ٹھاکر جی جمال دین کے بیٹے وصال دین کا گھوڑا بن گئے ہیں۔ سب سے پہلے تو ٹھاکرائی دوڑی آئی۔ وہ منظر دیکھ کر وہ بُت بن کر رہ گئی۔ ٹھاکر جی سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

حمیدہ نے یہ سنا تو ننگے پاؤں دالان کی طرف لپکی۔ ٹھاکر سب سے بے نیاز گھوڑا بن کر دوڑ رہا تھا۔ حمیدہ ایسے بوکھلا کر آئی تھی کہ اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ ٹھاکر کے قریب پہنچ کر وہ وصال دین پر گرجی۔ ”یہ کیا کر رہا ہے منحوس! تجھے تمیز نہیں، یہ ٹھاکر جی ہیں۔“

وصال دین سہم گیا۔ ماں ہمیشہ لاڈ پیار کرتی تھی۔ اس طرح پہلے کبھی نہیں ڈانٹا تھا اس نے۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے باگیں کھینچ لیں۔ ٹھاکر رُک گیا۔ اس نے سر اٹھا کر حمیدہ کو دیکھا۔ ”کیوں ڈانٹتی ہو اسے؟“

”میں تو اسے جان سے مار دوں گی...!“ حمیدہ غرائی۔

پھر وصال دین کی طرف پلٹی۔ ”اُتر تا ہے کہ نہیں۔“

وصال دین اُترنے لگا تو ٹھاکر نے خود کو اونچا کر لیا۔ ”نہ وصال دین، ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ بیٹھا رہ۔ میں تیری ماں کو سمجھا لوں گا۔“ اس نے کہا۔

حمیدہ کو بھی کچھ ہوش آیا۔ ”اسے یوں سر نہ چڑھائیں ٹھاکر جی۔“

ٹھاکر نے تنبیہی لہجے میں دُہرایا۔ ”ٹھاکر جی! ایسے بات کرتے ہیں بھلا؟“

حمیدہ اس کی بات سمجھ گئی۔ سرگوشی میں بولی۔ ”یہ کیا کرتے ہیں ویر جی۔“

ٹھاکر نے بلند آواز میں کہا تاکہ سب ملازم سن لیں۔ ”سن حمیدہ، تیرا بیٹا میرے اوتار سنگھ کا دوست ہے۔ اس ناتے یہ اس کا حق ہے مجھ پر۔ اور میں اپنے اوتار سنگھ کی بات کیسے ٹال سکتا ہوں۔“

”مگر یہ گستاخی ہے مالک۔“ حمیدہ نے بھی بلند آواز میں کہا۔

اس پر ٹھاکر نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ لفظ مالک سننا اسے گوارا نہیں تھا۔ ”تو چپ نہ کر حمیدہ۔ میں نے تو اسے اٹھایا ہے۔ یہ میرے حکم کی تعمیل کر رہا ہے اور تعمیل تو میرا حکم نہ ماننے میں ہوتی۔ تُو بھی مجھ سے بحث نہ کر۔ جا، یہ کہہ کر ٹھاکر پیٹھ پر بیٹھے وصال دین سے مخاطب ہُوا۔ ”ہاں بھئی، چلا گھوڑے کو۔“

مگر وصال دین اب چوکڑی بھول چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس نے ضرور کوئی غلطی کی ہے۔ وہ بیٹھا تو رہا۔ مگر اُکھڑا اُکھڑا تھا۔ دو چکروں کے بعد ٹھاکر نے اسے اُتار دیا۔ ٹھاکر نے تولیا اور لسّی لے کر آ گئی۔

یہ سچ ہے کہ اس روز ٹھاکر نے سب لوگوں کو بہت کچھ سمجھا دیا۔ مالک کے تیور پہچاننے والوں نے سمجھ لیا کہ جمال دین، حمیدہ اور وصال دین کی کوئی حیثیت ہے اور اب انھیں اس حیثیت کا خیال رکھنا ہے۔

اس رات حمیدہ نے یہ رُوداد جمال دین کو سنا دی۔ جمال دین پریشان ہوگیا۔ ”یہ تو بہت خطرناک بات ہے حمیدہ...“ اس نے متوحش ہو کر کہا۔ ”ہم لوگ برسوں سے آگ سے کھیل رہے ہیں۔ یہ تو اللہ کی مہربانی ہے کہ اب تک کوئی نقصان نہیں ہوا ہے اور یہ سب کچھ تم نے شروع کیا ہے۔“

”میں نے کیا کیا ہے؟“ حمیدہ نے بھڑک کر کہا۔

”چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے کا شوق تمھیں ہُوا تھا۔ سب وہیں سے شروع ہُوا ہے۔“

”تم مرد ہو۔ میری مجبوری کیا سمجھو گے...“ حمیدہ بولی۔ ”لیکن یہ تو سوچو کہ صرف میرے چاہنے سے کیا ہوتا۔ چھوٹے ٹھاکر نے خود ضد باندھ لی تھی کہ دودھ میرا ہی پئیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں فخر تھا۔ ”اب یہ تو اللہ کی مرضی ہی تھی ورنہ اتنے چھوٹے بچے ایسی ضد نہیں کر سکتے۔“

”یہ بات تو ٹھیک ہے۔ مگر...“

”آپ پریشان کیوں ہو...؟“ حمیدہ نے کہا۔ ”اب یہ بھی ٹھاکر خود ہی کر رہے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ہمارے بیٹے کی تو عادتیں بگڑ جائیں گی اور کسی دن جیت کا خون جوش مار گیا تو کیا ہوگا۔ سوچو تو ذرا۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے اپنی فکر نہیں۔ لیکن میرا بیٹا...“

حمیدہ بھی پریشان ہوگئی۔ ”ڈر تو مجھے بھی لگتا ہے مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔“

”اپنے بیٹے کی تربیت تو کر سکتے ہیں۔ اسے سمجھا تو سکتے ہیں کہ اپنی حیثیت ہمیشہ یاد رکھے۔ وہ سر چڑھائیں تو وہ نہ چڑھے۔“

”کوئی کسی کو کچھ نہیں سکھا سکتا۔ وقت آپ ہی سکھا دیتا ہے اور ٹھوکر سے گرے گا تو خود سمجھ جائے گا۔“

”سمجھاتا تو ہوتا ہے حمیدہ...“ جمال دین نے آہ بھر کے کہا۔ ”ضرور تربیت کا حکم کیوں دیتا۔ پھر آدمی بے خبری میں ٹھوکر سے تو چوٹ بھی بہت تکلیف ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتا میرے بیٹے کو کوئی تکلیف ہو۔ اسے گرنے کے لیے ہمیشہ ہونا ہوگا۔“

”مگر یہ سب کچھ اسے کیسے سمجھاؤ گے؟“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اب بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ میں دیکھ لوں گا۔“ جمال دین نے کہا اور کروٹ بدل لی۔

جمال دین پر حویلی کے دروازے بہت پہلے کھل چکے تھے۔ حویلی میں جب چاہے آ سکتا تھا اور جہاں چاہے جا سکتا تھا۔ اس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ٹھاکر کے خاص کمرے میں بھی بلائے جا سکتا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر کا پہلا جنم دن بڑی دھوم سے منایا گیا تھا اور اس روز ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے اپنے حلقے داروں پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اس مسلمان پریوار کو حلقے داروں سے کم نہیں سمجھتا۔

لیکن جمال دین نے اس رعایت سے کبھی استفادہ نہیں کیا۔ وہ اپنی کھال میں رہنے والا آدمی تھا۔ جانتا تھا کہ آسانی

گلچھرّے

☺...آدمی دو طرح کے ہوتے ہیں... ایک عقل مند، دوسرے شادی شدہ۔

☺...محبت ٹماٹروں کی طرح ہے جس سے چہرے کے گلاب کھل اٹھتے ہیں۔

☺...باپ کے گھر سوکھے ٹکڑوں پر گزارہ کرنے والی، شوہر کے گھر پراٹھے کھا کر بھی خود کو بدقسمت ہی سمجھتی ہے۔

☺...اگر عورتیں بھی جنازے کے ساتھ جانے لگیں تو یہ جنازہ نہیں دلہا میاں کی برات معلوم ہوگا۔

☺...کنوارے اور بیاہے میں ایک خاص فرق یہ بھی ہے کہ ایک کے غم محدود ہوتے ہیں اور دوسرے کے لامحدود۔

☺...آج کے جوان کے لیے سب سے دشوار کام اپنی جوانی سنبھالنا ہے۔

☺...محبت، پودینے کی مانند ہے جس کی خوشبو چھپائے نہیں چھپتی۔

☺...اگر چند عورتیں دو چار روز تک بیکار ہیں تو دوسری الف لیلہ ترتیب پا سکتی ہے۔

☺...آپ خود کو دیانت دار بنانے کے بعد یقین کر لیں کہ دنیا میں ایک بے ایمان کی کمی ہوگئی ہے۔

☺...کسی کا دل نہ دکھاؤ، ہو سکتا ہے کہ وہ آنسو تمھارے لیے سزا بن جائیں۔

ابن حسن عثمان آبادی کے قلم سے

اپنے مقام پر رہنے میں ہے۔ انسان کی عنایت کا کچھ اعتبار نہیں۔ کون جانے کب عتاب میں تبدیل ہو جائے۔ چناں چہ وہ کبھی کبھار ہی حویلی میں جاتا تھا۔

مگر اس صبح وہ حمیدہ اور وصال دین کے ساتھ حویلی چلا گیا۔ وہ دونوں تو ہر روز حویلی جاتے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر کا دودھ چھڑا دیا گیا تھا۔ مگر معمول پھر بھی نہیں بدلا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دودھ چھڑانے پر چھوٹے ٹھاکر نے بالکل واویلا نہیں کیا تھا۔ کوئی ضد نہیں کی تھی۔ بس ایک صبح حمیدہ نے اس سے کہا تھا۔ ”چھوٹے ٹھاکر، اب آپ خیر سے بڑے ہوگئے ہیں۔ اب آپ کو ایسے دودھ نہیں پینا ہے۔“

اوتار سنگھ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس وہ ٹکر ٹکر اماں کو دیکھتا رہا۔

وصال دین نے کہا۔ ”اور کیا چھوٹے ویر۔ دیکھو، میں تو

پہلے ہی ماں کا دودھ چھوڑ چکا ہوں۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں نا۔" اس نے بچوں کے بل کھڑے ہو کر قد اونچا کر کے دکھایا۔

اوتار سنگھ نے بھی اس کی نقل کی اور پھر طمانیت سے سر ہلایا جیسے اپنے بڑے ہو جانے کا یقین آ گیا ہو۔ "اب میں ایسے دودھ نہیں پیوں گا اماں۔" اس نے کہا۔

انداز ایسا تھا کہ حمیدہ نے اس کی بلائیں لے لیں۔ پھر وہ بولی۔ "آپ کو بھوک لگ رہی ہو گی چھوٹے ٹھاکر۔ دودھ نہیں پئیں گے؟"

"نہیں اماں۔ بھوک تو لگ رہی ہے۔ مگر میں دودھ نہیں پیوں گا۔"

"دودھ نہیں پئیں گے تو اور بڑے کیسے ہوں گے!"

"مگر آپ ہی تو کہہ رہی تھیں کہ..."

"ٹھیریں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ اب آپ کو دودھ کیسے پینا ہے۔" یہ کہہ کر حمیدہ چلی گئی۔ ذرا دیر بعد وہ ٹھاکرانی کے ساتھ واپس آئی۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کا کٹورا تھا جس میں دودھ تھا۔ اس نے کٹورا ٹھاکرانی کو دیا۔ "لیں مالکن، چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلا دیں۔"

ٹھاکرانی دودھ پلانے لگی تو ننھے ٹھاکر نے ہاتھ سے کٹورے کو پرے کر دیا، بولا "اماں کے ہاتھ سے پیوں گا۔"

ٹھاکرانی ہنسنے لگی۔ "وقت کے بڑے پکے ہیں میرے چھوٹے ٹھاکر۔ لے حمیدہ، یہ وقت تو تیرا ہی ہے۔"

حمیدہ نے دودھ پلا دیا۔ یوں معمول وہی رہا، وقت وہی رہا، بس دودھ پینے کا انداز بدل گیا۔

سو اُس صبح جمال دین بیوی اور بیٹے کے ساتھ حویلی چلا گیا۔ اس سے پہلے حویلی میں اتنی صبح وہ کبھی نہیں گیا تھا۔ اس نے ٹھاکرانی کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ ٹھاکرانی بڑے تپاک سے مسکرائی۔ "آؤ جمال دین، آج کیسے رستا بھول پڑے۔ تم تو کبھی آتے ہی نہیں۔"

"بس مالکن، مصروفیت ہی اتنی ہے۔ زمین فرصت ہی نہیں دیتی۔"

"جل پان کرو گے۔ کچھ لاؤں؟"

"شکریہ مالکن، ابھی ناشتا کر کے نکلا ہوں۔"

"ٹھاکر جی تو اپنے کمرے میں ہیں اور راستہ تمھیں معلوم ہی ہے۔" ٹھاکرانی نے کہا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ ٹھاکر جی سو رہے ہیں۔ جانتی تھی کہ ٹھاکر نے اپنے طور پر جمال دین کو یہ ادھیکار دے رکھا ہے کہ وہ جب چاہے، اس کے کمرے میں آئے اور وہ سو رہا ہو تو اسے جگا دے۔ یہ الگ بات کہ جمال دین نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔

جمال دین کا اب بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "مالکن، اس وقت تو میں چھوٹے ٹھاکر کے دیدار، ان کی سیوا کے لیے آیا ہوں۔"

"ابھی بلاتی ہوں انھیں۔" ٹھاکرانی نے کہا۔

لیکن حمیدہ تڑپ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ننھا ٹھاکر اس وقت بھوکا ہو گا اور اس کے ہاتھ سے ناشتے کا منتظر۔ اس نے شوہر سے کہا۔ "سنو جی، ابھی چھوٹے ٹھاکر کو ناشتا کرنا ہے۔ تم اپنا دیرا انتظار کر لو۔"

جمال دین نے اسے نظر انداز کر دیا اور ٹھاکرانی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "مالکن، چھوٹا منہ بڑی بات ہو گی۔ مگر مجھے ایک بات کہنی ہے۔"

"کہو جمال دین۔"

"ناشتا کھیل کود کے، کسرت کے بعد اچھا ہوتا ہے۔ پورے کا پورا جسم کو لگ جاتا ہے۔ ناشتے کے بعد کی کسرت صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔" ٹھاکرانی بولی۔

"میرا مطلب ہے، چھوٹے ٹھاکر پہلے مجھ سے مل لیں، کھیل کود لیں، پھر ناشتا کریں گے تو اچھا ہو گا۔"

حمیدہ احتجاج کرنا چاہتی تھی۔ مگر اسی لمحے ٹھاکرانی نے اس سے کہا۔ "جاؤ حمیدہ، چھوٹے ٹھاکر کو لے آؤ۔" پھر وہ خود حمیدہ کے ساتھ اندر چلی گئی۔

ننھا ٹھاکر وصال دین کے ساتھ دالان میں آیا تو وصال دین لکڑی کے گھوڑے کے پاس کھڑا اس کی پیٹھ سہلا رہا تھا۔ ٹھاکر دوڑ کر آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ "آپ آئے چاچا جی؟ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" اس نے چہک کر پوچھا۔

"یہ آپ کا گھوڑا رو رہا تھا۔ میں اس کے آنسو پونچھ رہا ہوں۔" جمال دین بولا۔

"یہ رو رہا تھا!" ننھے اوتار سنگھ نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں۔ آپ اس سے محبت کرتے تھے نا۔ روز اسے صاف کرتے تھے۔ اس پر بیٹھتے تھے۔ یہ خوش ہوتا تھا۔ اس کا دل خوش ہو گیا تھا۔ اب آپ نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ دیکھیں، اس کی گردن جھکی ہے۔" جمال دین نے گھوڑے پر ہاتھ پھیرا اور اپنا ہاتھ اسے دکھایا۔ "اس لیے یہ اُداس رہنے لگا ہے۔"

"اُداس رہنے لگا ہے!" ننھے ٹھاکر نے دُہرایا۔

یہ میں بے یقینی تھی۔

"آپ خود غور سے دیکھ لیں۔ آپ کو نظر آ جائے گا۔"

ننھے ٹھاکر نے غور سے دیکھا۔ اداسی کا مطلب تو اسے معلوم نہیں تھا۔ لیکن لکڑی کا وہ گھوڑا اُجڑا اُجڑا سا لگ رہا تھا۔ اسے افسوس ہونے لگا۔ "لیکن چاچا جی، یہ میرے کام کا نہیں۔ میں اس کا دیوں رہتا ہے۔ مجھے کہیں لے جاتا نہیں۔"

"یہ سچ ہے میرے چھوٹے ٹھاکر۔ لیکن ہر چیز کی اپنی حالات ہوتی ہے، اپنی طاقت ہوتی ہے۔ اس میں یہ طاقت نہیں۔ اس لیے اس سے ناراض ہونا ٹھیک نہیں۔ پہلے تو یہ آپ کا دل بہلاتا تھا نا۔ اب بڑے ہو گئے۔ لیکن اس کا تو قصور نہیں۔ اسے سزا نہیں ملنی چاہیے۔ محبت کرتے وقت دیکھ لینا چاہیے کہ کسی کی طاقت کتنی ہے۔ پھر محبت کرتا ہے تو بھی ظاہر نہیں ہونے دینا چاہیے۔ دوسرے کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ پچھتاوا جانے کا دکھ بڑا ہوتا ہے..." جمال دین عدم تحفظ کے احساس کے تحت اپنے بیٹے کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔ یہ بھی نہ سمجھ کہ ننھے بچے کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ "انجام کر چھوڑتے نہیں چھوٹے ٹھاکر۔" ننھا ٹھاکر کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا۔ مگر اس نے جمال دین کی ہر بات پلّے باندھ لی۔ ایسی باتیں تو کوئی بات نہیں جاتی۔ بہت سی باتیں ایسے وقت سمجھ آتی ہے۔ لیکن بہرحال وہ اداس ہو گیا۔ اسے لکڑی کے گھوڑے پر ترس آنے لگا۔ "پھر میں کیا کروں چاچا جی؟" اس نے پوچھا۔

"روز صبح سویرے اسے کپڑے سے صاف کریں اور اس کے پاس، چاہے تھوڑی دیر کے لیے بیٹھیں۔"

"پھر یہ اداس نہیں ہو گا۔ روئے گا تو نہیں!"

"بالکل نہیں۔ پھر یہ اگلی صبح تک خوش رہے گا۔"

ننھے ٹھاکر نے جلدی سے کپڑا لا کر اپنے گھوڑے کو صاف کیا۔ اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور پھر اس پر بیٹھ کر جھولنے لگا۔ اسے لگا نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس بات کی خوشی تھی کہ لکڑی کا گھوڑا خوش ہو رہا ہو گا... اور اب اگلے دن تک خوش رہے گا۔

دو منٹ بعد وہ گھوڑے سے اُتر گیا۔ "اتنا ٹھیک ہے چاچا جی؟" اس نے پوچھا۔

"جی میرے راج کمار۔ آیئے، اب اصل گھوڑا حاضر ہے۔" جمال دین نے جواب دیا اور گھوڑا بن گیا۔

وہ چھوٹے ٹھاکر کو اٹھا کر دوڑتا رہا۔ اس دوران میں مالکن اور حمیدہ بھی باہر دالان میں آ گئی تھیں اور یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ کافی دیر بعد ننھے ٹھاکر کے اصرار پر جمال دین نے اسے اتارا۔

"اب میری باری ہے ابا۔" وصال دین نے کہا۔

"نہیں بیٹے، میں تھک گیا ہوں۔ تجھے بعد میں سیر کرا دوں گا۔" جمال دین نے اسے ٹالا۔ اس نے سوچا تھا کہ اسے بعد میں سمجھائے گا۔

ننھے ٹھاکر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر پہلے ٹھکرانی کو اور پھر حمیدہ کو دیکھتے ہوئے تڑپ کر بولا۔ "اماں... جلدی سے تو لیا لاؤ اور لسّی بھی۔"

جمال دین کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لیکن دونوں عورتیں سمجھ گئیں۔ ٹھاکرانی نے حمیدہ کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ حمیدہ چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ایک ہاتھ میں تولیا اور دوسرے میں لسّی کا پیالہ تھا۔

ننھے ٹھاکر نے چند لمحے ماتا جی اور اماں کو دیکھا۔ پھر تولیا لیا اور ننھے ننھے ہاتھوں سے جمال دین کا چہرہ اور بازو خشک کرنے لگا۔ جمال دین بوکھلا گیا۔ "یہ... یہ آپ کیا کر رہے ہیں چھوٹے ٹھاکر۔"

ننھے ٹھاکر کے ہاتھ نہیں رُکے۔ "پتا جی کہتے ہیں، گھوڑے کا خیال رکھنا چاہیے۔"

اس دوران ٹھاکرانی مسکراتی رہی اور حمیدہ لسّی کا پیالہ لیے کھڑی رہی۔ ننھے ٹھاکر نے ہاتھ روکا اور حمیدہ سے بولا۔ "اب اپنے ہاتھ سے چاچا جی کو لسّی پلاؤ اماں۔"

"وہ بھی پلا دوں گی۔ اب آپ ناشتا کر لیں چھوٹے ٹھاکر۔"

ننھا ٹھاکر جمال دین کی طرف مڑا۔ "میں جاؤں چاچا جی؟ بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

"ضرور جائیں چھوٹے ٹھاکر۔ مگر پہلے ایک بات کر لیں۔ آج سے میں آپ کا گھوڑا ہوں۔ مگر یہ بتائیں، جب میں بڈھا ہو جاؤں گا اور آپ بڑے ہو جائیں گے تو میں آپ کو پیٹھ پر بٹھا کر دوڑ نہیں سکوں گا۔ تب آپ مجھے لکڑی کے اس گھوڑے کی طرح چھوڑ تو نہیں دیں گے؟"

"نہیں چاچا جی۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں چاچا جی۔"

"شکریہ چھوٹے ٹھاکر۔ اب آپ جائیں۔ ناشتا کر لیں۔"

اس روز دوپہر کو جمال دین کھانے کے لیے گھر آیا تو اس نے وصال دین کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ "بیٹا... اب میں تجھے بتاؤں گا کہ میں نے حویلی میں تجھے اپنی پیٹھ پر کیوں نہیں بٹھایا تھا۔"

وصال دین استفہامیہ نظروں سے باپ کو دیکھتا رہا۔

"دیکھ بیٹے، تُو میرا بیٹا ہے۔ میرا سب کچھ ہے۔ میں اور تیری ماں تیرے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ہم تجھ سے محبت کرتے ہیں۔ تو ہمارے لیے شہزادہ ہے۔ ماں باپ کے لیے ان کی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے لیکن ایک حقیقت اور ہوتی ہے۔ یہ کہ کوئی دنیا کے لیے کیا ہے۔ اس کی دنیا میں کیا حیثیت ہے۔ تیری سمجھ میں میری باتیں آسانی سے نہیں آئیں گی۔ لیکن غور سے سننا اور ہر بات کو یاد رکھنا۔ آدمی کو اپنی حیثیت ہر جگہ اور ہر حال میں یاد رکھنی چاہیے۔ کوئی اس سے بڑھ کر سمجھے تو یہ اس کی مہربانی، اس کا احسان۔ اور بندے کو احسان کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ تُو سمجھ رہا ہے میری بات؟"

چار سال کے وصال دین نے انکار میں سر ہلایا۔ "نہیں ابا۔"

"کوئی بات نہیں۔ بس غور سے سن اور یاد رکھ۔" جمال دین نے کہا۔ اسے بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ چار سال کا بچہ تو لفظ "حیثیت" کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن سمجھانا ضروری ہے۔ گستاخی تو گستاخی ہوتی ہے۔ چاہے چار سال کا بچہ کرے، بتانا تو پڑے گا۔ اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ "تو بیٹے، تیری حیثیت کیا ہے۔ ابھی تُو چھوٹا ہے۔ جب تُو دنیا میں کچھ کرے گا تو تیری حیثیت بنے گی۔ اُس وقت تک تیری حیثیت وہ ہے جو میری ہے اور میری حیثیت کیا ہے؟ میں کسان ہوں بیٹے۔ غریب کسان۔ مجھ پر ٹھاکر جی نے مہربانی کی کہ مجھے کچھ زمین دے دی۔ میں ویسے ہی ٹھاکر جی کا مزارعہ تھا۔ ان کی مہربانی کے بعد میں ان کا غلام ہو گیا۔ میں نے کہا نا، بندے کو احسان نہیں بھولنا چاہیے۔ ٹھاکر جی نے میرے ابا، یعنی تیرے دادا پر بھی احسان کیا تھا۔ میں اسے کبھی نہیں بھولتا۔ میں ٹھاکر جی کا کمی ہوں۔ وہ ایسا نہیں سمجھتے۔ مجھے برابری کا، زمین دار والا مقام دیتے ہیں۔ مگر اس سے میری حیثیت نہیں بدلتی۔ تُو بتا، میری حیثیت کیا ہے، میں کون ہوں؟"

چار سال کے لڑکے نے دماغ پر پورا زور دیا... باپ کو خوش کرنے کے لیے۔ ایسے میں قدرت راہ نمائی کرتی ہے۔ جواب اس کے اندر اُبھرا۔ اس نے کہا۔ "آپ بڑے ٹھاکر جی کے کمی ہیں ابا۔ آپ کسان ہیں۔"

جمال دین اس کے جواب سے بہت خوش ہُوا۔ "شاباش وصال دین، شاباش۔" اس نے بیٹے کی پیٹھ تھپکی۔ "اب یہ بتا کہ میری اپنی زمین نہیں ہے۔ میں نے زمین کمائی نہیں ہے۔ اب کوئی مجھے زمین دے دے تو کیا میں زمین دار ہو جاؤں گا؟"

"نہیں ابا۔"

"بالکل ٹھیک۔" جمال دین نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ "ٹھاکر جی چاہے مجھے اپنے برابر میں جگہ دیں۔ مگر میرا مقام ان کے قدموں میں ہے نا۔"

"جی ہاں ابا۔"

"اور جو میری حیثیت ہے، تیری بھی وہی ہے۔ تو تُو کون ہے؟"

وصال دین نے سینہ پھلا کر بڑے فخر سے کہا۔ "ابا، میں کمی ہوں... کسان ہوں... آپ کا بیٹا ہوں۔"

"شاباش۔ میں چاہتا ہوں، تُو یہ بات کبھی نہ بھولنا۔ اب تجھے ٹھاکر جی اور مالکن، چھوٹے ٹھاکر کے برابر سمجھیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تُو کبھی خود کو چھوٹے ٹھاکر کے برابر نہ سمجھنا۔ دیکھ، تیرے دادا پر جو احسان تھا، وہ مجھ پر ہے۔ کیوں کہ میں ان کا بیٹا ہوں۔ اور جو احسان مجھ پر ہے، وہ تجھ پر ہے۔ کیوں کہ تُو میرا بیٹا ہے۔ میں اس احسان کے بدلے کیا کرتا ہوں؟ ٹھاکر جی کی ہر بات مانتا ہوں، خود کو ان کا غلام سمجھتا ہوں... اور ہمیشہ سمجھوں گا۔

"اب حیثیت کی بات سمجھ۔ وہاں حویلی میں تُو اور چھوٹے ٹھاکر دونوں غلام ہیں۔ یہاں اس گھر میں ٹھاکر جی نہ ہوں تو میں بادشاہ ہوں اور تُو شہزادہ ہے۔ تجھ سے بڑھ کر دنیا میں میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں میں تیرا گھوڑا ہوں۔ جب تُو کہے تجھے سواری کراؤں گا۔ لیکن حویلی میں مَیں صرف چھوٹے ٹھاکر کا گھوڑا ہوں۔ وہاں تجھے سوار کروں تو تجھے چھوٹے ٹھاکر کے برابر سمجھوں گا اور یہ غلط ہے۔ ٹھیک سمجھا؟"

"میں سمجھ گیا ابا۔"

"اب تیرا دل چاہے تو میں تیرا گھوڑا بن جاؤں؟" وصال دین نے پوچھا۔

"نہیں ابا۔ مجھے تو اس کا شوق ہی نہیں۔"

"یہ بھی اچھا ہے۔ اب میری آخری بات غور سے سن۔ چھوٹے ٹھاکر نے تیری ماں کا دودھ پیا ہے۔ اس طرح تیری ماں کا بیٹا ہے۔ تیرا بھائی ہے۔ لیکن تو اس کا بھائی نہیں۔ تُو غلام ہی رہنا۔ کبھی اس کی برابری نہ کرنا۔ وہ تجھے اپنا بھائی سمجھے تو یہ اس کی بڑائی ہے۔ مگر تُو کبھی خود کو اس کا بھائی نہ سمجھنا۔ وہ تجھے کھیل میں، کسی بھی چیز میں شریک کرے، تجھے یہ خیال رکھنا ہے کہ تُو زمین ہے اور وہ آسمان اور زمین اور آسمان کبھی نہیں ملتے۔"

چار سال کے بچے نے فوراً چیلنج کیا۔ "ابا، آسمان

زمین تو ملتے ہیں۔ وہ دیکھیں!"

جمال دین نے اس طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔

"اس جگہ کی کوئی نشانی مقرر کر لے بیٹے جہاں زمین اور آسمان مل رہے ہیں۔"

وصال دین نے غور سے دیکھا اور بولا۔ "وہ بڑا پیڑ ہے برگد کا، وہاں ابا۔"

جمال دین اٹھ کھڑا ہُوا۔ "چل بیٹے۔ دیکھ کر آتے ہیں۔"

دونوں گھر سے نکل آئے۔ وہ پیڑ کوئی میل سوا میل کے فاصلے پر تھا۔ "تُو بس پیڑ پر نظر رکھنا بیٹے۔"

دھوپ میں وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ پسینے میں نہا گئے۔

"اب دیکھ بیٹے، آسمان کہاں ہے اور زمین کہاں ہے۔" جمال دین نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

وصال دین شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے آگے کی طرف دیکھا رہا تھا۔ "وہ دیکھو ابا۔ کرتار کے گھر کی چھت پر۔"

"چل، وہاں بھی دیکھ لیتے ہیں۔" جمال دین نے نرمی سے کہا۔

ننھے بچے کے حصے میں وہاں پہنچ کر بھی شرمندگی ہی تھی۔ مگر وہ اب بھی آگے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"نہیں دیکھ لیے، یہ نظر کا دھوکا ہے۔ زمین آسمان کبھی نہیں ملتے۔ دیکھنے والے کو ایسا لگتا ہے لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے تو چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ کھیلے تو دیکھنے والوں کو لگتا ہے کہ تُو اور وہ دوست ہیں لیکن اصل میں وہ مالک ہیں اور تُو غلام۔ تجھے یہ بات یاد رکھنی چاہیے بیٹے۔"

"ٹھیک ہے ابا۔" وصال دین نے کہا۔ اس نے زمین اور آسمان کا فلسفہ بہت اچھی طرح سمجھ لیا تھا... اور ہمیشہ کے لیے سمجھ لیا تھا۔

کہتے ہیں کہ ہر بیٹا اپنے باپ پر جاتا ہے۔ کچھ چیزیں تو پیدائش کے وقت ورثے میں خود بہ خود مل جاتی ہیں۔ وصال دین کی جمال دین کا بیٹا تھا۔ جو باپ نے سمجھایا تھا، وہ اپنی جگہ۔ لیکن بچے کے اندر پہلے سے موجود تھا۔ "ابا... آپ بڑے ٹھاکر جی کی ہر بات مانتے ہو۔ انکار نہیں کرتے؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل بیٹا۔ میں انکار کر ہی نہیں سکتا۔"

"تو میں بھی کبھی انکار نہ کروں۔"

"یہی تو میں سمجھا رہا ہوں تجھے۔"

"وہ گھوڑا بنیں اور مجھ سے بیٹھنے کو کہیں تو؟"

جمال دین لاجواب ہو گیا۔ "ٹھیک ہے۔ مگر اپنی حیثیت ہمیشہ یاد رکھنا۔" اس نے بجھے دل سے کہا۔

وہ تیسرا سال تھا کہ ٹھاکر فصلوں کی آمدنی میں جمال دین کا حصہ لے کر اس کے گھر آیا تھا۔ اس نے رقم کی پوٹلی جمال دین کو دیتے ہوئے کہا۔ "تم کب تک اپنے حصے کا کام مجھ سے کراتے رہو گے جمال دین۔ اب مجھے ہلکا کر دو۔"

جمال دین کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ پوٹلی ہاتھ میں لیے، نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔

"تم تو کچھ بولتے ہی نہیں۔ بھئی، اپنی زمینوں کا انتظام آپ سنبھالو نا۔"

"مجھے یہ سب کچھ آتا ہی نہیں ٹھاکر جی۔" جمال نے دبی آواز میں کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ، اس پیسے کا کیا کرتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔ صندوق میں رکھ دیتا ہوں ٹھاکر جی۔"

"اب یہ نہ کہنا کہ تمھیں پیسا خرچ کرنا بھی نہیں آتا۔"

"سچ ہے ٹھاکر جی۔ مجھے یہ بھی نہیں آتا۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے۔ اچھا سا مکان بنواؤ۔ مال مویشی خریدو۔ میری بہن کے لیے زیور گہنا بنواؤ۔ اب تمھارے پاس کمی تو نہیں ہے۔"

"نہیں ٹھاکر جی۔ اب تو زیادتی ہے جی۔ مکان کی ضرورت نہیں۔ یہ مکان کافی ہے ہمارے لیے۔ ابا کے ساتھ یہاں برسوں رہا ہوں میں۔ یہ ابا کی نشانی ہے۔"

تمام آئینے ترتیب سے رکھو محسن
وہ شخص نیند سے بیدار ہونے والا ہے
خوب صورت شعری مجموعہ
شور بھی ہے سناٹا بھی
کے خالق محسن اسرار کا دوسرا شعری مجموعہ
تاثیر
شائع ہو گیا
ناشر: سرزمین پبلی کیشنز۔ بی 204 گلمر شاپنگ مال آرکیڈ۔
ایس ٹی 17، بلاک 1۔ گلستان جوہر۔ بالمقابل این ای ڈی یونیورسٹی۔
مین یونیورسٹی روڈ۔ کراچی

"تو زمین کی کمی نہیں تمھارے پاس۔ کسی دوسری جگہ مکان بنوالو۔"

"ہم یہاں خوش ہیں ٹھاکر جی۔ تو دوسرا مکان کس کے لیے بنواؤں اور مال مویشی رکھوں تو اکیلی جان۔ کیسے دیکھ بھال کروں گا ان کی۔"

"نوکر ملازم رکھ لینا۔"

"نہیں ٹھاکر جی۔ میں تو خود نوکر ہوں۔ یہ کام میرے لیے اچھا نہیں اور حمیدہ کو زیور سے دل چسپی نہیں۔"

ٹھاکر کو حیرت ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ اب جمال دین کے پاس لاکھوں رُپے ہیں، جائیداد ہے لیکن وہ وہیں کا وہیں ہے۔ اس میں اوپر جانے کی لگن تھی ہی نہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اب تک ٹھاکر کے مقابلے میں کھڑا ہو چکا ہوتا۔ اس نے یہ بات جمال دین سے کہہ دی۔

"میں آپ کے سائے میں رہنا چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔ مجھے بڑا نہیں بننا۔ جیسا مجھے رب نے بنایا ہے، میں ویسا ہی اچھا ہوں..." جمال دین نے کہا۔ "جو زمین آپ نے میرے ابا کو دی تھی، وہ ہماری ضرورت کے لیے بہت کافی ہے۔ باقی سب کچھ تو میں نے صرف آپ کی خوشی کے لیے رکھا ہے۔ ورنہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔"

"اتنا مانتا ہے مجھے۔" ٹھاکر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

"اتنا مانتا ہوں ٹھاکر جی کہ بتا نہیں سکتا۔" جمال دین نے کہا۔ "آپ کے حکم پر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ جان بھی حاضر ہے۔"

ٹھاکر چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "اچھا، میں کہوں، نماز چھوڑ دے تو تُو نماز چھوڑ دے گا؟"

"نہیں ٹھاکر جی۔ نہیں چھوڑوں گا۔"

"تو پھر کیا مانتا ہے مجھے!"

"ہر ایک کا اپنا مقام ہے ٹھاکر جی۔ اللہ کا حکم سب سے بڑا ہے۔ اس کے حکم پر تو آدمی دوسروں کو مانتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا مقام سمجھتا ہے۔ جیسے آپ کے مقابلے میں مَیں کسی اور کی بات نہیں مانوں گا۔ ویسے ہی اللہ کے مقابلے میں آپ کی بات نہیں مانوں گا۔"

ٹھاکر کے تجسّس کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس نے جمال دین کو ہمیشہ وفاداری، عاجزی اور فرماں برداری میں لپٹا دیکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا تھا اور اس نے صاف انکار کیا تھا۔ "یہ کیا بات ہوئی جمال دین۔"

"اللہ سب سے بڑا ہے ٹھاکر جی۔ سب کچھ اس کے حکم سے ہے۔"

"اور یہ اپنا حکم نہ ماننے کی سزا میں تجھے یہاں سے نکال دوں تو؟"

"میں یہاں سے چلا جاؤں گا ٹھاکر جی۔" جمال دین نے ٹھاکر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔"

"اور جو تیرے اپنے گاؤں میں زمین تیرے باپ پر لگ ہوئی تھی... تو کس نے اسے سہارا دیا تھا؟"

"آپ نے۔"

"تو تجھے اللہ کے مقابلے میں میرا حکم نہیں ماننا چاہیے؟" ٹھاکر نے بے حد رسان سے کہا۔

"نہیں ٹھاکر جی۔ آپ کو اللہ نے ہمارا وسیلہ بنایا تھا۔ آپ کے دل میں ہماری مدد کا خیال اللہ نے ڈالا تھا۔ ہمیں تو پہلے اللہ کا حکم ماننا ہے۔"

"اور میں تجھے یہاں سے نکال دوں تو تم لوگ کہاں نہیں مر جاؤ گے؟"

"نہیں سرکار۔ اللہ رزق دینے والا ہے۔"

"تجھے یہ یقین کیسے ہے؟"

"اللہ نے رزق کا وعدہ فرمایا ہے ٹھاکر جی۔ اور دیکھ لیں کہیں کال پڑ جائے تو لوگ بھوک سے مرتے ہیں۔ یہ اللہ کا کام ہے۔ ورنہ کہیں بھوک سے کوئی نہیں مرتا اور پھر ہم جانتے ہیں کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ ہے۔ جب آنا ہے تو مرنا ہے۔ یہ ایمان ہے ہمارا ٹھاکر جی۔"

ٹھاکر بہت حیران تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ راجپوت آن کی خاطر بھگوان سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ذرا سے فائدے کے لیے بھگوان کے حکم کا انکار کر دیا جاتا ہے۔ پھر یہ جمال دین کس مٹی کا بنا ہے۔ پہلی بار اس کے دل کی گہرائیوں میں مسلمان کی عزت پیدا ہوئی۔ اس نے سوچا۔ 'ارے یہ تو ہم سے بڑھ کر اصول کے پکے ہیں۔'

"چھوڑ ان باتوں کو جمال دین...!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں یونہی تجھے آزما رہا تھا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تُو اچھی طرح رہے۔ اب پیسے کی تو کمی نہیں ہے تجھے۔ تُو زمین دار ہے۔ تجھے شان سے رہنا چاہیے۔"

"ساری شان اس رب کی ہے ٹھاکر جی...!" جمال دین نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے تو اوپر وہ ہے اور نیچے آپ ہیں۔"

"اچھا۔ میں چلتا ہوں جمال دین۔" ٹھاکر اُٹھ کھڑا ہُوا۔

جمال دین کی اس ملاقات اور گفتگو نے ٹھاکر پرتاپ سنگھ پر بہت گہرا اور ان مٹ نقش چھوڑا تھا۔ اس رات وہ دیر تک اس سلسلے میں سوچتا اور غور کرتا رہا۔ اسے یاد تھا کہ بچپن ہی سے اس نے مسلمانوں کے لیے لفظ ملیچھ سنا تھا۔ ہندو ان کا ذکر حقارت سے کرتے تھے۔ اب ملیچھ کا مطلب ہی گندہ ہے۔ تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ بچپن کے ساتھ بڑا ہُوا تھا۔ راجپوتوں میں تو ویسے ہی برتر ہونے کا احساس بہت ہوتا ہے۔ وہ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں گردانتے۔ اور ایسے ہی نہیں، ان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ بات کے سچے، کھرے اور صاف گو ہوتے ہیں۔ بہادر ہوتے ہیں۔ پیچھے سے وار نہیں کرتے اور کم زور پر ہاتھ اٹھانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ آن کے مقابلے میں جان کی بھی انھیں پروا نہیں ہوتی۔ وعدہ وہ کبھی نہیں توڑتے اور دوستی ہر قیمت پر نبھاتے ہیں۔ انھیں اپنے ان اوصاف پر فخر ہوتا ہے۔ فخر انھیں اپنے نسب پر بھی ہوتا ہے اور اسی لیے وہ اپنے خون میں ملاوٹ پسند نہیں کرتے۔ اسے خالص رکھنا چاہتے ہیں۔

اس لمحے ٹھاکر کو یاد آیا کہ جب چھوٹے ٹھاکر کے دودھ کا مسئلہ سامنے آیا تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ آگ بگولا ہو گیا۔ اس کا بیٹا ایک مسلمان عورت کا دودھ پی کر اُس کے خالص خون میں ملاوٹ کرے، یہ وہ کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ مگر وہ بچہ اس کے لیے زندگی، آن، دھرم، ہر چیز سے بڑھ کر تھا۔ وہ اسے بائیس برس کی منّتوں مرادوں کے بعد ملا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس کے بعد وہ کبھی صاحب اولاد نہیں ہو سکے گا۔ یہ بچہ نہ رہا تو اس کی نسل اسی پر ختم ہو جائے گی۔ چناں چہ اسے بچے کی ضد کے آگے ہارنا پڑا۔

اوتار سنگھ کی پیدائش سے پہلے اسے اور ٹھاکرانی کو خواب میں بیک وقت بشارت دینے والا بھی مسلمان تھا اور انھوں نے دیکھ لیا کہ بشارت سچی تھی۔ پھر اس کی پیدائش والے دن جو عجوبہ آیا، وہ بھی مسلمان تھا۔ پھر اس کے بعد اس نے خواب میں انھی مسلمان بزرگ کو دیکھا تھا۔ اسے ان کی ہر بات، ہر کلمہ یاد تھی اور وہ بچہ نہیں تھا۔ چاہے وہ شعوری طور پر اعتراف کرنے سے بچے لیکن اس نے جان لیا تھا کہ اس کے بچے کا مسلمانوں سے کوئی تعلق ہے اور اس کا جھکاؤ بھی مسلمانوں کی طرف ہے۔ یہی سمجھنے کے بعد تو اس نے مسلمانوں کے لیے اپنا رویہ تبدیل کیا تھا، بلکہ ٹھاکرانی کو بھی تنبیہہ کی تھی۔

بچے کی دودھ کی ضد کے سامنے ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے بری طرح شکست کھائی تھی۔ لیکن ایک سچے اور اچھے راجپوت کی طرح اس نے سر جھکایا تو پوری طرح جھکایا۔ اُس نے اس دن کے بعد حمیدہ کو اپنے من میں بہن کا درجہ دیا اور وہ سب کچھ کیا جو ایک احسان مند راجپوت کر سکتا تھا۔ لیکن برسوں کے نظریات جو اس کے باطن میں جڑ پکڑے ہوئے تھے، ایک دم سے نہیں مٹ سکتے تھے۔ چناں چہ یہ خلش اسے ہمیشہ ستاتی رہی کہ اس کا خالص خون خالص نہیں رہا۔ اس میں ملاوٹ ہو گئی ہے۔

قدرتی بات ہے کہ وہ اس پر غور کرتا تھا کہ اس کے خون میں ملاوٹ آخر کس قسم کی ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کے بیٹے میں کیسی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس کے پاس مسلمانوں کے بس دو ہی حوالے تھے۔ ایک اپنے پرانے کلاس فیلو امان اللہ کا اور دوسرا مہر دین اور اس کے گھرانے کا۔ مگر پہلے اسے ان کے بارے میں غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لیکن اب یہ ضروری ہو گیا تھا۔ چناں چہ اس نے وقت میں پیچھے جا کر یاد کرنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ اور اس نے امان اللہ کو نظر انداز کر دیا۔ ایک تو اس کا ساتھ بہت پرانی اور بھولی بسری بات تھی۔ دوسرے اس سے کوئی بلا واسطہ تعلق بھی نہیں تھا۔ جب کہ مہر دین کے بیٹے جمال دین سے تھا۔ اُس کا بیٹا اسی کی بیوی کا دودھ تو پی رہا تھا۔

سب سے پہلے تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مسلمان گندے ہرگز نہیں ہوتے۔ اس لیے انھیں ملیچھ کہہ کر پکارنا غلط ہے، بلکہ اس کے برعکس وہ ہندوؤں سے کہیں زیادہ صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ ہر نماز سے پہلے، یعنی دن میں کئی مرتبہ تو وہ آدھا اشنان کرتے ہیں۔ اس کے بغیر تو وہ نماز پڑھ ہی نہیں سکتے۔ پھر اپنی عادات میں بھی وہ پاکیزہ ہوتے ہیں۔ اور یہ کھلی ہوئی بات تھی۔

پھر ٹھاکر کو مہر دین سے ملاقات یاد آئی۔ وہ جب اس سے ملا تو مہاجن اس کے گھر پر قبضہ کر رہا تھا اور پوری بات ٹھاکر کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ گاؤں کا زمین دار مہر دین کی بیٹی کے چکّر میں تھا اور اس سلسلے میں مہاجن کے قرضے کو استعمال کر رہا تھا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے ایسے کھیل بہت دیکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان کے گاؤں، دیہاتوں بلکہ شہروں میں یہ کھیل کروڑوں بار کھیلا جا چکا ہے اور ہر بار غریب کسان نے شکست کھائی ہے اور ظالم زمین دار فتح یاب ہُوا ہے۔ غریب نے ہمیشہ عزت اور آبرو کے بدلے اپنا گھر، اپنا معاش بچایا ہے۔ لیکن مہر دین اس

پر آمادہ نہیں تھا۔ اس نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ ٹھاکر کو اس کی یہی ادا تو بھائی تھی۔ راجپوت اپنے کردار کے اوصاف پر فخر کرتا ہے۔ مگر اور کسی میں کردار دیکھے اور اوصاف نظر آئیں تو اسے بھی عزت دیتا ہے۔

پھر وہ گھرانا اس کے گاؤں میں آباد ہوگیا تھا۔ تب اس نے ان کے اور اوصاف دیکھے۔ مگر ان پر غور اب کر رہا تھا۔ وہ وفادار تھے۔ بات کے پکے تھے۔ احسان ماننے والے تھے۔ مطلبی نہیں تھے۔ احسان کرنے والے کے لیے جان دینے میں بھی انھیں عار نہیں تھی۔ یہ چھوٹی خوبیاں نہیں ہوتیں۔

یہ سب پرانی باتیں تھیں۔ مگر اب ٹھاکر پرتاپ سنگھ، جمال دین سے اپنی تازہ ترین گفتگو کے حوالے سے سوچ رہا تھا۔ وہ اپنا اور جمال دین کا موازنہ کر رہا تھا۔ اور موازنہ کرنے کے لیے آئینہ دیکھنا ضروری ہے۔ ٹھاکر کو خود کو بھی سمجھنا تھا۔ پہلے ہی مرحلے میں اسے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مسلمانوں کے لیے اس کی ناپسندیدگی کی کوئی ٹھوس اور معقول وجہ نہیں تھی۔ بلکہ اس کا سب نسل در نسل ورثے میں ملنے والا تعصب تھا۔ اور وہ خود کوئی اچھا ہندو نہیں تھا۔ اس کے خیال میں یہ دیوی دیوتا سب فرسودہ باتیں تھیں۔ اس نے زندگی میں کبھی پوجا نہیں کی تھی۔ مگر جب اسے بیٹے کی آرزو ہوئی اور وہ پوری ہوتی نظر نہیں آئی تو وہ مندروں میں گیا، پوجا کی، چڑھاوے دیے۔ درختوں تک سے اولاد مانگی۔ اس نے یہ سب کچھ کیا تو اپنی غرض، اپنے مطلب سے۔ اس وقت اگر کوئی اس سے کہہ دیتا کہ اپنے گاؤں میں مندر گرا دینے سے، کوئی مورتی توڑ دینے سے اس کی مراد پوری ہوسکتی ہے تو وہ یقیناً ایسا بھی کر گزرتا۔

اور اصل راجپوت ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے برعکس ایک عام مسلمان جمال دین تھا جس کی ذات کا، حسب نسب کا پتا نہیں تھا، بلکہ یقیناً وہ اونچی ذات کا نہیں تھا۔ لیکن وہ اس کے ہندو ہونے کے باوجود اس کے احسان کے حوالے سے اس کی ایسی عزت کرتا تھا کہ اس کے لیے جان دے سکتا تھا۔ اس نے خود کہا تھا کہ وہ اللہ کے بعد اسے سب سے بڑا مقام دیتا ہے... اسے... ایک ہندو کو! اس کی طاقت کی وجہ سے نہیں۔ صرف اس لیے کہ اس کے اللہ نے احسان ماننے کا حکم دیا ہے اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ چاہے اس سے روزگار چھن جائے، گھر بار چھن جائے، بیوی بچے چھن جائے، پھر بھی وہ نماز چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اگر وہ اس سے مورتی کی پوجا کرنے کو کہتا، تب بھی وہ انکار کر دیتا اور وہ منافق بھی نہیں تھا کہ گھر بچانے کے لیے نماز چھوڑنے کی ہامی بھر لیتا۔ بعد میں چاہے چھپ کر نماز پڑھتا رہتا۔ یعنی وہ بزدل نہیں تھا۔ بہادر تھا۔ کم زور ہونے کے باوجود طاقت ور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انکار کرتا تھا۔

اور ایک بہت بڑی خوبی جمال دین کا ایمان تھا۔ اللہ رزق دے گا۔ سب کچھ اسی کے حکم سے ہے۔ اس کا حکم ہوگا تو وہ مرجائے گا۔ زندگی بچانے کے لیے اس کے حکم کے خلاف کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ ایمان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ مگر اسے ایمان میں بڑی کشش محسوس ہوئی۔ اسے جمال دین پر رشک آیا۔ یہ ایمان اس کے پاس ہوتا تو وہ کہتا... میرے چھوٹے ٹھاکر بھگوان کی مرضی ہوئی تو جئیں گے۔ میں انھیں مسلمان عورت کا دودھ نہیں پینے دوں گا۔ ٹھاکر کو نامعلوم طور پر احساس ہو رہا تھا کہ ایمان والے کو کوئی نہیں ہرا سکتا۔ کیسے؟ یہ وہ نہیں جانتا تھا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ اب جمال دین کے پاس ٹھاکر سے زیادہ سے زمین تھی، زیادہ پیسا تھا۔ اس کے حلقے کوئی اور ہوتا تو ٹھاکر کی، نکالنے کی دھمکی سن کر کہتا، تم مجھے نکالو گے۔ میں مالک ہوں اس زمین کا۔ میں تمھیں نکال دوں گا یہاں سے۔ لیکن جمال دین نے اس کے نکالنے کا حق تسلیم کیا تھا۔ اس نے اپنا تابع ہی سے جوڑا۔ اور وہ کیسا آدمی ہے کہ اتنی زمین، اتنے پیسے کا مالک ہونے کے باوجود اپنے حال میں مست ہے۔ اس نے کسی سے نہیں کہا کہ اب میں بہت بڑا زمین دار ہوں۔ اس میں بڑائی نہیں۔ عاجزی ہی عاجزی ہے اور اس نے آخر میں کیسے کہا کہ میں کیا ہے تو اوپر اللہ ہے اور یہاں آپ ہیں ٹھاکر جی۔

اس عاجزی کے سامنے ٹھاکر کا سر جھک گیا۔ اس نے دل میں تسلیم کرلیا کہ جمال دین اس سے بڑا آدمی ہے۔ اس میں اور اس جیسے پوتوں سے زیادہ خوبیاں ہیں۔ پہلی بار اسے یہ اطمینان ہوا کہ جمال دین کے دودھ نے اس کے بیٹے کو اور بہتر انسان بنایا ہوگا اور یہ کہ وصال دین کے ساتھ کھیل کر اسے خوبیاں ہی ملیں گی، خرابیاں نہیں۔

اس رات ٹھاکر پرتاپ سنگھ سویا تو اس کی شخصیت میں ایک بہت بڑا انقلاب رُونما ہو چکا تھا۔

ٹھاکرانی رنجیتا ان دنوں بہت پریشان تھی۔ پریشان اور خوف زدہ بھی۔ پریشان وہ اس لیے تھی کہ اس کا ننھا بیٹا اور وصال دین سے بہت قریب ہوگیا تھا۔ بلکہ یوں کہیے کہ

انھیں دیکھ کر جیتا تھا۔ اس کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ زیادہ لوگوں سے گھلتا ملتا نہیں تھا۔ اور جن لوگوں سے تعلق جُڑا تو وہ بہت گہرائی تک جُڑا تھا۔ اس کی زندگی میں ماتا جی، پتا جی، اماں، ویر جی اور چاچا جی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ گھر میں اتنے ملازم، اتنی نوکرانیاں تھیں مگر اسے کسی سے غرض نہیں تھی۔

اب جب کہ اس کا دودھ چھڑایا جا چکا تھا تو ٹھاکرانی چاہتی تھی کہ اسے حمیدہ اور اس کے پریوار سے دُور کر دے لیکن چھوٹا ٹھاکر جس طرح ان کا دیوانہ تھا، اسے یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا، اور یہ تعلق اسی طرح بڑھتا رہا تو ٹھاکرانی کو خوف تھا کہ کسی دن ٹھاکر بری طرح ٹوٹ جائے گا۔

ویسے ٹھاکرانی کو اپنے چھوٹے سے بچے پر ترس بھی آتا تھا۔ اپنے بھائی بہن ہوں تو بچہ اتنا تنہا نہیں ہوتا۔ لیکن ننھا اوتار سنگھ تو بالکل اکیلا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ حمیدہ اور وصال دین نہ ہوتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ ٹھاکرانی سوچتی تو اس پر شرمندگی ہوتی کہ وہ انھیں بھی اس سے چھیننے کی کوشش کر رہی ہے۔

پھر اسے ایک خوف اور بھی تھا۔ اوتار سنگھ ساڑھے تین سال کا ہو چکا تھا۔ ٹھاکر پڑھا لکھا آدمی تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ضرور تعلیم دلائے گا۔ اور گاؤں میں کوئی اسکول تھا نہیں تو تعلیم کے لیے چھوٹے کو گھر سے دُور جانا ہوگا۔ ابھی تک تو ٹھاکر نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن ٹھاکرانی جانتی تھی کہ اس کے سر پر جدائی کی تلوار لٹک رہی ہے۔ یہ خیال ہی اس کے لیے تڑپا دینے والا تھا کہ ننھا راج کمار اس سے دُور ہو جائے گا۔ برسوں کی تنہائی کے بعد وہ اسے ملا تھا۔ وہ تو اسے ایک لمحے کے لیے بھی خود سے جدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ٹھاکرانی کو بیٹے سے اپنی جدائی کا خیال آتا تو وہ بے رحم ہو جاتی۔ وہ سوچتی کہ وہ عمر بھر کی ترسی ہوئی ماں ہو کر بھی اپنے بیٹے کی جدائی برداشت کر سکتی ہے تو اس کا بیٹا جو صرف ساڑھے تین سال کا ہے، حمیدہ اور وصال دین کی جدائی برداشت کیوں نہیں کر سکتا۔

یوں سوچتے سوچتے اسے ایک دن اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ مسئلے دو نہیں رہے، ایک ہوگیا۔ اس کے ایک مسئلے میں دوسرے مسئلے کا حل تھا۔ اوتار سنگھ پڑھنے کے لیے شہر جاتا تو وہ حمیدہ اور وصال دین سے بھی دُور ہو جاتا لیکن اس سے ٹھاکرانی کی تسلی نہیں ہوئی۔ یوں وہ بھی تو محروم ہو جائے گی اپنے بیٹے سے۔ ایسا کیوں ہو۔ اس کا، دودھ کا مطلب نکل چکا تو وہ پھر رقابت کی آگ میں جلنے لگی تھی۔

دھوئیں کا مندر

نائیجیریا میں ایک مندر ''دھوئیں کے مندر'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس مندر کی زیارت کرنے والے لوگ وہاں پائپ میں پینے والا تمباکو چڑھاتے ہیں۔ مندر کے چاروں طرف ہر وقت تمباکو کا دھواں چھایا رہتا ہے اس مندر کی تاریخ یوں بیان کی جاتی ہے کہ بہت عرصہ ہوا ایک بادشاہ پائپ پینے کا بہت شوقین تھا ہر وقت اس کے منہ میں پائپ لگا رہتا تھا اور اس کے چہرے کے چاروں طرف دھواں چھایا رہتا تھا مرتے وقت اس نے خواہش ظاہر کی کہ اس یادگار کے طور پر ایک مندر بنایا جائے جس میں خوشبوئیں جلانے کے بجائے صرف تمباکو جلایا جائے تاکہ اس کے دھوئیں سے اس کی روح کو سکون حاصل ہو۔

چنانچہ اس کی خواہش کے مطابق ایک مندر بنا دیا گیا۔ آج تک اس پر عقیدت مند لوگ تمباکو چڑھاتے ہیں اور شاید جب تک مندر موجود رہے گا اس وقت تک چڑھاتے رہیں گے۔

تعاون ✪ جنید احمد

آدمی جس چیز سے ڈرتا ہے، ڈر بڑھ جائے تو خود اس کی طرف لپکتا ہے۔ ٹھاکرانی کی پریشانی اور خوف اتنا بڑھا کہ اس نے خود ہی آگ میں کودنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس رات ننھے ٹھاکر کو سُلانے کے بعد وہ بڑے ٹھاکر کے کمرے کی طرف چل دی۔

اوتار سنگھ کی پیدائش کے بعد بڑے ٹھاکر میں بڑی تبدیلیاں آئی تھیں۔ اس کی باہر کی مصروفیات کم ہوگئی تھیں۔ شام ہوتے ہی وہ گھر میں آجاتا اور اوتار سنگھ کے سونے تک وہ اس کے ساتھ وقت گزارتا۔ یہ اس کا ٹھاکرانی پر احسان تھا۔ کیوں کہ ننھا اوتار سنگھ سوال بہت کرتا تھا۔ اور زیادہ تر سوال ایسے ہوتے تھے کہ ٹھاکرانی ان کا جواب نہیں دے سکتی تھی، بلکہ وہ دیکھتی تھی کہ بعض اوقات تو ٹھاکر بھی پریشان ہو جاتا ہے کہ کیا جواب دے۔

ٹھاکرانی پورے یقین سے ٹھاکر کے کمرے کی طرف گئی اور اس کا یقین غلط بھی نہیں تھا۔ ٹھاکر اپنی مسہری پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ ایسا مُنہمک تھا کہ اسے ٹھاکرانی کی آمد کا پتا بھی نہیں چلا۔ ٹھاکرانی کے پکارنے پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ''رنجیتا تم؟ کب آئیں؟''

''دیر ہوگئی ناتھ۔ مگر آپ تو ایسے کھوئے ہوئے ہیں۔'' ٹھاکرانی نے شکایتاً کہا۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ پچھلے چند ماہ سے ٹھاکر کو کتابیں پڑھنے کا شوق ہوگیا تھا۔ ہر ہفتے پندرہ دن

میں وہ شہر جاتا اور کتابیں خرید کر لاتا۔ اوتار سنگھ کے سونے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھتا رہتا تھا۔

ٹھاکر نے کتاب الٹ کر رکھ دی۔ ''ہاں، پڑھتے ہوئے کچھ ہوش ہی نہیں رہتا۔''

''یہ آپ کو اب پڑھنے کا شوق ہوا ہے!''

''بڑھاپے میں۔'' ٹھاکر نے ہنستے ہوئے ٹکڑا لگایا۔

''تمھیں حیرت ہوتی ہے؟''

''ہاں ناتھ۔ میری سمجھ میں اس کی ضرورت نہیں آتی۔ پڑھتے کیا ہیں آپ؟''

''کچھ نہیں زندگی کو، دنیا کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''مگر کس لیے؟''

''تمھارے بیٹے کے لیے رنجو۔'' ٹھاکر مسکرایا۔ ''دیکھتی نہیں، کیسے کیسے سوال کرتا ہے۔ میں جواب نہ دے پاؤں تو سمجھے گا کہ اس کا پتا جاہل ہے۔''

''بھگوان نہ کرے...!'' ٹھاکرانی نے جلدی سے کہا۔

''ویسے وہ سوال بڑے عجیب کرتا ہے۔'' ٹھاکرانی کے لہجے میں فخر تھا۔

''تو ایسے بچے کے لیے تیاری کرنا ضروری ہے نا۔ ایسی تو میں نے کبھی اپنے امتحان کے لیے بھی تیاری نہیں کی تھی...'' ٹھاکر ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ ''یہ بتاؤ، تم کیسے آئی ہو۔ ویسے تو کبھی خیال ہی نہیں آتا میرا۔ چھوٹے کے بعد تو بس تم اسی کی ہو گئیں۔ مجھے تو چھوڑ ہی دیا تم نے۔''

''ایسی باتیں نہ کریں ناتھ...!'' ٹھاکرانی کھسیا گئی۔ ''مگر اس وقت تو میں کام سے ہی آئی ہوں۔''

''تو کہہ دو جلدی سے۔''

''میں چاہتی ہوں کہ اپنے چھوٹے کو حمیدہ اور وصال دین سے دُور کر دیا جائے۔''

''کیوں بھئی؟'' ٹھاکر حیران رہ گیا۔

''ناتھ، بچہ اب سیکھنے کی عمر میں ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ رہے گا تو انھی کی باتیں سیکھے گا۔''

''یہ تو پہلے سوچنے کی بات تھی ٹھاکرانی...'' ٹھاکر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اس نے تو دودھ ہی مسلمان عورت کا پیا ہے۔ اب اتنی فکر کاہے کی کرتی ہو۔''

''وہ تو مجبوری تھی ناتھ۔ بچے کی ضد کے آگے ہارنا پڑا۔ مگر اب تو وہ دودھ چھوڑ چکا ہے۔ اب تو اسے آسانی سے ان سے دُور کیا جا سکتا ہے۔''

''تم بھول رہی ہو ٹھاکرانی کہ ہم راجپوت آن کے مقابلے میں کسی مجبوری کو نہیں مانتے...'' ٹھاکر کے تیور بہت خراب تھے۔ ''اور احسان لینا ہمیں منظور نہیں ہوتا۔ لیکن احسان لے لیں تو جیون بھر یاد رکھتے ہیں۔ سر جھک جائے تو جیون بھر نہیں اٹھتا۔ کیا ہم راجپوت عام لوگوں کی طرح مطلبی ہو سکتے ہیں کہ مطلب نکل جانے کے بعد مُنہ پھیر لیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہم نے ایسا کیا تو ہم میں اور ایک نیچ منش میں کیا فرق رہ جائے گا۔''

ٹھاکرانی اس کے تیور دیکھ کر سہم گئی۔ ''شما کر دیں ناتھ۔ میں تو سب کا بھلا سوچ رہی تھی۔''

''اچھا... یہ تو بتاؤ، تم اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتی تھیں۔ تمھارے خیال میں چھوٹے ٹھاکر کو ان لوگوں سے کیسے دُور کیا جا سکتا ہے؟''

''حمیدہ اور اس کے بیٹے کو حویلی آنے سے روک دیا جائے۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔ اس کے دل میں امید جاگ اٹھی تھی۔

''تم بڑی نادان ہو رنجو۔ اپنے بیٹے کو بھی نہیں جانتیں۔'' ٹھاکر نے بارٹھاکر کے لہجے میں پیار تھا۔ ''جب اسے بولنا نہیں آتا تھا، تو کبھی نہیں آتا تھا، طاقت بھی نہیں تھی اس میں، تب بھی اس کی ضد کے ہمیں ہرا دیا تھا۔ اب کیا ہو سکتا ہے، یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔''

ٹھاکرانی کچھ نہ بولی۔ یہ بات اس کے دل کو لگی تھی۔ لیکن اس کے ترکش میں ایک تیر ابھی باقی تھا۔ ''اور ناتھ۔ دوسری فکر مجھے چھوٹے کی پڑھائی کی ہے۔ اب پڑھنے کی عمر میں آ رہا ہے وہ۔''

''ہاں... بلکہ آ چکا ہے۔'' ٹھاکر نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ ''اس کے سوال، اس کی پوچھ تاچھ سے یہی پتا چلتا ہے۔ میرا خیال ہے، کچھ ہی دن بعد میں اس کے سوالوں کے جواب دینے سے ہار جاؤں گا۔ ہاں، اب اسے کسی گیانی استاد کی ضرورت ہے۔''

''لیکن یہاں قریب میں کوئی اچھا اسکول نہیں ہے۔''

''یہ درست ہے۔ تو پھر؟''

''اسے شہر بھیجنا پڑے گا۔''

ٹھاکر دل ہی دل میں پتنی کی عقل مندی پر مسکرایا۔ وہ بات بہت اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ تم اس سے دُوری سہہ سکتی ہو۔ اور تم چاہے سہہ لو، میرے بس کی بات نہیں۔''

اب کے سوال اٹھانے کی باری ٹھاکرانی کی تھی۔ ''تو پھر؟ اسے پڑھانا تو ضروری ہے۔''

''ہاں۔ لیکن میں ابھی تو اسے خود سے دُور نہیں کر سکتا۔

کچھ بڑا ہو جائے تو دیکھیں گے۔''

''تو پھر؟''

''تم یہ مجھ پر چھوڑ دو رنجو...'' ٹھاکر نے بڑے پیار سے کہا۔ ''میں خود بلی جاؤں گا۔ اس مسئلے کا کوئی حل نکل آئے گا۔''

اب ٹھاکرانی کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ ''جو آپ کی اچھا سوامی جی۔'' اس نے کم زور آواز میں کہا۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے اپنے بچے کو ایک کڑی آزمائش سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ٹھاکرانی کو اس سے تسلی نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے ہمیشہ یہ خیال رہتا کہ اس سلسلے میں کوشش ہی نہیں کی گئی اور وہ ہمیشہ ڈرتی اور ہاتھ ملتی۔ لیکن قدرت نے اسے اس کشٹ سے بچا لیا۔

اس بات کو چند ہی روز ہوئے تھے کہ پہلی بار معمول میں فرق آیا۔ حمیدہ اور وصال دین حویلی نہیں آئے۔ اس روز جمال دین اکیلا ہی آیا تھا۔

چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''چاچا جی، اماں نہیں آئیں، ویر جی نہیں آئے؟''

''نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ وہ نہیں آ سکیں گے۔ وصال دین کو بخار ہے... بہت تیز بخار۔''

ننھے ٹھاکر نے پہلے بخار کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ وہ اپنی اماں اور ویر جی کے نہ آنے کو بھی بھول گیا۔ فطری تجسس ہر بات پر حاوی آ گیا۔ ''یہ بخار کیا ہوتا ہے چاچا جی؟''

جمال دین گڑبڑا گیا۔ وہ اس طرح کے سوالات کا عادی نہیں تھا۔ اب بخار کے بارے میں کیا بتائے۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ''ایک بیماری ہوتی ہے۔''

''اور بیماری کیا ہوتی ہے؟''

جمال دین اور گڑبڑا گیا۔ اس دوران ٹھاکرانی بھی آ گئی تھی اور یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ وہ جمال دین کی مدد کو بڑھی۔ ''شریر میں جو خرابی ہوتی ہے، اسے بیماری کہتے ہیں۔'' اس نے ننھے بیٹے کو سمجھایا۔

''تو بیماری سے کیا ہوتا ہے؟'' ننھے ٹھاکر کے پاس سوالوں کی کمی نہیں تھی۔

''بیماری سے شریر کی شکتی کم ہو جاتی ہے۔''

''اور بخار کیا ہوتا ہے؟''

''اس میں شریر کی گرمی بہت بڑھ جاتی ہے۔ شریر دُکھتا ہے اور منش چل پھر نہیں سکتا۔''

اس طرف سے تسلی ہوئی تو ننھے ٹھاکر کو اپنی محرومی کا خیال آیا۔ ''تو ویر جی کب آئیں گے؟''

''پتا نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ بہت تیز بخار ہے اسے۔ دعا کریں کہ شام تک اتر جائے۔''

''خود بہ خود اتر جائے گا؟''

''نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ ابھی میں ویدجی کے پاس جا کر دوا لوں گا اس کے لیے...'' جمال دین نے کہا۔ پھر زمین پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''آیئے چھوٹے ٹھاکر۔ گھوڑا حاضر ہے۔''

ننھے ٹھاکر نے سواری تو کی لیکن انداز سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے اور ناشتے سے تو اس نے انکار ہی کر دیا۔ ٹھاکرانی کو تو پرانے دن یاد آ گئے جب اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔

بہ ہر حال بڑے ٹھاکر کے سمجھانے پر اس نے بڑی بے دلی سے ناشتا کر لیا۔ لیکن وہ دن اس نے جس طرح گزارا، اسے دیکھ کر ٹھاکر اور ٹھاکرانی دونوں کو ترس آنے لگا۔ وہ تو اس بچے کی طرح تھا جو بارونق میلے میں اپنے لوگوں سے بچھڑ گیا ہو۔ پورا دن اس نے کسی کھلونے میں، کھیل کود میں دل چسپی نہیں لی۔ بس وہ بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہا۔ بیٹھے بیٹھے اُکتا جاتا تو مشینی انداز میں اِدھر اُدھر چلنے پھرنے لگتا۔ وہ اِتنا بے زار اور اُکتایا ہُوا تھا کہ ٹھاکرانی کا دل کٹنے لگا۔

''چلو... بھگوان نے تمھاری منو کامنا پوری کر دی۔'' ٹھاکر نے رنجیدگی سے کہا۔ ''ننھا بیٹا حمیدہ اور وصال دین سے دُور ہو گیا۔''

''مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ حال ہو جائے گا میرے راج کمار کا۔'' ٹھاکرانی نے تاسف سے کہا۔

''مگر میں جانتا تھا۔ اس لیے منع کیا تھا۔''

ننھے ٹھاکر نے کھانا بھی برائے نام کھایا۔ ٹھاکرانی کے اصرار پر اس نے کہا۔ ''ماتا جی، کھایا نہیں جاتا۔ گلے میں کچھ پھنس رہا ہے۔''

اس کے لہجے میں ایسی بے چارگی اور دکھ تھا کہ ٹھاکرانی کے اپنے حلق میں کچھ پھنسنے لگا۔

اور سرِ شام ہی چھوٹا ٹھاکر مُنہ لپیٹ کر پڑ گیا۔ ورنہ اس وقت ہر روز وہ اپنے پتا جی سے کھیلتا، ان سے باتیں کرتا تھا۔ ٹھاکر نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنی جلدی کیوں لیٹ گیا ہے تو اس نے کہا۔ ''میں سو جاؤں گا پتا جی۔ صبح اٹھوں گا تو اماں اور ویر جی آ جائیں گے۔''

یعنی وہ اپنے بچھڑے ہوؤں کا انتظار کر رہا تھا۔

ٹھاکرانی کو تو ہول اٹھنے لگا۔ ''ناتھ... بھگوان نہ کرے، اس کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔

ٹھاکر خود بھی پریشان تھا۔ ”اگر وہ لوگ کل بھی نہیں آسکے تو؟“

”بھگوان نہ کرے...!“ ٹھاکرانی نے بڑے خلوص سے کہا۔ یہ سوال خود اسے بھی پریشان کررہا تھا۔ ”اور اگر ایسا ہُوا تو؟“

”کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔“

”کسی بھی طرح انھیں آنا ہی ہوگا۔“

ٹھاکر کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ”کیسی بات کرتی ہو رنجیتا۔ وہ بھی منش ہیں۔“

وہ دونوں بار بار بیٹے کے پاس جاتے۔ وہ لیٹا ہُوا تو تھا۔ لیکن اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ انھوں نے کئی بار اسے پکارا۔ لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ ظاہر یہی کررہا تھا کہ وہ سو رہا ہے۔ ٹھاکرانی بار بار اس کا ہاتھ تھام کر دیکھتی کہ کہیں اسے بخار تو نہیں ہے۔

دونوں کی وہ رات سوتے جاگتے گزری۔ کیوں کہ ان کا بیٹا بھی اسی حال میں تھا۔ ایک جھپکی آتی اور پانچ منٹ بعد وہ چونک کر اٹھ جاتا۔ ”ماتاجی... صبح ہوگئی؟“

”نہیں پُتر۔ ابھی تو آدھی رات ہے۔ صبح تو بہت دُور ہے۔“

”یہ صبح اتنی دیر میں کیوں ہوتی ہے؟“ ننھا بچہ جھنجلا کر پوچھتا۔

ٹھاکرانی اسے کیا بتاتی کہ صبح تو اپنے وقت پر ہوتی ہے۔ لیکن انتظار ہو تو وقت جیسے ٹھیر جاتا ہے۔

ٹھاکر بھی رات بھر اس کمرے کے چکر لگاتا رہا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ سوچے جارہا تھا کہ اس مسئلے کا کیا حل ہے۔

صبح کے قریب کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ نیند آہی جاتی ہے۔ اور گہری نیند آتی ہے۔ اس وقت ٹھاکرانی بھی سوگئی۔ ذرا ہی دیر ہوئی ہوگی کہ اوتار سنگھ نے اسے جھنجوڑ کر اٹھادیا۔ ”انھیں ماتاجی، اٹھ جائیں۔ صبح ہوگئی ہے۔“

ٹھاکرانی گھبرا کر اٹھی۔ کھڑکی کے پاس گئی۔ پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو گہرا اندھیرا تھا۔ ”نہیں پُتر جی، ابھی تو رات ہے۔“ اس نے کہا۔

”نہیں ماتاجی۔ سنیں تو۔ چڑیاں بول رہی ہیں۔“

ٹھاکرانی نے کان لگا کر سنا۔ کہیں ایک آدھ چہکار سنائی دے رہی تھی۔ مگر ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ ”سو جاؤ پُتر۔ ابھی تھوڑی دیر ہے صبح ہونے میں۔“ اس نے بیٹے کو سمجھایا۔

لیکن ننھے ٹھاکر کے لیے انتظار کی رات کی صبح ہوچکی تھی۔ یہ الگ بات کہ انتظار اب بھی کرنا تھا۔ وہ اس کے بعد نہ سویا، نہ ٹھاکرانی کو سونے دیا۔

وہ ایسی صبح تھی جس میں سب کے لیے انتظار ہی انتظار تھا۔ ٹھاکر اور ٹھاکرانی بھی آنے والوں کے منتظر تھے۔ لیکن ان کے آنے کا وقت ابھی دُور تھا۔

اور جب وہ وقت آیا تو مایوسی لے کر آیا۔ اس صبح بھی جمال دین اکیلا ہی آیا۔ ”وصال دین کا بخار کل سے اب تک نہیں اُترا ہے۔“ اس نے بتایا۔

ننھے ٹھاکر کی مایوسی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اُس روز اس نے جمال دین پر سواری کرنے سے بھی انکار کردیا۔ اور ناشتے کو وہ ہاتھ لگانے کا روادار بھی نہیں تھا۔

ٹھاکر اور ٹھاکرانی پریشان تھے کہ اب کیا کریں۔

اچانک ننھے ٹھاکر نے کہا۔ ”پتاجی... مجھے ویرجی کے پاس جانا ہے۔ مجھے لے کر چلیں۔“

ٹھاکر کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہُوا۔ اسے حیرت ہوئی اور خود پر غصہ بھی آیا۔ اتنے سامنے کی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس مسئلے کا واحد حل یہ تھا کہ ننھے ٹھاکر کو وصال دین کے پاس لے جایا جائے۔

لیکن ٹھاکر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ٹھاکرانی بول اٹھی۔ ”یہ نہیں ہوسکتا پُتر۔“

”کیوں نہیں ہوسکتا ماتاجی؟“

”بس... نہیں ہوسکتا۔“ ٹھاکر نے بے حد سخت لہجے میں کہا۔ پھر بیٹے کی طرف مڑا۔ ”یہ ٹھیک ہے پُتر۔ ہم خود تمھارے ویرجی کے گھر چلیں گے۔“

ننھا ٹھاکر خوش ہوگیا۔ چوبیس گھنٹے میں پہلی بار اس کے چہرے پر خوشی نظر آئی تھی۔ اسے دیکھ کر ٹھاکرانی کا دل بھی موم ہوگیا۔ ”ٹھیک ہے ناتھ۔“

”تم ناشتا تیار کرو رنجو۔ ہم ناشتا ساتھ لے کر جائیں گے اور تم جمال دین...“ ٹھاکر جمال دین کی طرف مڑا۔ ”تم ویدجی کو لے کر اپنے گھر پہنچو۔“

”ویدجی سے تو مجھے دوا لینی ہے...“ جمال دین نے حیرت سے کہا۔ ”وہ کب کہیں جاتے ہیں۔“

”ان سے کہنا، یہ میرا حکم ہے۔“ ٹھاکر نے سخت لہجے میں کہا۔

جمال دین چلا گیا۔ ٹھاکر گاڑی تیار کرانے لگا۔ جمال دین کا گھر گاؤں کے آخری سرے پر تھا۔ بچے کو اتنی دور پیدل نہیں لے جایا جاسکتا تھا۔

ٹھاکر نے گاڑی تیار تو کرالی۔ مگر اس کے بعد وہ دوسرے انداز میں سوچنے لگا۔ اسے یاد تھا کہ اپنی غرض کے لیے جب وہ پہلی بار جمال دین کے گھر گیا تھا تو اس نے یہ خیال رکھا تھا کہ غرض مندوں کی طرح جائے۔ سو وہ آدھی رات کو پیدل ہی اس کے گھر گیا تھا اور آج بھی بات غرض کی تھی۔ تو پھر یہ اہتمام اور کرّ وفر کیسا! دوسری بات یہ کہ اوتار سنگھ کا حمیدہ سے دودھ کا تعلق جڑنے کے بعد اس نے اس کے گھرانے کو ہر اعتبار سے برابری کا درجہ دیا تھا۔ اب اسے خیال آرہا تھا کہ یہ برابری تو نہیں۔ وصال دین اپنی ماں کے ساتھ ہر روز پیدل چل کر حویلی آتا تھا۔ جب کہ اس کا باپ پہلی بار حمیدہ کے گھر جارہا تھا۔ اسے بھی پیدل ہی جانا چاہیے۔

اور اس برابری کے خیال نے ٹھاکر سے ایک فیصلہ اور کرایا۔ یہ کیا کہ وصال دین اپنی ماں کے ساتھ ہر روز حویلی آئے۔ یہ بھی برابری تو نہیں۔ برابری تو یہ ہے کہ ایک دن وصال دین حویلی آئے اور دوسرے دن اوتار سنگھ اس کے گھر جائے اور وہاں وقت گزارے۔ یہ فیصلہ کرکے وہ پُرسکون ہوگیا۔

ٹھاکرانی ناشتے کا سامان لے کر آئی تو ٹھاکر نے دونوں فیصلے اسے سنادیے۔ ٹھاکرانی جز بز تو ہوئی۔ لیکن اختلاف کرنے کی ہمّت نہ کرسکی۔ تاہم اس نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ ”میرا بچہ اتنا چھوٹا ہے۔ پیدل چلے گا تو تھک جائے گا۔“

”نہیں تھکے گا ماتاجی۔ ویرجی سے ملنے تو میں خوشی خوشی جاؤں گا۔“ ننھے ٹھاکر نے کسی کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

وہ چلنے لگا تو ٹھاکرانی بھی ساتھ ہولی۔ ”آج تو میں بھی چلوں گی۔“

ٹھاکر نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹھاکرانی دیکھنا چاہتی ہے کہ اس کا بچہ کہاں جایا کرے گا۔

اس سے پہلے ننھے ٹھاکر کی دنیا صرف اس کی آبائی حویلی تھی۔ وہ کبھی باہر نکلا ہی نہیں تھا۔ سو اب وہ حیران بھی تھا اور خوش بھی۔ یہ باہر کی دنیا بہت بڑی تھی۔ تاحدِ نظر لہلہاتے ہوئے ہرے بھرے کھیت اور ان میں کام کرتے ہوئے کسان۔ یہ سب کچھ اسے بہت اچھا لگا۔ وہ ہر چیز کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور ہر سوال کے ساتھ وضاحتیں بھی تھیں۔ ٹھاکر جواب دیتے دیتے تھک گیا۔ ”باقی باتیں پھر پوچھ لینا پُتر۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

اسی لمحے اسے ایک درخت کے پاس وہی مجذوب کھڑا نظر آیا جسے اس نے اوتار سنگھ کی پیدائش کے دن دیکھا تھا۔ اس نے ٹھاکرانی کا ہاتھ دباتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ”رنجو... آج تمھیں بھی اس بابا کے درشن ہونے والے ہیں جسے تم نے خواب میں دیکھا تھا۔“

ٹھاکرانی نے نظریں اٹھا کر اس طرف دیکھا۔ مجذوب ان سے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ ٹھاکر نے اس کے تھامے ہوئے ہاتھ سے اس کے جسم کی تھرتھراہٹ محسوس کرلی۔ ”کیا بات ہے رنجو؟“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے ناتھ۔“ ٹھاکرانی کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

”دینے والوں سے ڈر کیسا؟“ ٹھاکر نے اسے تسلّی دی۔ ”دینے والے لے بھی تو سکتے ہیں۔“

وہ مجذوب کے پاس پہنچ کر رُک گئے۔ ٹھاکر اور ٹھاکرانی نے ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا۔ ٹھاکرانی کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

مجذوب ٹھاکرانی کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا جو نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ ”نظریں تو اُٹھا، ٹھاکرانی!“ مجذوب نے دھیمی آواز میں کہا۔

ٹھاکرانی نے ایک لمحے کو نظر اٹھائی اور فوراً ہی جھکالی۔ ان آنکھوں میں دیکھنے کی تاب نہیں تھی اُس میں۔

”دینے والے بہت سے نہیں ہوتے ناسمجھ۔ دینے والا ایک ہی ہوتا ہے۔“ مجذوب نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ”اور

دینے والا اتنا بڑا ہے کہ کسی بات پر خفا ہو کر دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتا۔"

ٹھاکرانی تو یہ سُن کر دہل گئی۔ اتنے فاصلے سے اس کی سرگوشی میں کہی ہوئی بات مجذوب نے کیسے سُن لی۔

"بھول ہوگئی مہاراج۔ میری پتنی نادان ہے۔ شما کر دیں اسے۔" ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔

"بھول تو ہوتی ہے۔ معافی بھی مل جاتی ہے۔ لیکن نشانیاں دیکھ کر سمجھنا تو چاہیے۔ یہ بات تُو بھی نہیں سمجھا کہ دینے والا صرف ایک ہے...!" مجذوب کے لہجے میں ہلکی سی سرزنش تھی۔ "تم کہاں کہاں مانگتے پھرے۔ مگر تمھیں کچھ نہیں ملا۔ پھر دینے والے نے تمھیں کچھ دینے سے پہلے برگد کے اس پیڑ کو جلا دیا جس سے تم نے آخری بار اولاد مانگی تھی۔ اس میں نشانی تھی کہ برگد کا پیڑ تو خود اپنی مرضی سے رہ بھی نہیں سکتا۔ دینے والا کوئی اور ہے جو تمھیں نظر نہیں آتا۔ مگر تم بدنصیب سمجھتے ہی نہیں۔"

اس بار ٹھاکر پر بھی تھرتھری چڑھ گئی۔ اس پیڑ کا جلنا پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ "بھول ہوگئی مہاراج!" وہ گڑگڑایا۔

"کب تک بھُولے رہو گے۔ کب تک بھول ہوتی رہے گی۔ خیر، بھول ہوگی تو معافی بھی ملے گی۔ وہ تو بہت معاف کرنے والا ہے مگر بھُولے رہو گے تو وہ بھی تمھیں بھول جائے گا۔"

ان لفظوں میں جانے کیا تھا کہ ٹھاکر اور ٹھاکرانی اندر سے تھرّا کر رہ گئے۔

"اور سنو۔ میں نے سب کچھ تو سمجھا دیا تھا..." مجذوب کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔ "ٹھاکرانی، تُو سمجھتی کیوں نہیں۔ چھوٹے کی خوشی کے آڑے نہ آیا کر۔ تُو اس کا راستہ کھوٹا نہیں کر سکتی۔ بس خود کو دُکھی کر لے گی اس کوشش میں۔ محبت کی ہے تو محبت کرنا بھی سیکھ۔ دل بڑا رکھ۔ اس نے تجھے قیمتی چیز دی۔ تو اسے سب کے ساتھ بانٹے گی تو وہ تیرا ہوگا۔ ورنہ تیرا نہیں رہے گا۔ اور سن... اسے اپنا راستہ معلوم ہے۔ اسے چلنے دے اس کے راستے پر۔ تب تیری ٹیڑھ بھی دُور ہو جائے گی۔"

اس بار مجذوب کی بات پوری طرح ٹھاکرانی کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے نظریں اٹھائیں اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ "اب غلطی نہیں ہوگی مہاراج۔"

اتنی دیر تک ننھا ٹھاکر مجذوب کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا تھا۔ اچانک مجذوب گھٹنوں کے بل بیٹھا اور اس نے ننھے ٹھاکر کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "آپ کیسے ہیں بیٹے!" اس نے کہا اس کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

"میں ٹھیک ہوں بابا۔ بس میرے ویر جی بیمار ہیں۔" ننھے ٹھاکر نے کہا۔

"ٹھیک ہو جائے گا وہ۔ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ بس آپ خوش رہیں، خوش رہنے والی باتوں میں۔ اللہ آپ کے ساتھ ہے۔" یہ کہہ کر مجذوب نے اس کے دونوں ہاتھوں کو محبت سے چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہُوا۔ "اب میں چلتا ہوں۔"

مجذوب دہلی کی سمت چل دیا۔ وہ تینوں کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ جمال دین کے گھر کی طرف چلے۔

راستے میں ننھے ٹھاکر نے باپ سے پوچھا۔ "یہ کون تھے پتا جی؟" اس کے لہجے میں احترام تھا۔

"یہ بہت بڑے گیانی ہیں پُتر... بڑی شکتی والے۔"

ننھے ٹھاکر نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ گیانی کیا ہوتا ہے اور شکتی کسے کہتے ہیں۔ یہ وہ بات تھی جو وہ پہلے سے جانتا ہو۔

چند منٹ بعد وہ جمال دین کے گھر پہنچ گئے۔

وید جی وصال دین کو دوا دے کر جا چکے تھے۔ ننھا ٹھاکر جاتے ہی وصال سے لپٹ گیا۔ "اٹھو نا ویر جی۔ میرے ساتھ کون کھیلے گا۔"

وصال دین کراہ کر رہ گیا۔

"پتا جی، ویر جی کا شریر تو آگیا ہے۔" چھوٹے ٹھاکر نے باپ سے فریاد کی۔

"دوا پیے گا تو ٹھیک ہو جائے گا پُتر۔" ٹھاکر نے اسے دلاسا دیا۔

"اب ناشتا تو کر لو چھوٹے ٹھاکر۔" ٹھاکرانی نے کہا۔

"ویر جی کے ساتھ کروں گا۔ اماں کے ہاتھ سے کروں گا۔"

دونوں شرطیں پوری کر دی گئیں۔ وصال دین سے کچھ کھایا تو نہیں گیا۔ اس نے دودھ پی لیا۔ ناشتے کے بعد چھوٹا ٹھاکر وصال دین سے لپٹ کر لیٹ گیا۔

ٹھاکرانی پریشان ہوئی۔ مگر ٹھاکر نے اسے بڑے یقین سے کہا۔ "ڈرو مت ٹھاکرانی۔ تمھارے بیٹے کو بخار نہیں ہوگا۔"

ٹھاکرانی کو مجذوب یاد آیا۔ وہ مطمئن ہوگئی۔

ایک گھنٹے بعد ٹھاکر اٹھ کھڑا ہُوا۔ "اب ہم جائیں گے جمال دین۔"

"آپ آئے سرکار۔ بڑی مہربانی آپ کی۔" جمال دین نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گا پتا جی۔" اوتار سنگھ بولا۔

ٹھاکر مسکرایا۔ "تم سے کون کہہ رہا ہے جانے کو۔ تمھیں میں شام کو آ کر لے جاؤں گا۔"

یہ سن کر حمیدہ ہکا بکا رہ گئی۔ ٹھاکرانی نے اس کی کیفیت بھانپ کر جلدی سے نرم لہجے میں کہا۔ "جب تک وصال دین ٹھیک نہیں ہو جاتا، چھوٹے ٹھاکر خود تمھارے گھر آیا کریں گے۔"

"اور ٹھیک ہو جانے کے بعد ایک دن وصال دین حویلی آئے گا تو دوسرے دن میرا پُتر تمھارے گھر آئے گا۔" ٹھاکر بولا۔ "تمھیں بوجھ تو نہیں لگے گا جمیدہ؟"

"بوجھ کیسا ٹھاکر جی سرکار۔ ہماری تو کُٹیا کے بھاگ جاگ گئے ہیں جی۔ سر آنکھوں پر۔"

ٹھاکر اور ٹھاکرانی اپنے بیٹے کو وصال دین سے لپٹا چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ راستے میں ٹھاکر نے پتنی سے کہا۔ "تمھاری سمجھ میں آیا کہ تم آج یہاں کیوں آئیں؟"

ٹھاکرانی نے نفی میں سر ہلایا۔

"بس اس مجذوب سے ملنا تھا۔"

ٹھاکرانی سوچ میں پڑ گئی "مگر ناتھ، اس کی بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

"نہ سہی۔ بس یاد رکھنا اور عمل کرنا۔ سمجھ میں خود آ جائیں گی۔"

"یہ کیسا بھید ہے ناتھ؟"

"بھید کے چکر میں نہ پڑنا رنجو۔ بھگوان کی باتیں بھگوان جانے۔"

"سچ کہتے ہو ناتھ۔"

پہلے تین دن تو چھوٹا ٹھاکر مسلسل حمیدہ کے گھر گیا۔ وصال دین کا بخار تو اُتر گیا تھا لیکن کم زوری بہت تھی۔ پھر بھی وہ صحن میں چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ کھیلتا رہا۔ تیسرے دن وہ گھر سے باہر کی مٹی میں خوب کھیلے۔ چھوٹے ٹھاکر کو بہت مزہ آیا، بلکہ یہ جان کر اسے افسوس ہُوا کہ اگلے روز وصال دین حویلی آئے گا۔ اسے گھر سے باہر کھلی فضا میں کھیلنے کا چسکا لگ گیا تھا۔

پھر وہ دوسرا معمول شروع ہو گیا۔ ایک دن وصال دین حویلی آتا اور اگلے دن چھوٹا ٹھاکر اُس کے گھر جاتا۔

ایک ہفتے بعد ٹھاکر پرتاپ سنگھ بیٹے کی تعلیم کی فکر میں دہلی چلا گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بیٹے کی تعلیم شروع ہو چکی ہے۔

ننھا ٹھاکر بے حد حسّاس فطرت کا مالک تھا۔ اس کا مشاہدہ بہت اچھا تھا... اور چیزوں کو دیکھ کر وہ ان کے بارے میں غور و فکر بھی کرتا تھا۔ اب وہ باہر نکلا تو پتا چلا کہ دنیا بہت بڑی ہے... اتنی بڑی کہ اس کی نظر اسے نہیں دیکھ سکتی۔

اب وہ سوال پہلے سے زیادہ کرتا تھا۔ لیکن اسے جواب بھی ملتے تھے۔ حمیدہ، ٹھاکرانی اور جمال دین دونوں سے مختلف تھی۔ اس میں تعلیم کی تو کمی تھی لیکن گرد و پیش سے مکمل آگہی اسے حاصل تھی۔ اور اس کے پاس دانش بھی تھی۔ وہ مشین کی طرح لگی بندھی زندگی گزارتی تو تھی لیکن اس کے پاس سوچتا ہُوا دماغ بھی تھا اور ننھے ٹھاکر کے لیے یہ بہت بڑی نعمت تھی۔

اس روز حمیدہ کو کھانا تیار کرنے میں دیر ہو گئی۔ چھوٹا ٹھاکر بھوک سے بے تاب ہو کر چلّایا۔ "اماں... مجھے ابھی روٹی چاہیے۔ جلدی سے دو۔"

حمیدہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "بس ذرا دیر رُک جاؤ بیٹے۔ ابھی دیتی ہوں۔"

"مجھے ابھی چاہیے۔"

"اچھا... یہاں آ جاؤ۔ دیکھو تو کر روٹی کیسے بنتی ہے۔"

ننھا ٹھاکر اس کے پاس جا بیٹھا۔ حمیدہ اسے قصے سناتی، بہلاتی رہی۔ اس کے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔ پھر اس نے پہلی گرم گرم روٹی اتاری، اس پر مکھن رکھا اور تھالی میں ساگ نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ "تو چھوٹے ٹھاکر، اب کھاتے جاؤ۔ میں گرم گرم روٹی اتارتی رہوں گی۔"

ننھا ٹھاکر بہت بھوکا تھا۔ مگر اس عالم میں بھی وصال دین کو نہیں بھولا۔ "آؤ ویر جی۔ کھانا کھائیں۔"

"ابھی نہیں... دو روٹیاں اور اُتر جائیں تو پھر وصال دین بھی بیٹھ جائے گا۔" حمیدہ نے کہا۔

لیکن چھوٹا ٹھاکر نہیں مانا۔ اس نے وصال دین کے بغیر لقمہ نہیں توڑا۔ اتنی بحث میں حمیدہ کو مہلت مل گئی۔ روٹی کا تسلسل بھی نہیں ٹوٹا۔ دونوں بچے کھانا کھا کر نمٹے تو چھوٹے ٹھاکر نے حمیدہ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"تم کتنی اچھی ہو اماں۔" اس نے کہا اور وصال دین کو دیکھا جو ہاتھ پھیلا کر دعا کرنے کے بعد چہرے پر ہاتھ

پھیر رہا تھا۔ ”یہ تم کھانے کے بعد کیا کرتے ہو ویر جی؟“ اس نے وصال دین سے پوچھا۔

وصال دین گھبرا گیا۔ اسے اپنے گھر میں ہمیشہ کھانے کے بعد ایسا کرنے کی عادت تھی۔ ماں نے اسے سکھایا تھا۔ لیکن ماں نے کہا تھا کہ حویلی میں کچھ کھاؤ تو ایسا نہ کرنا۔ دل میں ہی اللہ کا شکر ادا کر دینا۔ ”کچھ نہیں چھوٹے ٹھاکر۔“ اس نے کہا۔

”نہیں ویر جی۔ مجھے بتاؤ نا۔“

وصال دین نے گھبرا کر ماں کو دیکھا۔ حمیدہ نے جلدی سے کہا۔ ”اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا بیٹے۔“

”کون اللہ؟“

اب حمیدہ بھی گڑبڑا گئی۔ ”وہ جسے تم بھگوان کہتے ہو۔“

”اچھا۔ اور شکر کیا ہوتا ہے؟“

”ابھی تم خوش ہو کر مجھ سے لپٹ گئے تھے نا... اور کہا تھا... تم کتنی اچھی ہو اماں۔ تو یہ شکر تھا۔“

”میں سمجھ گیا اماں۔ کوئی کسی کو کچھ دے، کسی کو کسی سے کچھ فائدہ ہو تو وہ اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ ہے نا اماں؟“

حمیدہ اسے شکر یہ اور شکر کا فرق بتانے کی ہمت نہیں کر سکی۔ ”ہاں چھوٹے ٹھاکر... میرے بیٹے۔“

”تو ویر جی نے اللہ کا شکر کیوں ادا کیا؟ روٹی تو انھیں تم نے دی تھی اماں۔“

اب حمیدہ کو کون روک سکتا تھا۔ وہ چپ رہتی تو اس کا بیٹا خراب ہوتا... ایمان سے دُور ہوتا۔ ”اس کے لیے تمھیں یہ سمجھنا ہوگا بیٹے کہ روٹی کتنی مشکل سے بنتی ہے۔“

”مشکل سے بنتی ہے!“ چھوٹے ٹھاکر نے حیرت سے دہرایا ”آٹا گوندھا، چولھا جلایا، توا چڑھایا اور روٹی تیار۔“

”اور گیہوں کہاں سے آئے ہیں؟“

چھوٹے ٹھاکر کا تجسّس بھڑک اٹھا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ”تم بتاؤ اماں۔“

”کھیتوں سے۔“ حمیدہ نے کہا۔ ”کسان پہلے زمین میں ہل چلاتا ہے۔ پھر بیج بوتا ہے۔ چار پانچ مہینے اس کی دیکھ بھال، اس کی رکھوالی کرتا ہے۔ اللہ دھوپ سے گرمی دیتا ہے۔ وقت پر بارش برساتا ہے۔ تب فصل تیار ہوتی ہے۔ پھر بہت سے لوگ مل کر کٹائی کرتے ہیں۔ تب کہیں گندم یا مکئی ملتی ہے۔ اب سوچو، تمھاری ایک روٹی کے لیے کتنے لوگ مہینوں محنت کرتے ہیں۔ اور اللہ بارش روک دے تو فصل خراب ہو جاتی ہے۔ کبھی بہت دن سورج نہ نکلے تو بھی فصل خراب ہو جاتی ہے۔ اب سوچو، کتنا کچھ ہوتا ہے ایک روٹی کے لیے۔“

اس روز چھوٹے ٹھاکر کے لیے سوچ کے نئے دروازے کھل گئے۔ دنیا اس کے لیے کچھ اور بڑی، کچھ اور ناقابلِ فہم ہو گئی۔ جسے سمجھنے کی کوشش کرنی تھی۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ دہلی سے کافی رات گئے واپس آیا۔ چھوٹا ٹھاکر اس وقت سو چکا تھا۔ ٹھاکرانی کھانا لے کر ٹھاکر کے کمرے میں گئی۔ ٹھاکر نے کھانا کھایا۔ پھر پتنی سے بولا۔ ”رنجو... میں پورا بندوبست کر آیا ہوں، چھوٹے کی پڑھائی کا۔“

ٹھاکرانی کا تو دل دھک سے رہ گیا۔ اسے لگا کہ ٹھاکر نے بچے کو دہلی میں داخل کرانے کی بات کر لی ہے۔

ٹھاکر اُس کے چہرے کے تاثر سے سمجھ گیا۔ ”نہیں ٹھاکرانی۔ چھوٹا گھر پر ہی پڑھے گا۔ میں نے اسکول والوں سے بات کر لی ہے۔ ہم چھوٹے کو گھر پر ہی تیاری کرائیں گے۔ آٹھویں جماعت سے اسے اسکول میں جانا ہوگا۔ امتحان لیں گے۔ پھر داخلہ دیں گے۔ پھر اسے ہفتے میں صرف چھٹیوں میں گھر آیا کرے گا۔“

ٹھاکرانی کو اس وقت سے خوف آنے لگے۔ ”اس میں کتنا بڑا ہوگا ہمارا چھوٹا؟“

”بارہ تیرہ سال کا ہوگا۔“

ٹھاکرانی نے اطمینان کی سانس لی۔ ”تب تو ٹھیک ہے... فوراً ہی وہ پریشان ہو گئی۔ ”وہاں گھر پر اسے کون پڑھائے گا؟“

”اسی اسکول کے ایک ریٹائرڈ ٹیچر ہیں کانتی پرشاد۔ میں نے ان سے بات کی ہے۔ ہفتہ دس دن میں وہ یہاں آ جائیں گے۔ حویلی میں ہی رہیں گے۔ وہ اسکول کے نصاب سے واقف ہیں۔ صحیح تیاری کرائیں گے۔“

”یہ تو بہت اچھا ہے۔“ ٹھاکرانی نے کہا۔ اس کے دل سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔

ٹھاکر نے اگلے روز اس سلسلے میں جمال دین سے بات کی۔ جمال دین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ٹھاکر اسے کیوں بتا رہا ہے۔ ”میرا اوتار سنگھ وصال دین کے بغیر نہیں پڑھے گا...“ ٹھاکر نے وضاحت کی۔ ”وہ وصال دین کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔“

”تو ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔“

”تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“

”احسان فراموش نہیں ہوں سرکار...!“ جمال دین کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو آپ کا ایک اور احسان ہوگا

مجھ پر... اور وصال دین پر۔ ورنہ میں اسے کہاں پڑھاتا بھلا۔“

ٹھاکر کے لیے بات زبان پر لانا مشکل ہو رہا تھا۔ تاہم اس نے دل کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔ ”وہ ماسٹر کانتی پرشاد ہندو جاتی کا ہے۔ جمال دین۔ تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“

جمال دین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیسی بات کرتے ہیں ٹھاکر جی۔ علم تو کوئی بھی کسی کو دے سکتا ہے۔ اس کا تو احسان ہوتا ہے جی۔“

ٹھاکر کو حیرت ہوئی۔ یہ وہی جمال دین تھا جو مذہب کا پکا تھا۔ اس کے لیے کچھ بھی کھونے کو تیار تھا۔ کیا اسے ڈر نہیں لگتا کہ ہندو ماسٹر کے بچے کا دھرم خراب کر دے گا۔ جب کہ ٹھاکرانی تو صرف محبت سے ڈرتی تھی اور بچے کو اس مسلمان پریوار سے دُور کرنا چاہتی تھی۔

اس نے ٹھاکرانی کو یہ بات بتائی تو وہ بہت شرمندہ ہوئی۔

دہلی سے ماسٹر کانتی پرشاد آ گئے۔ دونوں بچوں کی پڑھائی شروع ہو گئی۔

کانتی پرشاد پڑھے لکھے، لائق اور روشن خیال آدمی تھے۔ دھرم کو انھوں نے بہت پہلے فرسودہ پا کر طاقِ نسیاں پر رکھ دیا تھا۔ ان کی عمر تدریس میں گزری تھی۔ اب ریٹائر ہو چکے تھے۔ پریشانی کوئی نہیں تھی۔ گھر بچوں نے سنبھالا ہوا تھا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی شکل انھیں بہت بڑی نعمت محسوس ہوئی۔ پتنی کے دیہانت کے بعد ان کا کہیں من نہیں لگتا تھا۔ بے کاری کا احساس ستاتا تھا۔ ٹھاکر کی مہربانی سے ان کا بے وقعتی کا احساس بھی دُور ہو گیا، گرد و پیش بھی تبدیل ہو گیا اور مصروفیت بھی مل گئی۔ یہ طے تھا کہ انھیں پیسا بھی بہت ملے گا۔ لیکن پیسے کی انھیں پروا نہیں تھی۔

انھیں دو شاگرد ملے۔ ابتدا میں ہی انھیں اندازہ ہو گیا کہ ٹھاکر کا بیٹا نہ صرف ذہین ہے۔ بلکہ اسے علم کی جستجو بھی ہے۔ اب کہ دوسرا لڑکا بس ٹھاکر کے بیٹے کی محبت میں پڑھ رہا تھا۔ اسے جو پڑھایا جاتا، توتے کی طرح رٹ لیتا جب کہ ٹھاکر کا بیٹا پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ کانتی پرشاد کو اندازہ ہو گیا کہ ان کا میلانِ طبع سائنس کی طرف ہے۔

پھر جیسے جیسے دن گزرتے گئے، کانتی پرشاد کی اوتار سنگھ میں دلچسپی بڑھتی گئی۔ وہ جتنا اسے پڑھانے کی کوشش کرتے تھے، اس سے زیادہ وہ پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یعنی استاد اور شاگرد کے درمیان ایک دوڑ لگی تھی... اور شاگرد ہمیشہ استاد پر فوقیت لے جاتا تھا۔ تجسّس سے علم کی لگن بڑھتی ہے۔ اوتار سنگھ متجسس بھی تھا اور غور و فکر بھی کرتا تھا۔ چناں چہ وصال دین اس سے بہت پیچھے رہ گیا۔

دوسری طرف ٹھاکرانی رنجیتا نے بھی اپنے طور پر ایک ذمے داری سنبھال لی تھی۔ وہ اپنے بیٹے سے دھرم کی، دیوی دیوتاؤں کی باتیں کرتی تھی۔ اور تو اور، اس نے حویلی میں ہی ایک چھوٹا سا مندر بنا لیا تھا۔ خود اسے دھرم کے بارے میں زیادہ جان کاری نہیں تھی۔ لیکن جتنا وہ جانتی تھی، اتنا بیٹے کو بتانا ضروری سمجھتی تھی۔ وہ اوتار سنگھ سے روز پوجا کراتی تھی۔

تیسری طرف حمیدہ تھی۔ اوتار سنگھ کے ذہن میں جو سوال ابھرتا، وہ اس کا جواب دینے کی کوشش کرتی۔ اس کے لہجے میں عجیب سی سچائی اور دل نشینی تھی۔ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی تھی۔ مگر اس کی باتیں ماتا جی کی باتوں سے متصادم ہوتی تھیں۔

آپس میں ایک دوسرے سے ملنے والے یہ تینوں ضلعے ایک مثلث بناتے تھے اور اس مثلث کے درمیان میں بیٹھا ہُوا اوتار سنگھ یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا کہ سچائی کیا ہے۔ ساتھ ہی وہ گرد و پیش کی ہر چیز پر غور کرتا۔ سوچتا کہ وہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور کیسے ہے؟ یہ سوال وہ تینوں سے کرتا اور تینوں کے جواب مختلف ہوتے۔ وہ حیران ہوتا۔ کہ ایک ہی چیز کے بارے میں تین افراد کے تین نظریے ہیں۔ اس سے اُس نے یہ سمجھ لیا کہ کثرت میں ابہام ہے، الجھاؤ ہے۔ اور یہ کہ نظریے ضروری نہیں کہ درست ہوں بلکہ ان کے غلط ہونے کا امکان زیادہ ہے۔

اوتار سنگھ اس پر غور کرتا کہ صبح کیا ہے۔ اپنے طور پر اس نے سمجھ لیا کہ سورج نکلتا ہے تو صبح ہوتی ہے اور جب تک سورج رہتا ہے، دن رہتا ہے۔ سورج غروب ہو تو رات ہو جاتی ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ سورج حرکت کرتا ہے۔ مشرق سے نکلتا ہے تو ہلکی ہلکی دھوپ پھیلتی ہے اور سورج اوپر آتا رہتا ہے تو دھوپ میں تیزی بڑھتی جاتی ہے اور ساتھ ہی گرمی بھی۔ پھر عین سر پر پہنچنے کے بعد سورج مغرب کی طرف جھکتا ہے تو دھوپ ہلکی ہونے لگتی ہے۔ روشنی کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہوتا ہے اور رات ہو جاتی ہے۔

سوال یہ تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی ضرورت کیا ہے۔ اس نے تینوں معلموں سے یہ بات پوچھی۔ ہمیشہ کی طرح جواب مختلف ملے۔ ماتا جی نے بتایا کہ سورج دیوتا کا کام ہی روشنی دینا ہے۔ دن بھر دھوپ بانٹنے کے بعد تھک جائیں تو

آرام کرتے ہیں۔ ماسٹر جی نے بتایا کہ سورج نہیں چلتا۔ بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ جس حصے میں ہم موجود ہیں وہ جب گھومتا ہُوا سورج کے سامنے آتا ہے تو صبح ہوتی ہے۔ جب تک سامنے رہتا ہے، دن رہتا ہے اور جب گھومتا ہُوا سورج سے اوجھل ہوتا ہے تو رات ہو جاتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ دراصل سورج غروب نہیں ہوتا۔ جس وقت ہمارے ہاں سورج غروب ہوتا دکھائی دیتا ہے تو وہ دوسری طرف طلوع ہوتا نظر آتا ہے اور وہاں صبح ہوتی ہے۔ حرارت نہ ہو تو زمین پر کوئی فصل نہ اُگے اور سردی ہی سردی ہو۔ اوتار سنگھ کو یاد تھا کہ یہ بات اماں نے بھی کہی تھی کہ دھوپ نہ نکلے تو فصلیں خراب ہو جائیں۔

اماں نے کہا کہ سورج اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے۔ اس سے زندگی ہے اور وہ اپنے وقت پر طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا بنایا ہُوا نظام ہے اور اماں نے ایک بات ایسی بتائی جو اس کی سمجھ میں سب سے زیادہ آئی۔ اماں نے کہا کہ اللہ نے دن اور رات بنائے ہیں تاکہ انسان دن میں کام اور رات میں آرام کریں۔

"وہ کیسے اماں؟"

"چھوٹے ٹھاکر، یہ بتاؤ کہ تم دن میں کیوں نہیں سوتے؟" اماں نے پوچھا۔

"مجھے اندھیرے میں نیند آتی ہے اماں۔ کمرے میں ذرا سی بھی روشنی ہو تو میں سو نہیں سکتا۔"

"تو سوچو، سورج ہر وقت نکلا رہتا تو تم کیسے سوتے اور نہیں سوتے تو تھکن بڑھتی رہتی۔ سوئے بغیر رہ سکتے ہو تم؟"

"نہیں اماں، کبھی میں زیادہ تھک جاؤں تو بستر پر لیٹتے ہی سو جاتا ہوں۔"

"اور سوچو کہ سورج نکلتا ہی نہیں اور ہر وقت اندھیرا رہتا تو لوگ کام کیسے کرتے۔ فصلیں کیسے ہوتیں۔ کھانا کیسے پکتا۔ زندگی تو ختم ہو جاتی نا!"

اوتار سنگھ نے بڑے فخر سے سوچا کہ اماں کتنی عقل والی ہیں۔ یہ بات تو ماسٹر جی نے بھی نہیں بتائی تھی۔

اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ سورج دیوتا بہت شکتی مان ہے۔ زمین پر زندگی اسی کے دم سے ہے۔ جب وہ غصّے میں ہوتا ہے تو گرمی بڑھ جاتی ہے۔ انسان اور جانور پسینے میں نہا جاتے ہیں، ہانپنے لگتے ہیں۔ لیکن پھر ایک دن سورج نہیں نکلا۔ آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اس نے غور کیا تو اندازہ ہُوا کہ یہ بات نہیں کہ صبح نہیں ہوئی۔ صبح تو ہوئی ہے۔ سورج بھی نکلا ہے۔ لیکن اس کی دھوپ، اس کی روشنی کا راستہ بادلوں نے روک رکھا ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ بادل تو معمولی چیز تھے اور وہ سورج جیسے شکتی مان کا راستہ روک سکتے تھے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔

پھر اس نے موسموں کا مشاہدہ کیا۔ ماسٹر جی نے اس کی بڑی رہنمائی کی۔ ورنہ ماتا جی اور اماں تو ہر بات کے جواب میں بھگوان کی اِچھا... اور اللہ کی مرضی کہہ دیتی تھیں۔ سردی آتی ہے۔ بس آتی ہے۔ گرمی آئے گی۔ اسے آنا ہے۔ ماسٹر جی نے اسے بتایا کہ موسموں کے پیچھے بھی سورج کا دخل ہے۔ زمین سورج سے دُور ہٹتی ہے تو سردی آتی ہے اور قریب ہوتی ہے تو گرمی آتی ہے۔ پھر اس نے بارش کو سمجھا۔ یہ بھی سمجھا کہ بارش کتنی اہم ہے۔ صرف دھوپ سے فصلوں کا تعلق نہیں تھا۔ بارش نہ ہو تو بھی فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

اگلے دو برس میں اس نے بہت کچھ سمجھ لیا۔ جس میں شکتی ہو اور جو سمجھ میں نہ آئے، وہ ماتا جی کے نزدیک دیوی تھی دیوتا۔ اور اماں ہر چیز کو اللہ سے جوڑ دیتی تھیں۔ وہ کہتیں، سب اللہ کے کام ہیں۔ کچھ سمجھ میں آجاتے ہیں، کچھ نہیں آتے سب طاقت اللہ کی ہے۔

پہلے بچوں کو کھیل کود سے فرصت نہیں تھی۔ اب ان کے لیے دن چھوٹا پڑتا تھا۔ تین بجے تو ماسٹر جی پڑھاتے تھے۔ اس لیے معمولات کچھ بدل گئے۔ اوتار سنگھ کے ایک دن چھوڑ کر حمیدہ کے ہاں جانے کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن اب وہ کم وقت کے لیے جاتا تھا۔

چھوٹا ٹھاکر آٹھ سال کا ہُوا تو ٹھاکر اوتار سنگھ نے اسے سچ مچ کا گھوڑا دیا۔ گھوڑا وصال دین کو بھی ملا۔ کیوں کہ ٹھاکر جانتا تھا کہ اس کا بیٹا اکیلا یہ تحفہ قبول نہیں کرے گا۔ پھر وہ ان دونوں کو گھڑ سواری سکھانے لگا۔ اور وہ بیٹے سے باتیں بھی کرتا تھا۔ وہ اسے راجپوتی آن کے بارے میں بتاتا۔ ان کے اوصاف سے متعارف کراتا۔ اسے پُرکھوں کی بہادری کے قصّے سناتا۔

باپ ہونے کے ناتے جمال دین بھی پیچھے نہیں تھا۔ وہ لٹھیا چلانے کا ہنر جانتا تھا۔ اس نے ان دونوں کو لٹھیا چلانا سکھانا شروع کر دیا۔ یوں وقت اور سمٹنے لگا۔ دونوں لڑکے ان کی مصروفیات میں بہت خوش تھے۔ ان کے نزدیک وہ نئے کھیل تھے... نئے بھی اور دل چسپ بھی۔

مگر پھر ایک دن یہ ہُوا کہ چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ کی معلومات کا ایک دروازہ بند ہو گیا۔ اب تک وہ یہ سمجھتا تھا کہ اللہ

اور بھگوان ایک ہی ہیں۔ فرق صرف زبان کا ہے... اور لفظوں کی طرح۔ جیسے ماتا جی شما کہتی ہیں اور اماں معافی۔ جیسے ماتا جی پتنی کہتی ہیں اور اماں التجا۔ اور اماں نے اسے تاکید بھی یہی دیا تھا۔

اُس دن اس نے اماں سے کہا۔ "اماں... تم بھی اللہ کی پوجا کرتی ہو؟"

اماں نے جھرجھری سی لی۔ ایک لمحے ہچکچائیں اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مجھے بھی دکھاؤ اماں۔ میں بھی اس کی پوجا کروں گا۔"

اماں تو ہکا بکا رہ گئیں۔ ان سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

"مجھے اللہ کی مورتی دکھاؤ نا اماں۔" اس نے ضد کی۔

"وہ تو... وہ تو چھوٹے ٹھاکر۔"

"کیوں اماں۔ بھگوان کی مورتی ہے۔"

"اللہ کی نہیں ہوتی۔ کیوں کہ اسے کسی نے دیکھا نہیں ہے۔" یہ چھوٹے ٹھاکر کو ہلا دینے والی بات تھی۔ "تو اللہ اور بھگوان ایک نہیں ہے؟"

اماں نے نفی میں سر ہلایا اور بولیں۔ "دیکھو چھوٹے ٹھاکر، تم اب مجھ سے یہ نہ پوچھنا۔ ٹھاکر جی اور ٹھاکرانی کو پتا چل گیا کہ میں تم سے ایسی باتیں کرتی ہوں تو وہ ہم سب کو مروا دیں گے اور یہ نہ بھی ہُوا تو تمھیں کبھی ہم سے ملنے نہیں دیں گے۔"

ٹھاکر تھا کر ڈر گیا۔ اس کے لیے تو ان سے نہ ملنے کا تصوّر بھی ناقابلِ قبول تھا۔ کجا یہ کہ مر جانے کی بات۔ اس نے غور سے حمیدہ کے چہرے کو دیکھا جو پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ لگ رہی تھی۔ "سچ اماں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں بیٹے۔ تم ہمیں زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو یہ بات کبھی نہ پوچھنا اور میری کہی ہوئی کوئی بات اپنے ماتا پتا کے سامنے نہ دُہرانا۔ اللہ کا نام بھی نہ لینا ان کے سامنے۔ ورنہ وہ سمجھیں گے کہ ہم تمھیں خراب کر رہے ہیں۔ وہ ہمیں مروا دیں گے بیٹے۔"

"ٹھیک ہے اماں۔ میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔" چھوٹے ٹھاکر نے بڑے خلوص سے وعدہ کیا۔ "مگر آج جو میں پوچھوں، وہ بتا دو۔"

حمیدہ نے بادلِ ناخواستہ ہامی بھر لی۔

تب حمیدہ نے اسے بتایا کہ اس کا اللہ ایک ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ کسی کو نظر نہیں آتا۔ مگر اس کی قدرت نظر آتی ہے۔ وہ زبردست ہے۔ سب کچھ اُسی نے بنایا، اُسی نے پیدا کیا ہے۔

"تو ماتا جی اور پتا جی اسے کیوں نہیں مانتے؟"

"ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ سب کا اپنا اپنا عقیدہ ہوتا ہے۔"

اس لمحے نو سالہ ٹھاکر اوتار سنگھ کے نتائج اخذ کرنے والے ذہن نے ایک بڑی بات سمجھ لی۔ اس نے جان لیا کہ ماننے، نہیں ماننے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ جو سچ ہے، وہ سچ ہے۔ نہ ماننے سے وہ تبدیل نہیں ہوگا اور جو نہیں ہے، اسے مان لینے سے وہ ہو نہیں جائے گا۔ ماننے میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ یہ سب کچھ اسے خود سمجھنا ہوگا۔

وہ اس کی تلاشِ حق کا نکتۂ آغاز تھا!

اس صبح پوجا کے بعد اوتار سنگھ نے ماں سے پوچھا۔ "ماتا جی، آپ نے بھگوان کو دیکھا ہے؟"

"روز دیکھتی ہوں پُتر۔ تم بھی دیکھتے ہو... یہ بھگوان ہیں نا۔" ٹھاکرانی نے مورتی کی طرف اشارہ کیا۔

"تو یہ سچ مچ کے بھگوان ہیں؟" اوتار سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔

ٹھاکرانی کو غلطی کا احساس ہو گیا۔ "میرا مطلب ہے، یہ بھگوان کی مورت ہے۔ ہم روز اس کے درشن، اس کی پوجا کرتے ہیں۔"

"تو یہ سچ مچ کے بھگوان تو نہیں ہیں نا۔"

ٹھاکرانی چوکنا ہو گئی۔ "بھگوان کی صورت بالکل ایسی ہے۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں ماتا جی۔ آپ نے بھگوان کو دیکھا ہے؟"

"نہیں، دیکھا تو نہیں۔ مگر مجھے معلوم ہے، یہ بھگوان کی مورت ہے۔"

"تو ماتا جی۔ ہمیں بھگوان کی پوجا کرنی چاہیے۔ اس مورت کی نہیں۔"

انتباہ

سب رنگ میں شائع شدہ تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ اس ضمن ادارے کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں۔ چناں چہ کسی نقصان، شکایت یا معلومات کے سلسلے میں مشتہرین سے ہی رجوع کیا جائے۔

ٹھاکرانی گھبرا گئی۔ ''دیکھو پُتر... ایسی باتیں نہیں کرتے۔ ہمارے باپ دادا صدیوں سے اس مورتی کی پوجا کرتے آئے ہیں۔ وہ غلط تو نہیں ہو سکتے۔''

چھوٹے ٹھاکر کی ذہانت پوری طرح کام کر رہی تھی ''ماتا جی، آپ کے باپ دادا کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ان کا تو دیہانت ہو گیا۔''

''دیہانت کیا ہوتا ہے ماتا جی؟''

''منش ہے نا۔ وقت پورا کرتا ہے تو مر جاتا ہے۔''

''تو آپ کا وقت پورا ہو گا تو آپ کا دیہانت ہو جائے گا۔ اور اپنا وقت پورا کر کے میں بھی مر جاؤں...''

ٹھاکرانی نے جلدی سے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ایسی باتیں مُنہ سے نہیں نکالتے پُتر۔''

''مُنہ سے نہ نکالنے سے کچھ بدل جاتا ہے ماتا جی...؟'' اوتار سنگھ نے بے حد معصومیت سے پوچھا۔ ''مجھے بتائیں نا۔ ایسا ہی ہو گا نا؟''

''ہاں۔'' ٹھاکرانی نے بات مختصر کرنے کی کوشش کی۔

''تو پھر جو دوسرے لوگ ہوں گے، وہ بھی اپنے بچوں سے یہی کہیں گے کہ ہمارے باپ دادا اس مورتی کو پوجتے تھے۔ مگر ماتا جی، آپ کے باپ دادا بھی غلطی تو کر سکتے تھے نا۔ آپ کو کیسے پتا کہ وہ دُرست تھے۔ آنے والوں کو بھی یہ پتا نہیں ہو گا کہ آپ درست تھیں۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو پُتر؟''

''یہی کہ ہمیں بھگوان کی پوجا کرنی چاہیے، اس کی مورتی کی نہیں۔''

ٹھاکرانی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ''سامنے مورتی ہے۔ مگر ہم پوجا تو بھگوان کی کرتے ہیں۔''

''تو ہم مورتی کے بغیر بھی پوجا کر سکتے ہیں ماتا جی۔ آپ کہتی ہیں، بھگوان سب جانتے ہیں۔''

''سو تو ہے پُتر۔ مگر ہمارے باپ دادا...''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ غلطی کرتے رہے ہوں۔''

''یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ غلطی کرتے رہے ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا اوتار سنگھ۔'' ٹھاکرانی نے سخت لہجے میں کہا۔

''اچھا ماتا جی۔ میرے... آپ کے جو پُرکھ تھے، وہ منش تھے نا؟''

''اوش تھے۔''

''اور منش غلطی کرتا ہے۔ اُس سے بھول بھی ہوتی ہے... بلکہ جیون بھر ہوتی رہتی ہے۔''

ٹھاکرانی کو احساس ہُوا کہ وہ بری طرح پھنس گئی ہے۔ انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ انکار کرتی تو ڈر تھا کہ آگے کہیں اس سے بری پھنس جائے گی۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''یہ باتیں چھوڑو نا چھوٹے۔''

''نہیں ماتا جی۔ بتائیں نا۔''

ٹھاکرانی بے بس ہو گئی۔ شکست خوردہ لہجے میں بولی ''ہاں پُتر۔ منش غلطی کرتے ہیں۔''

''تو ہو سکتا ہے کہ ہمارے پُرکھوں سے بھول ہوئی ہو'' اوتار سنگھ نے کہا اور یہ سوال نہیں تھا۔ وہ ماں سے اس کی تصدیق بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ تو سیدھا سا بیان تھا ''تو اسے ٹھیک کرنا ہماری ذمّے داری ہے۔ اچھا تو ماتا جی، یہ بتائیں کہ بھگوان کہاں رہتے ہیں؟''

''اوپر آکاش پر... پرلوک میں۔''

''میں انھیں دیکھ سکتا ہوں... ان سے مل سکتا ہوں ماتا جی؟''

''نا پُتر۔ بھگوان کو کسی نے دیکھا ہے بھلا!''

اوتار سنگھ نے تیزی سے اس کی بات پکڑ لی۔ ''کسی نے نہیں دیکھا؟''

''نا پُتر۔''

''تو پھر یہ مورتی کیسے بنا لی...؟'' اوتار سنگھ نے نیا نکتہ اعتراض کیا۔ ''اس کا مطلب ہے ماتا جی۔ یہ خیالی ہے۔ ضروری نہیں کہ بھگوان ایسے ہوں۔''

''دیکھ پُتر۔ ہمیں تو اس مورتی کی ہی پوجا کرنی ہے۔ ہمارے پُرکھوں سے ریت چلی آ رہی ہے۔'' ٹھاکرانی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''بھلے وہ غلطی پر ہی ہوں؟''

''بھلے وہ غلطی پر ہی ہوں۔'' ٹھاکرانی کے لہجے میں قطعیت تھی۔

''ماتا جی، اس نظر آنے والی خیالی مورتی کے مقابلے میں نظر نہ آنے والے سچے بھگوان کے سامنے سر جھکانا مجھے اچھا لگتا ہے۔''

''ہُوا کرے۔ مگر تمھیں پوجا روز کرنی ہے۔''

اوتار سنگھ اٹھ کھڑا ہُوا۔ سوچنے کو بہت سامان مل چکا تھا۔

فطری بات تھی کہ اوتار سنگھ نے اس کے بعد ماتا جی اور

اماں کے نظریات کا موازنہ کیا۔ اسے ایک بات مشترک نظر آئی۔ بھگوان بھی نظر نہیں آتا تھا اور اللہ بھی۔ اس کے آگے فرق ہی فرق تھا۔ ماتا جی کا کہنا تھا کہ بھگوان آکاش کے اوپر، پرلوک میں رہتا ہے۔ جب کہ اماں کہتی تھیں کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے۔ حتا کہ انسان کے اندر بھی۔ پھر اماں کہتی تھیں کہ سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے۔ اس کی قدرت ایسی ہے کہ وہ جو چاہتا ہے، ایک پل میں ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ماتا جی بہت سے دیوی دیوتاؤں کو مانتی تھیں۔ بھگوان نے بہت سے دیوی دیوتاؤں کو کام سپرد کر رکھے تھے۔ انھیں اختیار دے رکھا تھا۔

اور ماسٹر جی کہتے تھے کہ سب کچھ جو نظر آتا ہے جسے آپ چھُو سکتے ہیں، مادّہ ہے اور مادّہ کبھی فنا نہیں ہوتا۔ ہاں... وہ شکل بدل لیتا ہے۔ پانی ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ سمندر، دریا، جھیل، ندی اور چشمے۔ پانی پر دھوپ پڑتی ہے تو عمل تبخیر ہوتا ہے۔ بادل بنتے ہیں۔ پھر جب بادل کسی پہاڑ سے، درختوں سے ٹکرائیں تو بارش ہوتی ہے۔ یہ سب اوتار سنگھ کی سمجھ میں آتی تھی۔ اس نے چولھے پر رکھی پانی سے بھری دیگچی میں بھاپ بنتے دیکھی تھی اور دیگچی کو ڈھکنے سے بند کر کے چولھا بجھانے کے کچھ دیر بعد ڈھکنا اٹھا کر دیکھا تو ڈھکنے کے اندرونی حصّے پر پانی کے بے شمار قطرے جمے ہوئے دیکھے تھے۔ وہ بھاپ سے پانی بنا تھا۔ اور غذا جو ہم کھاتے ہیں، اس کا ایک حصّہ جسم میں شامل ہوتا ہے۔ باقی فضلہ ہوتا ہے۔ کھاد بن جاتا ہے۔ کھاد زمین میں ڈالی جاتی ہے تو فصل بہتر ہوتی ہے۔

اوتار سنگھ نے ندی تو دیکھی تھی۔ دریا اور سمندر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ان کے بارے میں ماسٹر جی سے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''دریا بڑا بھی ہوتا ہے اور چھوٹا بھی۔ مگر سمندر تو بہت ہی بڑا ہوتا ہے۔ اتنا بڑا کہ تم جہاں تک دیکھ سکو، پانی ہی پانی نظر آئے۔''

اوتار سنگھ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''اتنا پانی!''

''اور سمندر کا پانی اتنا کھاری، اتنا کڑوا ہوتا ہے کہ تم ایک گھونٹ بھی نہیں پی سکتے۔''

''کھاری کیا ماسٹر جی؟''

''کھاری کا مطلب، نمک ملا ہُوا۔''

''نمک ملا ہُوا؟''

اس کی حیرت ایسی تھی کہ ماسٹر جی کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ اور وہ اسے پانچ سال سے پڑھا رہے تھے۔ اس کا مزاج جانتے تھے۔ وہ تو بہت بڑھے ہوئے تجسّس والا بچہ تھا۔ ایسے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر زیادہ سیکھتے ہیں۔ ورنہ تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں ٹھاکر سے بات کی کہ بچوں کو سیر کرانا، دنیا دکھانا بھی ضروری ہے۔

''تو انھیں کہاں لے جانا ہے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ یہ پہاڑ بھی دیکھ لیں اور سمندر بھی۔''

ٹھاکر کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے ٹھاکرانی کو بھی ساتھ لے لیا۔ ماسٹر جی کو تو ساتھ جانا ہی تھا۔

اس ایک ماہ میں اوتار سنگھ نے جو کچھ دیکھا، وہ اس کے لیے چشم کُشا تھا۔ سمندر دیکھ کر اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ماسٹر جی کے بتانے میں وہ بات نہیں تھی جو اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں تھی۔ کنارے پر کھڑے ہو کر جو اس نے دیکھا تو جہاں تک نظر جاتی تھی، پانی ہی پانی تھا۔ اور سمندری آواز! اسے سُن کر خوف آتا تھا۔ پتا چلتا تھا کہ وہ بہت طاقت ور ہے۔ مگر اس میں ٹھیراؤ تھا۔ اور اوتار سنگھ نے ایک بار ندی کی باڑھ دیکھی تھی۔ معمولی سی ندی چڑھی تو گاؤں کے گاؤں ڈوب گئی۔ اب سمندر کو دیکھ کر وہ سوچ رہا تھا کہ یہ چڑھ گیا تو کیا ہو گا۔ یہ تو اتنا پانی ہے کہ دنیا ڈبو دے گا۔ اس نے ایک گھونٹ حلق سے اتارنے کی کوشش کی تو دل بگڑ گیا۔ پھندا لگ گیا۔ وہ زہر جیسا پانی تھا... کڑوا، کھاری!

پھر اس نے پہاڑ دیکھے تو اسے خوف آیا۔ پہاڑ گر جائے، لڑھک جائے تو کتنی تباہی ہو گی۔ مگر اس نے یہ بھی دیکھا کہ دنیا کتنی خوب صورت ہے۔ اس نے چشمے دیکھے، آبشار دیکھے، پہاڑی ندیاں، جھیلیں اور دریا دیکھے۔ شور مچاتے سُند خود دریا اور کیسے کیسے درخت، پھل پھول۔ اس ایک ماہ میں اس نے ماسٹر جی سے ایک سوال بھی نہیں کیا... ان کے اُکسانے پر بھی نہیں۔ وہ تو سحر زدہ تھا۔ صرف دیکھ رہا تھا اور جذب کر رہا تھا۔

اس سفر میں بھی اسے ایک کمی محسوس ہوئی۔ بہت کچھ دیکھنے کے بعد اسے ہوش آیا کہ وہ بہت سی قیمتی چیزیں پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ ویر جی، اماں اور چاچا جی... اور گاؤں۔ اسے گھر یاد آنے لگا۔ سب لوگ یاد آنے لگے۔ تب اسے واپسی کی لگ گئی۔

وہ واپس پہنچے تو اس کے سوالات کا سلسلہ شروع ہُوا۔ مشاہدے کی کوکھ سے سوال ہی سوال جنم لے رہے تھے۔ ''یہ دنیا تو بہت بڑی ہے ماسٹر جی۔'' اس نے کہا۔

"اتنی بڑی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے..." ماسٹر جی نے کہا۔ "جو کچھ تم نے دیکھا، وہ تو ہمارے دیس کا ایک چھوٹا سا بہت چھوٹا سا حصّہ ہے۔ صرف ہمارا دیس ہی اس سے سیکڑوں گنا بڑا ہے اور دنیا میں ایسے سیکڑوں دیس ہیں۔ آدمی پوری زندگی گھومتا پھرتا رہے تو بھی پوری دنیا نہیں دیکھ سکتا۔"

"ماسٹر جی، یہ زمین کیسے بنی؟"

"سائنس بتاتی ہے کہ زمین سورج کا حصّہ تھی۔ پھر یہ ٹوٹ کر علاحدہ ہوئی۔ لاکھوں برس یہ کھولتا ہُوا کرہ زندگی سے محروم رہا۔ بارشیں ہوتی رہیں۔ لاکھوں برس میں یہ ٹھنڈا ہُوا۔ پھر اس میں زندگی کا آغاز ہُوا۔ نباتات اور جان دار پیدا ہوئے۔"

"کیسے پیدا ہوئے؟" اوتار سنگھ نے جھٹ پوچھا۔

"کھولتی ہوئی زمین پر ٹھنڈا پانی برستا رہا۔ یہ ایک بہت وسیع اور ہمہ پہلو کیمیاوی عمل تھا۔ اس کے نتیجے میں زندگی شروع ہوئی۔"

"آدمی بھی ایسے ہی پیدا ہُوا؟"

کانتی پرشاد پریشان ہوگئے۔ انھوں نے کہا۔ "سائنس بتاتی ہے کہ بندر ترقی کر کے انسان بنا۔ غور سے دیکھو تو بندر انسان سے مشابہ بھی ہے۔"

اوتار سنگھ کو ہنومان کا خیال آ گیا۔ ماتا جی کہتی تھیں، ہنومان دیوتا ہے۔ اسی لیے بندروں کو نہ مارنا چاہیے، نہ ستانا چاہیے۔ لیکن اسے یہ خیال کچھ اچھا نہیں لگا کہ بندر اور انسان ایک جیسے ہوتے ہیں، بلکہ ایک ہی ہیں۔ "تو پھر باقی بندر ایسے کیوں رہ گے۔ آدمی کیوں نہیں بنے؟"

"عمل میں کوئی کمی رہ گئی ہوگی۔ جو عمل سے گزر گئے، وہ آدمی بن گئے۔"

"مگر ماسٹر جی، اصل چیز تو دماغ ہے۔ بندر کا دماغ تو آدمی جیسا نہیں۔ آدمی بولتا ہے، سوچتا ہے، چیزیں بناتا ہے، کپڑے پہنتا ہے۔"

"کیمیاوی تبدیلی تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ کچھ پتا نہیں کہ کہاں کہاں کیا کچھ بدل جائے۔"

اوتار سنگھ کی تسلّی تو نہیں ہوئی۔ لیکن اُس نے اس بات کو یہیں چھوڑ دیا اور دوسرے زاویے سے حملہ کیا۔ "تو کیمیاوی عمل اب بھی ہوتا ہے؟"

"اب تو ویسا عمل نہیں ہوتا..." کانتی پرشاد نے کہا۔ "زمین تو ٹھنڈی ہو چکی ہے نا۔"

"تو پھر اب درخت، پودے، انسان اور جانور کیسے پیدا ہوتے ہیں؟"

کانتی پرشاد کی سمجھ میں نہیں آیا۔ "وہ تو افزائش کا عمل چل رہا ہے۔"

"کیوں ماسٹر جی؟ آپ نے بتایا کہ تپتی ہوئی زمین پر ٹھنڈی بارش کے کیمیاوی عمل سے سب کچھ پیدا ہُوا۔ تو اب اس عمل کے بغیر سب کچھ کیسے پیدا ہو رہا ہے؟ ہمارے پُرکھے دادا پردادا مر گئے۔ ہم پیدا ہو گئے۔ یہ سب کیسے؟"

"یہ تو لیدی نظام ہے۔ خود کار نظام۔ ایک سسٹم ہے جس کے تحت تمام جان داروں اور نباتات کی افزائش ہوتی ہے۔"

"لیکن ماسٹر جی، پہلا درخت، پہلا جانور، پہلا انسان... وہ تو اس سسٹم سے پیدا نہیں ہوئے ہوں گے نا؟" اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

کانتی پرشاد بوکھلا گئے۔ "دیکھو چھوٹے ٹھاکر، ابھی تم چھوٹے ہو۔ خود کو اتنا نہ الجھاؤ۔ بعد میں ان پر بات کریں گے۔" انھوں نے ذہین شاگرد کو ٹالا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اسے تو خود انھیں بہت کچھ پڑھنا ہوگا۔

چھوٹے ٹھاکر نے ماں سے پوچھا۔ "ماتا جی... یہ سنسار کس نے بنایا ہے؟"

"بھگوان نے۔"

"کیسے؟"

"یہ تو بھگوان کو ہی معلوم ہوگا۔"

"اور یہ بھگوان کی مورتی کے تین سر کیوں ہیں؟"

"ایک بھگوان برہما ہے، دوسرا بھگوان وشنو اور تیسرا بھگوان شیو۔"

"تینوں کا جسم ایک کیوں ہے؟"

"تینوں مل کر بھگوان ہیں نا، اس لیے۔"

"بھگوان تین ہیں؟ میں تو ایک سمجھا تھا۔"

"ایک ہی ہے... پر نتو روپ تین ہیں۔ برہما، وشنو اور شیو۔ تینوں کے کام الگ الگ ہیں۔ برہما نے سنسار بنایا، وشنو نرمی اور محبت کا بھگوان ہے اور شیو جی غضب، غصہ اور ہلاکت ہیں۔"

تب اوتار سنگھ کو پتا چلا کہ تمام دیوی دیوتا ان تینوں میں سے کسی نہ کسی کے ماتحت ہیں اور دیوی دیوتاؤں کی تعداد بہت بڑی تھی جو سنسار کی مختلف ذمّے داریاں سنبھالتے تھے۔ اور ماتا جی کہتی تھی کہ کسی کی مورتی کے سامنے بھی پوجا کرو، پوجا بھگوان کی ہوتی ہے۔ اوتار سنگھ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پوجا کرنے کے لیے کسی مورتی کی ضرورت ہی کیا ہے۔

اس نے ٹھاکرانی سے یہ بات کہی تو وہ بھڑک گئی۔ "دیکھو بُرا، یہ صرف مورتی نہیں۔ یہ خود بھگوان ہے۔"

"مگر ماتا جی، آپ تو کہتی ہیں، وہ آکاش پر رہتے ہیں۔"

"رہتے ہیں مگر جہاں چاہے آسکتے ہیں۔ ان کی شکتی مہان ہے۔ تم الٹا سیدھا بولو گے تو وہ تمھیں شراپ بھی دے سکتے ہیں۔"

اوتار سنگھ کو ذرا سا ڈر لگا۔ تین سر والی مورتی سے اسے ویسے بھی ڈر لگتا تھا۔ "اور رام چندر جی اور کرشن جی کون تھے؟"

"رام چندر جی بھگوان وشنو کے اوتار تھے۔ ساتویں اوتار اور کرشن جی آٹھویں اوتار تھے۔"

"مطلب؟"

"ان کے اندر وشنو بھگوان کی آتما تھی۔ وہ منش کے روپ میں وشنو بھگوان تھے..." ٹھاکرانی نے کہا۔ "ویدوں میں لکھا ہے کہ دس اوتار آئیں گے۔ نو آچکے ہیں اور ایک باقی ہے۔"

"ماتا جی، یہ کیسے پتا چلتا ہے کہ کس منش میں بھگوان کی آتما ہے؟"

"ان کی شکتی سے پتا چلتا ہے... اور گیانیوں کو پتا چل جاتا ہے۔"

اوتار سنگھ اور اُلجھ گیا۔ یہ گورکھ دھندا کیا ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

چند روز بعد اس نے ماسٹر جی کو گھیر لیا۔ "ماسٹر جی، یہ دیوی دیوتا کیا سچ مچ ہوتے ہیں؟' اس نے ریاضی پڑھتے پڑھتے اچانک پوچھ لیا۔

ماسٹر جی کا ذہن ریاضی میں تھا۔ انھوں نے بے دھیانی میں کہا۔ "بھئی لوگ کہتے ہیں تو ہوتے ہی ہوں گے۔"

اس جملے سے اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گیا کہ ماسٹر جی دیوی دیوتاؤں پر اتنا یقین نہیں رکھتے۔ "آپ کا اپنا خیال کیا ہے ماسٹر جی؟"

"بھئی میں تو سائنس کا آدمی ہوں اور سائنس ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔"

"تو پھر آپ کے خیال میں یہ دیوی دیوتا کہاں سے آئے؟ ان کی ضرورت کیا تھی؟"

"آنا تو ان کا ثابت ہی نہیں ہوتا۔ ہاں میں اس سلسلے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی ضرورت کیوں تھی۔"

"تو بتائیے نا۔"

"دیکھو، خوف انسان کی بنیادی جبلتوں میں سے ہے۔ ہے نا؟"

"شاید ہو۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔" دس سالہ اوتار سنگھ نے ذہانت سے کام لیا۔ ورنہ وہ خوف کو سمجھتا تھا لیکن اس جواب سے وہ ماسٹر جی کو بھڑکانا چاہتا تھا۔ وہ بھڑکیں گے تو بھید کھولیں گے۔

اور کانتی پرشاد سچ مچ بھڑک گئے۔ "یقین سے کیسے نہیں کہہ سکتے۔ ابھی اس کمرے میں کوئی اجنبی آواز تمھیں پکارے اور دیکھنے پر کوئی نظر نہ آئے، تو تم لازمی ڈرو گے۔"

"جی ہاں۔ مگر اس کا دیوی دیوتاؤں سے کیا تعلق؟" اوتار سنگھ نے انھیں چیلنج کیا۔

"تعلق میں بتاتا ہوں..." کانتی پرشاد بڑے جوش سے بولے۔ "اب تو منش نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ ذرا بہت پرانے، ابتدائی دور کے منش کا سوچو۔ اس وقت کی بات سوچو، جب اس نے پتوں سے شریر ڈھانپنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ جب وہ ننگا رہتا تھا۔ جب اس نے سورج کو نکلتے دیکھا ہوگا تو ہلکی ہلکی دھوپ اسے نعمت لگی ہوگی۔ پھر سورج چڑھا ہوگا، دھوپ تیز ہوئی ہوگی اور اُس نے اس کے جسم میں کانٹے چبھوئے ہوں گے تو اس نے سوچا ہوگا کہ اس میں تو قہر بھی ہے اور طاقت بھی۔ اس کی اطاعت کرنی ہوگی۔ ورنہ یہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور شروع ہی سے جھکنا اطاعت کی علامت رہا ہے۔ سو اس نے سورج کو سجدہ کیا ہوگا۔ پھر تیز دھوپ میں چلتے چلتے وہ کسی درخت کے ٹھنڈے سائے میں رُکا ہوگا تو اس نے درخت کی طاقت کو تسلیم کیا ہوگا۔ ارے... یہ تو سورج دیوتا کے قہر سے بچاتا ہے۔ پھر بارش ہوئی ہوگی اور اس کے ننگے جسم پر تیز بارش کے ٹھنڈے نیزے برسے ہوں گے۔ کہیں امان نہیں ملی ہوگی تو اس نے بارش کو اور بعد میں بادل کو دیوتا مانا ہوگا۔ ایک بار پھر درخت نے اسے تیز بارش سے بچایا ہوگا۔ تب اس کے ذہن میں آیا ہوگا کہ درخت کی طرح پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپ کر وہ بھی بارش، دھوپ اور ہَوا سے بچ سکتا ہے۔ اور سوچو کہ ہَوا سے وہ کتنا ڈرا ہوگا۔ کیوں کہ وہ تو نظر بھی نہیں آتی ہے اور جب پہلی بار بجلی کڑکی ہوگی اور اس نے چمک دیکھی ہوگی تو اس کے خوف کا کیا عالم ہوگا؟ وہ بس سجدے میں گر گیا ہوگا۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ اس طرح دیوی دیوتا وجود میں آئے ہوں گے۔"

اوتار سنگھ سانس روکے ماسٹر جی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ایک کیفیت میں تھے۔ ان کی گفتگو میں زور تھا، بہاؤ تھا، اوتار سنگھ نے زور سے سانس بھی نہیں لی کہ کہیں وہ کیفیت ختم نہ ہو جائے۔

''دراصل منش کے اندر، بہت گہرائی میں اول دن سے ایک احساس کمتری بیٹھا ہُوا ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے کہ وہ اپنے سے برتر کسی نامعلوم طاقت سے ڈرتا ہے۔ معلوم قوت سامنے آتی ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح اسے تسخیر کر لیتا ہے اور جب بھی وہ خوف مٹ جائے، چاہے اوپری سطح پر مٹے... تو وہ فرعون بن جاتا ہے۔''

''تو ماسٹر جی، اس خوف کا فائدہ تو ہے نا۔ اس سے انسان اچھا بنا رہتا ہے۔''

''ہاں۔ اخلاقی طور پر تو فائدہ ہے...'' کانتی پرشاد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ خوف بہت اہم ہے۔ انسان... ہر انسان زندگی میں بارہا بے بسی محسوس کرتا ہے۔ جب اپنے مسائل اس سے حل نہیں ہوتے، جب اپنی ضرورتیں وہ پوری نہیں کر پاتا۔ ایسے میں اسے ایک برتر، ایک مشکل کُشا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بیمار ہے اور شفا چاہیے، بے اولاد ہے اور اولاد کی ضرورت ہے اور دنیا میں ایسا کوئی نہیں جس سے وہ یہ چیزیں مانگ سکے اور اُسے مل بھی جائیں۔ تو اس کے لیے وہ ایک برتر نامعلوم تخلیق کر لیتا ہے۔ کہیں وہ بھگوان ہے تو کہیں خدا۔''

''کہتے ہیں کہ بھگوان آکاش پر رہتا ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''وہ کسی ایسی ہی جگہ رہ سکتا ہے جو منش کی نظروں سے اوجھل ہو۔ اور آکاش سے اچھی ایسی جگہ اور کون سی ہوگی۔'' ماسٹر جی نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

''مگر لوگوں نے بھگوان کو دیکھا ہوگا تبھی تو مورتی بنائی ہے ان کی۔''

''نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ ایسے منش ہر دور میں رہے ہیں جو بہت اچھے تھے۔ اخلاق میں اعلا، لوگوں کے کام آنے والے۔ ایسے کہ لوگ ان سے محبت کرنے لگیں۔ اب کوئی مجسمہ تراشنے والا کسی سے محبت کرے گا تو اس کی مورتی تو بنائے گا ہی۔ اور محبت کرے تو آدمی آدمی کو اوتار مان لیتا ہے، بلکہ بھگوان بھی بنا دیتا ہے اسے۔''

یہ بات معقول تھی۔ اوتار سنگھ نے بارہا تاجی کو پتاجی سے کہتے سنا تھا کہ آپ تو میرے بھگوان ہیں۔ اگر ماتاجی کو مُکت ملا آتا تو وہ یقیناً پتاجی کا بُت بناتیں۔ پھر ہزاروں برس بعد لوگ پتاجی کو بھگوان کہتے۔

''اور مسلمانوں اور انگریزوں کے بھارت میں آنے کے بعد ہندو دھرم کے بہت سے نظریات تبدیل ہوئے ہیں۔ ترمورتی کا تصور عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث سے لیا گیا ہے۔ اور مسلمانوں سے متاثر ہو کر بھگوان کے تصور کو مرکزیت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔''

''تو یہ دیوی دیوتا، یہ سب خوف کی پیداوار ہیں... وہم ہے منش کا؟'' اوتار سنگھ نے پوچھا۔

ایک پل میں کانتی پرشاد کی کیفیت ختم ہوگئی۔ انھیں اچانک ہی احساس ہُوا کہ وہ بہت خطرناک گفتگو کر رہے ہیں... بلکہ کر چکے ہیں۔ اگر ٹھاکر جی کو پتا چل گیا کہ وہ ان کے بیٹے کو دھرم کے خلاف کر رہے ہیں تو وہ انھیں نکال باہر کریں گے۔ اور کانتی پرشاد کا یہاں دل بھی لگ گیا تھا اور برسوں بعد انسان کے جیون کو ایک مقصد مل گیا تھا۔ وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ میں نے کب کہا چھوٹے ٹھاکر۔''

''جو باتیں آپ نے کہیں، ان کا یہی مطلب نکلتا ہے۔''

اتنی دیر میں کانتی پرشاد نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ''نہیں۔ وہ تو میں سائنس کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔ ورنہ میں کوئی ناستک تو ہوں نہیں۔''

''یہ ناستک کون ہوتا ہے؟''

''جو نہ بھگوان کو مانے نہ خدا کو، وہ ناستک ہوتا ہے۔'' کانتی پرشاد نے یوں بدمزہ ہو کر کہا جیسے ناستک کوئی گالی ہو پھر پوچھا۔ ''چھوٹے ٹھاکر، تمھیں میں کیسا لگتا ہوں؟''

''اچھے لگتے ہیں۔''

''کیا تم یہ چاہو گے کہ میری جگہ کوئی اور ماسٹر تمھیں پڑھانے کے لیے آئے؟''

''نہیں۔ لیکن ایسا کیوں ہوگا؟''

''اگر ٹھاکر جی یا ٹھاکرائن کو پتا چل گیا کہ میں تمھیں ایسی باتیں بتا رہا ہوں تو وہ شاید مجھے مروا دیں۔ نہ بھی مروایا تو نکال ضرور دیں گے۔''

اوتار سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس سے پہلے اماں نے بھی یہی بات کہی تھی۔ اور وہ اماں سے کچھ پوچھنے سے محروم ہو گیا تھا۔ اب کیا ماسٹر جی بھی... ؟ نہیں۔ وہ ایسا نہیں ہونے دے

گا۔ ''میں پتاجی اور ماتاجی کو کبھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ لیکن ایک شرط ہے ماسٹر جی۔''

کانتی پرشاد تو گویا سولی پر لٹک گئے۔ ''وہ کیا ہے اوتار سنگھ جی؟'' انھوں نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

''میں جب بھی کچھ پوچھوں گا، آپ مجھے بتائیں گے۔ وہ جو آپ کے خیال میں سچ ہے۔''

کانتی پرشاد مطمئن ہوگئے۔ وعدہ کرنے میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے سوچا۔ لیکن دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وہ محتاط رہیں گے۔ ''ضرور، چھوٹے ٹھاکر...!'' انھوں نے اوتار سنگھ سے کہا۔ ''یہ تو میرا فرض ہے۔''

چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ کے دماغ میں دو صندوق تھے۔ ایک میں معلومات جمع ہوتی رہتی تھیں۔ دوسروں کے نظریات۔ وہ درست ہوں یا غلط۔ معقول ہوں یا احمقانہ۔ وہ اس صندوق میں جمع ہو جاتے تھے۔ اور دوسرے صندوق میں اس کے مشاہدات۔ اور اب یہ ہُوا کہ اسے تنہائی کی ضرورت محسوس ہونے لگی تاکہ وہ ان معلومات، نظریات اور مشاہدات کا تجزیہ کر کے ان سے نتائج اخذ کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تنہائی کے مواقع تلاش کرنے لگا۔ کھیل سے اس کا دل بالکل ہٹ گیا۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ سب سے اچھی اور طویل تنہائی رات کو بستر پر آتی ہے۔ سو دیر سے سونا اس کا معمول بن گیا۔ وہ بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتا اور سوچتا رہتا۔ ماتاجی اور پتاجی سمجھتے کہ وہ سو رہا ہے۔ تنہائی کی ضرورت اس لیے اور بڑھ گئی تھی کہ ماسٹر جی نے اسے ایک بہت وسیع مشغلہ دے دیا تھا۔ وہ تصور میں دیکھتا کہ وہ بہت پرانے... ابتدائی زمانے کا انسان ہے۔ وہ یہ کیفیت خود پر طاری کرتا۔ اُس کی مشکلات، اس کی پریشانیاں اور اس کی بے بسی محسوس کرنے کی کوشش کرتا۔ یوں وہ انسان کے ارتقا کو محسوس کر رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا اور یہ میدان بہت بڑا تھا۔

اس وقت تک وہ مطالعہ بھی بہت کر چکا تھا۔ ماسٹر جی خود بہت لائق انسان تھے۔ ان کا شاگرد ہونے کی حیثیت سے وہ علم میں اپنی عمر کے مقابلے میں بہت آگے تھا۔ اس پر مستزاد اس کا فطری تجسس... اس کے سوال۔ اسی حساب سے اس کا تصور بھی بہت زرخیز تھا۔

سو بیسویں صدی عیسوی کا اوتار سنگھ زمانۂ ماقبل تاریخ کی وسیع و عریض دنیا میں آزادی سے گھومتا پھرا۔

بالکل ابتدا میں انسان معاش کا شکار تھا۔ اور زندگی صرف پیٹ بھرنا اور اپنی بقا کا خیال رکھنا۔ چناں چہ وہ کہیں ٹکتا نہیں تھا۔ پانی میں ہاتھ سے مچھلی پکڑنا۔ پرندے اور زیادہ دشوار تھے۔ بکری اور ہرن وغیرہ کے لیے بہت مشقت کرنا پڑتی تھی۔ بڑے جانوروں سے تو وہ گھبراتا تھا۔

ایک بار دو دن ہو گئے اور کوئی شکار نہیں ملا۔ بھوک نے اسے نڈھال کر دیا۔ چلنے پھرنے کی طاقت بھی نہیں رہی۔ اب تو شکار کا کوئی امکان بھی نہیں رہا تھا۔ تب پہلی بار اس نے ڈرتے ڈرتے جنگلی بیریاں کھائیں۔ کچھ کڑوی کسیلی، کچھ میٹھی۔ ذائقہ اسے اچھا لگا۔ توانائی بھی ملی۔ یوں وہ پھلوں سے متعارف ہُوا۔ اب بھی شکار نہ ملتا تو وہ جنگلی پھل کھا لیتا۔ اس نے درختوں سے پل توڑنا سیکھ لیا۔

پھر ایک دن بڑے نکیلے دانتوں والا گیدڑ اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ بھاگا، گیدڑ اس کے پیچھے تھا۔ وہ بھاگتے بھاگتے تھک گیا اور ہانپنے لگا۔ گیدڑ اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ بے بس تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک پتھر نظر آیا۔ اس نے پتھر اٹھایا اور کھینچ کر مارا۔ پتھر گیدڑ کے مُنہ پر لگا اور گیدڑ کے مُنہ سے خون نکلا۔ گیدڑ بھاگ گیا۔

اس اتفاق سے اس نے سمجھا کہ وہ پتھر سے کام لے سکتا ہے۔ اگلی بار گیدڑ چپکے سے اس کے قریب آیا اور اس پر حملہ کر دیا۔ پتھر اس کے پاس تھا اور کھینچ کر مارنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ ہاتھ میں پتھر تھام کر گیدڑ کو مارتا رہا۔ یہاں تک کہ گیدڑ ختم ہو گیا۔ اس دن اس نے پتھر کا فرق بھی سمجھ لیا۔ نکیلا پتھر زیادہ کام آتا ہے۔ اس نے پتھر کو پتلا اور نکیلا کر کے ہتھیار بنائے۔ تحفظ کا تحفظ... اور شکار کرنا آسان ہو گیا۔

فاقے کا خطرہ دور ہُوا تو دماغ زیادہ کام کرنے لگا۔ پیٹ کی طرف سے بے فکری ہوئی تو مشاہدہ شروع ہُوا۔ اس نے مکئی دیکھی اور دیکھا کہ اسے پرندے شوق سے کھاتے ہیں۔ وہ خود بھی شوق سے کھاتا تھا۔ پھر وہ بیمار ہو گیا۔ مجبور ہو گیا کہ وہیں پڑا رہے۔ آگے جانے کی طاقت نہیں تھی۔ راستہ دشوار تھا اور سامنے پہاڑ تھا۔ اس کا جسم گرم ہو رہا تھا۔ اس نے مکئی کے دانے جہاں تک پھیلا سکتا تھا، پھیلا دیے کہ پرندے آئیں گے اور وہ پتھر سے ان کا شکار کر کے پیٹ بھرے گا اور طاقت بحال ہوگی تو آگے نکل جائے گا۔

تیس چالیس بار سورج نکلا اور ڈوبا تو اس نے دیکھا کہ جہاں اس نے مکئی کے دانے پھیلائے تھے، وہاں پودے نکل

رہے ہیں۔ پھر اس نے ان پودوں کو بڑھتے دیکھا۔ ہر پودے میں مکئی کے بہت سارے پھل تھے۔ بہت سارے سورج نکلے اور ڈوبے تو مکئی تیار ہوگئی۔ اس نے سوچا تو ان دانوں سے پودے نکلے ہیں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔

وہ صحت یاب ہوگیا تھا۔ مگر وہ آگے نہیں گیا۔ اس نے پھر دانوں کو پھیلا کر تجربہ کیا۔ پھر فصل ہوئی۔ مگر اس نے سمجھ لیا کہ اس کے لیے یہاں رہنا ضروری ہے۔ سو اس نے گھومنے پھرنے کو خیرباد کہا۔ اور وہیں ایک غار میں رہنے لگا۔ پھر اس نے پرندوں کو گھونسلا بناتے دیکھا اور اپنے لیے گھر بنایا جہاں وہ دھوپ اور بارش سے اور ہوا سے محفوظ تھا۔ وہ زراعت اور تمدن کا آغاز تھا۔

اہم ترین عناصر چار تھے... مٹی، پانی، ہوا اور آگ۔ ان کے بغیر زندگی کا تصور نہیں تھا۔ ہوا اور مٹی ہر جگہ موجود تھی۔ پانی کا ایک سسٹم تھا اور آگ نہ ہوتی تو انسان جانوروں کی طرح کچا کھاتا رہتا۔ پہلی بار وہ کھانا پکا کر ہی جانوروں سے ممتاز ہوا تھا۔

ان سب باتوں پر غور کرتے ہوئے اوتار سنگھ کے ذہن میں دو باتوں نے جڑ پکڑی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راسخ ہوتی گئیں۔ ایک یہ کہ دنیا میں کوئی کام خود بہ خود نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اتفاق کوئی چیز نہیں ہوتا۔ اور اس کا سبب اس کا عمیق مشاہدہ تھا۔

وہ ہر چیز کو علم کی کسوٹی پر پرکھتا ضرور تھا لیکن اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ کہیں کہیں سائنس بھی بے بس ہو جاتی ہے۔ جیسے دنیا کی ابتدا کے بارے میں وہ یہ کہہ کر الگ ہو جاتا تھا کہ ایک کیمیاوی عمل کے نتیجے میں زمین بنی اور اس پر زندگی کا آغاز ہوا۔ اور وہ کہتا تھا کہ وہ عظیم کیمیاوی عمل خود کار تھا۔ یہ بات اس کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ یہ طے ہے کہ کیمیاوی عمل عناصر کے درمیان ہوتا ہے اور یہ بھی طے ہے کہ عناصر خود بہ خود پیدا نہیں ہوتے۔ ہر چیز کی، ہر عمل کی کوئی نہ کوئی علت ہے۔ جو آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا، وہ اس پر اتفاق کا لیبل چپکا دیتا ہے۔ سو جہاں سائنس بے بس دکھائی دیتی تھی، وہ وہیں سے غور و فکر کرتا تھا۔

انسانی ارتقا کی تاریخ سے اوتار سنگھ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ انسان کا علم بہت محدود اور ناقابلِ اعتبار ہے۔ ابتدا میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ پھر اسے اپنی عقلی صلاحیت کا ادراک ہوا۔ تب اس نے سمجھنا شروع کیا اور تب سے اب تک کتنے ہی نظریات ایسے ہیں جن پر وہ مدتوں راسخ رہا مگر بعد میں انھیں غلط ماننے پر مجبور ہوگیا۔ تو یہ طے ہے کہ جو بھی انسان کو معلوم ہے، ہو سکتا ہے اس نے سمجھا ہے، اس کے درست ہونے کی کوئی ضمانت نہیں۔ کوئی بھی نظریہ کسی بھی وقت غلط ثابت ہو سکتا ہے۔

سائنس کی بنیاد انسان کی عقل اور اس کی جانچ کی طاقت پر ہے۔ اور اوتار سنگھ نے سمجھ لیا تھا کہ عقل خام ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں جنھیں عقل سمجھنے سے قاصر ہے تو اس وجہ سے ان کا انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔ جو کچھ انسان کو جب تک معلوم نہیں، تب تک وہ نامو جود ہے۔ لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے، وہ موجود تو ہوتی ہے۔ کسی کے وجود کا انکار کرنے سے وجود گم نہیں ہو جاتا اور جب انسان اسے دریافت کرتا ہے، تب اسے ماننا شروع کرتا ہے۔ حالاں کہ وہ بہت عرصے سے موجود ہوتی ہے۔ ابھی ماسٹر جی نے بتایا تھا کہ ایک اور ستارہ دریافت ہوا ہے جس کا نام پلوٹو ہے۔ دریافت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اب انسان کو نظر آیا ہے۔ اس کی سمجھ میں اب آیا ہے۔

خود ماسٹر جی نے بتایا تھا کہ نظام شمسی بہت بڑا ہو سکتا ہے کہ اس میں اور ستارے بھی ہوں جو ابھی انسان کی نظر نہ آئے ہوں اور یہ بھی کہ کائنات میں اس سے کہیں ہزاروں... بلکہ شاید لاکھوں نظام موجود ہوں۔ تو کائنات بڑی ہے... اتنی بڑی کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ابھی تک اپنے نظام شمسی کو بھی پورے طور پر نہیں سمجھ پایا ہے۔ اور یہ جو کچھ انسان نے سمجھا ہے، ہزاروں برسوں میں سمجھا اور جو سمجھا ہے، وہ بھی کل نہیں ہے۔ ہزاروں، لاکھوں سوال ایسے ہیں جن کے وہ ابھی تک جواب نہیں دے پایا ہے۔

پھر عقل کے ساتھ حواس بھی ہیں۔ انسان دیکھتا ہے تو مانتا ہے۔ سب سے زیادہ وہ آنکھوں پر اعتبار کرتا ہے۔ مگر اور حسیں بھی ہیں۔ وہ سن سکتا ہے۔ سونگھ سکتا ہے، چھو سکتا ہے، چکھ سکتا ہے۔ یہ تمام حسیں عقل کی مددگار ہیں۔ تبھی تو اس نے بہت سی ایسی چیزوں کا وجود تسلیم کیا جنھیں وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان میں ہوا بھی تھی اور خوش بو بھی۔

اوتار سنگھ دنیا کے نظام پر غور کرتا تھا۔ سورج ہر روز اپنے مقررہ وقت پر نکلتا اور غروب ہوتا تھا۔ چاند تھا۔ اس کی گردش کا دائرہ ایک خاص مدت میں مکمل ہوتا تھا۔ نیا چاند نکلتا، روز تھوڑا تھوڑا بڑھتا، مکمل ہوتا، پھر تھوڑا تھوڑا گھٹتا، دو دن غائب ہو جاتا اور پھر نیا چاند نکلتا۔ موسم تھے جو اپنے اپنے وقت پر آتے جاتے تھے۔ کچھ مہینے بارشوں کے تھے۔ گرمی سردی تھی۔ بہار خزاں تھی۔ تمام ستارے اپنی مخصوص رفتار سے آگے پیچھے گردش

کرتے تھے۔ ایسے کہ اس میں کبھی ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ تبھی تو جنتریوں سے پتا چلتا تھا کہ کب کون سا ستارہ کہاں ہے۔ زہرہ، مشتری، مریخ، عطارد اور زحل۔ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کب سے کب تک طلوع رہیں گے۔ یعنی زمین سے دیکھے جا سکیں گے۔ سب کچھ ایسے حساب کتاب سے تھا کہ مہینوں کو پہلے سے معلوم ہوتا تھا کہ کس سال، کس مہینے میں کتنے بج کر کتنے منٹ اور کتنے سیکنڈ پر سورج یا چاند گرہن ہوگا۔

سائنس بہت سی چیزوں کو نہیں مانتی تھی۔ ان میں آتما بھی تھی اور خدا بھی۔ اور بھی بہت کچھ تھا جسے وہ توہمات قرار دے کر مسترد کر دیتی تھی۔ دراصل سائنس بہت مجبور تھی۔ اس کی کچھ حدود تھیں۔ وہ مختلف چیزوں پر ان کی ماہیت، ان کے اجزائے ترکیبی کے حساب سے تجربے کر کے نتائج اخذ کرتی تھی۔ اور ایسا صرف ان چیزوں پر ہو سکتا تھا جو اس کی دسترس میں ہوں۔ جو انسانی حسوں کی حدود میں ہوں۔ ایسی چیزیں بھی تھیں جو انسان دیکھ سکتا تھا، محسوس کر سکتا تھا۔ مگر وہ اس کی پہنچ سے دُور تھیں۔ ان چیزوں کو وہ ریاضی کی مدد سے سمجھتا تھا۔ فلکیات کا پورا علم ایسا ہی تھا۔ اس کی براہِ راست تصدیق نہیں کی جا سکتی تھی۔ انسان نے بہت ترقی کر لی تھی۔ ثابت ہو چکا تھا کہ تمام جان داروں میں وہ سب سے برتر ہے۔ اس نے بہت کچھ تسخیر کر لیا تھا۔ بہت کچھ جان لیا تھا۔ بہت کچھ ایجاد کر لیا تھا۔ اس نے اپنے نظامِ شمسی کے سسٹم کو بھی حد تک سمجھ لیا تھا۔ لیکن اپنی قوتوں اور اختیارات کے باوجود بہت سے مقامات پر بے بس تھا۔ آسمانی بجلی، زلزلے، طوفان، ان کے سامنے اس کی نہیں چلتی تھی۔ اور وہ سسٹم میں تبدیلی کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ وہ سورج کو نہ پانچ منٹ پہلے نکال سکتا تھا نہ پانچ منٹ بعد۔ موسم بھی اس کے اختیار میں نہیں تھے۔

اور ایک اہم چیز وقت تھا۔ اس پر کسی چیز کا اثر و اختیار نہیں تھا اور اس کے اثرات سے کوئی چیز محفوظ نہیں تھی۔ اس کا تعلق سورج سے تھا اور وہ آگے ہی آگے بڑھتا تھا۔ کبھی رُکتا نہیں تھا۔ اوتار سنگھ نے بیج سے پودے کو نکلتے اور پھر پودے کو بڑھتے دیکھا تھا۔ اس نے خود کو بھی بڑھتے دیکھا تھا۔ وہ لمبا بھی ہوا تھا اور بڑھا بھی تھا۔ اس نے چیزوں کو پرانی اور بوسیدہ ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے ماتا جی کی آنکھوں کے نیچے پڑیوں کے پنجوں کے سے نشان آتے دیکھے تھے اور پتا جی کے چہرے پر جھرّیاں پڑتے بھی دیکھا تھا۔ وقت کے اثرات بے جان چیزوں پر اور طرح کے تھے۔ وہ بڑھتی نہیں تھیں۔ پرانی... وقت کے ساتھ بوسیدہ ہوتی چلی جاتی تھیں۔ لگتا تھا کہ گزرتا وقت ان میں توڑ پھوڑ کرتا ہے۔ انھیں کم زور کرتا ہے۔ جان دار چیزوں کے ساتھ معاملہ اور تھا۔ وہاں تعمیر بھی تھی۔ وقت پہلے جان دار چیزوں کو بڑھاتا تھا اور جان دار چیزوں کے بڑھنے کی ایک حد تھی۔ اس حد کو پہنچ کر بڑھوتی کا ہر عمل رُک جاتا تھا اور ایک مدت کے ٹھیراؤ کے بعد زوال کا عمل شروع ہو جاتا تھا۔

وقت ایک ایسی طاقت تھی جو نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن ہر چیز پر اس کے اثرات نظر آتے تھے۔ وہ ایک ایسا دھارا تھا جو کبھی رُک نہیں سکتا تھا۔ اوتار سنگھ نے غور کیا تو سمجھا کہ ہر جان دار چیز کے لیے ایک مہلت مقرر ہے اور وقت اس کا پیمانہ ہے۔ ہر چیز کو فنا ہے۔ جو جیتا ہے، وہ آخر کار مر جاتا ہے۔ اور اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ سب کی مہلت الگ الگ ہے۔ یہ نہیں کہ آدمی بوڑھا ہو کر مرے۔ گنگا رام کا بچہ دو سال کا مر گیا تھا۔ اور گنگا رام کا باپو 80 سال کا تھا مگر زندہ تھا۔ یہی حال نباتات کا تھا۔ کوئی پودا بڑا ہوتے ہوتے اچانک سوکھ جاتا تھا اور کوئی درخت برسوں سے ہرا بھرا تھا۔

وہ بارہ سال کا ہونے والا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب اسے گھر سے دُور جانا ہے۔ اسکول میں داخل ہونا ہے۔ اس خیال سے وہ گھبراتا نہیں تھا بلکہ خوش ہوتا تھا۔ اس کے تجسس کو گاؤں کے چھوٹے سے منظر نے مہمیز کر دیا تھا۔ وہ سوچتا کہ بڑے منظر میں جا کر وہ زیادہ دیکھے گا اور زیادہ سمجھے گا۔

پتا جی نے جب اسے اس بارے میں بتایا تو گویا دلاسا دینے کے لیے کہا۔ ”وصال دین بھی تمھارے ساتھ جائے گا... اور ماسٹر جی بھی۔“

وہ خوش ہوگیا۔ ویر جی نے کبھی اس کے تجسس میں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ خود کو ادھورا محسوس کرتا تھا۔

لیکن پتا جی اداس ہوگئے۔ ”پتا نہیں، تمھارے بغیر ہم کیسے جئیں گے۔“

”کیوں پتا جی۔ اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے سبھی لوگ دور بھیجتے ہوں گے۔“

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے گہری سانس لی۔ ”مگر تم تو میرے ایک بیٹے ہو... اور وہ بھی منّتوں مُرادوں والے...“

”یہ کیا ہوتا ہے پتا جی... منّتوں مرادوں والا؟“ اوتار سنگھ نے اپنا پسندیدہ جملہ دہرایا۔

اس کے جواب میں ٹھاکر نے اسے سب کچھ بتایا۔ بلکہ اسے لے جا کر برگد کا وہ درخت بھی دکھایا جو جل چکا تھا۔ مگر اب

بھی کھڑا تھا۔ ''یہاں ہم نے آخری بار تمھیں مانگا تھا۔ منّت چڑھائی تھی۔''

''تو اس کے بعد ہی میں پیدا ہُوا تھا؟''

''ہاں۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ اس درخت نے آپ کو مُراد دی۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

ٹھاکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بیٹے کو اس معاملے کی تفصیل نہیں بتانا چاہتا تھا۔ لیکن چند لمحے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے مُنہ سے نکلا۔ ''یہ درخت تو ہمارے منّت ماننے کے کچھ دن بعد ہی سوکھ گیا تھا۔''

''میرے پیدا ہونے سے بھی پہلے؟''

''ہاں پُتر۔ اس سے بہت پہلے۔''

ماتا جی اکثر اسے بتاتی تھیں کہ انھوں نے کیسے طویل برس اولاد کی آرزو میں گزارے تھے۔ کیا گزرتی تھی اُن پر۔ انھیں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہر چیز میسّر تھی لیکن انھیں کسی سے غرض نہیں تھی۔ وہ بس ہر جگہ اولاد کی پرارتھنا کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ انھوں نے بائیس برس اولاد سے محرومی کا کشٹ اٹھایا ہے اور جب انھیں وہ مل گیا تو جیسے سب کچھ مل گیا۔

اوتار سنگھ نے سوچا کہ وہ ہستی جس نے مجھے پیدا کیا، یقیناً زبردست ہے اور وہ یہ درخت تو ہرگز نہیں ہوسکتا جو خود ہی زندگی سے محروم ہوگیا ہے۔ میرے ماں باپ بائیس سال ہر کسی سے اولاد مانگتے رہے۔ لیکن اولاد نہیں ملی، پھر اس نے مجھے پیدا کیا تو میرے ماں باپ پر بڑا احسان کیا۔ مجھ پر بھی احسان کیا کہ مجھے ایسے محبت کرنے والے ماں باپ دیے۔ اور انھیں اتنا کچھ دیا کہ وہ میری ہر خواہش پوری کرسکتے ہیں۔ تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟

وہ اس سوال پر سوچتا رہا۔ اسے یاد آیا کہ ایک دن اس نے ماتا جی سے پوچھا تھا۔ ''آپ میرا اتنا خیال رکھتی ہیں۔ ہر چیز دیتی ہیں مجھے۔ اور پتا جی بھی کیا کچھ کرتے ہیں میرے لیے... تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ماتا جی۔ میں کیا کروں آپ کے لیے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ بس تم اچھے رہو۔ خوش رہو۔ میرے لیے یہی سب کچھ ہے۔'' ٹھاکرانی نے کہا تھا۔

''اچھے رہنے کا مطلب ہے؟''

''اچھے پُرش بنو۔ اچھے کام کرو تاکہ تمھارے پتا جی کا نام روشن ہو۔ لوگ خوشی سے کہیں کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا پوت مہاپرش ہے۔''

''اور کیا کروں؟ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اور کچھ بتائیے۔ کوئی مشکل سا کام۔''

ٹھاکرانی چند لمحے سوچتی رہی۔ اس دوران ٹھاکر پرتاپ سنگھ بھی آگیا۔ ''بس تم ہمیشہ ہم سے محبت کرو۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔

اور اوتار سنگھ ماں سے لپٹا اور اُسے پیار کیا۔ پھر پتا جی سے لپٹ گیا اور اسے چومنے لگا۔ ''وہ تو میں کرتا ہوں اور یہ بھی بہت آسان ہے میرے لیے۔''

''محبت کرنا کبھی آسان نہیں ہوتا...'' پتا جی نے کہا۔ ''مگر یہ بات تم ابھی نہیں سمجھو گے۔''

تب اوتار سنگھ نے سوچا کہ اسے اپنے پیدا کرنے والے سے محبت کرنی چاہیے... دنیا میں سب سے... ماتا جی، پتا جی، اماں اور ویر جی سے بڑھ کر۔ کیوں کہ اس نے اسے پیدا نہ کیا ہوتا تو نہ وہ اُن سب کو ملتا اور نہ یہ سب اُسے ملتے۔ اس نے کہا کہ مُراد کرنا اور محبت کرنا سب سے زیادہ اس کے لیے ہونا چاہیے جس نے اسے پیدا کیا ہے۔

مگر محبت کیسے کرے؟ وہ تو اسے جانتا بھی نہیں۔ تو پھر پہلے اُسے جاننے کی کوشش کرے۔ اسے تلاش کرے۔ پھر اس سے دنیا کی ہر ہستی اور ہر چیز سے بڑھ کر محبت کرے۔

''اے! تُو کہ جو بھی ہے، میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں... اُس سب پر جو تو نے مجھے اور میرے ماتا پتا کو دیا۔'' اوتار سنگھ نے سرگوشی میں کہا۔ ''اب میں تجھے تلاش کروں گا۔ تجھے ڈھونڈوں گا اور پھر تجھ سے محبت کروں گا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ میں بس ارادہ کرسکتا ہوں، کوشش کرسکتا ہوں، مگر تو مجھے اُسی وقت ملے گا جب تُو چاہے گا۔ جب تیری مرضی ہوگی۔ میں تجھ سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ میری مدد کر اور مجھے مل جا۔''

یہ دعا کر کے اسے ایک پل کو سکون آیا۔ مگر وہ فوراً ہی مضطرب ہوگیا۔ اسے تو ڈھونڈنا ہے... ان تھک کوشش کرنی ہے۔ سکون تو اس کے بعد کی چیز ہے۔ بعد میں ہی اچھا لگے گا۔

اب وہ سراپا عزم تھا!

مُشرکوں کے گمراہ پروہت نے ٹھاکر اوتار سنگھ کے کہنے پر اُس کے من میں ایک چنگاری بھی جو شعلہ بننے کے لیے بے تاب تھی

منتظر اور بے قرار آنکھوں کے لیے اس محبوب داستان کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے۔

ٹیلی فون

ہنری سلیسی/صلاح الدین شیخ

سنسنی کے شہنشاہ، ہنری سلیسر کے بیشتر بہا خزانے سے منتخب
مصروف رہنے والے ایک ٹیلی فون کا قصہ... اور اُس
مصروف رکھنے والوں کا ماجرا

وہ ڈائننگ روم میں اچار کی شیشی پر ڈھکن کس رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے گنتی شروع کی۔ ''ایک مسز برٹن، دو مسز منرو، تین مسز ولیم، چار۔'' یہ اس کے اپنے فون کی گھنٹی تھی۔ اس نے بیٹھک میں پہنچ کر ریسیور اٹھایا اور بولی۔ ''ہیلو۔''

''کیا مسز اسمتھ بول رہی ہیں؟'' دوسری طرف سے کسی مرد نے کہا۔ یہ آواز ہیلن اسمتھ کے لیے قطعی نامانوس تھی۔

''جی ہاں، میں مسز اسمتھ ہوں، فرمائیے؟''

''میرا نام فورڈ ہے اور میں مقامی پولیس سے تعلق رکھتا ہوں۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو مجھے ملاقات کا وقت دیجیے اور کچھ اہم معاملے پر آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

''اہم معاملہ! آپ کو میرے نام کے بارے میں تو کوئی مغالطہ نہیں ہُوا؟''

''جی نہیں۔ مجھے آپ ہی سے گفتگو کرنی ہے۔ میں ابھی چند منٹ بعد آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔''

''لیکن میں بالکل نہیں سمجھ سکی کہ مجھ سے آپ کو کیا کام ہوسکتا ہے، وہ گفتگو آپ فون پر نہیں کرسکتے؟ دراصل میں آج کچھ زیادہ ہی مصروف ہوں۔''

''مسز اسمتھ افسوس ہے کہ آپ سے فون پر وہ گفتگو نہیں ہوسکتی۔''

''خیر، کوئی بات نہیں، آپ تشریف لے آئیں۔ میں آپ کی منتظر رہوں گی۔''

''بہت بہت شکریہ، مسز اسمتھ!'' انسپکٹر فورڈ نے جواب دیا۔ وہ اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ ہیلن اسمتھ خود ہی سلسلہ

منقطع کردے۔ چناں چہ ہیلن اسمتھ نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور تعجب سے فون کو دیکھنے لگی۔

ڈائننگ روم میں جا کر ادھورے کام کو مکمل کرنا بیکار تھا کیوں کہ اسے یقین تھا کہ فون کی گھنٹی ابھی دوبارہ بجے گی اور اس کا اندازہ درست ہی نکلا۔ فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی اور چار مرتبہ مسلسل بج کر خاموش ہوگئی۔ مسز اسمتھ نے جھلا کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے مسز منرو کی چیختی چلاتی آواز سنائی دی۔ ''ہیلن، کہو کیا حال ہے؟ مجھے ابھی تم سے کچھ بات چیت کرنے کا خیال آیا، سب خیریت ہے نا؟''

''ہاں، بس خیریت ہی ہے۔'' ہیلن اسمتھ نے جواب دیا۔

تقریباً 15 سال سے وہ اس عمارت میں رہتی تھی اور یہاں کا ٹیلی فون سسٹم مشترکہ تھا اور اب تو یہ بات عام ہوچکی تھی کہ عمارت کا رہنے والا ہر شخص فون پر ایک دوسرے کی گفتگو سننے کا عادی تھا لیکن کوئی بھی اس اخلاقی جرم کا اقبال نہیں کرتا تھا۔ ابھی تک اس عمارت میں وہی پرانا سسٹم جاری تھا یعنی اگر فون پر گفتگو ہو رہی ہوتو نہ فلیٹ سے باہر کہیں فون کیا جاسکتا تھا اور نہ باہر سے کوئی کال آسکتی تھی۔

''اور کہو، جیک کا کیا حال ہے؟'' ہیلن اسمتھ نے پوچھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مسز منرو فون پر ہونے والی گفتگو کے بارے میں استفسار کریں۔ ویسے اسے یقین تھا کہ مسز منرو نے انسپکٹر فورڈ کی باتیں سن لی ہیں اور محض حیرت دُور کرنے کے لیے یہ فون کیا ہے۔

''ابھی تک اس کی مصروفیت کا وہی عالم ہے...'' مسز منرو نے جواب دیا۔ ''اور ہاں! ہیلن تم بتاؤ، کوئی خاص بات! کوئی دل چسپ خبر؟''

مسز اسمتھ نے غصے سے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے اور دل ہی دل میں کہا۔ 'خوب، تو گویا وہ بات مجھ سے اُگلوانا چاہتی ہو۔'

''جی نہیں، ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' اس نے سرد مہری سے جواب دیا۔

''میں نے کچھ دیر پہلے تمھارے فون کی گھنٹی سنی تھی، کون تھا وہ؟''

''وہ ارے وہ... ہاں وہ تو میرے درزی کا فون تھا۔''

''اوہو۔'' مسز منرو نے کہا۔

ہیلن اسمتھ سمجھ گئی کہ مسز منرو نے فون پر ہونے والی گفتگو یقیناً سُن لی ہے اور اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ اس کا اعتراف کر سکے۔ مسز منرو نے چند غیر ضروری باتوں کے بعد ٹیلی فون بند کر دیا۔

تین منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی تین مرتبہ بج کر خاموش ہوگئی اور ہیلن اسمتھ کو یقین ہوگیا کہ مسز منرو اب مسز ولیم کو فون کر رہی ہیں۔ اس نے جھٹ ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ مسز منرو، مسز ولیم کو بتا رہی تھی کہ مقامی پولیس کا کوئی انسپکٹر ہیلن سے ملنے آرہا ہے لیکن ہیلن نے اس کا اعتراف نہیں کیا اور بتایا کہ اس کے درزی کا فون تھا۔ ہیلن اسمتھ نے آہستہ سے ریسیور رکھ دیا اور سونے کے کمرے میں جا پہنچی اور اپنے کپڑے اور بناؤ سنگھار درست کرنے لگی تاکہ انسپکٹر کو خوش آمدید کہہ سکے۔ چند منٹوں کے بعد درمیانی عمر کا ایک دُبلا پتلا شخص پہنچ گیا، اس کی چوڑی پیشانی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کافی ذہین اور باصلاحیت ہے۔

''شام بہ خیر۔ مجھے انسپکٹر فورڈ کہتے ہیں۔''

''شام بہ خیر۔ اندر آیئے! میں آپ ہی کی منتظر تھی۔'' جب انسپکٹر نے اپنا تعارف کرایا تو مسز اسمتھ نے شیریں لہجے میں کہا۔

''میں نے یہاں جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ بعض اوقات دو تین منٹ کی تاخیر سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے...'' اس نے کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تو کچھ ٹھنڈک ہے، باہر تو خاصی گرمی ہے۔''

''کیا میں آپ کے لیے شربت لاؤں؟'' مسز اسمتھ نے پوچھا۔

''شکریہ! لیکن بہتر ہے پہلے وہ اہم گفتگو کر لی جائے...'' اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔ ''مسز اسمتھ کیا آپ کسی ایسے شخص کو جانتی ہیں جس کا نام ہارورڈ ملر ہو؟''

''ہارورڈ ملر...؟'' مسز اسمتھ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''جی نہیں، یہ نام میرے لیے بالکل نیا ہے۔ مسٹر ملر ہے تو میں واقف ہوں جو ڈاک خانے میں کام کرتی ہیں۔ کیا یہ شخص ان کا کوئی رشتے دار ہے؟''

''نہیں...'' انسپکٹر فورڈ نے کہا۔ ''ہارورڈ ملر 8 سال قبل اس عمارت میں رہتا تھا، وہ صرف 6 مہینے اس عمارت میں رہا اور بیوی کے انتقال کے بعد فلیٹ مسز ولیم کو دے کر چلا گیا۔ مسز اسمتھ کہیے اب آپ کو کچھ یاد آیا؟''

''ہاں اس کے متعلق کچھ کچھ تو یاد آرہا ہے...'' یہ کہتے ہوئے اچانک اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اچھا... ملر، ہاں وہ پاگل انسان بھلا

میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں؟''

''میرا بھی یہی خیال تھا مسز اسمتھ! میرا مطلب ہے اس نے آپ کے متعلق جو کچھ کہا تھا اس کے پیش نظر مجھے یہی امید لگی کہ آپ اسے نہیں بھولی ہوں گی۔ میں اس وقت اپنے دفتر میں نہیں تھا لیکن جو حالات میں نے سنے ہیں اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا ذہن منتشر تھا۔''

''وہ بالکل پاگل تھا...'' مسز اسمتھ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اس کے متعلق آپ جس سے چاہیں معلوم کرلیں، مجھے یقین ہے کہ سب میری رائے سے اتفاق کریں گے۔''

''مسز اسمتھ، کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گی کہ اسے آپ سے کیا شکایت تھی۔ میں یہ سب کچھ صرف معلومات حاصل کرنے کی غرض سے پوچھ رہا ہوں۔''

''میرا خیال ہے اس واقعے کو دُہرانے کی اب ضرورت نہیں۔''

''میں نے سنا ہے کہ ہارورڈ ملر نے اس عمارت میں داخل ہونے سے ایک سال قبل شادی کی تھی۔ اسے اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی۔ جب وہ اس عمارت میں منتقل ہُوا تو اس کی بیوی امید سے تھی اور اسے ساتواں مہینا شروع ہوگیا تھا۔ ایک رات اسے شدید درد اٹھا تو ملر نے اپنے فلیٹ کے فون سے ڈاکٹر کو بلانا چاہا مگر...''

مسز اسمتھ آنکھیں بند کیے دونوں ہاتھ گود میں رکھے کسی سوچ میں گم تھیں۔

''میں اس وقت تھانے پر تعینات نہیں تھا بہ ہر حال، مجھے کچھ بتایا گیا ہے بالکل وہی میں بیان کر رہا ہوں۔ سنا ہے اس وقت آپ غالباً کسی خاتون سے مصروفِ گفتگو تھیں۔''

''ہاں وہ مسز اینڈرسن تھیں...'' مسز اسمتھ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''میں ان سے ایک اہم موضوع پر گفتگو کر رہی تھی۔''

''کیا اب بھی وہ اس عمارت میں رہتی ہیں؟''

''جی نہیں، پانچ سال ہوئے وہ اپنے شوہر کے ساتھ فلوریڈا چلی گئی تھیں، وہاں ان بے چاری کا انتقال ہوگیا۔''

''بہ ہر حال...'' انسپکٹر نے رومال سے اپنے چہرے کا پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے سلسلہ منقطع نہیں کیا جس کے بعد ملر، ڈاکٹر کو فون نہیں کر سکا۔ اس کے بیان کے مطابق اس نے دونوں نے دانستہ فون پر گفتگو کو طول دیا، تاکہ اسے لائن نہ مل سکے اور وہ ڈاکٹر کو نہ بلا سکے۔''

''یہ بالکل جھوٹ ہے، سفید جھوٹ...!'' مسز اسمتھ نے چیختے ہوئے کہا۔ ''ہم نے صرف اتنی گفتگو کی تھی جس قدر کہ وہ گفتگو کی جاسکتی تھی۔''

''لیکن اس گفتگو کی وجہ سے وہ ڈاکٹر کو فون نہ کر سکا اور اسے خود جانا پڑا۔ اس تاخیر کی وجہ سے اس کی بیوی کو بروقت طبی امداد نہ مل سکی اور بالآخر اس نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیا۔ کیا یہ بات غلط ہے۔''

''دیکھیے انسپکٹر صاحب...''

''براہِ کرم میری باتوں کا غلط مطلب نہ لیجیے...'' انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''میں گزرے ہوئے واقعات اس لیے بیان نہیں کر رہا کہ کسی کو موردِ الزام ٹھہراؤں، بلکہ اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ آج صبح ہمارے دفتر میں ایک اطلاع موصول ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہم اس معاملے میں دل چسپی لینے پر مجبور ہوگئے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''مجھے یقین ہے آپ کو یہ نہیں معلوم ہوگا کہ اس عمارت کو چھوڑنے کے بعد ہارورڈ ملر پر کیا بیتی؟''

''واقعی مجھے کچھ نہیں معلوم۔''

نمک پارے

❁... چلتے ہوئے خیال رکھو کہ تمھارے پاؤں سے اٹھتی ہوئی دھول کسی کی منزل نہ گم کردے۔

❁... اپنے اندر ایسی خوبیاں پیدا کرو کہ زمانہ تمھارے آگے جھکنے پر مجبور ہوجائے۔

❁... زیادہ ہنسنے سے بچو کیونکہ اس سے بھی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

❁... اپنی غلطی تسلیم کرلو۔ کبھی بھٹک نہ سکو گے۔

❁... سہاروں کی زندگی بے سہارا ہے۔

❁... کسی کے آنسوؤں کو زمین پر گرنے سے پہلے جذب کرلو یہی انسانیت کی معراج ہے۔

❁... کوئی چیز اتنی خوش گوار نہیں ہوتی جتنی وہ ملنے سے پہلے دکھائی دیتی ہے۔

❁... دل اگر سیاہ ہو تو چمکتی ہوئی آنکھ بھی کچھ نہیں کر سکتی۔

❁... انسان کی نشانی یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کا بھی احترام کرتا ہے جن سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

❁... خوشیاں ایسے موتی کے مانند ہے جنھیں تلاش کرنے کے لیے انسان کو زندگی کے سمندر میں چھلانگ لگانی پڑتی ہے۔

ابن حسن عثمان آبادی کے قلم سے

''وہ اپنی بیوی کی ناوقت موت سے بے حد رنجیدہ اور افسردہ تھا، لہٰذا وہ یہاں سے نیویارک چلا گیا۔ چھ ماہ بعد وہاں ایک لوہے کے سامان کی ایک دکان سے چوری کے الزام میں پکڑا گیا۔ اس دکان سے اس نے صرف چند کیلیں چرائی تھیں۔ اسے چھ ماہ کی سزا ملی اور جیل میں صرف یہ پتا چلا کہ وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا ہے۔ ڈاکٹری معائنے سے معلوم ہُوا کہ وہ پاگل ہے، چناں چہ اسے جیل سے پاگل خانے منتقل کر دیا گیا جہاں وہ تقریباً 8 سال رہا۔ پھر موقع ملنے پر وہ وہاں سے بھاگ نکلا، یہی وجہ ہے کہ میں آپ کے پاس حاضر ہُوا ہوں۔''

''پاگل خانے سے بھاگ گیا...؟'' مسز اسمتھ نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ ''لیکن کہاں؟''

''یہ خبر ہمیں کل رات ملی ہے، حالاں کہ اسے فرار ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا۔ پاگل خانے کے منتظم کو اپنی تحقیق کے دوران جو حالات معلوم ہوئے ہیں ان کے پیشِ نظر یہ ضروری سمجھا گیا کہ آپ کو مطلع کر دیا جائے۔ بات دراصل یہ ہے مسز اسمتھ کہ ملر پاگل خانے میں اکثر کہا کرتا تھا کہ اس کی بیوی کی موت کی ذمہ دار آپ اور مسز اینڈرسن کے سر ہے، جب بھی اسے پاگل خانے سے آزادی ملے گی تو سب سے پہلے وہ... میرا مطلب یہ ہے کہ وہ انتقام کی آگ میں جل رہا ہے، ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا کرے گا لیکن مناسب سمجھا گیا کہ آنے والے خطرات سے آپ کو آگاہ کر دیا جائے، تاکہ آپ اپنی حفاظت کا کوئی انتظام کر سکیں۔ غالباً آپ میرا مطلب سمجھ گئی ہوں گی۔''

مسز ہیلن اسمتھ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی اور سارا جسم بری طرح کپکپا رہا تھا۔ ''آپ کا مطلب ہے ملر مجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہے اور وہ بھی اس حادثے کی بنا پر جو آٹھ سال قبل رونما ہُوا تھا۔''

''پاگل آدمی سے کسی قسم کی توقع نہیں کی جا سکتی...'' انسپکٹر نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ''جس پاگل خانے میں اس کا علاج ہوتا تھا وہ یہاں سے دو سو میل کے فاصلے پر ہے جو میرے خیال میں کافی طویل فاصلہ ہے لیکن اگر وہ... یعنی واقعی اس پر انتقام لینے کا جنون سوار ہے تو یہ فاصلہ اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا، بہ ہر حال خطرے کا امکان موجود ہے، آپ کو ہر ممکن احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہییں۔''

''میں اس فلیٹ میں بالکل تنہا رہتی ہوں، وہ مجھے رات کو سوتے میں بڑی آسانی سے قتل کر سکتا ہے۔''

''ہم فی الحال کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتے...'' انسپکٹر نے کہا۔ ''تاہم اتنا خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن ضرور ہے کہ خطرہ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کسی پڑوسی یا رشتے دار کو کچھ دن کے لیے اپنے ہاں بلا لیں۔ یا آپ خود ہی کسی رشتے دار کے پاس چلی جائیں، میرا خیال ہے یہ بہتر رہے گا۔''

''کیا پولیس میری حفاظت نہیں کر سکتی؟'' مسز اسمتھ نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''فی الحال یہ ممکن نہیں، یہ تو محض ایک قیاس ہے کہ ملر یہاں آئے گا اور ظاہر ہے اس قیاس پر پولیس کا پہرا ایک نامعلوم عرصے کے لیے نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر ملر اس علاقے میں نظر آ جائے تو دوسری بات تھی۔ اس وقت ہم آپ کی حفاظت کا مزید بندوبست کرتے۔ ویسے پولیس پوری سرگرمی سے اس کی تلاش میں مصروف ہے۔ بہتر ہے کہ آپ اپنے طور پر اپنی حفاظت کا بندوبست ضرور کریں۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا میں کیا کہہ رہا ہوں۔''

''ہاں میرا خیال ہے کچھ دن کے لیے میں اپنی بہن کے ہاں کیڈر فال چلی جاؤں۔ میں اس سے برسوں سے نہیں ملی، دراصل ہم دونوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔''

''ٹھیک ہے، اس موقع پر آپ اپنی بہن سے ضرور ملاپ کر لیجیے...'' کہہ کر انسپکٹر دروازے کی طرف چل پڑا اور دہلیز سے باہر قدم رکھنے سے پہلے بولا۔ ''مسز اسمتھ میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ آپ کو خواہ مخواہ خوف زدہ کروں، ویسے فی الحال کوئی حقیقی خطرہ موجود نہیں ہے۔ اگر کوئی نئی اطلاع ملی تو آپ کو فوراً مطلع کر دیا جائے گا۔ اگر آپ کو مدد کی ضرورت ہو تو فوراً آپ مقامی پولیس اسٹیشن کے دفتر میں مجھے فون کر لیجیے گا۔ پولیس اسٹیشن یہاں سے صرف دو فرلانگ کے فاصلے پر ہے، آپ کا فون ملنے کے دو منٹ بعد ہم آپ کے فلیٹ میں پہنچ جائیں گے، میں نے خصوصی احکام جاری کر دیے ہیں۔ مسلح پولیس کے سپاہی ہر وقت مستعد رہیں گے۔ آپ کو میرا نام تو یاد رہے گا۔''

''یقیناً انسپکٹر فورڈ۔''

''جی ہاں انسپکٹر فورڈ...'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''میرا خیال ہے، شربت وغیرہ کے تکلف کی ضرورت نہیں، مجھے اجازت دیجیے۔ مسز اسمتھ، خدا حافظ۔''

انسپکٹر کو گئے ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ فون کی گھنٹی چار مرتبہ بج کر خاموش ہو گئی۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا دوسری طرف مسز منرو تھیں۔

"ہیلن، کیا کار میں تم سے کوئی ملنے آیا تھا؟"

"نہیں تو۔"

"لیکن مجھے یقین ہے کہ..."

"آپ اپنے کام سے کام رکھیے۔" مسز ہیلن اسمتھ نے تیز لہجے میں کہا۔ "دوسروں کے معاملات میں تاک جھانک اور تجسس اچھی بات نہیں، سمجھیں؟"

مسز منرو نے فوراً ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ بعد میں ہیلن اسمتھ کو خیال آیا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ چند لمحوں بعد ٹیلی فون کی گھنٹی تین مرتبہ بج کر خاموش ہوگئی۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گئی لیکن اس نے مسز منرو اور مسز ولیم کی گفتگو سننے کا ارادہ ترک کر دیا اور جلدی سے دوسرے کمرے میں گئی اور پرانے کاغذات میں سے کیڈر فال میں اپنی بہن کا فون نمبر تلاش کرنا شروع کیا۔ کافی تلاش کے بعد اسے مطلوبہ نمبر مل گیا، وہ واپس بیٹھک میں پہنچی اور ریسیور اٹھایا۔ "لائن کلیئر تھی، مسز منرو اور مسز ولیم اپنی گفتگو ختم کر چکی تھیں، اس نے آپریٹر کے نمبر ڈائل کیے اور کیڈر فال میں اپنی بہن کے نمبر پر ٹرنک کال بک کرائی۔ دس منٹ بعد آپریٹر نے بتایا کہ مطلوبہ نمبر کا فون موسمِ گرما کے لیے کاٹ دیا گیا ہے، وہ سمجھ گئی کہ اس کی بہن مارگریٹ کسی پہاڑی مقام پر گرمیاں گزارنے گئی ہوگی اور کفایت کے خیال سے اس نے اپنا فون موسمِ گرما کے لیے کٹوا دیا ہوگا۔ وہ اپنی بہن کے متعلق سوچنے لگی اور تھوڑی دیر کے لیے اس کی توجہ ملر کی طرف سے ہٹ گئی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی تین مرتبہ بج کر خاموش ہوگئی، یقیناً یہ فون مسز ولیم کا تھا، اس نے خلافِ معمول فون پر ان کی گفتگو سننے کی کوشش نہیں کی۔ رات بس قریب تھی، چناں چہ اس نے سوچا کہ آج کی رات تو یہیں گزار دی جائے، کل کوئی متبادل انتظام کرنے کی کوشش کروں گی، رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے اور اس دوران میں تین مرتبہ فون کی گھنٹی بجی، اس نے کسی بھی فون کی گفتگو نہیں سنی، رات کا کھانا کھا کر وہ ایک رومانی ناول لے کر لیٹ گئی۔ ساڑھے نو بجے تھے کہ اچانک ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آئی، یہ مسز منرو کا کتا تھا، وہ بستر سے اٹھی اور صدر دروازے کو احتیاط سے بند کر کے واپس آ گئی۔

تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی تین مرتبہ بج کر خاموش ہوگئی۔ وہ سمجھ گئی کہ مسز منرو اور مسز ولیم پھر گفتگو کر رہی ہیں اور اچانک اسے دھیمی سی آواز آئی جیسے کوئی بڑی احتیاط سے فرش پر کودا ہو، آواز باورچی خانے سے آئی تھی۔ "ممکن ہے کوئی بلی ہو۔" اس نے سوچا اور پھر اسے اچانک ملر کا خیال آیا، اتنے بڑے فلیٹ میں وہ بالکل اکیلی تھی، وہ بری طرح خوف زدہ ہوگئی۔ چھٹی حس بار بار اسے آنے والے خطرے کا احساس دلا رہی تھی، وہ تیزی سے فون کے پاس پہنچی اور ریسیور اٹھا کر کان لگایا۔ مسز منرو اور ولیم گفتگو میں مصروف تھیں۔

"خدا کے لیے اپنا فون بند کر دیجیے۔" اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

"یہ کون ہے؟" مسز منرو کی آواز آئی۔

"میں ہیلن ہوں، خدا کے واسطے فون بند کر دو، مجھے پولیس کو فون کرنا ہے۔"

"پولیس کو، مگر کس لیے؟"

"میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ وضاحت کر سکوں۔ فون بند کر دو، جلدی کرو خدا کے لیے فون بند کر دو، مجھے پولیس انسپکٹر فورڈ کو فون کرنا ہے۔ دیر ہوگئی تو وہ مجھے قتل کر دے گا۔"

مسز منرو نے ایک قہقہہ لگایا۔ "کون، انسپکٹر؟ تم ہاں تو درزی کا فون آیا تھا۔"

"کیا تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے جان..." ولیم نے کہا۔ "آخر تمھیں کوئی بھلا کیوں مارنے لگا۔"

"میں کہتی ہوں فون بند کر دو، جلدی سے۔"

"دیکھا مار تھا تم نے..." مسز منرو نے مسز ولیم سے کہا۔ "کیسے لوگ ہیں جنھیں بات کرنے کا سلیقہ اور تمیز بھی نہیں۔"

"ہاں..." مسز ولیم نے کہا۔ "کسی کو کیا حق ہے کہ ہم پر چلائے، جب تک ہماری دوستی ہوگی ہم باتیں کریں گے۔"

"خدا کے لیے فون بند کر دو..." ہیلن اسمتھ نے روتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ "مجھے ایک ضروری ایک ضروری کرنا ہے ورنہ..." بقیہ آواز اس کے گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے یک دم فرش پر گر پڑا۔ ایسا محسوس جیسے کھانے کے کمرے میں کوئی دبے پاؤں چل رہا ہو۔ بھاگ کر کھانے کے کمرے میں پہنچی مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ باورچی خانے میں گئی، دروازے کی چٹخنی لگائی اور دروازے کے ساتھ ایک کرسی احتیاطاً لگا دی۔ پھر وہ دوڑتی ہوئی بیٹھک میں پہنچ گئی اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ مسز منرو اور مسز ولیم ابھی تک فون پر مصروفِ گفتگو تھیں۔

"بدبخت چڑیلو اب تو فون بند..." ابھی اس کا جملہ بھی نہیں ہوا تھا کہ پیچھے سے گھنے بالوں والے ایک مضبوط نے اس کا گلا دبوچ لیا اور اگلے ہی لمحے وہ فرش پر ڈھیر ہوگئی

تربیت نامہ

ماموریٰ الحق

تربیت کے لیے اُصولوں پر سختی سے کاربند رہنا بھی ضروری ہوتا ہے اولاد سے محروم ایک بستی کے سینے میں جنم لینے والے جذبے کی لفظی تصویر

وہ اپنی شان دار کار میں تنی ہوئی بیٹھی تھیں۔ ان کے ہوں میں کنسرٹ پروگرام کا کارڈ تھا اور نگاہیں ولسن کے سر کی پر جمی ہوئی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے، ہال میں اپنے باکس بیٹھے ہوئے وہ وقتی طور پر بھول گئی تھیں کہ یہ 1979ء ہے ان کی عمر 74 سال ہے۔ وہ یہ بھی بھول گئی تھیں کہ وہ دنیا میں ں قدر تنہا ہیں۔ لیکن اب گھر جاتے ہوئے وہ خود کو بڑی ت سے تنہا محسوس کر رہی تھیں۔

ایکس ویں اسٹریٹ کے موڑ پر ولسن نے کار کی رفتار کم کر ے کار ابھی گھوم ہی رہی تھی کہ مسز رڈولف کو کسی کار کی تیز لائٹس نے سراسیمہ کر دیا۔ کار کے ٹائر بری طرح چیخے، ت کے ٹکرانے کی زبردست آواز سنائی دی اور اتنا شدید لگا کہ وہ سیٹ سے گر گئیں۔

ولسن نے کار کو کسی طرح فٹ پاتھ کے قریب پہنچا دیا تھا۔ مسز رڈولف نے خود کو سنبھالا اور بولیں۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ولسن۔ میں جانتی ہوں کہ تمھاری اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ ذرا دیکھو... دوسری کار میں کوئی زخمی تو نہیں ہُوا ہے؟"

ولسن کار سے اترا۔ اگلے ہی لمحے مسز رڈولف نے اس کے چیخنے کی آواز سنی۔ جواب میں کوئی نوجوان چیخا۔ "اے... ذرا دیکھو تو... تم نے میری کار کا کیا حشر کر دیا ہے!"

مسز رڈولف بے ساختہ مسکرا دیں۔ 'چلو، کوئی زخمی تو نہیں ہُوا۔' وہ قدرے مطمئن ہوگئیں۔

خدا جانے کہاں سے بہت سارے لوگ نکل آئے اور کاروں کے گرد مجمع لگ گیا۔ ان کے تبصرے سُن کر پتا چلا کہ گاڑی خاصی پچک گئی ہے۔ پھر مسز رڈولف نے خود بھی دیکھا کہ بائیں جانب دروازے کے قریب گاڑی پچکی ہوئی

ہے۔ انھوں نے دوسری گاڑی پر نظر ڈالی۔ وہ چھوٹی سی کوپے تھی۔ اس کی اگلی جالی اور ریڈی ایٹر کو نقصان پہنچا تھا۔ گاڑی سے پانی ٹپک رہا تھا۔ مسز رڈولف نے افسردگی سے سر ہلایا۔ ایسا قانون بننا چاہیے کہ دوسرے شہروں کی گاڑیاں پابند کردی جائیں۔

پھر مسز رڈولف نے آرام دہ پشت گاہ سے سر ٹکایا اور آنکھیں موند لیں۔ ڈاکٹر نے انھیں تنبیہہ کی تھی کہ ہیجان ان کے لیے مضر ہے اور بلڈ پریشر میں خطرناک حد تک اضافہ بھی کر سکتا ہے... ویسے بھی ولسن ان کے مفادات کا خیال رکھنے کے لیے بہت کافی تھا۔ اس وقت بھی کار کے مجروح حصے کے قریب سے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دوٹوک انداز میں کہہ رہا تھا کہ اس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔

''تمھاری رفتار بہت زیادہ تھی...'' نوجوان نے الزام لگایا۔ ''تم یوں لہراتے ہوئے آرہے تھے، جیسے کوئی چمگادڑ روشنی سے خائف ہو کر اندھا دھند اُڑتی ہے۔''

مسز رڈولف کا منہ بن گیا۔ کیوں کہ وہ الزام بے بنیاد تھا۔

''سنو احمق ملاح...'' ولسن غرایا۔

'ملاح' مسز رڈولف کی آنکھیں بلا ارادہ کھل گئیں۔ نیوی سے انھیں خصوصی دل چسپی تھی، جب وہ نوجوان تھیں تو آناپولس کی بیش تر رقص پارٹیوں میں شرکت کیا کرتی تھیں۔ مسز رڈولف کا ایک قریبی دوست بہت عرصے تک نیوی میں سیکریٹری رہا تھا۔ اور مسز اسٹیوارٹ کا بیٹا بیڈل، یہیں واشنگٹن میں ایڈمرل کے عہدے پر فائز تھا۔

کھڑکی کی طرف کھسکنے کے بعد انھوں نے باہر جھانکا۔ ہاں... وہ یقیناً ملاح تھا۔ وہ ایک دل کش نوجوان تھا لیکن جس رویے کا مظاہرہ کر رہا تھا، وہ اسے زیب نہیں دیتا تھا۔

''اے نوجوان! یہاں آؤ۔'' مسز رڈولف نے اسے پکارا۔

وہ برا سا منہ بناتا ہُوا وہاں تک چلا آیا لیکن مسز رڈولف کو دیکھ کر اس نے احتراماً اپنی ٹوپی کو چھوا اور بولا۔ ''جی مادام؟''

مسز رڈولف نے بے حد طمانیت سے اسے دیکھا۔ کم از کم وہ خوش اطوار تو تھا۔ ''نوجوان...'' انھوں نے کہا۔ ''تم اتنے بڑے ہو کہ تمھیں جھوٹ جیسی اخلاقی برائی سے بچنا چاہیے۔ جھوٹ نہ صرف اخلاقی برائی ہے بلکہ بے حد مکروہ چیز ہے۔ جھوٹ سے مشکلیں آسان نہیں ہوتیں بلکہ آدمی نت نئی مشکلات میں پھنس جاتا ہے۔ یوں بھی تمھیں اس وردی کا احترام کرنا چاہیے، جو تم نے پہن رکھی ہے۔ میرا شوفر گاڑی بہت آہستہ چلا رہا تھا۔''

نوجوان نظریں چرانے لگا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

'واہ... کس قدر کھڑی اور خوب صورت ناک ہے۔' مسز رڈولف نے سوچا۔ 'ٹھوڑی بھی مضبوط ہے۔'

''مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے دانستہ جھوٹ بولا ہوگا۔'' انھوں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے، اس وقت تم اپنے آپ میں نہیں تھے۔''

نوجوان نے نظریں اٹھا کر انھیں دیکھا۔ ''دراصل اس کار کی ادائیگی کی قسطیں ابھی حال ہی میں مکمل ہوئی ہیں۔ آپ کی آمدنی صرف پچانوے ڈالر ہو تو اس صورت میں آپ کبھی کار کی قسطیں ادا کر کے دیکھیں، کبھی کوشش کریں دیکھیں، کیا گزرتی ہے۔''

اسی وقت سائرن کی آواز سنائی دی۔ نوجوان کی آنکھیں پھیل گئیں اور ان میں التجا مچلنے لگی۔ ''دیکھیں خاتون! آپ کے لیے اس نقصان کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن میرا معاملہ مختلف ہے۔ میں نے تو گاڑی کا بیمہ بھی نہیں کرایا ہے۔''

''تمھیں بیمہ کرانا چاہیے تھا۔'' مسز رڈولف نے کہا۔

اسی وقت اسکواڈ کار آپہنچی۔ ایک آفیسر کار سے اُترا اور اس نے مجمع کو پیچھے ہٹایا۔ پھر اس نے ولسن اور نوجوان سے لائسنس طلب کیے۔

''انتونی اسمتھ... اہی نوائے... ہونہہ۔'' آفیسر نے نوجوان سے کہا۔ ''تمھاری کار پر ڈی سی کی پلیٹ موجود ہے۔''

''جی ہاں جناب۔ یہ میرا اسٹیٹ ہے۔ میں شکاگو میں بھرتی ہُوا تھا اور آج کل یہاں این پی سی... میرا مطلب ہے نیول فوٹو گرافک سینٹر میں تعینات ہوں۔''

لڑکے کے لہجے میں خوف تھا۔ 'بے چارہ لڑکا!' مسز رڈولف نے سوچا۔ 'ابھی تو قسطوں سے جان چھوٹی تھی غریب کی... اور پھر کار بیمہ شدہ بھی نہیں ہے۔' وہ پولیس آفیسر سے کہنا چاہتی تھیں کہ کاروں کے نقصان کی تمام ذمے داری وہ قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن انھوں نے بروقت خود کو روک لیا۔

انھوں نے سوچا کہ ایک ایسے لڑکے کو جو مردانگی کے دور میں قدم رکھنے والا ہو، اس طرح خراب کرنا اچھی بات نہیں ہے۔

آفیسر نے ولسن کا لائسنس دیکھا اور پھر ٹہلتا ہُوا کار کی

طرف آگیا۔ اس نے دونوں کاروں کے نقصان کا جائزہ لیا اور پھر اس کھڑکی کی طرف چلا آیا جس سے مسز رڈولف جھانک رہی تھیں۔

''خاتون... میرے خیال میں معاملہ صاف ہے۔ گاڑیوں کی پوزیشن سے پتا چلتا ہے کہ غلطی آپ کے ڈرائیور کی نہیں تھی۔ ٹائروں کی رگڑ کے نشانات یہ ثابت کرتے ہیں کہ آپ کی گاڑی کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔''

پھر وہ پلٹا اور اس نے پکارا۔ ''اے مسٹر!'' پھر اس نے وہی سب کچھ نوجوان کو بتایا۔ نوجوان التجائیں کرنے لگا تو اس نے کندھے جھٹک دیے۔ ''بیٹے... اگر تم چاہو تو معاملہ کورٹ تک لے جا سکتے ہو۔ لیکن میری رپورٹ بہرحال تمھارے خلاف جائے گی۔ بہتر ہے ادائیگی کے معاملات آپس میں طے کرلو۔''

لڑکے کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ وہ مسز رڈولف کی طرف پلٹا۔ ''دیکھیے...'' اس نے یاس انگیز لہجے میں کہا۔ ''آپ بہت دولت مند ہیں اور میں بالکل ہی دست ہوں، یقین کیجیے، میرے پاس...''

''مت کروایسی باتیں...'' مسز رڈولف نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''تمھارے چہرے سے عظمت اور وقار ظاہر ہے۔ تم تن درست و توانا نوجوان ہو۔ بھکاری بننا کم از کم تمھارے لیے کوئی اچھی بات نہیں۔ اگر میں تمھارے اس رجحان کی حوصلہ افزائی کروں تو یہ تمھارے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اگر تمھاری عمر اتنی ہے کہ قانون تمھیں کار چلانے کی اجازت دیتا ہے تو تمھیں ذمے داریاں بھی قبول کرنی چاہییں۔''

''اس کی عمر زیادہ نہیں ہے...'' پولیس آفیسر نے مداخلت کی۔ ''آپ چاہیں تو معاملات اس کے والدین سے طے کر سکتی ہیں۔''

''میرے والدین کو بیچ میں لانے کی کوئی ضرورت نہیں...'' لڑکا برہم ہوگیا۔ ''میں بچہ نہیں ہوں۔ اپنے معاملات خود نمٹا سکتا ہوں۔ ادائیگی بھی میں خود کروں گا۔''

مسز رڈولف کو اس لمحے، لڑکے پر بہت پیار آیا۔ اسے اپنے والدین کا خیال تھا۔ انھوں نے اپنا نام، پتا اور ٹیلی فون نمبر لڑکے کو دیا اور بولیں۔ ''میری بیمہ پالیسی شاید صرف ان حادثات کے لیے ہے، جن کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی ہو۔ تاہم میں تمھاری خاطر بیمہ کمپنی سے رجوع کروں گی۔''

لڑکے کے چہرے پر امید کی روشنی بکھر گئی۔

گھر پہنچنے تک مسز رڈولف تمام راستے اسی کے متعلق سوچتی رہیں۔ گھر پہنچ کر وہ کار سے اتریں تو انھوں نے پُرخیال نگاہوں سے ولسن کی طرف دیکھا۔ مسٹر رڈولف کی موت کے بعد، ولسن ان کی گھر پر موجودگی کے دوران، بٹلر کے فرائض انجام دیتا تھا اور جب انھیں باہر جانا ہوتا تھا تو وہ شوفر بن جاتا تھا۔ وہ بے حد مخلص اور ذمے دار آدمی تھا۔ مسز رڈولف نے نگاہوں سے اس کے چہرے کو ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔ ''تمھارا کیا خیال ہے، لڑکے کو ادائیگی پر مجبور کرنا زیادتی ہوگی؟''

''زیادتی...؟'' ولسن نے قہقہہ لگایا۔ ''میرا بس چلے تو اسے کچل دوں۔ وہ فضول، بے کار، نکما اور بے حس...''

''یہ درست نہیں ہے۔'' مسز رڈولف نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ انھوں نے لڑکے میں بہت سی اعلا صفات دیکھی تھیں۔ یہ سننا انھیں اچھا نہیں لگا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر شال تبدیل کرنے کے بعد انھوں نے اپنے آں جہانی شوہر کے پورٹریٹ پر نظریں جما دیں۔ وہ تصویر انھیں بہت کچھ کہتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ تصویر مسٹر رڈولف کے کردار کی عکاس بھی تھی۔ وہ تصویر جب پینٹ کی گئی تو مسٹر رڈولف کی عمر چالیس سال تھی۔ ان کے خدوخال، ان کے کردار کے متعلق بتاتے تھے۔ وہ بے حد جرأت مند تھے۔ ان کے نقوش سے کردار کی مضبوطی اور اصولوں پر مفاہمت نہ کرنے کی عادت جھلکتی تھی۔

مسز رڈولف کو ایسا لگا جیسے وہ بھی لڑکے سے ادائیگی کرانے کے حق میں ہوں۔

''شکریہ ڈیئر۔'' مسز رڈولف نے کہا اور میز کا خفیہ خانہ کھول لیا۔ وہاں مسٹر رڈولف کے لکھے ہوئے یادگار خطوط، بہت سارے یادگار دعوت نامے اور ایسی ہی چیزیں رکھی تھیں۔ انھوں نے خطوط کے باکس کے پیچھے رکھا ہُوا اپنا جرنل نکال لیا۔

وہ میز پر جرنل رکھ کر بیٹھ گئیں۔ جرنل میں لکھتے ہوئے ان کے تصور میں لڑکے کا چہرہ لہرا رہا تھا۔ 'یہ بات نہیں کہ میں لڑکے سے رقم وصول کرنا چاہتی ہوں۔' انھوں نے لکھا۔ 'لیکن اس میں احساس ذمے داری کی نمو ہونا چاہیے۔ شاید...' قلم رک گیا۔ وہ مسکرا دیں۔ 'ہاں... ٹھیک ہے۔ ممکن ہے، میں وہ رقم اسے اس انداز میں لوٹا سکوں کہ اس کے لیے زیادہ منفعت بخش ثابت ہو۔'

انھوں نے جرنل بند کر دیا اور سوچ میں گم ہوگئیں۔

اس صبح وہ معمول سے ایک گھنٹا پہلے بیدار ہوگئیں۔ انھیں احساس ہو رہا تھا کہ انھیں کوئی بہت اہم کام کرنا ہے۔ بیمہ کمپنی فون کرنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ کار کو مرمت کے لیے گیراج بھی بھیجنا تھا۔ انتھونی اسمتھ یقیناً فون کرے گا... جاننا چاہے گا کہ اسے کتنی ادائیگی کرنا ہے۔

بیمہ کمپنی والوں نے وعدہ کیا کہ وہ تفتیش کریں گے لیکن انھوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر حادثے کا ذمے دار، لڑکا ثابت ہُوا تو وہ ادائیگی ہرگز نہیں کریں گے۔ ولسن گیراج سے لوٹا تو پونے چار سو ڈالر کا تخمینہ ساتھ لایا تھا۔

مسز رڈولف نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''کسی اور گیراج سے بات کرو۔''

اس دن ان سے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا گیا۔ نوالے حلق میں اٹک رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ اصولوں پر ان کا اصرار مبنی بر زیادتی تو نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ لڑکے کو کھانے کے بھی لالے پڑ رہے ہوں۔ ویسے بھی وہ کتنا ڈُبلا تھا۔ وہ ٹھیک طرح کھانا کھائے بغیر اٹھ گئیں۔ پھر انھوں نے نیوی ڈیپارٹمنٹ میں فون کیا۔ ''میں مسز رڈولف ہوں...'' انھوں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ''میں ایڈمرل بیڈل سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

بیڈل کا نفرنس سے اٹھ کر ان سے بات کرنے کے لیے آیا۔ اس کی پُراعتماد آواز سُن کر مسز رڈولف کو اطمینان ہو گیا کہ لڑکا ہر تکلیف سے محفوظ رہے گا۔ بیڈل نے یقین دلایا کہ اس کا محکمہ نہ صرف اپنے آدمیوں کے کردار کی تعمیر کا خیال رکھتا ہے بلکہ ان کی مثبت حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ان کے مسائل پر توجہ بھی دیتا ہے۔

مسز رڈولف پھر کھانے کی میز پر لوٹ آئیں۔ اگرچہ وہ کھانے کے دوران ٹیلی فون کی مداخلت ناپسند کرتی تھیں لیکن اس روز انھوں نے خصوصی ہدایات جاری رکھیں۔ ''اگر مڈشپ مین انتھونی کا فون آئے تو خیال رکھنا۔ میں اس سے بات ضرور کروں گی۔''

مڈشپ مین کہنے کے بعد وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ کیا یہ عہدہ درست تھا۔ ہاں... نیوی میں آفیسر بننے سے قبل مڈشپ مین ہی کہلاتے ہیں۔ ایڈمرل بیڈل خود پہلے مڈشپ مین رہا تھا۔

شام کو ولسن آیا تو تین سو ڈالر کا تخمینہ لایا۔ اس نے انھیں یقین دلایا کہ اس سے کم رقم میں کار کی مرمت نہیں ہو سکتی۔

''ٹھیک ہے۔'' مسز رڈولف نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''یاد رکھنا... میں مڈشپ مین انتھونی پر ایک سینٹ کا بھی فاضل بوجھ ڈالنا گوارا نہیں کروں گی۔''

ولسن نے عجیب سی نظروں سے انھیں دیکھا۔ ''وہ تو خیر ملاح ہے مادام۔''

''ہوگا۔'' مسز رڈولف نے کہا۔ وہ الجھن میں پڑ گئیں۔

انتھونی نے شام کو کافی تاخیر سے فون کیا۔ اس نے لہجے میں سب سے پہلے بیمہ کمپنی کے بارے میں پوچھا۔ رڈولف کو اسے یہ بتاتے ہوئے دکھ ہُوا کہ کمپنی ادائیگی نہیں کرے گی۔ پھر انتھونی نے بتایا کہ اس کی کار کی مرمت پر دو ڈالر خرچ ہوں گے۔

''میری کار پر تین سو ڈالر کا خرچ آئے گا۔'' مسز رڈولف نے افسردہ لہجے میں کہا۔

انتھونی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''کس شکل میں وصول کرنا پسند کریں گی آپ؟ میرے خون سے کام چل جائے گا؟''

مسز رڈولف نے پلکیں جھپکائیں۔ لڑکا اب جرأت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یہ چیز مناسب تربیت ملنے پر ایک مرد کی بہترین اثاثہ ثابت ہوتی ہے۔ ''ایسا کرتے ہیں کہ معاملے طے کرنے کے لیے مل بیٹھتے ہیں۔'' انھوں نے کہا اور کہتے انھیں احساس ہُوا کہ ان کے وجود میں گرم جوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی ہے۔ ''کل شام چائے پر آجاؤ نا۔''

اس صبح انھوں نے باورچی کو ہدایت کی کہ وہ چاکلیٹ کیک بنائے۔ ''بہت اچھے سے کیک بنانا۔'' انھوں نے فرمائش کی۔

انتھونی نے چائے کی آراستہ میز دیکھی تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ لیکن پھر وہ مشکوک نظر آنے لگا۔ ''فرمائیے خاتون! میں حسبِ ہدایت حاضر ہو گیا ہوں۔'' اس نے کہا۔

مسز رڈولف نے اس کے قد و قامت کو پُرستائش نگاہوں سے دیکھا۔ ''بیٹھ جاؤ مڈشپ مین انتھونی۔'' انھوں نے نرم لہجے میں کہا۔

وہ بیٹھ گیا لیکن مستفسرانہ نگاہوں سے انھیں دیکھتا رہا۔ مسز رڈولف نے اس کی پیالی میں چائے انڈیلی۔ ''کیک لو۔'' انھوں نے کہا۔

''شکریہ...!'' اس نے ایک کیک اٹھا لیا۔ ''ویسے مسز رڈولف، میں مڈشپ مین نہیں ہوں۔ آپ جانتی ہیں، نیوی میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔'' وہ جھینپی جھینپی سی ہنسی ہنسنے لگا۔ ''آفیسر اور زیرِ تربیت افراد۔ زیرِ تربیت افراد شپ مین کہلاتے

ہیں اور مستقبل میں آفیسر بنتے ہیں۔''

''مجھے یہ بات معلوم ہے مڈشپ مین انتھونی۔''

''دیکھیں...'' وہ ہاتھ پھیلاتے ہوئے ان کی طرف جھکا۔ انداز میں بے بسی تھی۔ ''میں ایک عام سیلر ہوں۔ یہ میری وردی دیکھیں آپ۔ مجھ جیسے لوگ کبھی ایڈمرل نہیں بن سکتے۔''

''ایسی باتیں مت کرو...'' مسز رڈولف نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''درست طرزِ فکر اور اعتماد سے منزل کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا مڈشپ مین انتھونی۔''

''جی مادام۔'' انتھونی نے نہایت سعادت مندی سے کہا۔

اس کی مسکراہٹ میں مسز رڈولف کو گرم جوشی محسوس ہوئی۔ ''شاید... شاید یہ پیش رفت کا آغاز ہو۔'' وہ جواباً مسکرائیں۔ ''لڑکا بہت اچھا ہے۔ بس ذرا رہنمائی کی ضرورت ہے۔'' انھوں نے سوچا۔

پھر انتھونی نے خود ادائیگی کا تذکرہ چھیڑا تو مسز رڈولف فتح مندی کے احساس سے سرشار ہو گئیں۔ انھوں نے جس باوقار انداز میں وضاحت کی کہ وہ ہر پندرہ دن بعد، تنخواہ والے روز، ڈالر بہ آسانی ادا کر سکتا ہے، وہ دل موہ لینے والا تھا۔ مسز رڈولف مسحور ہو کر رہ گئیں۔ پھر اس نے جیب سے نوٹ نکالے۔ مسز رڈولف نے دیکھا کہ اس کے پاس پانچ ڈالر سے بڑا نوٹ نہیں تھا۔ پانچ ڈالر کا نوٹ اور اس کے ساتھ ایک ڈالر والے پانچ نوٹ اس نے ٹی پاٹ کے نیچے دبا دیے۔

مسز رڈولف مسکرانے لگیں... وہ اس پر فخر محسوس کر رہی تھیں۔ ''جینا میرا انتظار کر رہی ہوگی۔''

''جینا؟''

''ہاں... میری گرل فرینڈ ہے۔''

''اوہ۔'' مسز رڈولف کے اعصاب تن سے گئے۔ وہ کچھ مایوس ہوئی تھیں۔ اتنی کم عمری میں لڑکی کا چکر! جب کہ اسے اپنے مستقبل کے متعلق سوچنا چاہیے۔ لیکن پھر انھیں اس پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ اسے جلدی جانا چاہیے۔ ویسے ہی خاصا ہینڈسم دار اور لاابالی لڑکا ہے۔ کاش... وہ اس کے لیے کوئی اچھی لڑکی تلاش کر سکتیں جو اس کے لائق ہوتی۔

پھر انتھونی مسکرایا۔ مسز رڈولف نے اتنی خوب صورت مسکراہٹ پہلے نہیں دیکھی تھی۔ ''مسز رڈولف! آپ کی مہربانی۔ میں نے آپ کی کار کا حلیہ بگاڑ دیا اور آپ نے مجھے ایک کھلائے اور اتنا اچھا سلوک کیا میرے ساتھ... جیسے میں آپ کا کوئی عزیز ہوں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ آپ پست ذہنیت کی مالک اور ایذا رساں ہیں، لیکن...'' اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں آئندہ تنخواہ والے روز پھر دس ڈالر ادا کر دوں گا۔'' اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

خاصا ہچکچانے کے بعد مسز رڈولف نے اس کا ہاتھ چھوڑا۔ ''میں چائے پر تمھارا انتظار کروں گی۔''

وہ کچھ گڑبڑا سا گیا۔ کچھ ہچکچاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''اچھا...'' پھر وہ کھل کر مسکرا دیا۔ اس نے فوجی انداز میں سیلیوٹ کیا اور بولا۔ ''خدا حافظ۔''

وہ چائے کی آخری خصوصی دعوت تھی جو مسز رڈولف نے اسے دی۔ اس کے بعد تو وہ جب بھی آیا، اس یقین کے ساتھ آیا کہ اس کی پذیرائی ہوگی۔ ایسے جیسے بچے اسکول سے گھر آتے ہیں۔ جلد ہی وہ دونوں بے تکلف ہو گئے۔

مسز رڈولف نے اس سے موسیقی، آرٹ اور ادب پر گفتگو کرنے کی کوشش کی جو ہمیشہ مایوس کن ثابت ہوئی۔ بہرحال، انھیں یہ پتا چل گیا کہ اس کا باپ اِلی نوائے میں بڑھئی کا کام کرتا ہے۔ اس کی ماں، اس کے چار چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ مصروف رہتی ہے۔ اس کی باتیں سُن کر مسز رڈولف نے اندازہ لگایا کہ وہ سیدھے سادے ایمان دار لوگ ہیں۔

پھر اس نے انھیں نیول فوٹو گرافک سینٹر میں اپنے کام کے متعلق بتایا۔ وہ زیرِ تربیت کارکنوں کے لیے تکنیکی قسم کی فلمیں بناتا تھا۔ ''ویسے بھی میں چیزیں بنانے کے معاملے میں بہت اچھا ہوں...'' اس نے کہا۔ ''اگر میں محنت کروں تو خاصی کم عمری میں چیف پیٹی آفیسر بن سکتا ہوں۔'' اس نے شکاگو میں تربیت کے دوران پیش آنے والے دل چسپ واقعات سنائے۔ پھر اس نے جینا کے متعلق بتایا جو ویٹریس تھی۔ ''آپ اسے یقیناً پسند کریں گی، پیاری ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ خوب سیرت بھی ہے۔''

انتھونی پر مسز رڈولف کا یقین، روز بہ روز معتبر ہوتا گیا۔ بس ایک چیز انھیں کھٹکتی تھی... جینا کا وجود۔ انھوں نے اپنے جرنل میں لکھا۔ ''اگر میرا بیٹا یا پوتا ہوتا تو وہ بھی اس سے اچھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے بگاڑنے... اس کے ساتھ لاڈ کرنے کی ترغیب، میرے لیے اب بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔''

جب انھیں پتا چلا کہ اس نے ان کے وعدے کی پاس داری کی خاطر اپنی کار ہی فروخت کر دی ہے تو ان کا دل بھر آیا۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھیں کہ میں تمھیں بہت شان دار گاڑی دینا چاہتی ہوں... اس گاڑی سے بڑی... بالکل نئی۔ لیکن انھوں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پا لیا۔

"آدمی کے راستے میں مشکلات آتی ہیں..." انھوں نے تبصرہ کیا۔ "لیکن عزتِ نفس ہر چیز سے اہم ہے۔"

پھر جب موسمِ بہار آیا تو چائے پارٹی عقبی باغ میں ہونے لگی۔ 'یہ سب کچھ بہت خوش گوار ہے۔' مسز رڈولف نے اپنے جرنل میں لکھا۔ 'پھر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں مجرمانہ غفلت کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ میں اس پیارے لڑکے کے سلسلے میں وہ فرائض ادا نہیں کر رہی ہوں، جو مجھ پر عائد ہوتے ہیں۔ مجھے چاہیے کہ میں اسے اہم کتابیں عاریتاً دوں، اسے اپنے ساتھ کنسرٹ میں یا کبھی کسی آرٹ گیلری میں لے جاؤں۔'

اگلی مرتبہ جس دن انتھونی کو آنا تھا، چائے کی میز پر کلاسیکی ادبی کتابوں کا ایک ڈھیر رکھا تھا، لیکن وہ نہیں آیا۔ اس نے ٹیلی فون کیا کہ وہ مصروف ہے۔ اگلی صبح ڈاک میں دس ڈالر کا منی آرڈر موصول ہوا۔ مسز رڈولف کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ ادائیگی کے معاملے میں انتھونی سخت اصول پرست ثابت ہو رہا تھا۔ اس کا کردار روز بہ روز نکھر رہا تھا۔ مسز رڈولف کو یقین تھا کہ وہ اگلی مرتبہ خود ہی آئے گا۔

وہ نہیں آیا اور اس بار اس نے فون بھی نہیں کیا۔ مسز رڈولف نے اندازہ لگایا کہ جینا ہی اس کے راستے کی رکاوٹ بن رہی ہو گی۔ چاکلیٹ کیک انھیں خود پر ہنستے محسوس ہو رہے تھے۔ انھوں نے باورچن کو حکم دیا کہ کیک واپس لے جائے اور فیصلہ کیا کہ آئندہ وہ کبھی کیک نہیں بنوائیں گی۔ انھوں نے خود کو یاد دلایا کہ وہ ایک بے وقوف بوڑھی خاتون ہیں جس کی کسی کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ اس وقت ان کا جی چاہا کہ کاش وہ مر جائیں۔

اگلی صبح ان کے نام آنے والے ایک لفافے میں سے پانچ ڈالر والے دو بوسیدہ نوٹ نکلے۔ ان کے ساتھ ایک رُقعہ بھی تھا۔

'مسز رڈولف! میں نے سوچا تھا کہ آپ سے ملنے کے لیے وقت نکال سکوں گا لیکن ان دنوں میں اوورٹائم کر رہا ہوں۔ مجھے آپ کی مہمان نوازی یاد ہے اور میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ ممکن ہُوا تو اگلی قسط ادا کرنے کے لیے میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔'

'کتنے خوب صورت انداز میں باتیں کرتا ہے وہ۔' مسز رڈولف نے سوچا۔ اور دو ہفتے بعد انھوں نے باورچن کو پھر کیک بنانے کا حکم دیا۔

اس مرتبہ وہ آیا تو اسے دیکھ کر مسز رڈولف کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے بانہوں میں سمیٹ کر کلیجے میں بھر لیں۔ تاہم ایک کیک کھانے کے بعد اس نے اپنی ٹوپی اٹھالی۔ "جینا باہر میری منتظر ہے۔" اس نے کہا۔

مسز رڈولف نے ایک طویل سانس لیا۔ "اسے بھی لا لو۔" ان کے لہجے میں لاچاری تھی۔ "جاؤ نا... جلدی سے اسے بھی لے آؤ تاکہ تم یہاں کچھ دیر ٹھیر سکو۔" اس کے جانے کے بعد انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں... خود کو یاد دلا رہی تھیں کہ جینا کی حیثیت مہمان کی سی ہو گی، ایک معزز مہمان!

"یہ جینا ہے، مسز رڈولف۔" انتھونی کی آواز نے انھیں چونکا دیا۔ انھوں نے آنکھیں کھولیں اور اسے سر سے اوپر تک بہ غور دیکھا۔ وہ سستا لیکن صاف ستھرا سوٹ پہنے ہوئے تھی لیکن اس پر وہ پکا پن نہیں تھا جس کی مسز رڈولف کو توقع تھی۔

"مجھے افسوس ہے۔ بس میں یونہی چلی آئی تھی..." جینا نے معذرت کی۔ "مجھے علم نہیں تھا کہ ہمیں کسی خاص جگہ بھی جانا ہو گا۔ دراصل میں اور انتھونی پارک جانے کے ارادے سے نکلے تھے۔ آج کل انتھونی بچت پر زور دے رہا ہے۔ اس لیے ہم کھانا بھی سستا ہی کھاتے ہیں۔ انتھونی کی کوشش ہے کہ آپ کا قرض بہ خیر و خوبی اتر جائے۔" اس نے [illegible] ہوئے انداز میں کہا اور بیٹھ گئی۔

مسز رڈولف نے کتابوں کی طرف ہاتھ بڑھایا جو وہ جانے کب سے انتھونی کو دینا چاہ رہی تھیں۔ "یہ لو لڑکے" انھوں نے انتھونی سے کہا۔ "میں یہ کتابیں تمھیں عاریتاً دینا چاہتی ہوں۔ جب آدمی بڑا ہو جائے اور بڑے حلقوں میں جانے لگے تو ادب اور فنون سے لاعلمی اسے بری طرح احساسِ کم تری میں مبتلا کر دیتی ہے۔"

"ہاں انتھونی... یہ بات تو ٹھیک ہے۔" جینا نے کہا۔

مسز رڈولف نے حیرت سے اسے دیکھا پھر مسکرا دیں۔ لڑکی سمجھ دار معلوم ہو رہی تھی۔ انھوں نے سوچا کہ ذرا سی توجہ دی جائے تو جینا بھی راستے کی رکاوٹ کے بجائے ایک اچھا [illegible] ثابت ہو سکتی ہے۔

"کیوں نہ بدھ کو رات کا کھانا تم دونوں میرے ساتھ کھاؤ۔ پھر اس کے بعد واٹر گیٹ کنسرٹ میں چلیں گے۔" انھوں نے کہا۔

"آپ کی مہربانی... لیکن..." انتھونی نے کہنا چاہا۔

"مجھے... مجھے بے حد خوشی ہو گی، آپ کی دعوت قبول کر کے۔" جینا نے جواب دیا۔

انتھونی نے ایک طویل سانس لے کر پوچھا۔ "کتنے بجے؟"

اس رات مسز رڈولف نے اپنے جرنل میں کنسرٹ کے متعلق لکھا۔ 'یہ کنسرٹ انتھونی کو دنیائے موسیقی سے متعارف کرائے گا۔' اس کے علاوہ ان کی نشستیں بہت سارے اہم لوگوں کے قریب ہی تھیں۔ ان لوگوں سے تعارف اور گفتگو انتھونی میں ایک نئی روح اور ولولہ پھونک سکتی ہے۔ انھوں نے ڈنر کے بارے میں دل ہی دل میں طے کر لیا کہ گائے کے گوشت کی ڈشز بہتر رہیں گی۔ ان کا تاثر یہ تھا کہ نوجوان گائے کا گوشت پسند کرتے ہیں۔

ان کا اندازہ درست تھا۔ انتھونی گوشت پسند کرتا تھا لیکن اس کے کاٹنے کا انداز مسز رڈولف کے لیے بے حد مایوس کن تھا۔ اس نے کانٹا مضبوطی سے ایک مٹھی میں بھینچا ہُوا تھا اور چاقو دوسری میں۔ جینا کی گرفت قدرے بہتر لیکن مایوس کن تھی... انھیں اس طرح کھاتے دیکھ کر مسز رڈولف کا چہرہ خفت کے مارے سرخ ہو گیا۔ جب کہ ان بے خبروں کو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔

'دولت حاصل کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ شہرت کے ذریعے ثانوی دوام حاصل کرنا بھی کچھ مشکل نہیں۔' مسز رڈولف نے سوچا۔ 'لیکن اس انداز کے ساتھ تو آدمی ہمیشہ وحشی ہی کہلائے گا۔'

وہ انتھونی کو کھاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ 'کانٹے کا خم ہمیشہ عمودی ہونا چاہیے۔' انھوں نے سوچا کہ اسے بتائیں گی۔ انھوں نے اپنا کانٹا اٹھایا... کانٹے نیچے... خم عمودی... پھر انھوں نے اسے گوشت میں گاڑ دیا۔ ہینڈل، ان کی ہتھیلی میں چھپا ہُوا تھا۔ "انتھونی!" انھوں نے پکارا۔ وہ فوراً ہی ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔

مسز رڈولف نے سرد آہ بھری۔ اور کر بھی کیا سکتی تھیں۔ اگر وہ کوئی چھوٹا سا بچہ ہوتا تو وہ یقینی طور پر اسے کھانے کے آداب سکھاتیں لیکن وہ کوئی بچہ تو نہیں تھا۔ پھر وہ ایک مہمان تھا جسے انھوں نے بالاصرار مدعو کیا تھا۔ وہ اتنا کر سکتی تھیں کہ خود اس کے لیے مثال بن جائیں۔

پھر کھانے کے دوران ہی انھیں ایک تبدیلی کا احساس ہوا۔ وہ تبدیلی جینا میں آئی تھی۔ اس کی انگشت شہادت بڑے سلیقے سے کانٹوں کے عین اوپر دباؤ ڈال رہی تھی۔ البتہ ہینڈل بے تکے پن سے انگوٹھے کی زد میں تھا۔ لیکن کھانے کے اختتام تک ہینڈل کی پوزیشن بھی درست ہو چکی تھی۔

کنسرٹ کے دوران، ان دونوں کا رویہ معقول رہا۔ مسز رڈولف کے احباب سے ملتے ہوئے انتھونی اپنی کشش انگیز

استاد

دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ حدیث کا درس دے رہے تھے کہ اچانک ایک خستہ حال بوڑھا یہ پکارتا ہوا آیا۔ "قاسم کہاں ہے؟ قاسم کہاں ہے؟" حاضرین کو اجنبی کا یہ لہجہ بہت ناگوار گزرا ممکن ہے کوئی اسے ٹوک بیٹھتا مگر مولانا قاسم فوراً دوڑے اور اجنبی سے بولے۔ "حضرت میں حاضر ہوں۔" بوڑھے کو انہوں نے ادب سے سلام کیا اور گلے ملے پھر پلنگ بچھایا۔ اس پر بستر لگایا اور بوڑھے کو عزت سے بٹھا دیا۔ طلبا سے انہوں نے کہا۔ "جب تک حضرت یہاں قیام پذیر ہیں درس موقوف رہے گا۔" جب تک وہ وہاں ٹھہرے مولانا قاسم ان کی خدمت میں مصروف رہے۔ درس کا سلسلہ ان کی روانگی کے بعد شروع ہوا۔ طلبا حیرت زدہ تھے۔ انہوں نے مولانا قاسم سے پوچھا۔ "حضرت یہ بزرگ کون تھے؟"

مولانا قاسم نانوتوی نے سادگی سے جواب دیا۔ "یہ وہ تھے جنہوں نے تمہارے استاد قاسم نانوتوی کو شیخ الحدیث بنا دیا۔ طلبا اور حیرت زدہ ہوئے مولانا نے بتایا۔ "یہ میرے ابتدائی معلم تھے۔ انہوں نے مجھے قلم پکڑنا سکھایا تھا۔"

ریاض تنولی کی عنایت، لاہور سے

شخصیت کو بہ خوبی استعمال کر رہا تھا۔ سبھی لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے۔ وہ اس سے ہاتھ ملاتے اور دھیمے لہجے میں پوچھتے۔ "کیا حال ہے، مڈشپ مین انتھونی؟" کوئی بے حد مشفقانہ انداز میں اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتا۔

ان کی کار میں گھر جاتے ہوئے انتھونی نے اچانک کہا۔ "موسم گرما کی راتوں میں تو مجھے بیس بال کے گیم سے زیادہ کوئی چیز نہیں بھاتی۔ کیوں مسز رڈولف، کیوں نہ آئندہ ہفتے کھانا میری طرف سے اور پھر بیس بال کا گیم دیکھنے چلا جائے۔"

"کیوں نہیں... مجھے تمھاری دعوت قبول کر کے مسرت ہو گی۔" انھوں نے جواب دیا۔

'میں بے حد خوش ہوں۔' اس رات انھوں نے اپنے جرنل میں لکھا۔ 'وہ ایک اچھا مجلسی آدمی ثابت ہُوا ہے... باشعور!'

اگلے روز وہ، ولسن کو ساتھ لے کر اپنی پسندیدہ دکان پر گئیں۔ وہاں سے انھوں نے ایک سوٹ کا کپڑا خریدا۔ پھر انھوں نے ولسن کو بھیج کر بک اسٹال سے بیس بال کے کھیل پر

متعدد کتابیں منگوائیں۔

انتونی انھیں لینے کے لیے آیا تو انھوں نے اپنی کار استعمال کرنے کی پیش کش کی لیکن انتونی نے انکار کر دیا۔ ''کم از کم اس وقت میں آپ کی پیش کش قبول نہیں کر سکتا...'' اس نے کہا۔ ''اس وقت بھی میں آپ کا ایک سو ساٹھ ڈالر کا مقروض ہوں۔ خدانہ خواستہ کوئی گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔''

''میں ہر چیز کی ذمے داری پیشگی قبول کرتی ہوں۔''

''تاکہ میرے کردار کو ایک کم زوری سونپ سکیں...'' اس نے چوٹ کی۔ ''نہیں مادام، شکریہ۔ پھر یہ دعوت بھی تو میری طرف سے ہے۔''

چناں چہ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر ریستوراں پہنچے۔ کھانے کے وقت جب انتونی نے کانٹا اور چھری سنبھالی تو مسز رڈولف دل ہی دل میں یہ دعا مانگے بغیر نہ رہ سکیں کہ خدا انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور وہ یہ دل دوز منظر خاموشی کے ساتھ دیکھ سکیں لیکن اگلا لمحہ حیرت کا تھا۔ وہ اس قدر سلیقے سے کھانا کھا رہا تھا کہ لگتا تھا، بچپن ہی سے اسے یہ آداب سکھائے گئے ہیں۔ وہ جینا کو پُرستائش نگاہوں سے دیکھنے پر مجبور ہو گئیں۔

اس حیرانی کا بدلہ انھوں نے گرفتھ اسٹیڈیم پہنچ کر لے لیا۔ اس بار حیرت کا جھٹکا انتونی کو سہنا پڑا۔ ''جی! کیا کہا آپ نے مسز رڈولف؟'' اس نے پوچھا اس کی آنکھیں کشادہ ہو گئیں۔

مسز رڈولف کی مسکراہٹ فخر آمیز تھی۔ ''میں نے ہیئر سے کہا کہ ایک آدمی سیکنڈ میں اور ایک تھرڈ میں ہے۔ یہ ڈبل ہٹ کرنے کا مناسب ترین وقت ہے۔'' انھوں نے جواب دیا۔

وہ لوگ کھیل سے خوب لطف اندوز ہوئے لیکن کنسرٹ کے دوران انتونی کی بے زاری کے برعکس، کھیل میں اس کی دل چسپی مسز رڈولف کے لیے خاصی مایوس کن تھی۔ واپسی کے سفر کے دوران مسز رڈولف نے کہا۔ ''بیس بال میں تمھاری دل چسپی فطری ہے لیکن فنون لطیفہ سے تمھارا اغماض کچھ اچھی بات نہیں۔ اتوار کو تم اور جینا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ اس کے بعد ہم نیشنل گیلری چلیں گے۔ کیا خیال ہے؟''

چند لمحے انتونی خاموش رہا پھر بولا۔ ''آپ کی نوازش مسز رڈولف لیکن میں مصروف ہوں گا۔''

''جھوٹ مت بولو...'' جینا نے اسے ٹوک دیا۔ ''مسز رڈولف کے پیش نظر تمھاری بہتری ہے۔ تم انھیں اپنی مدد کیوں نہیں کرنے دیتے؟''

''مجھے یقین ہے کہ تم بڑے آدمی ثابت ہو سکتے ہو...'' مسز رڈولف نے نرم لہجے میں کہا۔ ''بشرطیکہ اپنی چند کم زوریوں پر قابو پا سکو...'' پھر انھوں نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھپتھپا لیا۔ ''مجھے اپنے کسی کام آنے دو۔ میں تمھیں اپنے... بیٹے کی طرح سمجھتی ہوں۔ میں تم میں ہر وہ خوبی دیکھنا چاہتی ہوں جو اپنے بیٹے میں دیکھنا پسند کرتی۔''

''آپ... آپ بہت اچھی ہیں لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ آپ ہر وقت میرے لیے فکرمند رہیں۔''

''ارے بیٹے... یہ فکرمندی تو میرے لیے باعث مسرت ہے۔'' مسز رڈولف نے بے حد محبت سے کہا۔

اگلی شام انھوں نے ولسن سے کہا کہ وہ انھیں نیول فوٹو گرافنگ سینٹر لے چلے۔ ''میں تمھارے کمانڈنگ آفیسر سے ملنا چاہتی ہوں۔'' گیٹ پر انھوں نے گارڈ سے کہا۔ یوں انھیں کمانڈر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

''میں آپ سے ایک نوجوان کے مستقبل کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں...'' انھوں نے سفید بالوں والے کمانڈر سے کہا۔ ''وہ آپ کے محکمے میں کام کرتا ہے... مڈشپ مین انتونی اسمتھ۔''

''مڈشپ مین...؟'' کمانڈر نے انھیں عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ''ہمارے یہاں تو ایسا کوئی...''

''وہ فلمیں وغیرہ بناتا ہے۔''

''اوہ... اچھا۔'' کمانڈر مسکرایا۔ پھر اس نے ایک سوئچ دبایا اور کسی کو طلب کیا۔ آنے والا ایک گنجا آدمی تھا۔ ''شلزا'' کمانڈر نے اس سے کہا۔ ''تم انتونی اسمتھ کو جانتے ہو؟''

''انتونی اس...'' شلز الجھا ہوا سا نظر آنے لگا۔ اوہ... جی ہاں، انتونی اسمتھ۔ وہ اچھا لڑکا ہے جناب، محنت سے کام کرتا ہے۔''

مسز رڈولف خوش ہو گئیں۔ انھوں نے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''موجودہ رفتار کے لحاظ سے وہ کب تک آفیسر بن سکے گا؟''

''جی؟'' شلز حیرت سے انھیں گھورتا رہ گیا۔

کمانڈر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''میرا خیال ہے مسز رڈولف، وہ کبھی آفیسر نہیں بن سکے گا۔ اس کے لیے اعلا تعلیم ضروری ہے... کم از کم کالج کی سطح تک تو اسے تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔''

''اوہ، کہاں؟ آنا پولس مناسب رہے گا؟''

''وہاں داخلہ ملنا بہت دشوار ہوتا ہے۔''

''کیا بات کرتے ہیں آپ۔'' مسز رڈولف نے کہا۔

واپس گھر آتے ہی انھوں نے ایڈمرل بیڈل کو فون کیا۔ ''مڈشپ مین انتونی میں تعمیری جراثیم موجود ہیں...'' انھوں نے ایڈمرل کو آگاہ کیا۔ ''ذہنی رجحان کے اعتبار سے وہ انجینئر ہے۔''

''ہمارے ہاں انجینئرنگ کورپس موجود ہے۔'' ایڈمرل نے جواب دیا۔ ''لیکن اسے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرنا ہوگی۔''

''لیکن...'' مسز رڈولف کچھ ہچکچائیں۔ ''کیا انجینئرنگ ایڈمرل بھی ہوتے ہیں۔''

بیڈل مسکرایا۔ ''جی ہاں، لیکن ایڈمرل بننے میں کچھ برس لگتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے، میں مارٹن کو ٹیلی فون کروں...'' مسز رڈولف نے کہا۔ ''وہ کیپٹل یونیورسٹی کا صدر ہے۔ بتا سکتا ہے کہ کون سا انجینئرنگ اسکول مناسب رہے گا۔''

انھوں نے فوراً ہی مارٹن کو ٹیلی فون کیا۔ مارٹن نے کیپٹل یونیورسٹی کے انجینئرنگ اسکول کی سفارش کی۔

''ٹھیک ہے۔ میں مڈشپ مین انتونی کو تمھارے پاس بھیج دوں گی۔'' مسز رڈولف نے کہا۔ ''لیکن مارٹن، مجھے امید ہے کہ تم انجینئرنگ پر حد سے زیادہ مرتکز نہیں ہونے دو گے۔ کم از کم انتونی کو فنون لطیفہ غیر اہم ہو کر رہ جائے۔''

اس رات وہ اپنے جرنل میں لکھ رہی تھی کہ خادمہ نے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور بتایا کہ انتونی نیچے موجود ہے۔ مسز رڈولف مسکرائیں۔ 'کس قدر خوش گوار آمد ہے!' انھوں نے سوچا۔

انھوں نے بڑی گرم جوشی سے اسے خوش آمدید کہا لیکن وہ بہت برہم نظر آ رہا تھا۔ ''یہ لیجیے۔'' اس نے ایک پھولا ہوا لفافہ میز پر پٹخ دیا۔ ''میں ایک سو ساٹھ ڈالر قرض لے آیا ہوں۔ میرا آپ کا حساب صاف۔ اب براہِ مہربانی، میرا پیچھا چھوڑ دیں۔''

انھوں نے نرمی سے اس کے ہاتھ کو چھوا۔ ''کیا بات ہے، مائی ڈیئر... اتنے خفا کیوں ہو؟''

''بات...؟'' یہ کہہ کر انتونی بہت زور سے ہنسا۔ لیکن اس ہنسی میں طنز ہی طنز تھا۔ ''سارا دن میں عذاب میں مبتلا رہا ہوں۔ وہ سب مجھے مڈشپ مین کہہ کر بلاتے رہے ہیں۔ 'کہو بھئی، مڈشپ مین آنا پولس کب جا رہا ہے؟ مڈشپ مین، اس رفتار سے تم کب تک آفیسر بن جاؤ گے؟ اور یہ سب کچھ این پی سی تک محدود نہیں رہا۔ ہیر کس تک بات پہنچ گئی ہے۔''

''افوہ ڈیئر...!'' مسز رڈولف مایوسی کے عالم میں چیخیں۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میرا وہاں جانا تمھارے لیے باعث آزار ثابت ہوا۔ یقین کرو ڈیئر، میں تو صرف تمھاری بھلائی چاہتی ہوں۔''

''مجھے یقین ہے...'' اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔ ''میں جانتا ہوں لیکن میں آپ کی خیرات مزید قبول نہیں کر سکتا۔ آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میں اسے سراہتا ہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میرے لیے مزید کچھ کریں۔ میں خود بھی کچھ بننے کا خواہش مند ہوں لیکن سب کچھ اپنے بل بوتے پر کرنا چاہتا ہوں۔''

''انتونی... انتونی!'' مسز رڈولف نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ وہ بڑا پیارا لڑکا تھا... لیکن کبھی کبھی اسے سمجھانا بہت دشوار ہوتا تھا۔ ''بیٹے، جذبۂ افتخار ایک قابل تعریف چیز ہے بشرطیکہ اسے شعور کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ تمھیں اب تک علم ہو جانا چاہیے کہ بعض اوقات ہر شخص کو مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ کبھی کبھی مدد قبول بھی کر لینا چاہیے... اگر مدد کرنے والا مخلص ہو۔'' پھر انھوں نے بیڈل اور مارٹن سے اپنی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ ''میں تمھیں کیپٹل یونیورسٹی بھیجنا چاہتی ہوں، میرے بچے۔''

''شکریہ...!'' اس کے چہرے پر تختی چھا گئی۔ ''مجھے افسوس ہے، میں یہ پیش کش قبول نہیں کر سکتا۔ میں نیوی چھوڑ رہا ہوں۔ اپنے طور پر، اپنے مطلب کی ملازمت تلاش کروں گا۔ ملازمت کی ضرورت بھی ہے۔ میں اور جینا، شادی کرنے والے ہیں۔''

مسز رڈولف کی سانسیں رک سی گئیں۔ ''لیکن... لیکن ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے۔'' انھوں نے بہ مشکل کہا۔ ''تمھارا گزارہ کیسے ہوگا؟''

''گزارہ ہو جائے گا...'' انتونی کے لہجے میں بے رخی تھی۔ ''میں کسی نائٹ کورس میں داخلہ لے لوں گا۔ میں محنت کر سکتا ہوں۔ آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ میں نے فرمائش تو نہیں کی آپ سے کہ میرے لیے پریشان ہوتی رہیں... میرے لیے سوچیں...'' پھر اچانک اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔ ''مجھے افسوس ہے مسز رڈولف! میں آپ کے احساسات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا لیکن آپ نے خود ایک بار مجھے سمجھایا تھا کہ بھکاری بننا کم از کم میرے لیے اچھی بات نہیں۔ وہ بات میری سمجھ میں آ گئی... ہمیشہ کے لیے! آپ کی وہ نصیحت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ اب

آپ خود یہ چاہتی ہیں کہ میں اسے بھلا دوں۔ آپ نے مجھے کردار کی تعمیر کے راستے پر ڈالا تھا۔ اب آپ خود چاہتی ہیں کہ میں وہ روشن راستہ بھول جاؤں۔"

پھر اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

مسز رڈولف کے لیے سیڑھیاں چڑھنا دوبھر ہو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ اپنے آں جہانی خاوند کی تصویر کے سامنے کھڑی رہیں۔ پھر وہ میز کی طرف آئیں اور انھوں نے اپنا جرنل بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔

اگلی شام انھوں نے اطلاعی گھنٹی کی آواز سنی تو ڈوبتی ہوئی امید جیسے زندہ ہو گئی۔ لیکن آنے والی جینا تھی... اور وہ اکیلی تھی۔

"جو بھلائی آپ نے انتھونی کے ساتھ کرنے کی کوشش کی، میں اس پر آپ کی شکر گزار ہوں مسز رڈولف...!" جینا نے کہا۔ "آپ بہت اچھی ہیں لیکن انتھونی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں بتاؤں آپ کو... وہ اس قدر ضدی ہے کہ کبھی بڑا آدمی نہیں بن سکتا۔ وہ کچھ نہیں بن سکے گا اور میں بھی..." اتنا کہہ کر وہ رونے لگی۔ "میں کچھ بھی نہیں بن سکوں گی۔ اس سے ملنے سے پہلے میں بہت کچھ سوچا کرتی تھی لیکن اب تو مجھ میں سوچنے کی بھی ہمت نہیں کیوں کہ اگر میں کچھ بن گئی تو وہ مجھ سے محبت کرنا ترک کر دے گا۔"

مسز رڈولف چند لمحے کچھ سوچتی رہیں۔ اب تک وہ اندازہ ہی نہیں لگا سکی تھیں کہ انتھونی، جینا سے کتنی محبت کرتا ہے۔ "تم کالج میں داخلہ لینا پسند کرو گی، مائی ڈیئر؟" بالآخر انھوں نے پوچھا۔

"کالج...؟" جینا رونا بھول گئی۔ "مسز رڈولف... میں ہمیشہ کالج کے خواب دیکھتی رہی ہوں۔ لیکن میرے والدین بہت غریب تھے... اور پھر میری انتھونی سے ملاقات ہو گئی۔"

"میں تمھیں اپنے اخراجات پر کیپٹل یونیورسٹی بھجواؤں گی۔"

کچھ دیر جینا خاموش رہی۔ "میں نہیں جا سکتی..." بالآخر وہ بولی۔ "آپ کی پیش کش میرے لیے اعزاز ہے لیکن مجھے ملازمت کرنا ہو گی تاکہ میں اور انتھونی شادی کر سکیں۔"

"اسے بتا دینا لڑکی کہ تم نے میری پیش کش ٹھکرا دی ہے۔" مسز رڈولف نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ "میرے خیال میں اسے یہ علم ہونا چاہیے کہ تمھارے خواب کیا ہیں۔"

اگلی شام انتھونی آ گیا۔ "جینا نے بتایا تھا کہ آپ نے اسے کالج بھجوانے کی پیش کش کی ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں۔" مسز رڈولف نے اس کی پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔ یہ پیالی وہ اس یقین پر رکھے بیٹھی تھیں کہ وہ ضرور آئے گا۔ "جینا بہت پیاری لڑکی ہے اس میں فنونِ لطیفہ کے لیے فطری حساسیت موجود ہے۔ وہ کچھ بننا چاہتی ہے انتھونی... تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس نے تمھاری خاطر کتنی بڑی قربانی دی ہے۔"

"دیکھیے مسز رڈولف...!" انتھونی نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی مدد اور خلوص والی بات کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ جینا کالج جانا چاہتی ہے، وہ آپ کی پیش کش کو رد کرنے کے بارے میں بتاتے ہوئے بری طرح رو پڑی تھی۔ میں اسے محرومی نہیں دے سکتا۔ میرا خیال ہے، آپ اسے کالج بھجوا دیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، آپ مجھے یونہی رقم دینے کے بجائے قرض دے دیجیے..."

"قرض...؟" مسز رڈولف نے کہا۔ انھیں بے ساختہ وہ لڑکا یاد آ گیا جس نے ٹکر مار کر ان کی کار کو نقصان پہنچایا تھا۔ ذمے داری سے بچنا چاہ رہا تھا۔ اس لڑکے اور اس نوجوان میں کتنا فرق تھا۔ "یقیناً بیٹے...!" انھوں نے کہا۔ "قرض تمھارے لیے بہتر رہے گا۔ شاید میرے دل نے میرے دماغ کو شکست دے دی تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنی دانش مندی سے مجھے ہوش دلا دیا۔ واقعی... میں محبت میں تمھیں بگاڑ دینا چاہتی تھی۔"

"میں سخت محنت کروں گا اور آپ کو تمام رقم لوٹا دوں گا۔"

مسز رڈولف نے اس کی آنکھوں میں استقلال کی چمک دیکھی اور مسحور ہو کر رہ گئیں۔ "ہاں بیٹے... اور تمھیں تین فیصد منافع بھی دینا ہو گا۔ اب تمھیں مالی معاملات کے دستور بھی سمجھ لینے چاہئیں، مائی ڈیئر۔"

"آپ باکمال خاتون ہیں مسز رڈولف...!" انتھونی نے کہا۔ "میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ محبت کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ حالاں کہ آپ اصولوں کی پکی ہیں۔"

مسز رڈولف کی آنکھوں میں خوشی کی دُھند اُتر آئی۔

'یہ بہت مشکل تھا۔' اس رات انھوں نے اپنے جرنل میں لکھا۔ 'اس سے منافع طلب کرنا واقعی بہت مشکل تھا میرے لیے۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ جب ایڈمرل انتھونی اسمتھ کو تر کے میں میری تمام دولت ملے گی تو وہ جان پائے گا کہ دولت کا کیا مصرف ہوتا ہے اور اس کے بارے میں کیا رویہ رکھنا چاہیے۔'

میکسم گورکی کی نایاب تحریروں سے انتخاب

بھائی بہن

اپنے معذور بھائی سے شدید محبت کرنے والی بہن کی کیفیات

وہ اپنے محبت میں بھی گرفتار تھی، یہ جانتے ہوئے کہ بھائی کے لیے اس کی محبت زیادہ مرہم یا خود اپنے لیے مگر وقت کے لیے یہ ثابت کرنا کچھ مشکل نہ تھا

انگور کی بیلوں کے سبز کاہی پردے سے چھن چھن کر دھوپ کی سنہری بوچھار ہوٹل کے ڈھلواں چبوترے پر برس رہی ہے... ہَوا میں معلق سونے کے تاروں کے مانند۔ بھورے پتھر کی سلوں کے فرش اور سفید میز پوشوں پر عجیب و غریب نقش و نگار کی پرچھائیاں نظر آ رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر انھیں دیر تک دیکھا جائے تو انھیں ایک نظم کی طرح پڑھنا ممکن ہو سکتا ہے۔ انگوروں کے خوشے، دھوپ میں موتیوں کی طرح دمک رہے ہیں یا پھر اس عجیب، بے آب پتھر 'اولیون' کے مانند اور میز پر رکھے ہوئے پانی کے جگ میں نیل گوں ہیرے چمک رہے ہیں۔

میزوں کے درمیان فرش پر ایک چھوٹا سا کروشیا کا بنا ہُوا رومال پڑا ہے۔ ظاہر ہے وہ کسی خاتون نے گرایا ہو گا اور یقیناً وہ ایک آسمانی حُسن کی مالک ہو گی۔ اس کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

ایسے گرم، غنائیہ اور پُرسکون دن میں، جب کہ ہر عام اور معمولی اور بے کیف چیز سورج کی آب و تاب کے سامنے گویا شرم سے مُنہ چھپا کر غائب ہو جاتی ہے، کچھ اَور سوچنا ممکن ہی نہیں ہے۔

ہر طرف سکوت طاری ہے۔ باغ میں چہچہاتی ہوئی چڑیوں کی آواز، پھولوں کے گرد اُڑتی ہوئی شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور کہیں پہاڑیوں پر لگے ہوئے انگور کے باغوں کی طرف سے آتی ہوئی ایک گیت کی مدھم دُھن... بس ان آوازوں کے سوا اَور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ گانے والے دو ہیں، ایک مرد اور ایک عورت... گیت کے ہر بند کے بعد ایک منٹ کی خاموشی ہوتی ہے۔ پھر دوسرا بند شروع ہوتا ہے۔ اس نے گیت کو ایک عجیب دعائیہ سی خصوصیت عطا کر دی ہے۔

اب ایک خاتون نمودار ہوتی ہے، وہ باغ سے آتے ہوئے

سنگ مرمر کے چوڑے زینے پر دھیرے دھیرے چڑھ رہی ہے۔ وہ ایک بوڑھی خاتون ہے، بہت دراز قد۔ اس کے سانولے چہرے پر جھریوں کا رنگ ہے، اس کی پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں اور اس کے پتلے ہونٹ، اس طرح زور سے بھینچے ہوئے ہیں گویا اس نے ابھی ابھی کچھ کہا ہو۔ نہیں! اس کے بڑھاپے شانوں پر ایک لمبا چوڑا زرتار ریشم کا کیپ کی طرح کا لبادہ پڑا ہوا ہے جس کے کناروں پر کروشیا کے جھالر لگے ہیں۔ ایک سیاہ کروشیا کا بانا ہوا رومال اس کے چھوٹے سے سفید مرگوڈا حاشیے ہوئے ہے۔ وہ اپنے ایک ہاتھ میں ایک لمبے دستے والا چھوٹا سرخ چھاتا لیے ہوئے ہے اور دوسرے ہاتھ میں نقرئی تاروں سے مزین سیاہ مخمل بٹوا۔ وہ سورج کی کرنوں کے مہین جالے کے درمیان ایک سپاہی کی طرح مضبوط چال سے چل رہی ہے۔ اس کا چہرا، ڈھلوان چبوترے کے پتھروں پر زور زور سے لگ رہا ہے۔ ایک رخ سے دیکھنے میں اس کا چہرہ اونچی زیادہ سخت ہے۔ اس کی ناک توتے کی چونچ کی طرح ہے، ٹھوڑی نکیلی ہے اور اس پر ایک بڑا سا بھورا مسا ہے۔ ابھری ہوئی پیشانی کے نیچے سیاہ حلقے ہیں اور ان کے اندر آنکھیں جھریوں کے باریک باریک جال میں چھپی ہوئی ہیں، اور اتنی اندر دھنسی ہوئی ہیں کہ بوڑھی عورت اندھی معلوم ہوتی ہے۔

اس کے پیچھے ایک کہنہ کار، بلیغ کی طرح جھوم جھوم کر چلتا ہوا ناٹا اور موٹا پیکر نمودار ہوتا ہے۔ اس کے بڑے سے ڈھلکے ہوئے سر پر ایک نرم بھورا ہیٹ رکھا ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ اس کی واسکٹ کی جیب میں چھپے ہوئے ہیں اور اس وجہ سے وہ پتلون چڑا اور بے ڈھنگا ہے، اس سے بھی زیادہ معلوم ہو رہا ہے۔ وہ ایک سفید سوت پہنے ہے اور نرم مخملوں والے سفید جوتے۔ اس کا منہ بند ہے اور اس کے چہرے زرد اور ناہموار دانت نظر آرہے ہیں۔ اس کے اوپری ہونٹ پر چند سیاہ اور سخت بال ناخوش گوار طریقے سے آگے بھی ہیں، وہ زور زور سے اور تکلیف کے ساتھ سانس لے رہا ہے۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے ہیں لیکن مونچھیں بالکل نہیں ہل رہیں۔ چلتے وقت اس کی چھوٹی ٹانگیں بڑی بڑی طرح مڑتی ہیں اور اس کی بے حد بڑی آنکھیں، بے نیلی سے زمین گھور رہی ہیں۔ اس کا مختصر سا جسم طرح طرح کی بڑی بڑی اشیاء سے مزین ہے۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی میں ایک بڑی سی، مگینہ جڑی ہوئی سونے کی انگوٹھی پہن رکھی ہے۔ ایک سیاہ فیتے کے سرے پر جو گھڑی کی زنجیر کا کام دیتا ہے، ایک بڑی سی منہری کنجی لٹکی ہوئی ہے اور اس کی نیلی ٹائی میں ایک حد سے زیادہ بڑا دودھیا چمکتا کا

ہوا ہے جو محسوس بھی جھگا جاتا ہے۔

چبوترے پر ایک اور سیکر نظر آتا ہے، وہ بھی ایک بوڑھی عورت کا ہے۔ وہ پستہ قد اور بھلا سا گول مٹول ہے۔ اس کا چہرہ سرخ اور شفقت آمیز ہے اور آنکھیں زندگی سے بھرپور ہیں۔ بظاہر وہ ایک زندہ دل اور باتونی عورت ہوگی۔

وہ سب چبوترے پر سے اترتے ہوئے بھول کے دروازے کی طرف چلتے ہیں۔ وہ ہوگا تھ کی کسی تصویر کے لوگوں سے ملتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بدصورت، مگر مچھ نما، مضحکہ خیز اور اس تابندہ آفتاب کے پیچھے ہر چیز کے لیے اتنے زیادہ بھیتی کہ انھیں دیکھ کر ہر چیز بے کیف، دھندلی اور بے رنگ ہو جاتی ہے۔

وہ بھانجی بہن ہیں اور بالینڈ کے رہنے والے ہیں۔ وہ ایک ہیروں کے سوداگر اور پیشگی لانے والا دیں۔ اگر اس کا بیان کا یقین کیا جائے جو ان کے متعلق بیان کیا گیا ہے تو ان کی زندگی کی تاریخ بڑی ہی عجیب و غریب ہے۔

بچپن میں کپتان سیلاہ خاموش طبیعت اور عالم خیال میں تھی۔ اس کی والدہ بچہ تھا، اسے کھلونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی طرف اس کی بہن کے سوا اور کوئی بالکل دھیان نہیں دیتا تھا۔ اس کے ماں باپ کا خیال تھا کہ ایک بدصورت مخلوق کے لیے اس قسم کا رویہ بالکل فطری ہے۔ لیکن بچی جو اس سے چار سال بڑی تھی، اپنے ساتھی کے عجیب و غریب طور طریقوں سے پریشان رہتی تھی۔

وہ اپنا تقریباً تمام وقت اس کے ساتھ گزارتی تھی۔ اور اس کا دل بہلانے اور اسے ہنسانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ وہ اس کے لیے کھلونے دیتی تھی اور کبھی ایک اور پراسے سامان کا اہرام سا بنا دیتا۔ بہن نے اسے شاید ہی کبھی مسکراتے ہوئے دیکھا ہو۔ عام طور پر وہ اسے بھی اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اجنبیت اور خالی خالی نگاہوں سے دیکھتا تھا جن سے وہ اپنے آس پاس کی ہر چیز کو تکتا تھا۔ ان نگاہوں سے بہن گھبرا جاتی تھی۔

"تم ان نگاہوں سے مجھے دیکھنے کی جرأت مت کرو، تم بڑے ہو کر بالکل احمق ہو گے!" وہ زمین پر پاؤں مار مار کر چلاتی تھی۔ وہ اس کے پٹکیاں لیتی تھی اور تھپڑ مارتی تھی۔ اور وہ روتا اور بسورتا تھا، اپنے سر کو بچانے کے لیے اپنے لیے بازوؤں کو اوپر اٹھا لیتا تھا لیکن وہ کبھی بھی بہن کے سامنے سے بھاگتا نہیں تھا۔ اور نہ ہی بھی کسی سے شکایت کرتا تھا۔

بعد میں، جب لڑکی کو یہ خیال ہوا کہ اب اس کا بھائی ہی اس بات کو سمجھ سکے گا جو خود اس کے لیے روز روشن کی طرح

صاف تھی تو اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"جب کہ تم میں بدصباحتی خرابی ہے تو تمھیں عقل مند ہونا چاہیے ورنہ ہم سب ... ہاں، اچھا اس وجہ سے تمھاری وجہ سے شرمندہ ہوں گے۔ میاں! زمانوں کو بھی ایک ایسے دولت مند گھر میں ملازمت کرنے سے شرم محسوس ہوتی ہوگی جس میں ایک چھوٹا سا عجیب الخلقت بچہ موجود ہو۔ ایک دولت مند گھر میں ہر چیز میں خوب صورتی ہونی چاہیے یا عقل مندی، سمجھے؟"

"ہاں!" اس نے اپنے بڑے سے سر کو ایک طرف جھکا اور اپنی بے جان، تاریک نگاہیں پرکار کنجیکھی سے جواب دیا۔

ماں اور باپ اس چھوٹی لڑکی کا اپنے بھائی کے ساتھ یہ رویہ دیکھ کر بہت خوش تھے۔ وہ لڑکے کے ساتھ اس کی نرمی کی تعریف کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ لڑکی نے اپنے کیرے کی مالی ہونے کی حیثیت کھو دی۔ وہ اسے کھلونوں سے کھیلنا سکھاتی تھی، اس کے سامنے پڑھ کر سناتی تھی۔ اس کے پریوں شہزادوں کی داستانیں پڑھ کر سناتی تھی۔

لیکن وہ اسی طرح خاموش طبیعت اور عالم خیال میں رہا، گویا وہ نہیں بلندی پر پہنچنا چاہتا ہو اور اپنے آپ کو اونچے اونچے ڈھیر بناتا رہا۔ اور اسی دن سے اس کے دل میں تعمیر کے لیے ایک شدید اور پُرشوق جذبہ گھر کر اٹھا۔ کئی کئی دن تک متواتر وہ اپنے کمرے کے فرش پر مینھا مٹوشی سے اونچے مینار بناتا رہتا اور جب وہ خود ہزار مرتبہ سے پچھے گر پڑتے تھے تو وہ انھیں نئے سرے سے بناتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ چیز اس کے لیے اتنی ضروری ہو گئی کہ وہ کھانے کے وقت بھی چھری کانٹوں اور تپکنیوں کے تھملوں سے کچھ نہ کچھ بنانے کی کوشش کرتا رہتا۔ اس کی آنکھوں میں زیادہ گہرائی پیدا ہوتی اور اس کی نظروں میں تعمیر اور توجہ۔ اس کے ہاتھوں میں زندگی کی بھرپور گہرائی اور وہ مسلسل متحرک رہنے لگے۔ اس کی انگلیاں ہر اس چیز کو کھینچنے اور مٹولنے لگیں جو ان کی پہنچ میں تھی۔

اب وہ شہر میں چہل قدمی کرتے وقت گھنٹوں کھڑا ہو کر تعمیر ہوتے ہوئے مکانوں کو دیکھتا۔ ان دنوں کرتے آہستہ آہستہ زمین سے الگ ہو کر آسمان کی طرف بلند ہونے لگا۔ نظارہ پُرشوق نظروں سے کرتا۔ وہ پھر چکر تے ہوئے ستونوں کے ساتھ، زینوں کی طرح اینٹوں کی گرد اور اڑتے ہوئے چونے کی خوش بو کو گہرے گہرے سانسوں کے ذریعے پیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، ان پر ایک خواب آلود غرور ظاہر کا پردہ سا پڑ جاتا تھا۔ اور جب اس سے کہا جاتا تھا کہ اس طرح کھڑے ہو کر تماشا دیکھنا بُرا ہے تو وہ یہ بات سنتا ہی نہیں تھا۔

"چلو!" اس کی بہن اس کا ہاتھ کھینچ کر اصرار کرتی تھی۔

وہ اپنا سر جھکا لیتا تھا اور آگے چل پڑتا تھا۔

اور پھر اپنی بے کیف آنکھوں میں ایک سوالیہ کیفیت لیے ہوئے اپنی بہن کی طرف مڑتا تھا۔

"اس میں کیسی کوئی دل چسپی ہے؟" بہن نے اس سے پوچھا۔

"ہاں!" اس نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔"

لیکن ایک دن اس نے اس کی وضاحت کی۔ "اتنے چھوٹے چھوٹے آدمی اور ایسی چھوٹی چھوٹی اینٹیں۔ لیکن وہ کتنا بڑے بڑے مکان تعمیر کرتے ہیں۔ کیا پورا شہر اسی طرح بنا تھا؟"

"ہاں، ظاہر ہے۔"

"ہمارا مکان بھی؟"

"ہاں، اور کیا!"

اسے دیکھتے ہوئے لڑکی نے مضبوطی سے کہا۔ "بڑے ہو کر تم ایک مشہور معمار تعمیر بنو گے!"

اسے لکڑی کے بلاک بہت بڑی تعداد میں خرید کر دے دیئے گئے۔ اور اسی دن سے اس کے دل میں تعمیر کے لیے ایک شدید اور پُرشوق جذبہ گھر اٹھا۔ کئی کئی دن تک متواتر وہ اپنے کمرے کے فرش پر مینھا مٹوشی سے اونچے مینار بناتا رہتا اور جب وہ خود ہزار مرتبہ سے پچھے گر پڑتے تھے تو وہ انھیں نئے سرے سے بناتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ چیز اس کے لیے اتنی ضروری ہو گئی کہ وہ کھانے کے وقت بھی چھری کانٹوں اور تپکنیوں کے تھملوں سے کچھ نہ کچھ بنانے کی کوشش کرتا رہتا۔ اس کی آنکھوں میں زیادہ گہرائی پیدا ہوتی اور اس کی نظروں میں تعمیر اور توجہ۔ اس کے ہاتھوں میں زندگی کی بھرپور گہرائی اور وہ مسلسل متحرک رہنے لگے۔ اس کی انگلیاں ہر اس چیز کو کھینچنے اور مٹولنے لگیں جو ان کی پہنچ میں تھی۔

اب وہ شہر میں چہل قدمی کرتے وقت گھنٹوں کھڑا ہو کر تعمیر ہوتے ہوئے مکانوں کو دیکھتا۔ ان دنوں کرتے آہستہ آہستہ زمین سے الگ ہو کر آسمان کی طرف بلند ہونے لگا۔ نظارہ پُرشوق نظروں سے کرتا۔ وہ پھر چکر تے ہوئے ستونوں کے ساتھ، زینوں کی طرح اینٹوں کی گرد اور اڑتے ہوئے چونے کی خوش بو کو گہرے گہرے سانسوں کے ذریعے پیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، ان پر ایک خواب آلود غرور ظاہر کا پردہ سا پڑ جاتا تھا۔ اور جب اس سے کہا جاتا تھا کہ اس طرح کھڑے ہو کر تماشا دیکھنا بُرا ہے تو وہ یہ بات سنتا ہی نہیں تھا۔

"چلو!" اس کی بہن اس کا ہاتھ کھینچ کر اصرار کرتی تھی۔

وہ اپنا سر جھکا لیتا تھا اور آگے چل پڑتا تھا۔

پیچھے مڑ کر دیکھتا رہتا تھا۔

"تم ماہر تعمیر بنو گے نا؟" اس کی بہن اس سے اکثر پوچھا کرتی تھی۔

"ہاں۔"

ایک دن جب وہ دوپہر کے کھانے کے بعد ملاقاتی کمرے میں بیٹھے قہوہ کا انتظار کر رہے تھے تو باپ نے کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ لڑکا کھلونوں سے کھیلنا چھوڑ دے اور سنجیدگی سے پڑھائی شروع کرے۔ لیکن اس کی بہن نے ایک ایسے شخص کے سے لہجے میں کہا جس کی رائے کا احترام نہ کرنا اور جسے اہمیت نہ دینا ناممکن ہے۔

"ابا مجھے امید ہے کہ آپ اسے کسی اسکول میں بھیجنے کا خیال نہیں کر رہے ہیں!"

باپ نے، جو ایک لمبا چوڑا، ڈاڑھی مونچھ صاف آدمی تھا اور جس کے جسم کے مختلف حصوں کو چمکتے دمکتے ہیرے جواہرات کی بہت بڑی تعداد نے مزین کر رکھا تھا، اپنا سر سہلایا۔

"اور میں بھلا کیوں یہ خیال نہ کروں؟"

"آپ خود اچھی طرح جانتے ہیں کہ کیوں..."

چوں کہ وہ لوگ اس کے متعلق بات چیت کر رہے تھے اس لیے کبڑا خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ نکلتے نکلتے اس نے اپنی بہن کو کہتے سنا۔

"لیکن ہر شخص اس کا مذاق اُڑائے گا!"

"ہاں ہاں، یہ تو ظاہر ہی ہے!" ماں نے خزاں کی ہوا کی سی بھیگی بھیگی، بھاری آواز میں کہا۔

"اس کی طرح کے لوگ تو چھپا کر رکھنے چاہییں!" بہن نے شدید جذباتی انداز میں کہا۔

"ہاں، اور کیا۔ اس پر بھلا فخر کیسے کیا جا سکتا ہے..." ماں نے کہا۔ "اس ننھے سے سر میں کتنی عقل بھری ہوئی ہے!"

"ہاں، تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔" باپ نے اتفاق کیا۔

"لیکن یہ کتنی عقل مند ہے!"

کبڑا دروازے کے پاس آ کر بولا۔ "اور میں بھی بے وقوف نہیں ہوں..."

"دیکھتے ہیں۔" باپ نے کہا۔

پھر ماں بولی۔ "کوئی تمھیں بے وقوف نہیں سمجھتا۔"

"تم گھر پر پڑھو گے!" اس کی بہن نے اسے اپنے برابر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم ہر وہ چیز سیکھو گے جو ایک ماہر تعمیر کو سیکھنی چاہیے... تمھیں یہ چیز پسند ہے؟"

"ہاں، تم دیکھو گی۔"

"میں کیا دیکھوں گی؟"

"کہ مجھے کیا پسند ہے۔"

وہ قد میں اس سے ذرا ہی نکلتی ہوئی تھی، کوئی چند انگلی زیادہ۔ لیکن اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر شخص سے، یہاں تک کہ اس کے ماں باپ سے بھی، کہیں زیادہ لمبی ہے... اس وقت وہ پندرہ سال کی تھی... کبڑا ایک کیکڑے سے مشابہ تھا اور وہ... لمبی، چھریری اور مضبوط... اسے ایک دل کش پری معلوم ہوتی تھی جس نے خود اسے اور پورے گھر کو اپنے سحر سے مسخر کر رکھا تھا۔

اب کبڑے کے پاس سرد مہر اور مہذب قسم کے لوگ باقاعدگی سے آنے لگے۔ جو اسے کچھ سکھانے کی کوشش کرتے تھے۔ صبر سے اسے مختلف باتیں سمجھاتے تھے اور اس سے سوالات کرتے تھے۔ لیکن کبڑا ڈھٹائی سے اعتراف کرتا تھا کہ وہ اپنے استادوں کی بتائی ہوئی آدھی بات بھی نہیں سمجھتا اور وہ سرد مہری سے انھیں تکتا رہتا تھا۔ اور اس دوران میں اپنے خیالات میں محو رہتا تھا۔ وہ بہت کم بولتا تھا لیکن بعض اوقات عجیب عجیب سوال کر ڈالتا تھا۔ "لوگ کچھ بھی نہیں کرنا چاہتے ان کا کیا حشر ہوتا ہے؟"

اس کے استاد نے، جو ایک انتہائی شائستہ اور مہذب آدمی تھا اور ایک گلے تک بند سیاہ کوٹ میں ملبوس بہ یک وقت پادری اور سپاہی سے مشابہ دکھتا تھا، جواب دیا۔ "ان لوگوں کا انجام بدترین ہوتا ہے! مثلاً ان میں سے اکثر سوشلسٹ بن جاتے ہیں۔"

"شکریہ...!" کبڑے نے کہا۔ وہ اپنے استاد سے ایک بڑے آدمی کی سی روکھی شائستگی کے ساتھ پیش آتا تھا... "اور سوشلسٹ کیا ہوتا ہے؟"

"بہترین صورتوں میں وہ ایک خیالوں کی دنیا کا باسی اور وقت گنوانے والا ہوتا ہے۔ اور عام طور پر وہ ایک ذہنی مفلوج ہوتا ہے جو خدا، ملکیت اور وطن کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔"

اس کے استاد ہمیشہ مختصر جواب دیتے تھے۔ ان کے جواب اس کے حافظے میں اس طرح پیوست ہو جاتے تھے جیسے فٹ پاتھ پر پتھر۔

"کیا ایک بوڑھی عورت بھی ذہنی مفلوج ہو سکتی ہے؟"

"ہاں، اور کیا۔"

"اور ایک کم عمر لڑکی بھی؟"

"ہاں، یہ ایک پیدائشی چیز ہے۔"

اس کے استاد اس کے متعلق کہتے تھے۔ "اس میں ریاضی کی صلاحیت تو بہت کم ہے لیکن یہ اخلاقیات کے مسائل میں

بہت گہری دل چسپی کا اظہار کرتا ہے۔"

"تم باتیں بہت کرتے ہو!" جب اس کی بہن کو اس کی اور اس کے استادوں کی باہمی گفتگو کا علم ہوا تو اس نے یہ بات کہی۔

"وہ مجھ سے زیادہ باتیں کرتے ہیں۔"

"تم دعا کیوں نہیں مانگتے ہو۔"

"خدا میرے کب کو ٹھیک نہیں کر دے گا۔"

"اوہو، تو تم اب اس کے متعلق سوچ رہے ہو؟" وہ حیرت زدہ ہو کر چلائی۔ "اس دفعہ تو میں تمھیں معاف کرتی ہوں..." اس نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمھیں اس قسم کے خیالات کو ہمیشہ اپنے دماغ سے نکال دینا ہے، سن رہے ہو؟"

"ہاں!"

اب وہ لمبے لباس پہننے لگا تھا اور اس کا بھائی تیرہ سال کا ہو گیا تھا۔

اس دن سے کبڑا اپنی بہن کو بہت پریشان کرنے لگا۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوتا ہو کہ وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی ہو اور کوئی بورڈ یا تختہ یا اوزار اس کے سر اور شانوں اور ہاتھوں پر نہ آ گرا ہو۔ کبڑا ہمیشہ اسے زور سے خبردار کر دیتا تھا۔ "دیکھ کر آؤ!" لیکن وہ ہمیشہ ایک منٹ دیر سے کہتا تھا اور لڑکی کے اکثر چوٹ لگ جاتی تھی۔

ایک دفعہ، شدت درد سے لنگڑاتی ہوئی وہ اس کے اوپر چیخی۔ اس وقت مارے غصے کے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ چلائی۔ "تم یہ جان بوجھ کر کر رہے ہو، کبڑے!" اور اس نے کبڑے کے تھپڑ دے دیا۔

اس کی ٹانگیں کم زور تھیں، وہ گر پڑا اور فرش پر بیٹھے بیٹھے اس نے کسی قسم کی خفگی ظاہر کیے یا آنسو بہائے بغیر دھیرے سے کہا۔ "تم کیسے سمجھ سکتی ہو؟ تم مجھ سے محبت کرتی ہو نا؟ کرتی ہو نا تم مجھ سے محبت؟"

وہ درد کے سبب کراہتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ معذرت کرنے کے لیے واپس آئی۔

"اصل بات یہ ہے..." اس نے صفائی پیش کی۔ "تم نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔"

"پہلے میرے پاس یہ سب چیزیں نہیں تھیں۔" اس نے ہاتھ سے ایک ہمہ گیر سا اشارہ کرتے ہوئے پُرسکون انداز میں جواب دیا۔ اس اشارے نے پورے کمرے کو محیط کر لیا جس میں کونوں میں رکھے ہوئے بورڈ، نجاری کی میز پر ڈھیر لکڑی کے تختے، دیوار کے پاس رکھی ہوئی خراد، یہ سب انتہائی بے ترتیبی سے پڑی ہوئی چیزیں شامل تھیں۔

"تم نے یہ سب فضولیات یہاں کیوں بھر لی ہیں؟" بہن نے کراہیت اور شبہے سے اپنے گرد و پیش نظر دوڑاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تم دیکھ لوگی!"

اس نے چیزیں بنانی شروع کر دی تھیں۔ اس نے ایک خرگوش رکھنے کا صندوق اور ایک کتا گھر بنا لیا تھا۔ اب وہ ایک نئے قسم کے چوہے دان پر کام کر رہا تھا۔ اس کی بہن اس کے کام کی ترقی کو بڑے شوق سے دیکھتی تھی۔ اور کھانے کے وقت وہ اپنے ماں باپ کے سامنے بہت فخریہ اس کی کام یابیوں کا ذکر کرتی تھی۔ باپ پسندیدگی سے سر ہلا کر کہتا تھا۔ "سب کچھ شروع چھوٹی چیزوں سے ہوتا ہے۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے!"

اور ماں اپنی بیٹی کو گلے لگا کر بیٹے سے کہتی تھی۔ "تمھیں کچھ اندازہ ہے کہ تم پر اس کا کتنا زبردست احسان ہے؟"

"ہاں!" کبڑا جواب دیتا تھا۔

جب چوہے دان تیار ہو گیا تو اس نے اپنی بہن کو بلایا اور اسے اپنی یہ بھدی سی انوکھی مشین دکھائی۔

"یہ کوئی کھلونا نہیں ہے..." اس نے کہا۔ "اسے تو پیٹنٹ کرایا جا سکتا ہے۔ دیکھو، یہ کتنی سادہ اور زوردار چیز ہے۔ اپنی انگلی یہاں رکھو۔"

لڑکی نے اسے چھوا اور کوئی چیز کھٹ سے بند ہوئی۔ وہ چیخ پڑی اور کبڑا اس کے پاس کھڑا اچھلتا اور بدبداتا رہا۔ "اوہ، یہ غلط ہے، غلط ہے۔"

ماں دوڑی ہوئی آئی اور پھر ملازم بھی دوڑے۔ انھوں نے چوہے دان کے مختلف حصوں کو الگ الگ کیا۔ لڑکی کی پھنچی ہوئی نیلی انگلی نکالی اور اسے بے ہوشی کے عالم میں وہاں سے لے گئے۔

اس شام کو اس کی بہن نے اسے بلایا اور اس سے پوچھا۔ "تم نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی۔ تم مجھ سے نفرت کرتے ہو... کیوں؟"

اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے نپی تلی اور پُرسکون آواز میں کہا۔ "تم نے اسے غلط ہاتھ سے چھوا، بس اور کوئی بات نہیں۔"

"یہ جھوٹ ہے!"

"لیکن میں تمھارے ہاتھ کو مسخ کیوں کرنا چاہوں گا؟ اور پھر یہ تو وہ ہاتھ بھی نہیں تھا جس سے تم نے مجھے مارا تھا۔"

"دیکھو، کبڑے تم مجھے چنگیوں میں نہیں اُڑا سکتے!"

"میں جانتا ہوں۔" اس نے اتفاق کیا۔

اس کا نکیلا چہرہ، ہمیشہ کی طرح پُرسکون تھا اور اس کی آنکھوں میں غور و فکر کا رنگ تھا۔ یہ خیال کرنا ناممکن تھا کہ وہ خفا ہے یا یہ کہ وہ جھوٹ بول سکتا ہے۔

اس واقعے کے بعد لڑکی نے اس کے کمرے میں آنا جانا کم کر دیا۔ اس کی سہیلیاں اس سے ملنے آتی تھیں۔ بشاش، خوش دل، نوجوان لڑکیاں۔ بھڑکیلے کپڑوں میں ملبوس، ان بڑے بڑے اور کچھ ٹھنڈے اور بے رنگ سے کمروں میں تیتریوں کی طرح اُڑتی پھرتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی موجودگی میں تصویریں، مجسمے، پھول اور ملمع دار آرائشی اشیا، سب چیزیں کچھ پہلے سے زیادہ گرم ہوگئی ہیں۔ بعض دفعہ لڑکے کی بہن اپنی سہیلیوں کو اس کے کمرے میں لے آتی تھی، وہ بڑے مقطع انداز سے اپنی گلابی ناخنوں والی چھوٹی چھوٹی انگلیاں اس کی طرف بڑھاتیں اور اس کے ہاتھ کو اس احتیاط سے چھوتی تھیں، گویا انھیں ڈر ہو کہ کہیں وہ ٹوٹ نہ جائے۔ وہ اس سے بہت نرمی سے بات کرتی تھیں اور وہ تجسس آمیز دلچسپی کے ساتھ کپڑے کے اپنے اوزاروں، ڈرائنگ، لکڑی کے ٹکڑوں اور برادے سے گھرا ہُوا ہونے کے نظارے کو دیکھتی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ یہ لڑکیاں اسے ''موجد'' کہتی ہیں۔ یہ اس کی بہن کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان سب کو توقع ہے کہ وہ مستقبل میں کوئی بڑا کام کر کے دکھائے گا جو اس کے باپ کا نام روشن کرے گا۔ اس کی بہن ہمیشہ بڑے وثوق اور اعتماد سے اس موضوع پر بات کرتی تھی۔

''وہ ظاہر ہے، بدصورت تو ہے لیکن عقل مند بہت ہے۔'' وہ اکثر کہا کرتی تھی۔

وہ اب اُنیس سال کی ہوگئی تھی۔

اس کے ماں باپ کشتی پر ایک سیر و تفریح کرتے ہوئے ختم ہوگئے۔ کیوں کہ ایک امریکی سامان کے جہاز کے بدمست سکان گیر نے اپنے جہاز کو ان کی کشتی سے ٹکرا کر اسے ڈبو دیا تھا تو اس وقت اس کا ایک خواست گار بھی پیدا ہو چکا تھا۔ وہ بھی اس کشتی میں ان کے ساتھ جانے والی تھی لیکن دانت کے درد کی وجہ سے اسے گھر ہی پر رہنا پڑا۔

جب اسے اپنے والدین کی موت کی اطلاع ملی تو وہ اپنا دانت کا درد بھول گئی اور کمرے میں دیوانہ وار روتی اور ہاتھ ملتی اِدھر سے اُدھر دوڑنے لگی۔

''نہیں، نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا... ہرگز نہیں ہوسکتا!''

کبڑا، جو پردے میں لپٹا ہُوا سا دروازے پر کھڑا تھا، لڑکی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور اپنا کُب ہلاتا رہا۔ آخر کار وہ بولا۔

''ابّا تو اس قدر گول اور کھوکھلے تھے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا وہ ڈوب کس طرح گئے...''

''خاموش رہو، تم کسی سے محبت نہیں کرتے ہو!'' اس کی بہن چلّائی۔

''فقط یہ بات ہے کہ میں میٹھے میٹھے الفاظ کہنا نہیں جانتا؟'' اس نے کہا۔

باپ کی لاش نہیں مل سکی تھی۔ لیکن ماں پانی کے اندر جانے سے پہلے ہی مر گئی تھی، اس کی لاش مل گئی تھی۔ وہ اپنے تابوت میں بالکل اسی طرح لیٹی ہوئی تھی جیسی وہ زندگی میں تھی۔ ایک پرانے درخت کی مردہ شاخ کی مانند سوکھی اور سخت۔

''اب میں اور تم اکیلے رہ گئے ہیں...'' ماں کے کفن دفن کے بعد بہن نے اپنے بھائی کو اپنی سرد، بھوری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ ہمارے لیے بڑی کٹھن چیز ہوگی۔ ہم کچھ نہیں جانتے اور بہت ممکن ہے کہ ہم بہت کچھ کھو دیں۔ کتنی بُری بات ہے کہ میں فوراً شادی نہیں کر سکتی!''

''اوہ!'' کبڑا اچھلا یا۔

''اس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟''

اس نے ایک منٹ سوچا اور پھر بولا۔ ''ہم پیسے کمائیں...''

''تم تو یہ اس طرح کہہ رہے ہو جیسے اس سے تمھیں بہت ہی ہو!''

''مجھے کسی چیز سے خوشی نہیں ہوتی۔''

''یہ بہت ہی بُری بات ہے۔ تم تو ایک جیتے جاگتے انسان سے بہت ہی مختلف ہو۔''

شام کے وقت اس کا منگیتر اس کے پاس آیا کرتا تھا... وہ ایک درمیانے قد کا زندہ دل آدمی تھا۔ سنہری بال، گول گول سنولایا ہُوا چہرہ اور گھنی مونچھیں۔

ان لوگوں کی منگنی ہو چکی تھی اور شہر کی ایک بہترین سڑک پر ان کے لیے ایک مکان بن رہا تھا۔ کبڑا ابھی جائے تعمیر پر نہیں گیا تھا اور وہ اس کا ذکر سننا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کی بہن کا منگیتر اپنا انگوٹھیوں سے بھرا ہاتھ اس کے کندھے پر مار کر ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ، جس سے اس کے چھوٹے چھوٹے دانتوں کی بتیسی پوری نظر آجاتی تھی، اس سے کہتا تھا۔ ''تمھیں چل کر اسے دیکھنا چاہیے۔ کیوں، کیا خیال ہے تمھارا؟''

بہت دن تک کبڑا طرح طرح کے عذر تراش کر جانے سے انکار کرتا رہا۔ لیکن آخر کار وہ مان گیا اور اپنی بہن اور اس کے منگیتر کے ساتھ جائے تعمیر پر گیا۔ دونوں مرد مچان پر چڑھے لیکن پوری پہنچتے ہی وہ گر پڑے۔ منگیتر سیدھا چونے کی ایک ناند میں جا گرا لیکن بھائی کے کپڑے ایک آگے کو نکلے ہوئے تختے میں الجھ کے

اور وہ ہَوا میں معلّق ہوگیا اور جب تک کہ راج مزدوروں نے اسے وہاں سے نہیں ہٹایا، وہ اسی طرح لٹکا رہا۔ اس کی ٹانگ اور بازو کی ہڈی اتر گئی اور چہرے پر کچھ خراشیں پڑ گئیں۔ لیکن منگیتر کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور ایک طرف کی پسلیاں چکنا چور ہوگئیں۔

بہن کو تشنج کے دورے پڑ گئے۔ وہ زمین پر پڑی ہوئی اپنے ناخنوں سے زمین کھرچنے لگی اور اس سے سفید گرد و غبار کا ایک بادل سا پھیل گیا۔ وہ بہت دن تک روتی رہی۔ ایک مہینے سے زیادہ روئی اور پھر اس کے بعد وہ اپنی ماں کی طرح سوکھی اور دُبلی ہوگئی۔ اس کی آواز میں بھی وہی ٹھنڈا پن اور وہی بھاری پن پیدا ہوگیا۔

''تمھاری کھوٹی تقدیر ہو!'' وہ کہتی تھی۔

خاموشی سی زمین پر اُگتا رہتا تھا۔ اس کی بہن نے جیسے ہمیشہ کے لیے سیاہ لباس زیب تن کر لیا۔ اس کی پیشانی پر مستقل بل رہنے لگے۔ جب وہ اپنے بھائی کو دیکھتی تھی تو اتنے زور سے دانت بھینچتی تھی کہ اس کے رخسار پر ہڈیاں ابھر آتی تھیں۔ کبڑا حتّا الامکان اس سے دُور دُور رہنے کی کوشش کرتا تھا اور خاموشی سے، الگ تھلگ اپنی ڈرائنگ میں مصروف رہتا تھا۔ وہ دونوں اسی طرح رہتے رہے۔ یہاں تک کہ کبڑا سن بلوغ کو پہنچ گیا اور اس دن سے ان لوگوں کے درمیان کھلی جنگ چھڑ گئی۔ ان کی پوری زندگیاں اس جنگ کے لیے وقف تھیں اور یہ انھیں باہمی توہین اور تذلیل کے عہد و پیمان میں باندھے ہوئے تھے۔

جب وہ کبڑا بالغ ہُوا، اس نے اپنی بہن سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''عقل مند جادوگروں اور نیک پریوں کا کوئی وجود نہیں ہے، اس دنیا میں صرف انسان بستے ہیں۔ بعض بُرے ہیں، بعض بے وقوف ہیں۔ اور نیک دلی کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے وہ سب پریوں کی داستان ہے! لیکن میں اس پریوں کی داستان کو عملی شکل دینا چاہتا ہوں۔ تمھیں یاد ہے، تم نے کیا کہا تھا! ایک دولت مند گھر میں ہر چیز میں خوب صورتی ہونی چاہیے یا عقل مندی؟ ایک دولت مند شہر میں بھی ہر چیز خوب صورت ہونی چاہیے۔ میں شہر سے باہر زمین کا ایک قطعہ خرید رہا ہوں، وہاں میں اپنے اور اپنے جیسے دوسرے عجیب الخلقت اور مفلوج لوگوں کے لیے ایک مکان بناؤں گا۔ میں انھیں اس شہر سے باہر لے جاؤں گا جہاں رہنا ان کے لیے تکلیف دہ ہے، جہاں وہ تمھارے جیسے لوگوں کی طبع نازک پر بار ہیں۔''

''نہیں!'' اس نے کہا۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے! یہ بالکل دیوانہ پن ہے!''

''یہ خود تمھارا خیال ہے۔''

وہ معقولیت اور ٹھنڈے پن سے بحث کرتے رہے... بالکل انھی لوگوں کی طرح جو ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں اور جنھیں اپنی نفرت کو چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

''یہ طے ہے...'' کبڑے نے کہا۔

''میں نے طے نہیں کیا۔'' اس کی بہن نے جواب دیا۔

اس نے اپنا کُب اوپر اٹھایا اور باہر چلا گیا۔

کچھ ہی عرصے بعد اس کی بہن نے سن لیا کہ اس نے زمین خرید لی ہے اور نیویں کھودی جا رہی ہیں اور اینٹیں، پتھر، لکڑی اور لوہا گاڑیوں میں بھر بھر کر لے جایا جا رہا ہے۔

''تم اب تک اپنے آپ کو ایک نوعمر لڑکا ہی سمجھتے ہو...؟'' بہن نے کہا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ کوئی کھیل ہے؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ہفتے میں ایک دفعہ اس کی بہن... تیر کی طرح سیدھی اور مغرور... ایک سفید گھوڑا جتی ہوئی چھوٹی سی گاڑی میں بیٹھ کر، جسے وہ خود ہی چلاتی تھی، شہر کے باہر جایا کرتی تھی۔ جائے تعمیر کے قریب آہستہ آہستہ گاڑی چلاتی ہوئی وہ ٹھنڈے پن سے لال لال گوشت کی سی اینٹوں کو لوہے کی کڑیوں کی نسوں میں پھنستا ہُوا اور زرد لکڑی کو اس بھاری تودے میں اعصاب کی طرح گزرتا ہُوا دیکھتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے دور سے اپنے بھائی کو کیکڑے کی طرح مچان پر رینگتے ہوئے دیکھا، وہ ہاتھ میں چھڑی لیے ہوئے تھا۔ اس کے سر پر ایک مسلا ہُوا ہیٹ رکھا تھا۔ وہ ایک مکڑی کا سا گرد آلود اور بھورا معلوم ہو رہا تھا... بعد میں گھر پر اس نے غور سے اپنے بھائی کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں، جو پُر جوش اور جان دار معلوم ہو رہا تھا، اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ نرم اور روشن ہوگئی تھیں۔

''میں کہتا ہوں تم سے کہ میرا یہ خیال بہت ہی زور دار خیال ہے...'' اس نے کہا۔ ''یہ ہمارے لیے اچھا ہے اور تمھارے لیے بھی! تعمیر بہت ہی اچھی چیز ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جلد ہی میں اپنے آپ کو ایک مسرور انسان سمجھنے کے قابل ہو جاؤں گا۔''

''مسرور؟'' بہن نے ایک پُر اسرار نگاہ سے اس کے مسخ جسم کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا بولا ہُوا لفظ دُہرایا۔

''ہاں! تم جانتی ہو کہ جو لوگ کام کرتے ہیں وہ ہم سے بالکل مختلف ہیں، وہ آدمی کے دل میں عجیب عجیب احساسات پیدا کرتے ہیں... ایک معمار ہونا اور اس شہر کی سڑکوں پر سے گزرنا، جس میں اس نے درجنوں گھر بنائے ہیں، کتنی عمدہ چیز

ہے! مزدوروں کے درمیان سوشلسٹوں کی کافی تعداد ہے۔ وہ سنجیدہ اور سمجھ دار لوگ ہیں اور مجھے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی خودداری اور احساس وقار بہت مضبوط ہے۔ بعض دفعہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے ہی آدمیوں کے متعلق بہت کم جانتے ہیں۔''

''یہ بڑی عجیب وغریب گفتگو ہے۔'' اس کی بہن نے اظہارِ خیال کیا۔

کبڑا روز بہ روز زیادہ شگفتہ، زندہ دل اور باتونی ہوتا چلا گیا۔

''سچ تو یہ ہے کہ ہر چیز اسی طرح آگے بڑھ رہی ہے جیسا تم چاہتی تھیں...'' اُس نے اپنی بہن سے کہا۔ ''میں وہ عقل مند جادوگر ثابت ہوں گا جو اپنے شہر کو عجیب الخلقت لوگوں سے پاک صاف کرے گا... تم اگر چاہو تو نیک پری بن سکتی ہو... تم جواب کیوں نہیں دیتیں؟''

''ہم اس کے متعلق بعد میں بات کریں گے۔'' اس نے اپنی طلائی گھڑی کی زنجیر سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔

ایک دن اس نے اپنی بہن سے ایک ایسی زبان میں بات کی جو بہن کے لیے بالکل نئی تھی۔

''شاید میں تمھارا اس سے بھی زیادہ گناہ گار ہوں جتنی تم میری ہو...''

وہ حیران رہ گئی۔

''میں... تمھاری گناہ گار!''

''ٹھیرو! میں قسم کھاتا ہوں کہ میرا قصور اتنا زیادہ نہیں ہے جتنا تم سمجھتی ہو! میری ٹانگیں لڑکھڑا جاتی ہیں اور شاید میں نے واقعی اس وقت اسے دھکا دیا تھا۔ لیکن یقین مانو کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا! اس سے کہیں زیادہ تو میں اس کے لیے قصوروار ہوں کہ میں نے تمھارے اس ہاتھ کو مسخ کرنے کی کوشش کی جس سے تم نے مجھے مارا تھا...''

''ہم اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔'' اس نے کہا۔

''ہمیں ایک دوسرے سے لطف وعنایت کے ساتھ پیش آنا چاہیے...'' کبڑا مُنہ ہی مُنہ میں بدبدایا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ لطف ومحبت محض خواب ہی نہیں ہے، وہ ممکن بھی ہے...''

شہر کے باہر کی وسیع عمارت تیزی سے بڑھ رہی تھی، وہ زرخیز زمین پر پھیلتی چلی گئی اور آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ اس کا رنگ ہمیشہ خاکستری رہتا تھا اور جو ہمیشہ بارش کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔

ایک دن آفیسروں کا ایک گروپ جائے تعمیر پر آیا۔ انھوں نے عمارت کا معائنہ کیا، خاموشی سے آپس میں بات چیت کی اور کام بند کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

''یہ تمھاری حرکت ہے!'' کبڑا چلّایا... وہ اپنی بہن پر جھپٹ پڑا اور طیش کے عالم میں اس نے اپنے لمبے اور طاقت ور ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ لیکن لوگ کہیں سے نمودار ہو گئے اور انھوں نے اسے اس کی بہن سے الگ کر دیا۔

''آپ دیکھتے ہیں، حضرات!'' اس نے ان لوگوں سے کہا۔ ''یہ واقعی نارمل نہیں ہے اور اسے ایک سرپرست کی ضرورت ہے! ہمارے باپ کی، جس سے یہ والہانہ محبت کرتا تھا، موت کے کچھ ہی عرصے بعد سے اس کی یہ کیفیت شروع ہوئی۔ آپ لوگ ملازمین سے دریافت کر سکتے ہیں، وہ سب اس کی بیماری کے متعلق جانتے ہیں۔ انھوں نے آج تک مُنہ سے بھاپ بھی نہیں نکالی۔ کیوں کہ وہ اچھے لوگ ہیں اور اس گھر کی عزت اور ناموس انھیں عزیز ہے جس میں ان میں سے اکثر بچپن سے اب تک رہتے آئے ہیں۔ میں نے بھی اپنی بدقسمتی کو ابھی تک چھپائے رکھا کیوں کہ بہ ہر حال، اگر کسی کا بھائی پاگل ہو تو یہ کوئی قابلِ فخر بات تو نہیں...''

جب کبڑے نے یہ بات سنی تو اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر اُبل پڑیں، وہ گنگ ہو گیا اور خاموشی سے ان لوگوں کو نوچنے لگا جو اسے پکڑے ہوئے تھے۔ اور اس کی بہن کہتی رہی۔ ''اسی تباہ کن مہم کو، اس گھر کی تعمیر کو لیجیے، جسے میرا شہر کو دینے کا ارادہ ہے، تاکہ اسے ایک دماغی مریضوں کا اسپتال بنایا جائے، جس کا نام میرے باپ کے نام پر رکھا جائے...''

اس پر اس نے زور سے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ لوگ اسے اٹھا کر لے گئے۔

جب عمارت کی تعمیر مکمل ہو گئی تو اسے پہلے مریض کی حیثیت سے وہاں بھیجا گیا، اس نے سات سال وہاں گزارے، جو پاگل ہو جانے کے لیے کافی مدت ہے۔ اسے مالیخولیا کی شکایت پیدا ہو گئی۔ اسی دوران میں اس کی بہن بوڑھی ہو گئی، اس نے ماں بننے کی تمام امیدیں چھوڑ دیں اور جب آخر کار اس نے دیکھا کہ اس کا دشمن مر چکا ہے اور اب بھی اس میں جان نہیں پڑے گی تو اس نے اسے اپنے سائے تلے لے لیا۔

اس طرح یہ لوگ کرۂ ارض پر مارے مارے پھرتے ہیں، یہ اندھے پرندوں کی طرح، ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے رہتے ہیں اور ہر چیز پر بے کیف اور مسرت سے نا آشنا نگاہ ڈالتے ہیں... اور کبھی کہیں اپنے سوا اور کسی چیز کو نہیں دیکھتے۔

تعاقب

انوار صدیقی

اسرار و تحیر میں لپٹی ایک داستان
جسے پڑھ کر آپ چونکے بغیر نہیں رہ سکیں گے

قارئین سب رنگ کے دیرینہ محبوب کا شاہ کار

آخر دسمبر کی وہ یخ بستہ رات بڑی قیامت خیز تھی۔ جہاز کے تمام مسافر سرِ شام ہی اپنے اپنے کیبنوں میں بند ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ جو اگا دُگا من چلے ڈیک پر تھے انھوں نے سردی کی لذت سے محفوظ رہنے کی خاطر خود کو کمبلوں اور لحافوں میں سرتاپا لپیٹ رکھا تھا۔

سمندری سفر کی راتیں عام حالات میں بھی سرد ہوتی ہیں لیکن وہ رات جسے دبیز کُہر نے پوری طرح تسخیر کر رکھا تھا، بڑی ہی ہول ناک اور پُراسرار محسوس ہو رہی تھی۔

رات کے ساڑھے دس بجے کا عمل ہوگا۔ میں اپنے کیبن میں لیٹا، ایک ایڈونچرس ناول کے مطالعے میں غرق تھا کہ کیبن کے دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکا دیا۔

''اس سرد موسم میں، اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے؟'' میں نے سوچا۔ پھر اس خیال سے کہ شاید دستک دینے والا کوئی ضرورت مند ہم سفر ہو اور انتہائی ضرورت کے تحت میرے پاس آیا ہو، میں نے کتاب کو ایک طرف رکھا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر کوئی نہیں تھا! میں نے راہ داری میں اِدھر اُدھر دیکھا جہاں کہر آلود روشنی بھی بڑی پُراسرار لگ رہی تھی۔ اس مدھم روشنی میں پوری راہ داری مجھے سنسان ہی نظر آئی۔ سرد ہَوا کے تیز تھپیڑوں سے بچنے کی خاطر میں نے دروازے کو فوری بند کر دیا۔

دستک کی آواز کو اپنا وہم سمجھ کر میں دوبارہ اپنے آرام دہ بستر پر لیٹ گیا۔ کمبل کو سینے تک گھسیٹ کر میں نے دوبارہ کتاب اٹھالی لیکن... ابھی بہ مشکل آدھا صفحہ بھی نہیں پڑھ سکا تھا کہ دروازے پر دوبارہ دستک کی آواز سنائی دی۔ اس بار آواز اتنی واضح تھی کہ میں اسے اپنا وہم نہ قرار دے سکا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں جو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

خیال اُبھرا وہ یہی تھا کہ شاید پڑوس کے کیبنوں میں موجود کوئی شریر بچہ مجھے پریشان کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

بحری سفر پر روانہ ہوئے مجھے چھٹا دن تھا۔ اس سے قبل کسی نے میرے سکون کو برباد کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کتاب کا جو حصّہ میں پڑھ رہا تھا وہ انتہائی دل چسپ تھا۔ چناں چہ میں نے اس آواز کو نظر انداز کر کے مطالعہ جاری رکھا مگر چند لمحوں بعد جب تیسری بار میرے صبر کو آزمایا گیا تو میں بُری طرح جھلا گیا۔

''کون ہے...!'' میں نے اونچی آواز اور ناخوش گوار لہجے میں کہا ''کیوں بلاوجہ تنگ کر رہے ہو؟ دفعان ہو جاؤ۔''

''کھٹ... کھٹ... کھٹ!''

میری جھلاہٹ کے باوجود یکے بعد دیگرے تین بار دستک دی گئی تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے تلملا کر دروازے کی سمت دیکھا۔ نہ جانے کون بے ہودہ بچہ تھا جو اپنے غیر معیاری مذاق سے میرے جسم میں دوڑتے لہو کو جوش دلا رہا تھا، میرا سکون غارت کر رہا تھا۔

''خدا تمھیں غارت کرے...!'' میں نے زیادہ بلند آواز میں چیخ کر کہا۔ ''تم مرو بھی جاؤ تب بھی میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔''

میرا خیال تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہوگا، اپنی اس ناشائستہ حرکت پر شرمندہ ہو کر چلا جائے گا لیکن ایسا نہیں ہُوا۔ دروازے پر یکے بعد دیگرے دستک کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ اس بار دستک کی آواز کے ساتھ کسی کی سسکیوں کی آواز بھی صاف سنائی دی۔ باہر جو بھی تھا، غالباً رو رہا تھا۔ چند لمحے میں ان سسکیوں پر غور کرتا رہا پھر میں چپکے سے اُٹھا، پنجوں کے بل چلتا ہُوا دروازے تک گیا، بولٹ کو اس طرح آہستہ سے کھولا کہ کوئی آواز نہ پیدا ہو۔ پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر لپک کر باہر چلا گیا مگر اُس وقت میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مدھم روشنی میں، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے کے باوجود مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ میں غصّے کے عالم میں اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا۔ میرا خون بُری طرح کھول رہا تھا۔ اگر دستک دینے والا مجھے نظر آ جاتا تو میں یقیناً اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہ کرتا۔ لیکن کسی کی غیر موجودگی میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں اپنی جھلاہٹ خود آپ پر اتاروں اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہوں۔

میں اپنے اگلے اقدام کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے میں مصروف تھا جب کسی کی سسکیوں کی آواز پھر میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس بار وہ آواز کرب میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس بات کی تصدیق کر رہی تھی وہ جو کوئی بھی تھا شدید زخمی حالت یا پھر کسی ناقابلِ برداشت غم سے دوچار تھا۔ میں نے آواز کی سمت پر غور کیا۔ وہ دبیز دُھند میں لپٹے ہوئے عرشے کے تقریباً اختتام کی جانب سے آ رہی تھی... میں نے کچھ سوچ کر اپنے کیبن کے دروازے کو باہر سے بند کیا اور آواز کی سمت قدم اٹھانے لگا... راہ داری عبور کر کے عرشے پر آ گیا جہاں اس وقت ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ ہَوا کے سرد تھپیڑے جسم میں سوئیوں کی طرح چبھتے محسوس ہو رہے تھے۔ سمندر کی موجوں کا شور ماحول کو پُراسرار بنا رہا تھا۔

میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اطراف کا جائزہ لے رہا تھا، سسکیوں کی آواز میرے عرشے پر آتے ہی بند ہو گئی تھی۔ لیکن درد میں ڈوبی سسکیوں کی آواز یقیناً مجھ سے کسی ہم دردی یا مدد کی مستحق تھی۔

''تم کہاں ہو دوست؟'' میں نے کچھ توقف کے بعد اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے اسے آواز دی۔

جواب میں مجھے تیز ہَوا کی سائیں سائیں اور موجوں کے شور کے سوا اور کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ میں عجیب کشمکش میں گرفتار تھا۔ دوسری بار اپنا سوال دُہرانے کے بعد میں کیبن میں جانے کے بارے میں غور کر رہا تھا جب دبی دبی سسکیوں کی آواز ایک بار پھر اُبھری۔ اس بار میں نے سمت کا تعیّن کر لیا۔ آواز میرے بائیں جانب کے اس حصے سے آئی تھی جہاں لائف بوٹ اور چھوٹی کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں تیزی سے اس جانب لپکا اور بالآخر دُھند میں اس انسانی وجود کو پا لیا جو لائف بوٹس کے قریب کھڑا سسکیاں بھر رہا تھا۔

''کون ہو تم...؟'' حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے اس انسانی ہیولے سے کچھ فاصلے پر رُک کر، ٹھوس آواز میں دریافت کیا۔

''مم... میں ایک بدنصیب انسان ہوں۔'' اس کی آواز میں درد تھا، احساس محرومی تھا۔

''تمھیں مجھ سے کوئی کام ہے...؟''

''ہاں...'' وہ سرد آہ بھر کر کپکپاتی آواز میں بولا۔ ''اگر تم اس کشتی کی بندشیں کھول کر سمندر میں اتارنے میں میری مدد کر دو تو میں تمام زندگی تمھارا احسان مند رہوں گا۔'' اس نے جہاز کے ساتھ رسیوں سے بندھی ایک کشتی کی سمت اشارہ کیا۔

فوری طور پر میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے اس کی خواہش پر تعجب ہُوا۔ میں نے سوچا کہ آخر وہ اس طوفانی رات میں ایک چھوٹی کشتی کو سمندر میں کیوں اتارنا چاہتا ہے...؟ معاً میرے ذہن میں ایک خیال بڑی سرعت

اُبھرا... یہ یقیناً کوئی مجرم ہے جو رات کی تاریکی میں جہاز کے عملے اور مسافروں کی نگاہوں سے بچ کر فرار ہونے کے منصوبے بنا رہا ہے... جس انداز میں وہ مجھے عرشے تک لانے میں کام یاب ہُوا تھا وہ بھی پُراسرار اور مشکوک تھا اور میرے دل میں اُبھرنے والے شبے کو ہَوا دینے کے لیے کافی تھا۔

''کیا نام ہے تمھارا؟'' میں نے سپاٹ آواز میں سوال کیا۔

''بینی اسوان...'' اس نے نام بتانے کے بعد بڑی حسرت سے پوچھا۔ ''کیا تم اس کشتی کو کھول کر نیچے اتارنے میں میری مدد کرنے کو تیار ہو؟''

''تمھارا مقصد کیا ہے...؟'' میں نے دل کڑا کر پوچھ ہی لیا۔ ''کیا تم جہاز سے فرار ہونا چاہتے ہو؟''

''نہیں، تمھارا اندازہ غلط ہے...'' وہ مضطرب لہجے میں بولا۔ ''میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں فرار نہیں ہوں گا۔ بس، تم اس کشتی کو کھولنے میں میرا ہاتھ بٹا دو۔''

''تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟'' میں نے اصلیت جاننے کی کوشش کی۔

''اس لیے کہ اس کشتی میں...'' وہ کچھ کہتے کہتے ایک لمحے کو رکا پھر رقّت بھری آواز میں بولا ''اس کشتی میں ایک لاش موجود ہے... میری ایک عزیزہ کی لاش... میں نہیں چاہتا کہ جہاز کا عملہ یا مسافر اسے دیکھیں۔ بولو... کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟''

''ہوں۔'' میں نے قدرے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''گویا تم قاتل ہو!''

''نہیں...'' اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا ''میں نے اسے قتل نہیں کیا... صرف اس اذیّت سے نجات دلا دی جس میں وہ مبتلا تھی۔''

''تم... یقیناً کوئی جنونی قاتل ہو...'' یک لخت میں نے جوشیلا انداز اختیار کیا ''اس سے قبل کہ تم ایک لاش کو سمندر بُرد کرنے کے ناپاک منصوبے میں کام یاب ہو، میں تمھیں گرفتار کرا دینا زیادہ مناسب سمجھوں گا۔''

''نہیں... تم ایسا نہیں کر سکو گے... اگر تم نے ایسی کوئی حماقت کی تو تمھارا انجام بھی موت ہوگا... ایسی دردناک موت جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' اس بار وہ سفّاک لہجے میں بولا۔

اس کی آواز میں نہ جانے کیا سحر تھا کہ میں سر تا پا لرز اٹھا۔ میرے جسم کے رونگٹے خوف سے کھڑے ہو گئے۔ سردی کے باوجود، موت کے تصور ہی سے میرا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا... بڑی سرعت سے بھاگ کر میں نے اپنے کیبن کی سمت جانے کی

''گھر سے نکلنے سے پہلے تم نے بلی کو باہر نکال دیا تھا؟''

کوشش کی۔ مگر اپنے ارادے میں کام یاب نہ ہو سکا۔ کوئی نادیدہ قوت پوری طرح مجھ پر حاوی ہو گئی۔ میں اپنی جگہ سے ایک قدم بھی نہ اٹھا سکا... مجھ پر جیسے بے ہوشی کا غلبہ ہونے لگا۔ میرے اعصاب میرے قابو میں نہ رہے۔ میں نے خود کو بیدار رکھنے کی کوشش کی لیکن... کام یاب نہ ہو سکا۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا!

غنودگی کی حالت میں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اطراف بہت سارے افراد جمع ہیں اور شور و غل کی آوازیں ہر لمحہ بڑھتی جا رہی ہیں۔ چند ثانیے تک میں آنکھیں بند کیے اپنے ذہن کی منتشر قوتوں کو یکجا کرتا رہا۔ پھر ایک دم میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ کوئی میرے کیبن کے دروازے کو زور زور سے پیٹ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سورج کی روشنی دیکھ کر مجھے اندازہ ہُوا کہ میں دیر تک سوتا رہا ہوں... گذشتہ رات والے واقعات کے بارے میں مَیں نے فوری طور پر یہی تصور کیا کہ وہ محض ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ حقیقت ہوتی تو میں اس وقت اپنے کیبن میں نہ ہوتا جو اندر سے بند بھی تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ میجر رحمان اور اس کی حسین و جمیل بیوی ریحانہ اس وقت میرے کیبن کے دروازے پر اس طرح حیران و پریشان کھڑے تھے جیسے ان پر کوئی قیامت گزر گئی ہو۔ چہرے سُتے سُتے نظر آ رہے تھے۔

قبل اس کے کہ میں واقعات کے تسلسل کو جاری رکھوں،

یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میجر رحمان بحری سفر میں محض تین روز قبل میرا ہم سفر بنا تھا۔ اس سے پیش تر ہمارے درمیان کوئی واقفیت نہیں تھی۔ میرے کیبن سے ملحقہ دو کیبن اس کے تصرف میں تھے۔ ایک میں وہ اپنی بیوی ریحانہ کے ساتھ مقیم تھا جب کہ دوسرا کیبن اس کی نوجوان خوب صورت سالی فرزانہ اور دو لڑکوں انجم اور پرویز کے لیے وقف تھا۔ انجم کی عمر سات سال اور پرویز پانچ سال کا تھا۔

پہلی بات جو میرے لیے اس خاندان کی طرف متوجہ ہونے کا سبب بنی وہ ریحانہ اور فرزانہ کی ایک دوسرے سے حیرت انگیز مشابہت تھی۔ دونوں کو ایک ساتھ کھڑا کر دیا جاتا تو ایک عام آدمی کے لیے دونوں میں تمیز کرنا مشکل تھا کہ اس میں سے کون کس نام سے پکارا جاتا تھا۔ لباس کے انتخاب میں بھی دونوں کی پسند تقریباً ایک جیسی ہی تھی۔ البتہ ایک فرق جو میں نے محسوس کیا وہ ریحانہ کی سنجیدگی اور کم آمیزی تھی۔ جب کہ اس کے برعکس فرزانہ بے حد ہنس مکھ اور ملن سار طبیعت کی مالک تھی۔

میجر رحمان کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ وہ حد درجہ شکی مزاج اور اکھڑ قسم کا آدمی تھا۔ غیر متعلقہ لوگوں سے رسمی تعاوف کے وقت بھی اس کی کشادہ پیشانی پر آڑی ترچھی سلوٹیں نمودار ہونے لگتی تھیں۔ پہلی ملاقات ہی میں مَیں نے اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی۔ یہی فیصلہ کیا تھا کہ اس سے الگ تھلگ ہی رہنا مناسب ہوگا۔ چناں چہ اس وقت جب میں نے اسے اپنے کیبن کے باہر ریحانہ کے ساتھ دیکھا تو کسی خوشی کا اظہار نہ کر سکا۔

''مسٹر طارق! میں اس وقت آپ کے آرام میں مخل ہونے کی معافی چاہتا ہوں لیکن ایک سوال ضرور کروں گا۔ کیا آپ نے فرزانہ کو کہیں دیکھا ہے؟'' میجر نے بدحواس لہجے میں سوال کیا۔

''جی نہیں...'' میں نے جان بوجھ کر خشک انداز میں جواب دیا۔ ''اگر آپ اس وقت دروازہ پیٹ کر مجھے بیدار نہ کرتے تو شاید میں ابھی مزید کچھ دیر سوتا رہتا۔ رات سے میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

''پھر... وہ گئی کہاں؟'' میجر نے خلا میں گھورتے ہوئے خود کلامی کی۔ اس کے چہرے پر پھیلی غصے اور جھلاہٹ کی ملی جلی کیفیت اس امر کی ترجمان تھی کہ وہ فرزانہ کے سلسلے میں کسی شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔

میں نے دیدہ و دانستہ میجر کی الجھن کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

''مسٹر طارق...'' ریحانہ نے میری بے رُخی کو محسوس کرتے ہوئے بڑی عاجزی سے مجھے مخاطب کیا۔ ''میری بہن فرزانہ اچانک نہ جانے کہاں گم ہوگئی ہے۔ ہم نے اسے تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔ لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا اور...''

''اور اب آپ حضرات نے فرزانہ کو برآمد کرنے کی خاطر میرے کیبن کی تلاشی لینے کا سوچ رکھا ہے۔'' میں نے ترش لہجے میں جواب دیا۔

''پلیز، آپ غلط نہ سمجھیں طارق صاحب...!'' ریحانہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ہم نے ایک پڑوسی کے رشتے سے آپ کو اپنی پریشانی میں شریک کرنے کا ارادہ کیا تھا ورنہ خدانخواستہ آپ پر کسی قسم کا شک یا شبہ نہیں ہے۔ بات چوں کہ ایک جوان لڑکی کی ہے اس لیے... ہم اس کی تشہیر نہیں چاہتے۔''

''ہوسکتا ہے کہ آپ کی ہمشیرہ اس وقت اپنی کسی نئی سہیلی کے ساتھ اس کے کیبن میں ہو...'' میں نے اس بار قدرے نرمی سے کہا۔ ''کیا آپ نے اپنے تمام واقف کاروں سے فرزانہ کے بارے میں پوچھ لیا ہے؟''

''پریشانی کی بات تو یہی ہے کہ جہاز پر ہمارا کوئی واقف کار نہیں ہے۔'' ریحانہ نے کن انکھیوں سے اپنے شوہر کی سمت دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ نے اسے کب سے نہیں دیکھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''صبح سے۔''

''بچوں نے کیا بتایا؟''

''کچھ بھی نہیں...'' ریحانہ اب دیدہ دلیر ہوگئی۔ ''بچوں نے بھی یہی کہا ہے کہ جب وہ سو کر اٹھے تو فرزانہ کیبن میں نہیں تھی۔''

''چلو ریحانہ...'' میجر رحمان نے الجھے ہوئے انداز میں اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ پھر فوجی لہجے میں بولا ''کچھ دیر اور فرزانہ کا انتظار کرلو۔ اس کے بعد ہمیں مجبوراً جہاز کے کپتان سے مدد لینی پڑے گی۔''

میجر رحمان اور ریحانہ چلے گئے تو میں واپس اپنے کیبن میں آ گیا... مجھے گذشتہ روز والی پُراسرار باتیں یاد آنے لگیں جو غالباً خواب کی سی کیفیت میں میرے ساتھ پیش آئی تھیں۔ چند لمحہ گنگ کھڑا، میں اس ڈراؤنے خواب کے بارے میں الجھتا رہا۔ پھر جلدی جلدی میں نے مُنہ ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کیا۔ بہ عجلت ناشتے سے فراغت حاصل کر کے عرشے پر آ گیا جہاں ہر طرف خوش گوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

میں عرشے پر ریلنگ کے سہارے کھڑا بہ ظاہر ناظرانہ

پھیلے ہوئے سمندر کی بے قرار موجوں کو تکتا رہا۔ لیکن میری نظریں متعدد بار اس کشتی کی طرف اُٹھ چکی تھیں جو اُس وقت بھی رسّی کی بندشوں میں قید تھی۔ کل رات بھی میں اسے خاص طور پر، غالباً خواب کی حالت میں دیکھ چکا تھا... میں اُس وقت اس کشتی کو اندر سے ایک نظر دیکھ لینے کو بے چین تھا جسے خواب میں نظر آنے والے، بنی اسوان نے سمندر میں اتارنے کی درخواست کی تھی۔ اس نے یہی کہا تھا کہ اس کشتی کے اندر اس کی کسی عزیزہ کی لاش موجود ہے۔ ہر چند کہ میرے نزدیک کسی خواب کا عام زندگی سے کوئی تعلق جوڑنا حماقت کے مترادف تھا، اس کے باوجود میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ عرشے پر اس وقت میرے علاوہ اپر کلاس کے اور مسافر بھی موجود تھے۔ ان کی موجودگی میں اونچے مقام پر بندھی ہوئی ایک کشتی تک پہنچ کر اُس کے اندر جھانکنا یقیناً ایک مضحکہ خیز حرکت ہوتی۔ پھر بھی میں اس کشتی کو اندر سے ایک نظر دیکھنے کے لیے مناسب موقع کا منتظر رہا۔

ابھی میں اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے کوئی طریقہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک عقب میں چیخ پکار کی آواز سُن کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ جہاز کا ایک خلاصی جو غالباً کسی ضرورت کے تحت کشتیوں کے اوپر چڑھا تھا، اسی مخصوص کشتی کے قریب کھڑا ہذیانی انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر چلّا رہا تھا۔ وہ مسافروں کو بلند آواز میں بتا رہا تھا کہ اس کشتی کے اندر ایک لاش موجود ہے!

چند لمحوں میں کپتان کے علاوہ عملے کے کچھ اور ذمے دار بھی وہاں آ گئے۔ کشتی کو نیچے اُتار کر دیکھا گیا تو خلاصی کی بات درست ثابت ہوئی۔ لاش پر نظر پڑتے ہی میں خوف سے کانپ اٹھا۔ دہشت کے مارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں نے پہلی ہی نظر میں فرزانہ کو شناخت کر لیا جو اَب لاش کی صورت کشتی میں پڑی تھی۔ کسی نے اُس معصوم کو بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ اس کے جسم کے عریاں حصوں پر جا بہ جا گہرے نیل کے دھبّے موجود تھے۔ ننگے بازوؤں کی کھال کئی مقام سے اُدھڑی اُدھڑی نظر آ رہی تھی۔ ان زخموں کے اطراف گاڑھا خون جم کر رہ گیا تھا۔ چہرے کی حالت بھی نہایت دہشت انگیز تھی۔ قاتل نے غالباً مقتولہ کو تشدد کرنے کے بعد گلا گھونٹ کر ہلاک کیا تھا۔ اس بات کا اندازہ مجھے فرزانہ کی بے جان آنکھیں دیکھ کر ہُوا جو اپنے حلقوں سے باہر اُبلی نظر آ رہی تھیں۔

فرزانہ کی لاش کی برآمدگی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے جہاز پر پھیل گئی۔ کشتی کے اطراف مسافروں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ میجر رحمان بھی وہاں آ چکا تھا۔ اس وقت اُس کی

جرأت

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کا جہانگیر کے سامنے سجدہ تعظیمی نہ کرنے کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ جہانگیر نے برہم ہو کر آپ کو قید کر دیا لیکن کچھ عرصے بعد رہا کر کے آپ کو اپنے ساتھ رکھنے لگا۔ بادشاہی خیمے کے ساتھ آپ کا خیمہ بھی جاتا تھا۔ کبھی گوالیار، کبھی آگرہ، کبھی سورت، کبھی اجمیر وغیرہ۔ اس دوران میں شہزادہ خرم (شاہ جہاں) اور دربار شاہی کے کئی دوسرے لوگ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔ حضرت کے کمال زہد و تقویٰ اور غیر معمولی تبحر علمی سے خود شہنشاہ جہانگیر بھی بے حد متاثر ہوا اور آپ سے عقیدت رکھنے لگا۔

ایک بار آگرہ سے باہر رمضان کو 29 تاریخ کو بادشاہ شکار کھیلنے گیا اور چاند دیکھ لیا۔ دیگر مصاحبوں نے بھی دیکھا۔ دوسرے دن آگرہ میں روزہ کھولنے کا عام حکم ہو گیا مگر حضرت مجدد نے روزہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ جب حسب معمول دربار شاہی میں تشریف لے گئے تو بادشاہ نے دستور کے مطابق تعظیم دے کر پان کی گلوری بڑھائی۔ آپ نے لے کر رکھ لی۔ تھوڑی دیر بعد اطلاع آئی کہ فلاں گاؤں کے کچھ بھلے ہے رویتِ ہلال کی شہادت دینے آئے ہیں۔ بادشاہ نے بلایا اور شہادت لی۔ حضرت مجدد نے اب گلوری اٹھا کر منہ میں رکھ لی۔ جب بھلے چلے گئے تو بادشاہ نے پوچھا کہ آپ مجھے بھلے ہوں سے بھی کم تر سمجھتے ہیں۔ حضرت مجدد نے بغیر کسی ادنیٰ خوف و ہراس کے فرمایا کہ آپ کے فسق و فجور کی گواہی کو میں شرعاً معتبر نہیں سمجھتا اور آپ کے حواری اس قدر خوشامدی ہیں کہ ان کی گواہی بھی معتبر نہیں۔ جو آپ کہیں گے وہ ہاں میں ہاں ملائیں گے۔ اور ان بھلے ہوں سے میں واقف ہوں۔ یہ لوگ کبھی جھوٹی گواہی نہ دیں گے۔ یہ نہایت دین دار لوگ ہیں۔ بادشاہ یہ سن کر خاموش ہو گیا۔

تعاون ✪ اویس آذر

کیفیت کسی ٹھہرے ہوئے طوفان جیسی تھی۔ کشتی کے قریب کھڑا وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے فرزانہ کی لاش کو ٹکٹکی باندھے گھور رہا تھا۔ البتہ ریحانہ کی حالت خاصی غیر ہو رہی تھی۔ کچھ مسافر خواتین نے اسے پکڑ رکھا تھا لیکن وہ بار بار اپنی بہن کی طرف لپک رہی تھی۔ اگر بروقت مسافر خواتین نے اسے قابو نہ کیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ وہ بھی فرزانہ کے غم میں کوئی انتہائی اقدام اٹھا بیٹھتی۔ میجر رحمان کے دونوں لڑکے اس کے دائیں بائیں

دم بہ خود کھڑے تھے۔

جہاز کے کپتان کو صورتِ حال پر قابو پانے کی خاطر خاصی مشکلات پیش آرہی تھیں۔ لیکن کسی نہ کسی طور وہ مجمع کو منتشر کرنے میں کام یاب ہوگیا۔ اس کے بعد وہ میجر رحمان کو ایک طرف لے کر کچھ باتیں کرنے لگا۔ میں چوں کہ دُور تھا اس لیے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سُن سکا۔

فرزانہ کی لاش دست یاب ہونے کے کوئی پانچ گھنٹے بعد اسے ضروری مذہبی رسومات کی ادائیگی کے بعد بحری قانون کے مطابق سمندر کی بے تاب لہروں کے سپرد کر دیا گیا۔ جس وقت لاش کو نیچے اتارا جارہا تھا، اس وقت میجر رحمان نے ریحانہ کو پوری قوت سے تھام رکھا تھا۔ دوسری شکل میں شاید وہ بھی ریلنگ پھلانگ کر بہن کے آخری سفر میں شریک ہوجاتی!

دو دن تک جہاز کا متعلقہ عملہ فرزانہ کے پُراسرار قتل کے بارے میں تفصیلی چھان بین کرتا رہا لیکن کوئی قابلِ سُراغ حاصل کرنے میں ناکام ہی رہا۔ ان دو دنوں میں میرے ذہن میں شب و روز بنی اسوان کا نام گونجتا رہا۔ قتل سے پہلے کا جو بھیانک خواب دیکھا تھا، اس کے مختلف پہلو بار بار میرے خیالوں میں گردش کرتے رہے۔ میں نے ذاتی طور پر انتھک کوششوں کے بعد جہاز پر سفر کرنے والے تمام مسافروں کی وہ فہرست بھی دیکھ ڈالی جو جہاز کے ایک ذمّے دار آفیسر کے پاس موجود تھی۔ لیکن مجھے اس میں بنی اسوان کا نام کہیں نظر نہ آسکا۔ مسافروں کے درمیان بھی اس شکل و صورت کا کوئی ایسا مشتبہ شخص مجھے نظر نہیں آیا جس پر بنی اسوان ہونے کا شبہ کیا جاسکتا۔ صورتِ حال کسی معمّے کی طرح اُلجھتی جارہی تھی۔

ایک دو بار میرے ذہن میں یہ خیال اُبھرا کہ براہِ راست ریحانہ سے مل کر بنی اسوان کے بارے میں دریافت کروں لیکن مجھے اس کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ اس لیے کہ میجر رحمان فرزانہ کی لاش ملنے کے بعد سے ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ میری ہچکچاہٹ کی ایک وجہ اور بھی تھی... بنی اسوان کے وہ جملے ابھی تک ذہن میں بار بار گونج اٹھتے تھے جو اس نے میرے مُنہ سے اپنی گرفتاری کے بارے میں سُن کر بڑے سفاک لہجے میں کہے تھے۔

''نہیں... تم ایسا نہیں کرسکو گے... اگر تم نے ایسی کوئی حماقت کی تو تمھارا انجام بھی موت ہوگا۔ ایسی دردناک موت جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتے...''

اُس رات بھی میں اپنے کیبن میں بیٹھا اپنے پریشان خیالات سے اُلجھ رہا تھا جب دروازے پر ہونے والی دستک نے میری سوچوں کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ریحانہ حواس باختہ کھڑی تھی۔

''طارق صاحب۔ میرے شوہر کی حالت اچانک بہت خراب ہوگئی ہے۔ پلیز، آپ جہاز کے ڈاکٹر کو بلا دیں۔''

ریحانہ اپنا جملہ مکمل کر کے طوفان کی طرح دوڑتی ہوئی اپنے کیبن میں واپس چلی گئی۔

پانچ منٹ بعد جب میں ڈاکٹر کو ساتھ لیے میجر رحمان کے کیبن میں داخل ہُوا تو مجھے اس کا چہرہ زرد نظر آیا۔ پہلی نظر میں یہی محسوس ہُوا جیسے وہ یرقان کا مریض ہو۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے نظر آرہے تھے۔ سانس بھی رُک رُک کر آرہا تھا... میجر رحمان کی وہ کیفیت میرے لیے سخت حیران کن تھی، اس لیے کہ چند گھنٹے قبل جب میں نے اسے ڈائننگ روم میں دیکھا تھا، اس وقت وہ بے حد تن درست اور چاق و چوبند نظر آرہا تھا۔ لیکن اب وہ بے حد لاغر لگ رہا تھا۔ میں نے جہاز کے ڈاکٹر کی آنکھوں میں بھی اُلجھن اور حیرت کے ملے جلے تاثرات دیکھے۔ وہ بڑی توجہ سے میجر رحمان کا معائنہ کر رہا تھا۔ معائنے سے فارغ ہوکر ڈاکٹر نے دو انجکشن لگائے پھر ضروری دوائیں تجویز کرنے کے بعد میرے ساتھ ہی کیبن سے باہر آگیا۔ وہ بدستور کسی اُلجھن میں مبتلا تھا۔

''ڈاکٹر!'' میں نے کیبن سے کچھ دُور جانے کے بعد ڈاکٹر کو مخاطب کیا ''میجر رحمان کی زندگی کو کوئی خطرہ تو لاحق نہیں ہے؟''

''یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میرے خیال میں میجر دو چار گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔'' ڈاکٹر چلتے چلتے یک لخت رُک گیا۔ تشویش بھرے انداز میں بولا۔ ''آج تک میری نظروں سے کوئی ایسا مریض نہیں گزرا جس کے جسم کا سارا خون محض چند گھنٹوں میں یوں خشک ہوگیا ہو جیسے... جیسے ہوا بن کر اُڑ گیا ہو۔''

''میں سمجھا نہیں ڈاکٹر!'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا میجر رحمان کو بچانے کی کوئی صورت نہیں ہے؟''

''صرف ایک صورت ہے کہ اسے خاصی مقدار میں تازہ اور دوست گروپ کا خون فراہم کیا جائے لیکن...''

''لیکن کیا؟'' میں نے تیزی سے سوال کیا۔ ڈاکٹر کی

خاموشی مجھے بڑی گراں گزری تھی۔

"ہمارے پاس جہاز پر اتنا خون موجود نہیں ہے اور مختصر عرصے میں مسافروں کا بلڈ گروپ چیک کرنا اور خون حاصل کرنا..."

قبل اس کے کہ ڈاکٹر اپنا جملہ مکمل کرتا، ریحانہ دیوانوں کی طرح کیبن سے برآمد ہوئی۔ اس نے چیخ کر ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ "جلدی آؤ ڈاکٹر، میرے شوہر کو اچانک نہ جانے کیسا دورہ پڑا ہے۔"

ڈاکٹر کے ہمراہ میں بھی دوڑتا ہُوا دوبارہ ریحانہ کے کیبن میں داخل ہُوا جہاں میجر کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔ پورا جسم یوں کپکپا رہا تھا جیسے اسے بجلی کے ننگے تاروں سے جھٹکے لگ رہے ہوں۔ وہ پھٹی پھٹی، وحشت ناک نظروں سے کیبن کی چھت کو گھور رہا تھا۔ اچانک اس کی زبان سے بے ربط جملے نکلنے شروع ہو گئے۔

"باسٹرڈ! چلے جاؤ ورنہ شوٹ... تم... ناپاک اور کمینے... گندے وجود... میں تمھیں... مردود... نہیں، نہیں... خدا کے لیے... بدبخت، چھوڑ دے مجھے ورنہ... آہ.. اف... ب... بچاؤ..!"

میں اور ڈاکٹر دونوں عجیب شش و پنج میں مبتلا تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، میجر رحمان کا کیا علاج کیا جائے۔

"ڈاکٹر... پلیز، کچھ کرو۔" میں نے ڈاکٹر کا ہاتھ تھام کر اسے جھنجوڑا۔

"آں... ہاں۔" ڈاکٹر نے چونک کر میری سمت دیکھا مگر اس سے پیش تر کہ وہ میجر کی اس دیوانگی کے بارے میں کسی علاج پر غور کرتا، وہ کسی زندہ لاش کی طرح اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ریحانہ خوف کے مارے چیخ پڑی۔ ڈاکٹر سہمے ہوئے انداز میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میرے وجود پر بھی ایک نامعلوم سی دہشت طاری ہو رہی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے میجر رحمان کے اکڑے ہوئے جسم نے دو تین شدید جھٹکے کھائے اور اوندھے مُنہ کیبن کے فرش پر گر گیا۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس کی نبض ٹٹولی۔ پھر بستر کی اجلی چادر گھسیٹ کر میجر کے جسم کو سر تک ڈھانپ دیا۔ گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ میجر کی روح اس کے قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔

ریحانہ میرے قریب کھڑی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جب اسے اپنی بیوگی کا احساس ہُوا تو ہذیانی انداز میں چیخ مارتی ہوئی اپنے شوہر کی لاش سے لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگی۔

میں نے اور ڈاکٹر نے مل کر اسے بہ مشکل میجر کی لاش سے علاحدہ کیا۔ لیکن وہ بہ دستور پچھاڑیں کھاتی رہی...

اسی رات میجر رحمان کی لاش کو بھی ضروری رسوم کے بعد سمندر کی بے چین لہروں کے حوالے کر دیا گیا!

فرزانہ اور اس کے بعد میجر رحمان کو پیش آنے والے حادثات نے جہاز کے بیش تر مسافروں کو دہلا کر رکھ دیا۔ شوہر کی موت کے بعد ریحانہ نے پرویز اور انجم کو اپنے کیبن میں منتقل کر کے دوسرا کیبن خالی کر دیا۔ لیکن کسی مسافر نے اسے حاصل کرنے کی جسارت نہیں کی۔ خود ریحانہ بھی ہر وقت سہمی سہمی اور خوف زدہ نظر آتی تھی۔ اپنے دونوں بیٹوں کو ایک پل کے لیے بھی نظروں سے دُور نہیں ہونے دیتی تھی۔ سرِ شام ہی اپنے کیبن میں بند ہو کر رہ جاتی... جہاز پر میرے سوا کسی اور سے اس کی زیادہ واقفیت نہیں تھی، چناں چہ جب بھی مجھے موقع ملتا، میں اس کا دکھ بانٹنے کی کوشش ضرور کرتا اور بہ ہر طور اپنی ہم دردی کا یقین دلاتا رہتا۔

میرے ذہن میں سب سے زیادہ جو بات مچلا رہی تھی وہ بنی اسوان کی شخصیت تھی جو محض ایک بار انتہائی پُراسرار انداز میں میرے سامنے آیا... پھر چھلاوے کے مانند کہیں گم ہو گیا تھا۔ میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ بنی اسوان کون تھا؟ اگر وہ اسی جہاز پر سفر کر رہا تھا تو کس بھیس میں تھا؟ اس کا اصل نام کیا تھا؟ اور اسے میجر رحمان سے کیا پُرخاش تھی جو اس نے میجر اور اس کی نوجوان سالی کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا تھا؟ ان دونوں کی موت سے اسے کس قسم کی تسکین حاصل ہوئی تھی؟

ایک دو بار میں نے ارادہ کیا کہ اس معمّے کو حل کرنے کی خاطر براہِ راست ریحانہ سے گفتگو کروں۔ لیکن یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ ریحانہ کا غم ابھی تازہ تھا۔ میرے استفسار سے ممکن تھا کہ اسے مزید ذہنی خلش کا شکار ہونا پڑتا۔ خاموشی اختیار کیے رکھنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ زبان کھولنے کی صورت میں بنی اسوان نے مجھے بھی دردناک موت کی دھمکی دی تھی۔ لیکن قطعِ نظر ان تمام باتوں کے، ایک خیال اکثر مجھے الجھاتا رہتا کہ کیا جو کچھ میں نے پہلی بار دیکھا اور محسوس کیا، وہ خواب تھا یا حقیقت تھی؟

اس روز بھی جب میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد حسبِ معمول کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے اپنے کیبن میں آیا تو میرے ذہن میں یہی سوالات رہ رہ کر گونج رہے تھے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ان پریشان خیالات کو ذہن سے جھٹک دوں لیکن اپنے ارادے میں کام یاب نہ ہو سکا۔ واقعات اور یکے بعد دیگر پیش آنے والے حالات نے مجھے اس خوف ناک کہانی کا ایک جزو بنا دیا تھا۔ اس سے چھٹکارا پانا میرے بس میں نہیں تھا۔

میں بستر پر لیٹا انھی خیالات کے تانوں بانوں سے الجھ رہا تھا کہ نہ جانے کب نیند پوری طرح مجھ پر غالب آ گئی اور میری آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ میری آنکھ کھلی تو کیبن میں گہری تاریکی تھی۔ میں نے اٹھ کر لائٹ آن کی۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو اندازہ ہُوا کہ میں پورے سات گھنٹے تک سوتا رہا ہوں۔

اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ میں ہاتھ مُنہ دھو کر اور لباس بدل کر جہاز کے ریکری ایشن روم تک جانے کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ دروازہ پر ہونے والی دستک کی آواز سُن کر ٹھٹک گیا۔ اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا دروازے کو گھورتا رہا۔ دوسری بار دستک کی آواز ابھری تو میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر ریحانہ کی جو اس وقت بے حد پریشان اور بدحواس نظر آ رہی تھی۔

"خیریت تو ہے؟" میں نے بہ عجلت سوال کیا۔

"جلدی چلیے طارق صاحب، وہ ...وہ..." وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور اپنے کیبن کی جانب خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے کی رنگت زرد ہوتی جا رہی تھی۔

"آپ کے بچے تو خیریت سے ہیں؟" میں نے کسی خیال کے پیشِ نظر تیزی سے پوچھا۔

"طارق صاحب... وہ... وہ خبیث پرویز کے سرہانے بیٹھا ہے۔" ریحانہ نے خوف سے تھرتھراتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کس خبیث کی بات کر رہی ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"مجھے اور میرے بچوں کو بچا لیجیے طارق صاحب... وہ کہیں پرویز کو بھی..."

ریحانہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی، اسے غش آ گیا۔ میں نے اگر بروقت اسے بازوؤں کے حصار میں نہ لیا ہوتا تو وہ بری طرح گرتی۔ کسی شدید صدمے کے تحت وہ بیہوش ہو گئی تھی۔ میں اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھائے اس کے کیبن میں داخل ہُوا تو وہاں اس کے دونوں محوِ خواب بچوں کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے ریحانہ کو بستر پر لٹانے کے بعد احتیاطاً پردوں کے پیچھے اور واش روم میں بھی جھانک لیا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا سب کہ ریحانہ نے چند منٹ پیش تر جو یہ کہا تھا کہ کوئی خبیث، پرویز کے سرہانے بیٹھا ہے۔ اس نے بڑی عاجزی سے مجھ سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ میں اسے اور اس کے بچوں کو اس خبیث سے بچا لوں۔

"وہ کون تھا؟" میرے ذہن میں پھر بنی اسوان کا ہیولا ابھرنے لگا۔

میں نے فوری طور پر ریحانہ کے کیبن ہی سے جہاز کے ڈاکٹر سے رابطہ کیا۔ اُس نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ ڈاکٹر نے کچھ دیر ضروری معائنہ کرنے کے بعد مجھے اس بات کا اطمینان دلایا کہ ریحانہ کی بے ہوشی معمولی نوعیت کی ہے اور اسے کچھ دیر بعد ہوش آ جائے گا۔ ڈاکٹر ضروری انجکشن لگا کر چلا گیا تو میں نے جا کر اپنے کیبن کو باہر سے لاک کیا۔ پھر دوبارہ ریحانہ کے پاس آ گیا۔ اس کے قریب دوسرے بستر پر بیٹھ کر اسے بہ غور دیکھنے لگا۔ بے ہوشی کی حالت میں بھی اس کے چہرے سے خوف مترشح تھا۔ میں نے سوچا، 'یقیناً مسز رحمان نے اپنی بہن اور شوہر کی موت کا بہت گہرا اثر قبول کیا ہے۔ اس لیے بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ ممکن ہے اس کی ذہنی کیفیت بہت زیادہ متاثر ہو گئی ہو۔' میں تادیر اسی اُلجھن اور ذہنی کش مکش میں مبتلا رہا۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد ریحانہ کو ہوش آ گیا۔ وہ بوکھلا کر اٹھی تھی لیکن مجھے قریب بیٹھا دیکھ کر اُس کے چہرے پر سکون کی ایک لہر آ کر گزر گئی۔ اس نے تیزی سے باری باری اپنے بچوں پر نظر ڈالی پھر دبی زبان میں مجھ سے پوچھا۔

"کیا... وہ چلا گیا؟"

"آپ کس کے بارے میں پوچھ رہی ہیں؟" میں نے کریدنے والا انداز اختیار کیا۔

وہ ایک لمحے تک اپنا ہونٹ چباتی رہی۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر رازداری سے بولی۔ "وہ... بنی اسوان ہی تھا..."

"بنی اسوان...؟" میرے ذہن میں جھماکا سا ہُوا۔ یہ وہی نام تھا جس نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی تھی اور اب ریحانہ کے مُنہ سے بھی وہی نام سن رہا تھا۔

میرے اعصاب میں تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ میں نے سوچا، 'اگر ریحانہ نے بھی بنی اسوان کو دیکھ لیا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ جہاز پر موجود تھا۔ ایسی صورت میں ریحانہ کا تعاون حاصل کر کے میں نہ صرف اس سے دو زندگیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے سلسلے میں باز پُرس کر سکتا تھا بلکہ جہاز کے کپتان کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کر کے بنی اسوان

کو بہ طور قاتل بھی پیش کر سکتا تھا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ ہمارے خاموشی اختیار کیے رہنے کی صورت میں وہ ریحانہ کے دونوں بچوں یا پھر ریحانہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔

''مسز رحمان... کیا آپ مجھے بنی اسوان کے بارے میں مزید کچھ بتانا پسند کریں گی؟'' میں نے نرمی سے اسے ہموار کرنے کی کوشش کی۔ مجھے اپنے ارادے میں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کچھ دیر وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی پھر بڑی مدھم اور مضمحل آواز میں کہنا شروع کیا۔

''اس بات کو بہت طویل عرصہ نہیں گزرا۔ آٹھ سال قبل میں اپنے والد کے ساتھ بڑے اشتیاق سے اہرامِ مصر دیکھنے کے شوق میں مصر گئی تھی... مصر میں ہمارا قیام ایک ہوٹل میں تھا۔ یہیں میری اور بنی اسوان کی پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ ایک مقامی تاجر کا اکلوتا لڑکا تھا۔ بے حد ملن سار، خوش گفتار اور مردانہ وجاہت کا نمونہ۔ ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ وہ ہمیں اپنی لمبی، خوب صورت اور قیمتی گاڑی میں دن بھر تاریخی مقامات کی سیر کراتا رہتا۔ رفتہ رفتہ ہماری بے تکلفی، محبت میں تبدیل ہوگئی۔ میرے والد نے بھی ہماری دوستی اور بڑھتے ہوئے میل ملاپ پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دوسری جانب بنی اسوان جذباتی انداز میں اس بات کو کئی بار دُہرا چکا تھا کہ میرے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔ ہر قیمت پر مجھے حاصل کرے گا۔

''ایک روز باہمی مشورے کے بعد بنی اسوان نے جب مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار والد صاحب سے کیا تو وہ یک لخت آگ بگولا ہوگئے۔ انھوں نے اس رشتے کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مصر کے بعد ہمارا پروگرام فرانس جانے کا بھی تھا لیکن والد صاحب بنی اسوان سے اس درجہ متنفر ہوئے کہ دوسرے ہی دن جہاز میں سیٹ بک کرائی اور مجھے لے کر واپس وطن آگئے۔''

ریحانہ نے ایک لمحے کے لیے اپنی منتشر یادداشت کو یکجا کیا۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

''وطن واپس آنے کے فوراً ہی بعد والد صاحب نے میجر رحمان سے میری شادی کر دی جو اُن کے ایک قریبی دوست کے لڑکے تھے۔ میں نے اس شادی پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔ شادی کے دو سال بعد تک مجھے بنی اسوان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ نہ ہی میں نے جاننے کی کوشش کی۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ خوش گوار زندگی گزار رہی تھی اور اپنے ماضی کو بھلانے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ پھر ایک دن مجھے اچانک بنی اسوان کا ایک خط ملا جس میں اس نے میری بے وفائی کا گلا بڑے جذباتی انداز میں کیا تھا۔ میں نے اس خط کو جلا کر راکھ کر دیا پھر بنی اسوان کو اپنی شادی کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ سخت الفاظ میں یہ تاکید بھی کی کہ وہ آئندہ مجھ سے رابطہ کرنے کی حماقت نہ کرے۔''

ریحانہ نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر بڑے مضمحل لہجے میں بولی۔

''میرا خیال تھا کہ بنی اسوان دوبارہ مجھے پریشان کرنے کی حماقت نہیں کرے گا... میرے شب و روز بڑے خوش گوار گزر رہے تھے۔ میرے شوہر کو مجھ پر مکمل اعتماد تھا لیکن... یہ اعتماد بھی بنی اسوان کی وجہ سے ختم ہوگیا... ایک روز میں حسبِ معمول گھر کے کام کاج میں مصروف تھی جب ملازم نے کسی نووارد کی آمد کی اطلاع دی۔ میں دروازے پر گئی تو بنی اسوان کو خلافِ توقع اپنے سامنے دیکھ کر دم بہ خود رہ گئی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں بے حد کم زور اور لاغر نظر آرہا تھا۔ [illegible] خوب صورت آنکھیں حلقوں میں دھنسی دھنسی نظر آرہی تھیں۔ میلا لباس، سر کے بال جھاڑ جھنکار کی طرح بڑھے ہوئے اور بے ترتیب، چہرے پر وحشت اور دیوانگی... آنکھوں میں حسرت اور مایوسی... میں کچھ دیر ہکا بکا کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر میں نے دل کڑا کر کے بڑی سختی سے اپنے بنگلے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ میرا خیال تھا کہ میری بے رُخی اور ترش لب و لہجہ اسے واپس جانے پر مجبور کر دے گا۔ لیکن وہ بہ دستور کھڑا بڑی حسرت سے کھڑا مجھے گھورتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا۔ قبل اس کے کہ میں کسی ملازم کو آواز دیتی اور اسے اپنی زندگی سے دُور کر دیتی، میرے والد کسی کام سے آگئے۔ انھوں نے بنی اسوان کو پہچانا تو آپے سے باہر ہوگئے۔ ملازموں کو آواز دے کر طلب کیا اور بنی اسوان کو حقیقتاً دھکے دے کر بنگلے سے باہر نکلوا دیا۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس آگئی۔

''والد صاحب کچھ دیر بعد میرے کمرے میں آئے تو ان کا پارہ چڑھا ہُوا تھا۔ بڑے تلخ انداز سے مجھے بنی اسوان کے سلسلے میں کریدنے لگے۔ میں نے ہر طرح انھیں اپنی بے گناہی کا یقین دلایا لیکن انھیں یقین نہیں آیا... میں اسے اپنی قسمت کی بدنصیبی ہی کہوں گی کہ میرے اور والد کے درمیان ہونے والی گفتگو میرے شوہر نے بھی سُن لی۔ بعد میں ملازم کی زبانی مجھے

علم ہُوا کہ میرے شوہر دفتر سے کسی کام سے آئے تھے لیکن دروازے پر رُک کر انھوں نے میرے اور والد کے درمیان ہونے والی تمام باتیں سُن لیں۔ پھر دروازے ہی سے واپس چلے گئے۔ اسی دن سے میرے شوہر کے برتاؤ میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی۔ ہمارے درمیان غلط فہمی کی ایک دیوار حائل ہوگئی۔ اُنھی دنوں میرے شوہر کو ملازمت سے ریٹائرمنٹ کا پروانہ مل گیا۔ وہ والد صاحب کے مشورے پر مجھے لے کر فرانس چلے گئے جہاں میری چھوٹی بہن فرزانہ اپنی تعلیم مکمل کر رہی تھی۔''

ریحانہ نے ایک جھرجھری لی۔ پھر دل شکستگی سے بولی۔

''طارق صاحب، آپ خود بھی دیکھ چکے ہیں کہ فرزانہ کس حد تک مجھ سے جذباتی وابستگی رکھتی تھی۔ فرانس پہنچ کر میرے شوہر نے میرے جذبات و احساسات کو یک سر نظر انداز کر کے فرزانہ میں دل چسپی لینی شروع کر دی۔ فرزانہ میرے مقابلے میں بہت زیادہ ماڈرن تھی، میرے شوہر نے اسے ہم وار کرنے کی خاطر یہ بھی بتا دیا کہ میں بنی اسوان نامی شخص کی محبت میں گرفتار تھی اور شادی کے بعد بھی اُس سے ملتی رہی۔

''میں نے اس الزام پر کوئی احتجاج نہیں کیا، میری خاموشی کو ہزاروں غلط معنی پہنائے گئے، طرح طرح کے الزامات تراشے گئے لیکن میں نے اُف تک نہ کی اور شوہر کو خوش رکھنے کی کوشش میں اپنے حصے کا کردار ادا کرتی رہی۔''

یہاں تک بیان کرنے کے بعد ریحانہ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے رونے سے منع نہیں کیا۔ جب اس کے دل کا غبار کچھ چھٹ گیا تو اس نے اپنے آنسوؤں کو خشک کیا پھر بڑے سوگوار لہجے میں بولی۔

''آج سے کوئی پندرہ دن پیش تر مجھے فرانس میں اپنے والد صاحب کا خط ملا کہ وہ سخت بیمار ہیں۔ میں نے شوہر سے جانے کی اجازت مانگی لیکن انھوں نے منع کر دیا۔ دو روز بعد دوسرا خط آیا کہ اگر آخری دیدار کرنا ہے تو فوراً پہنچو، اس خط کے ملنے کے بعد میرے شوہر بھی میرے ہم راہ واپس آئے۔ لیکن [illegible] بدنصیب تھی کہ والد کی موت سے پہلے ان سے دو بات بھی نہ کر سکی... فرانس سے روانگی کے وقت بھی میرے شوہر نے بنی اسوان کی آڑ میں جو کچھ ان کے مُنہ میں آیا، کہا اور اس بات کا عہد بھی کیا کہ وہ پہلی فرصت میں مصر جا کر بنی اسوان کو گولی مار کر [illegible] کا قصہ ہمیشہ کے لیے تمام کر دیں گے۔ والد کی موت کے تین دن بعد ہی انھوں نے اس جہاز پر نشستیں حاصل کر لی تھیں... [illegible] کے بعد جو کچھ ہُوا وہ آپ کے سامنے ہے...''

''کیا آپ کے شوہر نے بنی اسوان کو جہاز پر سفر کرتے دیکھ لیا تھا؟'' میں نے بڑی سنجیدگی سے سوال کیا۔

''میں اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن میں نے اُسے آج پہلی بار دیکھا... پرویز کے سرہانے بیٹھے ہوئے!''

''آپ کا ذہن کیا کہتا ہے؟'' میں نے بڑے تحمل سے پوچھا۔ ''کیا فرزانہ اور میجر رحمان کی موت میں بنی اسوان ہی کا ہاتھ ہے؟''

''میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی لیکن ... بہ ظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔'' اس نے رُندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

میں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ بعد از مرگ واویلا کرنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ میں کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے کیبن میں آگیا۔ اس وقت تک دونوں بچے محوِ خواب ہی تھے!

ہمارا سفر ختم ہونے میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ اس شام میری طبیعت بھی کچھ مضمحل تھی۔ میں اسنیک بار میں بیٹھا کافی سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ جہاز کا فرسٹ آفیسر جس سے میری واقفیت اچھی خاصی ہوگئی تھی، میرے قریب آکر بولا ''مسٹر طارق... میں صبح سے محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کچھ کھوئے کھوئے سے ہیں۔''

''ہاں... کچھ ایسی ہی بات ہے۔''

''کہیں آپ کو کسی حسینہ ہم سفر کے چھوٹ جانے کا ملال تو نہیں ہو رہا؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''اوہ... آپ کا اشارہ غالباً مسٹر رحمان کی بیوہ کی طرف ہے...'' میں نے اُداس لہجے میں جواب دیا۔ ''میرے دوست، تم جو سمجھ رہے ہو وہ غلط ہے۔ مسز رحمان ہم سب کی ہم دردی کی مستحق ہے۔ قدرت نے اس غریب کو جن حالات سے دوچار کر دیا، وہ پُراسرار بھی ہیں اور ناقابلِ فہم بھی۔''

''میں آپ کی بات سے سو فیصد متفق ہوں لیکن... یہ بھی اندازہ ہے کہ وہ بھی تمھاری ذات میں دل چسپی لے رہی ہے۔''

مجھے فرسٹ آفیسر کی بات سخت ناگوار گزری۔ وہ جس ملک کا باشندہ تھا وہاں انسانی احساسات کی باریکیوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ میں نے بڑی خوب صورتی سے گفتگو کا رخ بدل دیا۔ بحری سفر پر اُس کے تجربوں کی کہانی سنتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ جانے کے لیے پر تولنے لگا تو مجھے اچانک

بنی اسوان کا خیال آگیا۔ ہر چند کہ میں جہاز میں مسافروں کی فہرست بہ ذاتِ خود دیکھ چکا تھا لیکن مارٹن کو اس ضمن میں مزید ٹٹولنے میں کوئی حرج بھی نہیں تھی۔ چناں چہ میں نے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''مطمئن رہو... میں تم سے مونیکا کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا کہ تم خاص طور پر اس میں دل چسپی کیوں لے رہو ہو! البتہ بنی اسوان کے بارے میں اگر تم مجھے کچھ بتا سکو تو یہ تمھاری نوازش ہوگی۔''

میں نے بنی اسوان کا نام سن کر اُسے یک لخت سنجیدہ ہوتے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ یقیناً اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتا تھا جو اس نے بڑے خدشات سے میری طرف دیکھا۔ پھر اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھ گیا۔ کچھ توقف سے بولا۔

''میجر رحمان کی مسز کو پیش آنے والے حالات نے عملے کے ہر شخص کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مسافروں میں بھی تشویش پائی جا رہی ہے۔ لیکن... مجھے اور کپتان کو سب سے زیادہ حیرت ہے۔''

''وہ کیوں؟'' میں نے چونک کر دل چسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ ''کیا تم بنی اسوان کے بارے میں کسی اہم بات سے واقف ہو؟''

''ہاں... مارٹن نے اِدھر اُدھر دیکھ کر بڑی رازداری سے جواب دیا۔ ''وہ... وہ اس جہاز پر موجود ہے لیکن...''

''لیکن کیا...؟'' میں نے مارٹن کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دوستانہ انداز میں پوچھا۔ ''تم خاموش کیوں ہو گئے؟''

''مم... میں اسے براہِ راست نہیں جانتا۔ یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس کردار کا مالک رہ چکا ہے مگر اتنا بڑے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کسی کو قتل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔''

''حیرت انگیز!'' میں نے پہلو بدل کر مارٹن کو وضاحت طلب نظروں سے گھورا۔ ''جب تم اس کے کردار کے بارے میں کوئی معلومات ہی نہیں رکھتے تو پھر اس قدر وثوق سے اسے بے گناہ کیوں کہہ رہے ہو؟''

''اس لیے کہ وہ...'' مارٹن نے ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھا پھر میرے اور قریب ہو کر بڑی رازداری سے کہا۔ ''مسٹر طارق... مجھ سے ایک پکا وعدہ کرو۔ میں جو کچھ تمھیں بتاؤں گا اس کا ذکر تم کسی قیمت پر، کسی سے نہیں کرو گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔'' میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔ بنی اسوان کی حقیقت جان لینے کی خاطر میرے دل کی دھڑکنیں لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

''وہ بحری جہاز پر موجود ہے۔'' مارٹن نے نہایت مدھم آواز میں جواب دیا۔

''یقیناً وہ کسی بھیس میں نام بدل کر سفر کر رہا ہوگا... اس لیے کہ مجھے مسافروں کی فہرست اُس کا نام نظر نہیں آیا۔'' میں نے اپنی تفتیش کی بنیاد پر رائے کا اظہار کیا تو مارٹن نے بہ دستور سنجیدگی سے جواب دیا۔

''تمھاری معلومات بھی غلط نہیں ہیں لیکن بنی اسوان...''

مارٹن ایک لمحے کو خاموش ہو گیا پھر اس نے وہ راز اُگل دیا جو اس کے سینے میں محفوظ تھا۔ ''وہ... ایک لاش کی صورت میں لکڑی کے مضبوط تابوت میں بند ہمارے ساتھ سفر کر رہا ہے۔''

''لاش کی صورت میں...؟'' میں مارٹن کے اس انکشاف پر اچھل پڑا۔ پھر دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم مجھے تفصیل بتا سکتے ہو کہ بنی اسوان کن حالات میں مرا تھا؟''

''میں اس تفصیل کے بارے میں قطعی لاعلم ہوں...'' مارٹن نے صاف گوئی سے کہا۔ پھر ایک سگریٹ سلگا کر اُس کے دو چار طویل کش لینے کے بعد رازداری سے بولا۔ ''ہمیں اس کی لاش کا تابوت مصر کی بندرگاہ پر دیا گیا تھا... کپتان نے بحری قانون کے مطابق بغیر کسی مخصوص اجازت نامے کے اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن جب اسے بھاری رقم کی پیش کش ہوئی تو اُس نے مجھے بھی اعتماد میں لیا۔ اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا۔ یہ راز میرے اور کپتان کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا۔ تیسرے تم ہو...'' مارٹن نے کسمسا کر بات جاری رکھی ''اگر مجھے فرزانہ اور میجر رحمان قتل نہ ہوتے تو شاید میں اب بھی اپنی زبان بند ہی رکھتا۔ اب کہو بتاؤ کہ ایک لاش کو کسی کے قتل کا مرتکب کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔''

میں پھٹی پھٹی نظروں سے مارٹن کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''کیا تمھارے علم میں یہ بات بھی ہے کہ وہ تابوت کپتان کے حوالے کس نے کیا تھا؟''

''ممکن ہے اس نے غلط بیانی سے کام لیا ہو۔ مگر اس کا بیان یہی تھا کہ وہ مرحوم کا بدنصیب باپ ہے اور مصر میں ایک بڑے تجارتی ادارے کا مالک ہے... نہ ہوتا تو بھاری رقم کی آفر

تاثیر دعا

ایک دن ایک پیر صاحب علامہ اقبال سے ملنے آئے۔ اتفاقاً اُسی وقت اُن کا ایک مرید نہایت بے چین اور مضطرب، ہانپتا کانپتا آیا، اور پیر صاحب کے پیروں میں گر پڑا، اور کہا، ''حضور کی آمد کی اطلاع ملی تو بھاگا بھاگا آیا ہوں۔ حضور! میری حالت بڑی خراب ہے! دو سو روپے کا قرض دار ہو چکا ہوں۔ حضور! میرے لیے دعا فرمائیں کہ یہ قرض ادا ہو جائے۔ یہ کہہ کے اُس نے دو روپے نذر کیے۔ پیر صاحب نے دونوں روپے جیب میں ڈال لیے، اور ہاتھ اٹھا کر اُس کے لیے دعا کرنے لگے۔

یہ نظارہ دیکھ کر علامہ اقبال سے رہا نہ گیا۔ آپ نے بھی فوراً آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے، اور بلند آواز سے دعا مانگنی شروع کر دی، ''خدایا! آج کل کے پیر گم راہ ہو گئے۔ انھیں ہدایت دے، اور اے خدا! آج کل کے مریدوں کو بھی ہدایت دے کہ پیروں کے کہنے میں نہ آئیں۔ یا الٰہی! یہ نادان مرید کہتا ہے کہ میں دو سو روپے کا مقروض ہوں، مگر یہ نہیں جانتا کہ دو سو روپے کا نہیں، بلکہ دو سو دو روپے کا مقروض ہے۔''

پیر صاحب بہت برہم ہوئے، مگر علامہ اقبال بولے، میں تو یہ دعا اُس وقت تک مانگے جاؤں گا، جب تک آپ یہ دو روپے مرید کو واپس نہ کر دیں گے!''

آخر تنگ آ کر پیر صاحب نے دو روپے واپس کر دیے، اور اقبال سے جان چھڑائی۔ بعد میں مرید کو علامہ اقبال نے کہیں نوکر کرا دیا، جس سے اُس کی مالی مشکلیں آسان ہو گئیں۔

تعاون ✪ کاشف حسین غائر

کس طرح کرتا!''

''ایک بات اور...'' میں نے سوال کیا۔ ''تمھیں یا کپتان کو بنی اسوان کا نام کس طرح معلوم ہوا؟''

کپتان نے احتیاطاً لاش کے سلسلے میں اپنا اطمینان کرنے کے لیے خاطر موت کا سرٹیفکیٹ طلب کر لیا تھا۔ اس میں بنی اسوان کا نام اور موت کا سبب بھی درج ہے...'' مارٹن نے اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''کپتان کو صرف اتنا کرنا ہے کہ تابوت کو مسافروں کی نظروں سے بچا کر ایک خاص بندرگاہ پر اتارے اور میرے ذریعے اس پتے پر ڈیلیور کرا دے جو کپتان کو دیا گیا ہے۔ کپتان نے اس کام کے عوض بھی کچھ اضافی رقم اینٹھ لی تھی۔''

''کیا تمھیں وہ پتا یاد ہے؟'' میں نے بے تابی کا مظاہرہ کیا۔ مارٹن نے جس مخصوص بندرگاہ کا نام لیا تھا، وہی میری اور ریحانہ کی منزل بھی تھی۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' اس نے مدھم آواز میں کہا۔

میں مارٹن کے ساتھ اس کے کیبن میں گیا۔ دروازے کو اندر سے بولٹ کرنے کے بعد اس نے اپنی آہنی الماری سے ایک فائل نکال کر میرے حوالے کر دی جس میں بنی اسوان کی موت کا سرٹیفکیٹ بھی تھا۔ اس کے ساتھ وہ پتا بھی ایک علاحدہ کاغذ پر درج تھا جس پر نظر پڑتے ہی میرے دل کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ ریحانہ کے گھر کا مکمل پتا تھا۔

میرے ذہن میں بہت سارے بیتے واقعات ابھرنے لگے۔ دُھند زدہ رات میں جس نے مجھ سے کشتی کو سمندر میں اتارنے کی درخواست کی تھی اس نے بھی اپنا نام بنی اسوان بتایا تھا... ریحانہ کا بیان تھا کہ وہ بنی اسوان کو خود اپنی نظروں سے اپنے بچے کے سرہانے بیٹھا دیکھ چکی تھی... معاً میرے ذہن میں ایک خیال بجلی بن کر کوندا۔ کہیں بنی اسوان زندہ ہونے کے باوجود، تابوت میں بند لاش کی حیثیت میں سفر نہ کر رہا ہو۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' مارٹن نے میرے چہرے سے میرا تجسس محسوس کرتے ہوئے کہنی مار کر پوچھا۔

مارٹن کی آواز میرے کانوں میں گونجی تو میں چونک اٹھا۔ پھر میں نے بڑی عاجزی سے اس سے ایک درخواست کی۔

''میرے دوست... کیا تم کسی طرح مجھے ایک نظر وہ تابوت دکھا سکتے ہو؟''

''مشکل کام ہے۔ اگر مسافروں کو علم ہو گیا تو جہاز میں افراتفری پھیل جائے گی۔ کپتان بھی مجھ سے جواب طلب کرے گا۔ اس کے علاوہ ایک بات اور میری سمجھ سے باہر ہے...'' مارٹن نے مجھے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا ''تم، ایک مردہ شخص کو دیکھ کر کس نتیجے پر چھلانگ لگانے کے خواہش مند ہو؟''

"کیا تم نے یا کپتان نے تابوت وصول کرنے کے بعد اسے کھول کر دیکھا تھا؟"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" مارٹن نے معنی خیز نظروں سے مجھے گھورا۔

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جس تابوت کو یہ کہہ کر تمھارے حوالے کیا گیا ہو کہ اس میں بنی اسوان کی لاش ہے، اُس میں وہ زندہ حالت میں مردہ بنا لیٹا ہو۔"

مارٹن میری بات سُن کر بری طرح چونکا۔ ایک لمحے تک وہ کسی ذہنی الجھن میں مبتلا رہا۔ پھر اس نے اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا۔

اسی رات پروگرام کے مطابق مارٹن مجھے جہاز کے نچلے حصے میں لے گیا جہاں بنی اسوان کے تابوت کو دیگر سامان سے الگ تھلگ اس طرح ترپال ڈال کر ڈھانکا گیا تھا کہ وہ کسی کی نظروں میں نہ آسکے۔

جس وقت مارٹن انتہائی محتاط انداز میں تابوت کھولنے میں مصروف تھا، میرے دل کی کیفیت غیر ہوتی جارہی تھی۔ جب مارٹن تابوت کا ڈھکن کھولنے لگا تو خود اُس کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ پھر تابوت کا ڈھکن کھلنے کے بعد مارٹن کے چہرے پر بھی خوف اور دہشت کے تاثرات پھیل گئے۔ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر تابوت کے اندر نظر ڈالی تو میری آنکھیں بھی پھٹی پھٹی رہ گئیں... تابوت خالی تھا۔ البتہ کافور اور کسی لاش کو محفوظ کرنے کے لیے جو ضروری مسالا جات استعمال کیے جاتے ہیں، ان کی تیز بُو خالی تابوت سے پھوٹ رہی تھی۔

میں اور مارٹن دونوں ہکا بکا کھڑے ایک دوسرے کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ یک لخت میرے ذہن میں ایک ہول ناک خیال اُبھرا۔ دوسرے ہی لمحے میں پلٹ کر دروازہ کھولتا ہُوا تیزی سے فرسٹ کلاس کے کیبنوں کی طرف دوڑنے لگا۔ میری چھٹی حس کسی خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔

ریحانہ کے کیبن کے دروازے پر پہنچ کر میں بس ایک ثانیے کو رُکا۔ پھر میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے دروازہ کھول کر کیبن کے اندر قدم رکھا تو وہاں اعصاب کو جھنجوڑ ڈالنے والا ایک منظر میرے سامنے تھا... ریحانہ کی اکڑی ہوئی لاش کیبن کے چھت پر جھولتی نظر آرہی تھی۔ دونوں بچے اپنے اپنے بستروں پر موجود تھے لیکن ان کی آنکھیں اپنے حلقوں سے ابل کر باہر آگئی تھیں۔ قاتل نے انھیں بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ان مناظر کو دیکھ کر میری جو کیفیت ہوئی اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں... میں کچھ دیر کھڑا ان اکڑی ہوئی لاشوں کو باری باری دیکھتا رہا پھر پلٹ کر باہر آگیا۔ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں واپس مارٹن کی طرف جارہا تھا کہ وہ مجھے راستے میں مل گیا۔

"کیا بات ہے مسٹر طارق...؟" اس نے میرے چہرے پر نظر ڈال کر حیرت سے پوچھا۔ "سب خیریت تو ہے؟"

"نہیں..." میں نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔ "بنی اسوان نے ریحانہ اور اس کے معصوم بچوں کو بھی قتل کر دیا۔"

"مائی گاڈ!" مارٹن نے بوکھلا کر کہا۔ پھر میرا ہاتھ تھام کر دوبارہ بیگیج روم کی طرف لپکا جہاں وہ تابوت کھلا چھوڑ آیا تھا۔ پھر اس وقت ہم دونوں کے ذہنوں کو ایک اور شدید جھٹکا پہنچا جب ہم نے تابوت کے قریب پہنچ کر اس کے اندر جھانکا۔ دونوں ہی کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ لاش کچھ دیر پہلے تابوت سے غائب تھی اس وقت کفن میں لپٹی بے حس و حرکت موجود نظر آرہی تھی۔ مارٹن نے ڈرتے ڈرتے سر کے قریب سے کفن کو تھوڑا سا ہٹا کر اس بات کی تصدیق بھی مجھ سے کرالی کہ وہ لاش بنی اسوان کے سوا کسی اور کی نہیں تھی۔ میں نے مارٹن سے اجازت لیے بغیر خاموشی سے جیب سے اپنا بال پین نکال کر لاش کے پیٹ کے مقام پر زور سے چبھو دیا لیکن اس میں قطعاً برابر حرکت نہیں ہوئی۔ مارٹن نے جلدی جلدی تابوت کو دوبارہ کیلیں ٹھونک کر بند کر دیا۔ پھر ہم دونوں باہر آگئے۔

"مائی گاڈ!" مارٹن نے اپنے سینے پر سیدھے ہاتھ کی الٹی سے صلیب کا نشانہ بناتے ہوئے، ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں اپنی اٹھائیس سالہ ملازمت کے عرصے میں اتنے خوف ناک تجربے سے کبھی دوچار نہیں ہُوا۔ مقدس یسوع مسیح ہم دونوں کو اپنی امان میں رکھے۔"

حسبِ معمول کپتان نے نئے حادثے کی خبر ملنے پر انتہائی خاموشی سے میری موجودگی میں ضروری رسومات ادا کرکے رات کی تاریکی میں تین عدد لاشیں اور سامان کی دو پیٹیاں کے حوالے کر دیں۔

اسی رات میں اپنے کیبن میں لیٹا گزرے ہوئے حالات پر غور کر رہا تھا جب دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ میں سے لرز اٹھا۔ میں نے سوچا۔ "کیا بنی اسوان اب مجھے بھی

کر دینا چاہتا ہے؟" ہر چند کہ اس کے لیے دروازے کی بندش کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ پھر بھی میں نے طے کرلیا کہ دروازہ کسی قیمت پر نہیں کھولوں گا۔ بہ ہر حال بستر سے اٹھ کر میں دبے قدموں دروازے کے قریب گیا اور اونچی آواز میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

"دروازہ کھولو، مسٹر طارق... میں مارٹن ہوں۔"

مارٹن کی آواز پہچان کر میں نے دروازہ کھول دیا جسے اس نے اندر آنے کے بعد دوبارہ بولٹ کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بند لفافہ تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے تجسس سے دریافت کیا۔

"یہ وہ لفافہ ہے جو ہمیں تابوت کے ساتھ دیا گیا تھا۔" مارٹن نے دبی زبان میں جواب دیا۔ پھر بڑی احتیاط سے لفافے کو کھول کر اندر سے ایک کاغذ نکالا۔ یہ ایک پیغام تھا جو خط کی صورت میں بنی اسوان کے والد کی طرف سے ریحانہ کے والد کو تحریر کیا گیا تھا۔ ہم دونوں نے سر جوڑ کر اسے پڑھنا شروع کیا... لکھا تھا:

میرے محترم دوست!

میں بدنصیب باپ ہوں جو اپنے اکلوتے بیٹے کی تدفین کرنے کے بجائے اسے تمھارے پاس روانہ کر رہا ہوں۔ بنی اسوان کی وصیت کے مطابق میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ اس خط کے ساتھ ہی میں نے باقاعدہ قانونی دستاویزات بھی کفن کے اندر بہ حفاظت محفوظ کر دی ہیں۔ میرے بیٹے نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے نام کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد تمھاری بیٹی ریحانہ کے نام کر دی جائے۔ اس کی آخری خواہش کا احترام بھی میں ایک فرض سمجھ کر کر رہا ہوں۔

میرے عزیز! تم نے میرے بیٹے کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ سچ پوچھو تو وہ اسی دن مر گیا تھا جس دن تم نے ریحانہ کے ساتھ اس کے رشتے کو بڑی حقارت سے مسترد کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک چلتی پھرتی لاش بن گیا تھا جسے دنیا کی کسی چیز سے کوئی سروکار نہیں رہ گیا تھا۔ نہ خود سے، نہ ہی اپنے اس بوڑھے باپ سے جس نے اس کے مستقبل کے لیے بڑے اونچے اونچے خواب بُنے تھے۔ کئی ہفتوں وہ گھر سے غائب رہتا، جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرتا۔ ایک دن گھر آیا تو اپنے اجاڑ کمرے میں بند ہو کر رہ گیا۔ چار روز کے صبر آزما انتظار کے بعد ہم نے کمرے کا دروازہ توڑا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کے سینے پر، میرے نام اس کا آخری خط رکھا تھا۔ اسی کی خواہش کے پیشِ نظر میں اس بدنصیب کا تابوت تمھارے پتے پر کسی نہ کسی طرح روانہ کر رہا ہوں۔ میری درخواست ہے کہ تم کم از کم میرے بیٹے کی لاش کے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہیں کرو گے۔ اس کے تابوت کو ریحانہ کے پہلو میں دفن کر دینا۔ شاید میرے مظلوم بیٹے کو یہ امید رہی ہو کہ جسے وہ زندگی میں نہ حاصل کر سکا، دوسری دنیا میں پالے گا!

بنی اسوان کا حرماں نصیب باپ

"حیرت انگیز!" مارٹن نے خط پڑھنے کے بعد بڑے تعجب سے پوچھا۔ "یہ بات مرنے والے کے والد کو کس طرح معلوم ہوئی کہ تابوت کو دفن کرنے سے پیش تر ریحانہ بھی اس دنیا میں نہیں ہوگی؟"

"خدا ہی بہتر جانے۔" میں نے ایک طویل سانس مُنہ سے خارج کرتے ہوئے جواب دیا۔

مارٹن نے لفافے کو پوری احتیاط سے دوبارہ بند کیا۔ پھر کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا تو میں نے نائٹ بلب آن کیا اور ان حادثوں پر غور کرنے لگا جو میرے سامنے رونما ہو چکے تھے۔

میں نے جو واقعات رقم کیے ہیں انھیں گزرے پندرہ برس بیت چکے۔ مجھے نہیں معلوم کہ بنی اسوان کے تابوت کے ساتھ ریحانہ کے باقی ماندہ عزیز داروں نے کیا سلوک کیا ہوگا۔ نہ ہی اس بات کا علم ہے کہ جہاز راں کمپنی کے ذمّے داروں نے ریحانہ، اس کے شوہر، بچوں اور بہن کی پُراسرار موت کے بارے میں کیا توجیہہ پیش کی۔

ذاتی طور پر اس سوال کے جواب میں کہ کیا کوئی مرنے کے بعد بھی اپنی محبت کو پالینے کی خاطر بنی اسوان جیسی درندگی کا مظاہرہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے، میں یہی جواب دوں گا کہ کم از کم میری عقلِ سلیم اس بات کو تسلیم نہیں کرتی!

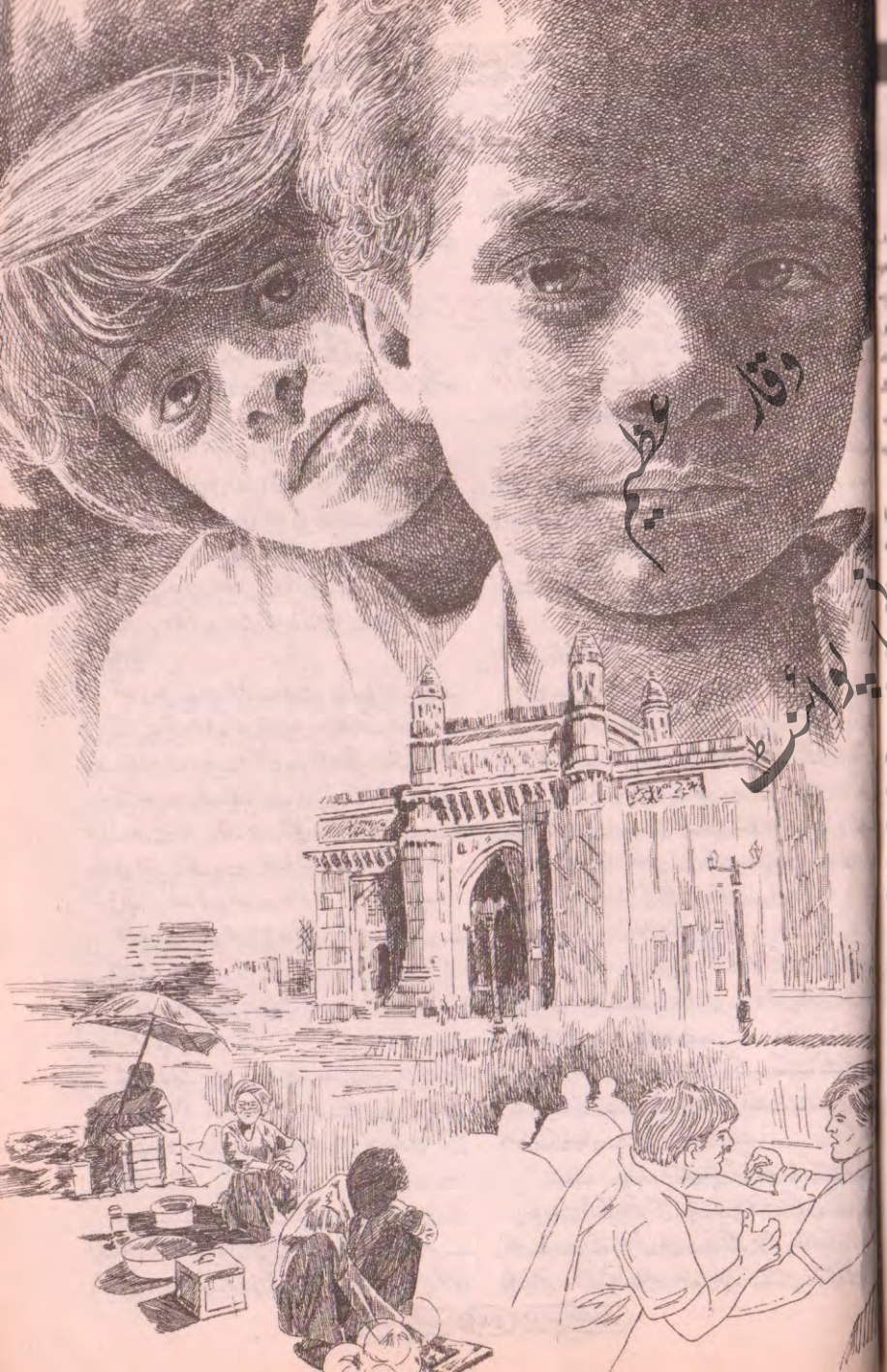

معصومیت کے مُتلاشی بھگوان کی، دھرتی یاترا کا جاں گداز احوال

دادر پُل کے بچے

کرشن چندر

زیرِ نظر کہانی کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اسے کرشن چندر نے لکھا ہے۔ اس کا موضوع، دلچسپ اور حسن بیان اس کی زینت و آرائش ہیں۔ کرشن سے محبت، سہ رنگ کے عُشاق کی مُشترکہ قدر ہے۔ زندگی کے جتنے پرتو ہیں، جتنے زاویے کرشن پر وا ہوئے... شاید ہی کسی پر زندگی یوں آشکارا ہوئی ہو۔ زندگی کے دھوپ چھاؤں روپ، اور اُس کے زندانیوں کے رُخ بھی، اُن کے محسوسات، دروغ کے فیاضانہ اور سچ پہ آرے تھپڑ جڑنے والی بار کو انھوں نے خوب سمجھا... اور اسی خوبی سے بیان بھی کیا۔ سنگین حقائق کے پہلو میں شگفتہ چٹکی لینا، آنسو چھلکتی آدم زاد کی اذیت میں یوں بیان کرنا کہ اذیت بھی تڑپ اُٹھے... اور معاشرے کے ناسوروں کی جراحی، کچھ انھی کے قلم کا خاصّہ تھا۔ یہ اُن کے سادہ اور رواں بیان کا کرشمہ بھی تو ہے کہ یہ تحریر آج بھی روزِ اوّل جتنی تر و تازہ اور پُرتاثر ہے۔ پڑھیے اور دیکھیے کہ دھرتی کے باسی اپنی پاکیزگی، اپنی معصومیت اور اپنا مستقبل کس طرح داغ دار کر رہے ہیں!

ایک روز کا ذکر ہے میں دو دن کا بھوکا، اپنی فاقہ مست زندگی سے جھلایا ہُوا، پریشان حال کولی واڑہ چال کی ایک تاریک کھولی میں بیٹھا ہُوا، اپنی پھٹی بنیان سے جوئیں چُن رہا تھا کہ بھگوان میری کھولی میں داخل ہوئے۔ بولے۔ ''میں تمھارے شہر کے بچوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

میں نے جھلّا کر کہا۔ ''جاؤ جاؤ، میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔''

بھگوان نے کہا۔ ''اگر تم میرے ساتھ چلو گے تو میں تمھیں نکڑ کے ریستوراں سے دو سلائس، ایک انڈے کا آملیٹ اور ایک سنگل چائے پیش کروں گا۔''

''سچ بولتے ہو؟ کہ خالی پیلی بوم مارتے ہو؟'' میں نے بے یقین نگاہوں سے بھگوان کو تاکتے ہوئے پوچھا۔

بھگوان نے جیب سے دس کا ایک نوٹ نکالا اور اسے میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

میں فوراً اٹھ کھڑا ہُوا۔ ''تو پہلے کیوں نہیں بولا...؟'' میں نے ترش رو ہو کر کہا۔ ''ہمارا ٹائم کھوٹی کیا۔ اور بمبئی میں کوئی کام پھوکٹ میں نہیں ہوتا۔''

ایرانی ریستوراں میں جا کر میں نے بیرے کو بولا۔ ''دیکھو، صاحب جو مانگیں انھیں دے دو۔ مگر مجھ کو چار سلائس، دو انڈے کا آملیٹ اور ایک ڈبل چائے فوراً دو!''

بھگوان نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر میں نے تو صرف دو سلائس، ایک انڈے کا آملیٹ اور ایک سنگل چائے کا وعدہ کیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے سورگ ریستوراں کو ذہن میں رکھ کر آرڈر دیا ہوگا۔ مگر یہ سورگ نہیں ہے، یہ بمبئی ہے۔ یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ شاید تم نے کبھی بمبئی کا سلائس نہیں دیکھا۔ کتنا مہین، پتلا اور باریک کٹا ہُوا ہوتا ہے کہ تم اس کے آر پار دیکھ سکتے ہو۔ اور اس کو تھوڑا سا مکھن لگا کر اُس سے شیو بھی کر سکتے ہو۔ اور انڈے بمبئی کی مرغی کے انڈے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ آملیٹ خوردبین کی مدد سے کھانا پڑتا ہے! رہا سنگل چائے کا کپ؟ یہ کپ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ ایک فلسوبھی اس میں مشکل سے سما سکتا ہے!''

مگر بھگوان نے میری بات نہیں مانی۔ اور میں ان کی بات نہیں مانا۔ دس منٹ تک ہم دونوں جھگڑتے رہے۔ آخر جب ریستوران کے مالک نے پولیس کو بلانے کی دھمکی دی تو یکایک بھگوان مان گئے اور انھوں نے فوراً میرے لیے چار سلائس، دو انڈے کا آملیٹ اور ڈبل چائے کا آرڈر دے دیا۔ اور اپنے لیے اسپرو کی ایک ٹکیہ منگالی۔

میں نے کہا۔ ''تم نے خوامخواہ لفڑا کیا۔ اگر تم پہلے ہی میری بات مان جاتے تو اس وقت اسپرو کھانے کی ضرورت نہ پڑتی!''

بھگوان نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ''بھئی آج کل فارن ایکسچینج کی بڑی دِقّت ہے۔ سورگ سے بمبئی آنے کے لیے مجھے صرف سو روپے ملے ہیں اور جانے کتنے روز مجھے یہاں رہنا پڑے۔ اس لیے ایک ایک پائی پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔''

''اماں ہٹاؤ بھی...!'' میں نے جل کر کہا۔ ''تمھیں فارن ایکسچینج کی کیا دقّت ہوگی۔ یہ سب مصیبت تو ہم غریبوں کے لیے ہے۔ جب ہمارے دیس کے ایک معمولی کارخانے کے مالک کو فارن ایکسچینج کی کوئی دقّت نہیں ہوتی... تو تم تو ساری دنیا کا

کارخانہ چلاتے ہو، تمہیں کیا دقت ہو سکتی ہے؟''

''تم نہیں سمجھتے ہو...؟'' بھگوان نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''بھگوان کو بھی قاعدے قانون سے چلنا پڑتا ہے ورنہ یہ دنیا نہیں چلے گی!''

''کیسے نہیں چلے گی؟''

''کیسے چلے گی؟ اگر میں اس وقت تمہارے سلائس کو لوہے کا پترا بنادوں۔ تو تم اسے کیسے چباؤ گے؟''

میں نے کہا۔ ''بمبئی کے بعض ہوٹلوں میں لوہے کے پترے سے زیادہ سخت سلائس چبانے پڑتے ہیں!''

''اگر میں تمہاری چائے میں زہر ملادوں، تو تم مر نہیں جاؤ گے؟''

''بمبئی میں روز ہم لوگ زہریلی ہوئی چائے پیتے ہیں۔''

''اگر میں روشنی کی رفتار اتنی کم کردوں کہ وہ سورج سے زمین تک آتے آتے تین میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلنے لگے... تو جب تک روشنی تم تک پہنچے گی، کیا تم مر نہ جاؤ گے؟''

میں چپ ہو گیا۔ بھگوان نے آخری بات تو بالکل ٹھیک کہی تھی۔ میں سر جھکا کر پلیٹ میں آملیٹ ڈھونڈنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ دادر پل کے نیچے کھڑے تھے۔ پل کے نیچے ایک طرف مندر تھا جہاں سادھو بھنگ گھوٹ رہے تھے۔ ایک طرف ریلوے اسٹیشن کے آہنی جنگلے سے لگے خارش زدہ کتے سو رہے تھے۔ ایک طرف کچرا پٹی کے ڈھیر تھے۔ ایک طرف دادر پل کا زینہ تھا۔ جہاں پھٹی گدڑیوں میں لپٹے ہوئے بھکاری بھیک مانگ رہے تھے، غرضیکہ شمال، مغرب، جنوب مشرق جدھر دیکھو، خوب صورت مناظر نظر آتے تھے!

بھگوان نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ ''یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟''

''بچوں سے ملانے کے لیے؟''

''مگر بچے ہیں کہاں؟''

میں نے کہا۔ ''بچوں سے ملنے سے پہلے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم دونوں بھی کچھ عرصے کے لیے بچے بن جائیں؟ میرا خیال ہے یہ کام تم بہ آسانی کر سکتے ہو۔ اس میں فارن ایکسچینج نہیں لگتا ہے!''

دوسرے لمحے میں ہم دونوں بچے بن گئے۔ ہم دونوں نے ایک پھٹی نیکر اور ایک پھٹی میلی چکیلی بنیان پہن رکھی تھی۔ میرے ہاتھ میں امرود کی ایک ٹوکری تھی۔ بھگوان نے اپنے سر پر لکڑی کی ایک بڑی سی ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں انھوں نے بچوں کے پڑھنے کے لیے بڑی خوب صورت اور رنگین کتابیں سجا رکھی تھیں۔ ہم دونوں جلدی سے دادر پل کا زینہ چڑھ کر پل کے اوپر جا پہنچے۔ اور میں نے جلدی سے ٹوکری اُتار کر لوہے کے جنگلے کے قریب رکھ دی۔

''اے! کیا کرتا ہے...؟'' ایک بُڑھیا زور سے چلائی۔ ''ٹوکری یہاں سے اٹھاؤ۔''

وہ ایک بدمزاج اور بدصورت بُڑھیا تھی۔ اور اس کی آواز بے حد بھیانک اور کرخت تھی۔ اس نے بھی میری طرح اپنی ٹوکری میں امرود سجا رکھے تھے۔

میں نے کہا۔ ''یہ سرکاری پُل ہے۔ یہاں ہر کوئی اپنا سودا بیچ سکتا ہے۔ دیکھ لو، چاروں طرف لوگ اپنا اپنا مال بیچ رہے ہیں۔ پھر میں یہاں کیوں نہ بیٹھوں؟ تمہارے باپ کا پُل ہے؟''

بُڑھیا کے بالکل قریب ایک آٹھ سال کا لڑکا اپنے سامنے ایک ٹوکری رکھے بیٹھا تھا۔ جس میں کیلے بھرے تھے۔ اس نے گھور کر غصے سے مجھے تاکا پھر بولا۔ ''ٹوکری اٹھاتے ہو کہ نہیں؟''

میں نے کوئی جواب دینے سے پہلے اس لڑکے کی طرف دیکھا۔ قد میں، عمر میں اور طاقت میں بھی وہ مجھ سے کم دکھائی دیتا تھا۔ لہٰذا میں نے اکڑ کر کہا۔ ''نہیں اٹھاؤں گا۔ یہیں بیٹھوں گا۔''

وہ لڑکا بجلی کی سی تیزی سے اٹھا۔ دوسرے لمحے میں اس کی ایک ٹانگ میرے پیٹ میں تھی۔ ایک گھونسا میرے مُنہ پر تھا۔ اور میں زمین پر تھا۔ بھگوان نے مجھے بچانا چاہا تو ایک مُکا ان کے مُنہ پر بھی پڑا اور ان کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔

''اٹھاؤ ٹوکری!'' وہ لڑکا تحکمانہ لہجے میں بولا۔

میں نے بھگوان کی طرف دیکھا۔ مگر بھگوان اپنی ناک پونچھنے میں مصروف تھے۔ لہٰذا میں نے ٹوکری اٹھالی اور ہم دونوں خاموشی سے آگے کو ہو لیے۔

چار قدم آگے جا کر بھگوان نے آہستہ سے کہا۔ ''میں اسے ایسا مُکا مارتا کہ اسے دن میں تارے نظر آجاتے۔ مگر یہ میرے اصول کے خلاف ہے!''

''بے شک، بے شک!'' میں اپنی کمر سہلاتے ہوئے بولا۔

چار قدم آگے جا کر ہمیں ایک اور لڑکا ملا جو لکڑی کے ایک چھوٹے سے تختے پر فونٹن پین رکھے انھیں بیچ رہا تھا اور آوازیں لگا رہا تھا... اصلی شیفر کا پین، صرف چار آنے میں۔ اصلی شیفر کا پین، صرف چار آنے میں!''

بھگوان نے حیران ہو کر مجھ سے پوچھا۔ ''اصلی شیفر کا پین تو پچھتر روپے میں بھی نہیں مل سکتا، یہ اسے چار آنے میں کیسے بیچ سکتا ہے؟''

''ہو سکتا ہے۔ اس کا باپ کروڑ پتی ہو...!'' میں نے کہا۔ ''اور خلقِ خدا کا بھلا کرنا چاہتا ہو۔ آؤ اسی بھلے لڑکے کے قریب بیٹھ جائیں۔''

''جاؤ۔ جاؤ...'' اس لڑکے نے ہمیں اپنے قریب آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ''کہیں کوئی دوسری جگہ دیکھو۔ میری گاہکی خراب نہ کرو۔''

میں نے کہا۔ ''دوست میرے پاس تو امرود ہیں۔ اور اس کے پاس کتابیں ہیں۔ پھر ہمارا تمہارا کیا مقابلہ؟''

وہ لڑکا بڑی تلخی سے بولا۔ ''معلوم ہوتا ہے نئے نئے آئے ہو دادر پل پر۔ ورنہ یہ بات نہ کہتے۔ مگر، کبھی گاہک کی صورت بھی دیکھی ہے؟ جانتے ہو گا کہ گاہک کا مزاج ایک پل میں کیسے بدلتا ہے۔ آئے گا فونٹن پین لینے اور چلا جائے گا امرود لے کر... جاؤ بھاگو یہاں سے ورنہ...؟''

وہ لڑکا ہم دونوں سے ٹکرا بھی تھا۔ لہٰذا ہم دونوں فوراً وہاں سے ہٹ کر کھڑے ہوئے۔

آگے جا کر بھگوان نے خفیف ہو کر مجھ سے کہا۔ ''تم سمجھتے ہو وہ مجھ سے گھبرا گیا تھا؟ یہ بات نہیں ہے۔ میں تو اسے وہیں ختم کر دیتا مگر یہ بات میرے اصول کے خلاف ہے!''

''کیوں نہیں! کیوں نہیں!'' میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

اب ہم پُل کے بالکل آخری کونے پر آپہنچے تھے۔ راستے میں کسی نے بھی ہمیں اپنے نزدیک بیٹھنے نہیں دیا۔ یہاں آخری کونے پر ایک لڑکا... نہیں، اسے لڑکا کہنا غلطی ہوگی، ایک نوجوان بیس بائیس برس کی عمر کا ایک سیاہ اور کہنہ چھاتا کھولے، اس میں رنگا رنگ رومال سجائے کھڑا تھا۔ جب وہ چھاتا گھماتا تو گویا دھنک کے ساتوں رنگ ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے تھے۔ بھگوان نے انتہائی شیریں لہجے میں اس سے کہا۔ ''ہم تمہارے پاس اپنی دکان لگالیں؟''

اس نوجوان نے کہا۔ ''لگالو۔ مگر چار چار آنے نکالو۔''

بھگوان نے جلدی سے ایک اٹھنی نکال کر اسے دے دی۔ ہم دونوں اس کے قریب بیٹھ کر اپنا سودا بیچنے لگے۔ ایک گھنٹا گزر گیا۔ میں نے تو چھ امرود بیچ لیے مگر بھگوان کی ایک کتاب بھی نہیں بکی۔

بھگوان نے ناامید ہو کر کہا۔ ''اتنے چاؤ سے میں بچوں کے لیے کتابیں لایا تھا۔ مگر کوئی خریدتا نہیں!''

وہ نوجوان طنزیہ انداز میں ہنسنے لگا۔

بھگوان نے اس نوجوان سے پوچھا۔ ''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ کیا بمبئی میں بچے پڑھتے نہیں ہیں؟''

''پڑھتے ہیں...!'' وہ نوجوان بڑی دل جمعی سے بولا۔ ''میں خود بی اے پاس ہوں!''

''بی اے پاس ہو اور رومال بیچتے ہو؟'' بھگوان نے بڑی حیرت سے اسے تاکتے ہوئے کہا۔

نوجوان پھر ہنسا۔ اس نے قریب کے ایک ساتھی کو آواز دی۔ ''اے وکٹر، ذرا اِدھر آؤ۔''

وکٹر جو اسمگل کی ہوئی گھڑیاں بیچ رہا تھا، ہمارے قریب آیا۔ رومال بیچنے والے نے وکٹر کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ وکٹر ہے۔ ایف اے پاس ہے۔''

پھر اس نے آس پاس کے دوسرے لڑکوں سے تعارف کرایا۔ ''یہ شریف ہے، انٹر پاس ہے۔ یہ دھولے ہے، آٹھویں پاس ہے۔ یہ فیروز ہے، یہ ساتویں میں پڑھتا ہے۔ یہ گورکھا ہے، یہ پانچویں میں پڑھتا ہے۔ اور عورتوں کی چولیاں بیچتا ہے۔''

''مگر...'' بھگوان نے ان سب کی طرف حیرت سے دیکھ کر کہا۔ ''تم لوگ اسکول یا کالج کس وقت جاتے ہو؟''

''ہم لوگ کبھی اسکول یا کالج نہیں گئے!'' وہ لوگ قہقہہ مار کر بولے۔

''پھر تم کس طرح اپنے آپ کو ایف اے پاس یا انٹر پاس کہتے ہو۔''

''یہ ہم اس لیے کہتے ہیں کہ اگر ہم اسکول جاتے تو آج میں بی اے پاس ہوتا۔ یہ شریف انٹر پاس ہوتا۔ یہ گورکھا اسکول جاتا تو آج عورتوں کی چولیاں نہ بیچتا۔ اور پانچویں جماعت میں پڑھتا ہوتا!''

ہمارے اِردگرد بھیڑ دیکھ کر پولیس کا ایک حوالدار پہنچا۔ ''کیا ہے... کیا ہے...؟'' وہ اپنا چھوٹا سا ڈنڈا ہوا میں لہراتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں حوالدار جی...'' وکٹر اپنے سانولے ہونٹوں کے اندر سے سفید دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ''یہ دو نئے رنگروٹ آئے ہیں پُل پر سودا بیچنے!''

حوالدار نے کہا۔ ''یہ خلافِ قانون حرکت ہے!''

''دو روپے نکالو...'' وکٹر نے آہستہ سے ہم دونوں سے کہا۔

"پھر تم دونوں ایک ماہ تک دادر پُل پر سودا بیچ سکو گے۔"

"اور اگر ہم دو روپے نہ دیں تو؟" بھگوان نے پوچھا۔

"تو پُل پر سودا بیچنا خلاف قانون ہو جائے گا!"

"ہوں!" کہہ کر بھگوان نے کچھ سوچا۔ پھر اپنی جیب سے دو روپے نکال کر انھوں نے وکٹر کو دیے۔ وکٹر حوالدار کو ایک کونے میں لے گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد حوالدار چلا گیا۔ سب لڑکے پھر اپنی اپنی جگہوں پر جا کر سودا بیچنے لگے۔

ڈیڑھ گھنٹا اور گزر گیا۔ بھگوان کی ایک کتاب نہیں بکی۔ لوگ رومال خرید رہے تھے اور امرود خرید رہے تھے۔ فونٹین پین خرید رہے تھے۔ موزے خرید رہے تھے، چولیاں خرید رہے تھے اور ہیر پن اور ربن خرید رہے تھے مگر بچوں کی کتاب کوئی نہیں خریدتا تھا۔

"حیرت ہے صاحب!" بھگوان نے بڑی ناامیدی سے کہا۔

"میرا خیال تھا۔ بچوں کے ماں باپ اپنے بچوں کے لیے خوب صورت کہانیوں کی یہ خوب صورت کتابیں فوراً خرید کر لے جائیں گے مگر..."

"مگر جن کے پاس بچوں کی اسکول کی کتابیں خریدنے کے پیسے نہ ہوں، وہ تمھاری کہانیوں کی کتاب کہاں سے خریدیں گے؟" میں نے بھگوان سے کہا۔

بھگوان کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ اتنے میں زینے کے نیچے سے بلّہ ہُوا۔ میں نے دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا آدمی اپنے گلے میں کالا تعویذ باندھے، گول گلے کی دھاری دار نارنجی بنیان اور نہایت تنگ پتلون پہنے، جس کی مہری اس نے ٹخنوں سے اوپر چڑھا رکھی تھی، آہستہ آہستہ بڑے شاہانہ انداز میں زینے کے اوپر چڑھ رہا ہے۔ اسے دیکھ کر بھکاری لوگ کھڑے ہو گئے اور مؤدّب جھکتے گئے۔ بہت سے لوگ کھسر پھسر کرنے لگے اور جب وہ زینہ چڑھ کر اوپر آیا تو رومال بیچنے والے نے اپنے بتیس دانت نکال اسے سلوٹ کیا۔ وکٹر نے بھی کیا۔ شریف نے بھی کیا۔ گورکھے نے بھی کیا۔ صرف ہم دونوں فرش پر اپنے اپنے مال کے قریب بیٹھے رہے۔ اس نے ہم دونوں پر ایک چبھتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اپنے جوتے کی نوک اس نے بھگوان کے لکڑی کے کھوکھے پر رکھی جس پر کتابیں سجی ہوئی تھیں اور اسے ایک ٹھوکر مار کر وکٹر سے پوچھا۔ "یہ بچہ لوگ ادھر کدھر سے آیا؟"

وکٹر نے کہا۔ "دادا، یہ... یہ... نوا چھوکرا ہے، آج سے ادھر دھندا کرے گا۔ حوالدار نے اجازت دے دی ہے؟"

دادا نے حوالدار کی شان میں دو چار انتہائی نفیس گالیاں رقم فرمائیں پھر بولا۔ "ان کو بولو، ہم کو روز کا چار آنہ دے گا تو ادھر پُل پر بیٹھ سکتا ہے۔"

"مگر ہم کو حوالدار نے اجازت دے دی ہے...!" بھگوان نے غصے سے کہا۔ "اگر سرکار ہم کو اِدھر کام کرنے کی اجازت دیتی ہے، تو تم کون ہوتا ہے ہم کو روکنے والا؟"

"ہم کون ہوتا ہے...؟" دادا کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے اپنی آستین چڑھا کر کہا۔ "ہم کون ہوتا ہے؟" اس نے دہرایا۔ پھر اس نے بھگوان کے سامنے رکھا ہُوا لکڑی کا کھوکھا اٹھا کر زور سے پُل کے نیچے پھینک دیا۔ تمام کتابیں مرغیوں کی طرح ہوا میں اپنے پر کھول کر پھڑ پھڑائیں۔ پھر نیچے ریلوے لائن پر جا گریں۔ دوسرے لمحے میں امرودوں سے بھری ہوئی ٹوکری بھی نیچے لڑھک گئی۔ تیسرے لمحے میں کلیان لوکل گوکتی ہوئی، خوب صورت کتابوں کو روندتی ہوئی پُل کے نیچے سے گزر گئی۔ اور جب کلیان لوکل گزر گئی تو بہت سے لڑکے کھیتوں سے نکل آئے اور ریل کی پٹڑی پر گرے ہوئے امرود اٹھا اٹھا کھانے لگے۔ مگر کسی نے کتابوں کی طرف توجہ نہ دی۔

بھگوان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

وکٹر نے دھیرے سے کہا۔ "یہ اس پُل کا دادا ہے۔ سمجھو اس کا مالک ہے۔ اس کی پرمیشن کی اجازت کے بغیر کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ اس سے معافی مانگو اور چار آنے روج کا بھتا طے کر دو۔ نہیں تو یہ تم کو پریشان کرے گا۔"

"میں کاہے کا بھتا اس کو دوں گا۔ نہیں دوں گا..." بھگوان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں ہرگز نہیں دوں گا اور اسی پُل پر بیٹھ کر اپنا سودا بیچوں گا۔"

دادا نے دانت پیس کر بھگوان کو گلے سے پکڑ لیا اور اپنا، کالا سیپ والا لمبا چاقو نکال لیا۔ میں نے پیچھے سے دادا کی ٹانگوں کو کاٹ کھایا۔ وہ گھوم کر مڑا تو ہم دونوں پُل سے نیچے کی طرف بھاگ لیے۔ اس نے دُور تک ہمارا تعاقب کیا۔ مگر ہم دوڑتے دوڑتے رنجیت اسٹوڈیو کے اندر گھس گئے۔ چوں کہ اُس علاقے کا دادا دوسرا تھا اس لیے پہلے دادا کو رنجیت اسٹوڈیو کے اندر گھسنے کی ہمت نہ پڑی اور وہ ہمیں گالیاں دیتا ہُوا واپس چلا گیا۔

آدھ گھنٹے تک ہم لوگ اسٹوڈیو کے آرٹ ڈیپارٹمنٹ میں گھسے رہے اور گھس کر تین سروں والی، برہما کی ایک مورتی کے

پیچھے چھپے رہے۔ آخر جب چاروں طرف سناٹا ہو گیا اور سانس میں سانس اور جان میں جان آئی تو ہم دونوں دھیرے دھیرے آرٹ ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکلنے لگے۔ یہ لنچ کا وقت تھا اور سب لوگ کینٹین میں گئے ہوئے تھے، اس لیے آرٹ ڈیپارٹمنٹ میں سناٹا تھا۔

بھگوان برہما جی کی مورتی کو دیکھ کر بولے۔ "یہ تین سروں والی مورتی برہما جی کی ہے نا؟"

"ہاں!"

"کیا اس کی یہاں پوجا کی جاتی ہے؟"

"نہیں۔ یہ فلم اسٹوڈیو میں نقد نارائن کے علاوہ اور کسی کی پوجا نہیں کی جاتی۔ یہ تو پلاسٹر کے مٹی کے برہما جی ہیں۔ سیٹ پر رکھے جائیں گے اور جب ان کا کام ختم ہو گا، انھیں توڑ کر اسی مٹی سے راون کا بت بنا لیا جائے گا۔"

"ہم!" بھگوان کچھ سوچ کر مسکرانے لگے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

بھگوان نے کہا۔ "جب میں نے سرشٹی رچی تو برہما نے مجھ سے اپنے جسم کے لیے ایک سر کے بجائے تین سر مانگ لیے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ 'برہما جی... تین سر لے کر آپ کیا کریں گے؟' مگر برہما جی اپنے بات پر ڈٹے رہے۔ بولے۔ 'آپ دے دیجیے نا، آپ کا کیا بگڑتا ہے؟'

"چناں چہ میں نے برہما کو تین سر دے دیے۔ مگر اُس وقت برہما جی کی ضد کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ آج جس وقت میں دادر پُل پر کھڑا تھا اور اس غنڈے نے میرا گلا دبایا تو یکا یک مجھے محسوس ہُوا کہ دادر پُل پر کام کرنے کے لیے انسان کے پاس ایک کے بجائے چار سر ہونے چاہییں۔

"اب سوچتا ہوں۔ برہما جی غلط نہیں تھے!" بھگوان نے مسکرا کر کہا۔

"غلط تھے یا صحیح تھے، یہ اپن کو معلوم نہیں ہے۔ بڑے لوگوں کی باتیں بڑے لوگ جانیں۔ اپن تو جانتے ہیں کہ اس دنیا میں ایک سر بچانا ہی مشکل ہے۔ تین سر ہوتے تو تین مُنہ بھی ہوتے۔ روٹی اپن لوگ کدھر سے ڈالتے؟ اور روٹی سے خیال آیا کہ مجھے سخت بھوک لگی ہے!"

"اونہہ! تمھیں تو ہر وقت بھوک لگی رہتی ہے!" بھگوان نے طنزیہ فرمایا۔

"کیا تمھیں بھوک نہیں لگتی؟"

"نہیں۔ مجھے کبھی بھوک نہیں لگتی؟ ہاں کبھی کبھی میرے سر میں درد ہوتا ہے۔" بھگوان نے یکا یک افسردہ ہو کر کہا۔

"کب درد ہوتا ہے؟"

"جب کوئی ستارہ اپنی چال سے بہک جاتا ہے۔ جب کوئی بچہ اپنی ماں سے بچھڑ جاتا ہے۔ جب کوئی پھول وقت سے پہلے مرجھا جاتا ہے۔ اس وقت میرے سر میں درد سا ہونے لگتا ہے۔"

"درد سر میں کہ دل میں ہوتا ہے؟"

"سر میں۔ کیوں کہ میرے پاس کوئی دل نہیں ہے۔ دل تو میں نے دیوتاؤں کو بھی نہیں دیا۔ دل تو میں نے صرف انسانوں کو دیا ہے کیوں کہ صرف وہی گناہ کر سکتے ہیں!"

میں مبہوت ہو کر بھگوان کو دیکھنے لگا۔ مگر ان کے چہرے پر کچھ نہ تھا۔ کوئی سوچ نہ تھی، کوئی فلسفہ نہ تھا۔ صرف بچوں کی معصومیت تھی۔ یکا یک مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے ہمارے قریب زمین پر نیچے گنیش کی مورتی کا سونڈ اوپر اٹھا اور پھر بھگوان کے قدموں میں جھک گیا۔ بھگوان نے چونک کر میری طرف دیکھا اور ہولے سے مسکرا کر کہا۔ "چلو تمھاری بھوک بھی مٹا دیں!"

"ناممکن ہے۔ بھلا انسان کی بھوک بھی کسی نے مٹائی ہے؟"

رنجیت اسٹوڈیو کی کینٹین میں مَیں نے پہلے تو کوکا کولا پیا۔ پھر میں نے دال فرائی، چکن فرائی، بریانی فرائی اور کھیر ملائی کا آرڈر دیا۔ اور بھگوان نے اپنے لیے پھر اسپرو منگائی۔ بھگوان نے اسپرو کھائی اور میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ اور جب بل

ملاقات

ایک روز میرزا صاحب فتح الملک بہادر سے ملنے گئے۔ جب غلام گردش میں پہنچے تو خدمت گاروں نے صاحب عالم کو اطلاع دی کہ میرزا نوشہ آرہے ہیں، وہ کسی کام میں مشغول تھے، اس لیے میرزا صاحب کو فوراً نہ بلا سکے... میرزا صاحب کچھ دیر وہیں ٹہلتے رہے۔ اتنے میں صاحب عالم نے پکار کر ملازم سے فرمایا، "ارے، میرزا صاحب کہاں ہیں؟"

میرزا غالب نے یہ سن کر وہیں سے جواب دیا، "غلام گردش میں ہے۔"

یہ سن کر صاحب عالم خود باہر تشریف لے آئے، اور فوراً میرزا صاحب کو اپنے ساتھ اندر لے گئے۔

تعاون ✿ نوین عباس

بھگوان نے ادا کیا تو اس کے بٹوے میں سَو سَو کے نوٹ دیکھ کر ایک بونے فلم اسٹار کی آنکھیں کھل گئیں۔

یہ بونا فلم اسٹار جس کا نام ٹکّو تھا جو فلموں میں بچے یا لڑکے کا کام کرتا تھا۔ اس کی عمر چالیس برس کی تھی اور یہ کامیڈی رول بہت اچھا کرتا تھا۔ آج کل اچھی حالت میں نہیں تھا۔ جس بھوکی نگاہ سے وہ سامنے رکھی ہوئی میری بھری ہوئی پلیٹوں کو دیکھ رہا تھا، اسی سے مجھے اس کی حالت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ دادر کے چوراہے پر پان کی دکان پر وہ مجھے اکثر ملا کرتا تھا اور گاہے گاہے دو چار آنے مجھ سے ادھار لے لیا کرتا تھا۔ یعنی جب میں اس پوزیشن میں ہوتا تھا کہ کسی کو کچھ ادھار دے سکوں!

ٹکّو کا چہرہ بے ریش و بروت اور بالکل معصوم اور بھولا بھالا نظر آتا تھا۔ اس کا قد ہم دونوں سے بھی ایک فٹ کم تھا۔ ٹکّو بھگوان کو دیکھ کر مسکرایا اور ان کے قریب جا بیٹھا۔

''تم بمبئی میں نئے نئے آئے ہو؟'' ٹکّو نے مجھے چکن کی پلیٹ صاف کرتے دیکھ کر بڑی حسرت سے اپنی زبان اپنے ہونٹوں پر پھیری اور بھگوان سے کہا۔

مگر بھگوان سے بات کرتے وقت اس کی ایک آنکھ مجھ پر تھی، ایک بھگوان پر۔

بھگوان نے کہا۔ ''ہاں، آج ہی آیا ہوں۔''

''فلم میں کام کرنے کا ارادہ ہے؟''

''ہے تو سہی۔ اگر مل جائے!''

''تمھارے ماں باپ کہاں ہیں؟''

''میرے ماں باپ تو ہیں نہیں۔'' بھگوان نے سر جھکا کر افسردگی سے کہا۔

ٹکّو اور ان کے قریب ہوگیا۔ بھگوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اور میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''یہ تمھارا چھوٹا بھائی ہے؟''

''نہیں، محض ایک دوست ہے!'' بھگوان نے کہا۔

ٹکّو نے انتہائی شبے کی نگاہوں سے مجھے دیکھا جیسے مجھے دوست نہیں چور سمجھ رہا ہو۔ میں نے بھی جواب میں اس کی طرف انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔

ٹکّو نے پوچھا۔ ''کیا یہ بھی فلم میں کام کرنے کے ارادے سے آیا ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں ہے۔ اسی سے پوچھو۔'' بھگوان بولے۔

''پوچھنے کی کیا ضرورت ہے...!'' ٹکّو نے انتہائی تحقیر آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''اس کا چہرہ کہے دیتا ہے کہ یہ زندگی بھر فلم اسٹار نہیں بن سکتا۔''

''اور میرا چہرہ؟'' بھگوان نے پوچھا۔

''تمھارے چہرے پر ایک عجیب سی دلآویز معصومیت ہے۔ تمھارا چہرہ ایسا ہے کہ بڑے سے بڑا بچہ اداکار تمھارے قدموں میں جھک جائے۔ تمھارا چہرہ، چہرہ ہے!''

''اور میرا چہرہ شاید تھوبڑا ہے!'' میں نے جل کر ٹکّو سے کہا۔ ٹکّو مجھے اس وقت پہچان نہیں رہا تھا۔ کیوں کہ میں اس وقت ایک بچے کی صورت میں تھا ورنہ میں ٹکّو کو اس وقت ٹھیک کر دیتا۔ مگر ٹکّو نے میری بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے بھگوان سے کہا۔ ''تمھارا نام کیا ہے؟''

''بھگوان!''

''تمھاری عمر کیا ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں!''

''میری عمر کے معلوم ہوتے ہو۔ بڑی مشکل سے بارہ برس کے ہوگے!''

''کیا تم بھی بارہ برس کے ہو؟'' بھگوان نے ٹکّو سے پوچھا۔

''اگلی کرسمس میں بارہ برس کا ہو جاؤں گا...'' ٹکّو نے اعتماد انکسار سے کہا۔ پھر وہ بڑے پیار سے بھگوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''آج سے تم مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھو۔ میرا نام ٹکّو ہے، مجھے اس فلم انڈسٹری میں کام کرتے ہوئے تیس سال، میرا مطلب ہے تین سال ہوگئے ہیں۔ چائلڈ اسٹاروں میں میرا نام صفِ اول کے اسٹاروں میں آتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ میں اس پوزیشن کو کبھی نہیں پہنچ سکوں گا جو عنقریب تمھیں حاصل ہونے والی ہے! تمھاری آنکھوں میں ایک بات ہے!''

''کیا بات ہے؟''

ٹکّو نے اَن سنی کرتے ہوئے بھگوان سے کہا۔ ''اگر تم میرے کہنے پر چلو تو میں تمھیں فلم انڈسٹری کا سب سے بڑا اسٹار بنا دوں گا... سب سے بڑا چائلڈ اسٹار۔ تمھیں معلوم ہے، ڈیزی ایرانی کو ایک پکچر میں کام کرنے کا کیا ملتا ہے؟''

بھگوان نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا ملتا ہے؟''

''تیس ہزار!''

''تیس ہزار...؟ نہیں... نہیں، یہ ناممکن ہے!'' بھگوان نے تقریباً چیخ کر کہا۔ ''دس سال کی بچی کے لیے اتنی بڑی رقم؟''

''اور فلم اسٹار سومی کو کیا ملتا ہے! آٹھ سال کا ہے وہ۔''

''صرف آٹھ سال کا؟''

''جانتے ہو اسے ایک پکچر میں کام کرنے کا کیا ملتا ہے؟'' بھگوان نے انجان ہو کر سر ہلایا۔

''چالیس ہزار!''

''چالیس ہزار؟''

ٹکّو نے کہا۔ ''آج سے پندرہ برس پہلے، میرا مطلب ہے آج سے پانچ سال پہلے... یعنی آج سے پانچ ماہ پہلے میں نے ہی اسے ایک فلم میں کام دلوایا تھا۔''

''چالیس ہزار...!'' بھگوان نے حیرت سے دُہرایا۔

''اور مجھے ان لوگوں نے چلتے وقت صرف سو روپے دیے۔ آج تک میں نے سو روپے سے زیادہ روپے ہی نہیں دیکھے۔ میرے ساتھ آؤ، میں تمھیں فلم ڈائریکٹر سے ملائے دیتا ہوں!''

ٹکّو بھگوان کو گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا۔

''ارے کہاں جا رہے ہو؟'' بھگوان میرے، کہاں جا رہے ہو۔'' میں ناامیدی سے چلّایا۔

''فلم اسٹار بننے...!'' بھگوان نے جلدی سے جواب دیا۔

ان کے لہجے میں غیر معمولی حسرت تھی! ''تم یہیں بیٹھو۔'' بھگوان نے مجھے اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ''یہیں کینٹین میں۔ میں ابھی فلم اسٹار بن کر آتا ہوں!''

میں غصے سے دانت پیس کر کینٹین میں بیٹھ گیا۔

وہ ایک گھنٹے کے بعد واپس آئے۔ اور اکیلے واپس آئے، ٹکّو ان کے ساتھ نہیں تھا۔

''ٹکّو کہاں ہے؟'' میں نے بھگوان سے پوچھا۔

''وہ وہیں رہ گیا...'' کہنے لگا۔ ''آج شام کو مجھے ہند ماتا سنیما کے باجو میں ملو!''

''اچھی بات ہے۔ بتاؤ، کیا ہوا۔ کس کے پاس لے گیا تھا تمھیں؟'' میں نے جلدی جلدی سے ان سے پوچھا۔

بھگوان بہت خوش تھے۔ مسکراہٹ ان کے چہرے پر کھلی پڑتی تھی۔ ''اب میں چند دنوں میں فلم اسٹار بن جاؤں گا۔ مجھے سورگ جانے کی کیا ضرورت ہے۔ سنتے ہو۔ اب میں واپس سورگ نہیں جاؤں گا۔ یہاں پر میں اگلے ہفتے ایک فلم میں کام کر رہا ہوں۔ وہ لوگ مجھے پہلی پکچر میں تیس ہزار روپے دیں گے۔ مجھے ایک ائر کنڈیشنڈ فلیٹ بھی لے دیں گے۔ سیر کرنے کے لیے میرے پاس ایک کیڈی لک ہوگی۔ کون احمق سورگ جانا چاہتا ہے۔ یہاں پر مجھے سب کچھ مل جائے گا۔ جو سورگ میں بھی نہیں ملتا۔ سب اخباروں میں میرا نام ہوگا۔''

''تمھارا نام پہلے ہی لیا جاتا ہے! تمھارا نام تو ہر جگہ لیا جاتا ہے!''

''مگر اخباروں میں تو نہیں لیا جاتا! تم مجھے بتا دو، کس اخبار میں میرا نام آتا ہے؟ ٹھیک ہے، وہ لوگ میرا نام مندر میں لیتے ہیں، مسجد میں لیتے ہیں، گوردوارہ اور گرجا میں لیتے ہیں۔ مگر اخباروں میں تو نہیں لیتے، نائٹ کلب میں نہیں لیتے۔ ہوٹل میں نہیں لیتے، کسی دل چسپ جگہ میرا نام نہیں لیا جاتا... مگر اب مووی فینز میں میری تصویر پوجی جائے گی اور میں نروپا رائے کے ساتھ کام کروں گا۔ اور جانتے ہو اس میں اشوک کمار اور پران بھی ہیں۔'' بھگوان تقریباً خوشی سے ناچنے لگے۔

''باؤلے ہوئے ہو...'' میں نے بھگوان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''دنیا کون چلائے گا؟''

''جہنم میں بھیجو اس دنیا کو۔'' بھگوان نے گرج کر کہا۔ ''اس دنیا کے نام ہی سے میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔''

میں نے پریشان ہو کر پھر ایک کوکا کولا پیا اور ان سے پوچھا۔ ''آخر یہ سب کچھ اتنی جلدی کیسے طے ہوگیا؟''

''میرا چہرہ۔ میرا بھولا بھالا چہرہ دیکھ کر ایک دم طے ہوگیا...'' بھگوان نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ٹکّو بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ مجھے سب سے پہلے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے پاس لے گیا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے بڑی ہم دردی سے میری رام کہانی سنی اور جب اسے معلوم ہُوا کہ میرے ماں باپ نہیں ہیں اور میں فلم میں کام کرنا چاہتا ہوں تو اسے مجھ پر بڑا رحم آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ 'تمھاری جیب میں کیا دو روپے ہیں؟' میں نے کہا۔ 'ہیں'، وہ بولا۔ 'مجھے دے دو۔ آج ڈائریکٹر نے مجھے لنچ کے پیسے نہیں دیے۔ کل تمھیں واپس کر دوں گا۔ ایک بہت اچھا رول ہے۔ اگلی پکچر میں... بس اس میں تم چائلڈ اسٹار بن جاؤ گے۔ میں تمھیں ابھی فلم ڈائریکٹر سے ملوائے دیتا ہوں۔' چناں چہ میں نے اسے دو روپے دے دیے۔''

''دو روپے دے دیے۔'' میں نے بیزاری کے عالم میں پوچھا۔

''ہاں۔ اور وہ مجھے فوراً فلم ڈائریکٹر سے ملانے کے لیے لے گیا۔ فلم ڈائریکٹر شاٹ لینے میں بے حد مصروف تھا۔ مگر جب ٹکّو اور اسسٹنٹ فلم ڈائریکٹر نے اسے جا کر بتایا کہ ایک

نہایت ہی خوب صورت بچہ فلم میں کام کرنے کے لیے آیا ہے تو وہ دوڑا دوڑا میرے پاس آیا اور اس نے مجھ سے میری رام کہانی سنی اور جب اسے معلوم ہُوا کہ میرے ماں باپ نہیں ہیں تو اسے بھی مجھ پر بڑا رحم آیا۔ اور اس نے مجھ سے پوچھا۔ 'تمھاری جیب میں دس روپے ہیں؟' میں نے کہا۔ 'ہیں؟' تو وہ بولا۔ 'مجھے دے دو۔ آج پروڈیوسر نے مجھے میرا چیک نہیں دیا ہے۔ کل مل جائے گا تو تمھیں ادا کردوں گا۔ اور تم اگلی پکچر میں میرے ساتھ کام کررہے ہو۔' چناں چہ میں نے اسے دس روپے کا نوٹ دے دیا... اور اب میں اس کی اگلی پکچر میں کام کررہا ہوں۔ پھر اس کے بعد ٹکو فلم پروڈیوسر سے ملانے کے لیے لے گیا۔ اس کے پاس کلکتے سے ٹرنک کال آنے والا تھا۔ مگر جب اسے علم ہُوا تو فوراً بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔ اور اس نے بڑی ہم دردی سے مجھے اپنے پاس بٹھا کر میری رام کہانی سنی اور جب اسے معلوم ہُوا کہ میرے ماں باپ نہیں ہیں تو اسے بھی مجھ پر بڑا رحم آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ 'کیا تمھاری جیب میں پچیس روپے ہیں؟' میں نے کہا۔ 'ہیں؟' تو وہ بولا۔ 'مجھے دے دو۔ آج میرا چیک ڈسٹری بیوٹر لے کر آنے والا تھا مگر نہیں آیا۔ کل آجائے گا۔ کل آتے ہی تمھارے پچیس روپے تمھیں واپس کردوں گا، اور تم سے تیس ہزار روپے کا کنٹریکٹ بھی کرلوں گا۔' چناں چہ میں نے اسے پچیس روپے دے دیے... اور اب میں اشوک کمار، پران اور نرو پا رائے کے ساتھ کام کررہا ہوں!'' بھگوان نے بڑی دل جمعی سے کہا اور چپ ہوگئے۔ ان کا معصوم چہرہ مسرت سے چمک رہا تھا۔

میں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا، پھر ان سے پوچھا۔ ''اور ٹکو نے تم سے کچھ نہیں لیا؟''

''نہیں... پانچ روپے اس نے بھی لیے تھے مگر وہ کل واپس کرنے والا ہے۔ اور آج شام کو مجھے ہندماتا کے باجو میں ملنے والا ہے۔ جہاں سے وہ مجھے ایک نئی فلم کمپنی میں لے کے جانے والا ہے۔ ٹکو بہت اچھا لڑکا ہے!''

''ٹکو لڑکا نہیں ہے...!'' میں نے غصے سے تقریباً اپنے بال نوچتے ہوئے کہا۔ ''وہ چالیس برس کا بونا ہے جو لڑکوں کا پارٹ کرتا ہے۔ بھگوان کی قسم تم کتنے احمق ہو؟''

بھگوان کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ مجھے اس کا بھولا بچوں کی طرح معصوم چہرہ بہت پیارا لگا اور میرے دل کو دکھ ہُوا کہ میں نے کیوں ان کا خوامخواہ دل دکھایا۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''اچھا... جو ہوگیا، سو ہوگیا۔ اب یہاں سے باہر نکلو نہیں تو تمھارا بٹوا صاف ہوجائے گا۔''

شام کے پانچ بجے ہم لوگوں نے ہندماتا سینما کے باجو میں کھڑے ہوکر دو گھنٹے تک ٹکو کا انتظار کیا۔ مگر ٹکو نہیں آیا۔

رات کو کھولی میں ہم دونوں فرش پر چٹائیاں بچھا کر قریب قریب لیٹے تھے۔ کھولی کے اندر آکر ہم دونوں پھر بچوں سے بڑے بن گئے۔ اور اپنی اصلی حالت میں آچکے تھے۔ بھگوان نے اپنے دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا تھا اور اوپر چھت کو گھور رہے تھے۔ میں نے اپنی پھٹی بنیان بھی اتار پھینکی تھی۔ کیوں کہ یہاں شدید حبس تھا۔

''واقعی، یہاں بے حد گرمی ہے۔ اور تمھاری کھولی میں تو بجلی بھی نہیں ہے۔''

''تین مہینے سے بھاڑا نہیں دیا تھا۔ بجلی والے کنکشن کاٹ گئے۔ اور بمبئی میں پنکھا نہ ہو تو کھولی بہت شدید حبس ہوجاتا ہے!''

''واقعی، مجھے بھی گرمی محسوس ہورہی ہے...'' بھگوان نے کسی قدر محجوب ہوکر کہا۔ ''اب سورگ میں رہتے رہتے اچھے موسم کی ایسی بری عادت پڑگئی ہے...''

''ایک بات پوچھوں؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''پوچھ لو۔''

''کیا سورگ کا وجود ہے؟''

''ہے؟''

''نرک؟''

''اور نرک بھی ہے؟''

''اور نیکی؟''

''نیکی بھی ہے۔''

''اور بدی؟''

''بدی بھی ہے۔''

''اور نیکی کی جزا ملتی ہے۔ اور بدی کی سزا؟''

''ہاں!''

''اس لیے تم برے آدمیوں کو جہنم میں رکھتے ہو۔ اور نیک آدمیوں کو سورگ میں؟''

''ہاں!''

''حالاں کہ برے آدمیوں کو سورگ کی زیادہ ضرورت

ہے۔ وہ جن کے دماغ میں نیکی نہ تھی۔ جن کے دل میں اندھیرا تھا۔ جن کے ہاتھ لہو سے بھرے تھے۔ جن کی نگاہوں میں بے رحمی تھی، جن کا ضمیر ہر قدم پر ٹھوکر کھاتا تھا۔ انھیں سب سے زیادہ تمھارے سورگ کی ضرورت تھی۔ کیوں کہ صرف اندھیرے کو روشنی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ صرف وہی ہاتھ معاف کیے جاسکتے ہیں جو لہو میں بھرے ہوں۔ لیکن تم ایسا کیوں کرتے ہو کہ جو پہلے ہی سے خوب صورت ہیں، نیک ہیں اور خوش اطوار ہیں، جن کا دل پاک اور ضمیر مطمئن ہے، انھیں تم سورگ میں بھیجتے ہو۔ اور جو پہلے ہی سے بدی اور نفرت، برائی اور ظلم کی آگ میں جل رہے ہیں، انھیں جہنم میں بھیجتے ہو۔ گویا تم سورگ کو سونا بانٹتے ہو اور جہنم کو جہنم میں بھیجتے ہو؟... کیا اسی سے تمھارا مقصد پورا ہوتا ہے؟''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' بھگوان نے سوچ کر کہا۔ ان کی بانہیں ان کے سر کے نیچے تھیں۔ ان کی نگاہیں چھت پر تھیں۔

''میں چاہتا ہوں، تم برے آدمیوں کو کبھی بھی سورگ میں بھیج دیا کرو۔ اور نیک آدمیوں کو کبھی بھی نرک میں ڈال دیا کرو۔ ہر ایک کو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اس نے کیا کھویا ہے؟ جس گناہ میں معافی نہیں اور جس نیکی میں درد نہیں، اس کا مزہ ہی کیا ہے؟''

''گویا تم یہ چاہتے ہو...'' بھگوان نے ہنس کر کہا۔ ''کہ اس اندھیری کھولی میں روشنی آجائے؟ مگر مسٹر اس کے لیے تمھیں محنت کرنا پڑے گی۔ میں نے تخلیق کردی ہے، بدلنا انسان کا کام ہے!''

''بدلنا بہت مشکل ہے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔ اسی لیے تو یہ کام میں نے دیوتاؤں کو نہیں سونپا، انسان کو سونپا ہے۔''

تاریک کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ مجھے نیند سی آنے لگی۔ بھگوان کی آواز میرے کانوں میں دھیمی ہوتی جارہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''مگر نیکی اور بدی، سزا اور جزا سے اوپر، زندگی اور موت کا چکر ہے۔ یہ اخلاق سے بلند، مطلق اور آزاد قدریں ہیں، اس وقت اینڈرومیڈا میں ایک سیارہ پھٹ رہا ہے۔ ایک لمحے میں دو کھرب جان داروں کو موت آگئی۔ ایک لمحہ پہلے وہ زندہ تھے، پیار کرتے تھے، نفرت کرتے تھے، ظلم کرتے تھے، رحم کرتے تھے، امید رکھتے تھے۔ امید... کھلے آسمان کی، ہری کونپلوں کی، مہکتے ہوئے ہونٹوں کی، ہنستی ہوئی آنکھوں کی... مگر اسی لمحے وہ سیارہ

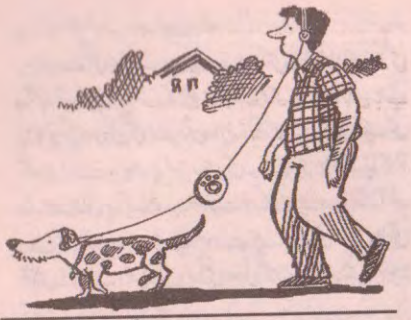

پھٹ رہا ہے۔ اور اسی لمحے کہکشاں کے کسی دوسرے کونے میں ایک نیا ستارہ جنم لے رہا ہے۔ پہلے ستارے نے کون سی برائی کی تھی کہ وہ مرگیا۔ دوسرے ستارے نے کون سی نیکی کی تھی کہ اسے زندگی ملی...؟ اس لیے مجھ سے نیکی اور بدی، سزا اور جزا کے بارے میں کچھ نہ کہو۔ ایک بار میں نے مشیت کی کھٹالی میں نیکی اور بدی، سزا اور جزا، سورگ اور نرک، تاریکی اور روشنی کو اکھٹا کیا اور انسان بنادیا۔ اب ریت میں سے سونے کے وارے چننا میرا کام نہیں ہے۔ یہ تم جانو!''

آواز بہت دُور، کہکشاں سے بھی پرے، انجانی خلاؤں سے آرہی تھی اور میں اونگھ رہا تھا۔ کیوں کہ میں دن بھر کا تھکا ہارا تھا۔ پھر یکا یک مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ کسی نے زور سے میری ران پر ہاتھ مارا اور میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔

بھگوان کہہ رہے تھے۔ ''ابے سالے بلکٹ! اتنی جلدی سونے لگا؟ ابھی تو رات جوان ہے۔''

میں نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم تو بھگوان ہو۔ تمھیں تو نیند آتی نہیں ہے۔ بندہ ایک غریب انسان ہے۔ دن بھر کا تھکا ہارا ہے۔ اس لیے بندہ تو سوئے گا۔ دوسری بات یہ ہے حضور کہ یہ بے تکلفی مجھ سے اچھی نہیں...! سالا؟ بلکٹ؟ اپن کو یہ باتیں پسند نہیں ہیں۔ کچھ بھی کرو۔ آخر میں تم ہمارے بھگوان ہو۔ تم ہمارے باس ہو۔ ہم تمھارے داسی ہیں اور داس کی باس سے کیا دوستی؟ اور کیسی بے تکلفی؟ لہٰذا مجھے معاف کرو اور سونے دو۔''

یہ کہہ میں چٹائی پر کروٹ بدل کر سوگیا۔ بھگوان دھیرے دھیرے کہہ رہے تھے۔ ''اونہہ! اپنی بھی کیا زندگی ہے؟ اکیلا۔ تن تنہا۔ سب اپنے پجاری ہیں، دوست ایک بھی نہیں! ایسا کوئی بھی نہیں جس کے شانے پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر اسے سالا کہہ سکوں؟ کاش، کوئی ایسا ہوتا جو مجھے پیار سے گالی دے سکتا!

ہائے! کیسی خوف ناک تنہائی ہے...''

جانے کتنی دیر تک وہ کہتے رہے۔ میں ان کی اداس، میٹھی مدھم، شہد بھری آواز کے جھولے میں خراٹے لینے لگا۔ جب جاگا تو صبح ہو چکی تھی اور روشن دان سے تیز دھوپ کی ایک لمبی تکون سامنے دیوار پر لرز رہی تھی۔ میں ہڑ بڑا کر جاگا تو سامنے چٹائی پر ایک خوب صورت اور بھولا بچہ سو رہا تھا۔ آٹھ سال کا پیارا سا اور خوب صورت بچہ۔ اس کی لانبی لانبی پلکیں اس کے رخساروں پر جھکی ہوئی تھیں اور نیند میں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔

بچوں سے ملاقات کرتے ہوئے بھگوان کا بمبئی میں دوسرا دن تھا۔ آج صبح ہی میں نے ان کا تعارف منہر سے کرایا تھا۔ منہر ایک دُبلا پتلا، سوکھا سڑا سا گجراتی لڑکا تھا۔ مگر باتیں کرنے میں بے حد تیز تھا۔ اس کی بھوکی بے چین آنکھیں گویا ہر وقت کسی شکار کی تاک میں رہتیں۔ باہر کی کنڈی کھٹکھٹا کر جب وہ کھولی میں داخل ہُوا تو اپنے سامنے دو بچوں کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''سیٹھ کدھر ہے؟''

یہ اشارہ میری طرف تھا۔ مگر میں تو اس وقت بچہ بنا ہُوا تھا لہٰذا وہ مجھے پہچان نہ سکا۔ میں نے کہا۔ ''سیٹھ باہر گیا ہُوا ہے۔''

منہر نے میری طرف غور سے دیکھا۔ بولا۔ ''تم سیٹھ کے لڑکے معلوم ہوتے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور یہ کون ہے؟'' منہر نے بھگوان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''لڑکا ہے!'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

منہر چپ ہو گیا۔ چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔ ''سیٹھ کو بول دینا چوکا آ گیا ہے۔ اس کے نو روپے میرے پاس ہیں، شام کو آ کے دے جاؤں گا۔''

پھر میری طرف تیز نگاہوں سے تاکتا ہُوا، سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتا ہوئے بولا۔ ''لگاؤ گے؟''

''لگاؤں گا!'' میں نے جواب دیا۔

''کیا؟''

''تئے سے پانچا؟''

''کتنا؟''

''دو آنے!''

منہر نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر نوٹ کر لیا۔ میں نے بھگوان سے ایک دوانّی اُدھار لے کر اسے دے دی۔ پھر منہر نے بھگوان کی طرف دیکھا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''اور یہ لگائے گا؟''

''کیا؟'' بھگوان نے پوچھا۔

''نمبر!'' منہر نے جواب دیا۔

''نمبر کیا ہوتا ہے؟'' بھگوان نے پوچھا۔

منہر حقارت سے ہنسنے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''یہ کل ہی اپنے گاؤں سے آیا ہے!''

منہر جھٹ بھگوان کے پاس بیٹھ گیا اور اسے سمجھانے لگا۔ ''یہ سٹے کا نمبر ہوتا ہے۔ اوپن ٹو کلوز لگایا جا سکتا ہے۔ اوپن لگایا جا سکتا ہے، کلوز لگایا جا سکتا ہے۔ شام کو جب بھاؤ کھلے گا تو اگر تمھارا نمبر آ گیا تو تمھیں ایک روپے کے نو روپے دوں گا۔''

''ایک روپے کے نو روپے...؟'' بھگوان نے حیرت سے کہا۔ ''ہمارے ہاں تو ایک بدی کی ایک ہی سزا ہوتی ہے اور ایک نیکی کی ایک ہی جزا ملتی ہے۔''

''یہ سزا جزا کیا بولتا ہے؟'' منہر حیران ہو کر مجھ سے پوچھنے لگا۔

''یہ اس کے ملک کا سٹہ ہے!''

''اچھا... تو پھر اس سٹے میں مزہ کیا؟ یہاں ایک لگاؤ تو نو ملیں گے۔ اور ہاتھ سے جائے گا صرف ایک ہی!''

''یہ تو بڑے مزے کا کھیل ہے...!'' بھگوان نے خوش ہو کر کہا۔ ''ایک چونی میں بھی لگاتا ہوں!''

''کس پر؟''

''نیکی پر!''

''پھر وہی نیکی؟ میاں کوئی نمبر بولو۔ ایک سے بندی تک یا اوپن لگاؤ یا کلوز لگاؤ۔ اوپن ٹو کلوز لگاؤ۔ اور جلدی لگاؤ۔ اپنے پاس جاستی ٹائم نہیں ہے۔''

''وقت تو کبھی ختم نہیں ہوتا!'' بھگوان نے آہستہ سے کہا۔

منہر بولا۔ ''یہ تمھارا دوست کیسی باتیں کرتا ہے۔ کس ملک سے آیا ہے؟ سٹہ لگانا ہے تو لگاؤ ورنہ میں جاتا ہوں۔''

''کیا تم اسکول نہیں جاتے ہو؟'' بھگوان نے پوچھا۔

منہر نے ہنس کر کہا۔ ''بی اے پاس کرنے والے، دادر پوسٹ آفس کے باہر خط لکھتے ہیں اور دس آنے روز کماتے ہیں۔ یہاں سٹے سے دن میں دس روپے کما لیتا ہوں۔ میں اسکول جا کر کیا کروں گا۔ معلوم ہوتا ہے تم کو مجھ سے دھندا نہیں کرنے کا ہے۔ اچھا میرا کھوٹا ہوتا ہے۔ اپن جاتا ہے!''

جب منہر چلا گیا تو بھگوان نے کہا۔ ''یہ سٹہ کھیلتا ہے! بارہ سال کا بچہ ہو کر سٹہ کھلاتا ہے؟ سٹہ تو جوا ہے۔''

''بمبئی کی تین چوتھائی آبادی سٹہ کھیلتی ہے اور جیتنے کی امید پر صبح سے شام کرتی ہے۔ تم یہ خوشی بھی ان کے ہاتھ سے چھین لینا چاہتے ہو۔''

''مگر وہ تو بچہ ہے۔''

''بمبئی میں ہزاروں بچے دن رات یہی کاروبار کرتے ہیں۔ کوئی سڑک، کوئی حصہ، کوئی بازار، کوئی گلی ان بچوں سے خالی نہیں ہے۔''

''اوپن ٹو کلوز!'' بھگوان غصے سے بڑبڑائے۔

''ہمارا اوپن ٹو کلوز میں لگا بھاؤ دیتا ہے۔ تم اپنے اوپن ٹو کلوز یعنی زندگی سے موت تک کیا دیتے ہو۔ لاتیں، دکے، بھوک، بیکاری، مفلسی؟'' میں نے حل کر کہا۔

''چلو، اس کھولی سے باہر نکلیں۔'' بھگوان نے گھبرا کر کہا۔

ماہم میں کرسٹان لوگ کے بچوں کا بڑا میلہ تھا۔ سینٹ اینڈ یوز چرچ کا وسیع کمپاؤنڈ لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ رنگا رنگ جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ کمپاؤنڈ کے ایک کونے میں پتھر کے ایک کھلے مندر میں، مقدس مریم کے بُت کے گرد لوگ دراز ہوتے تھے۔ خوب صورت کپڑے پہنے ہوئے بچے، مرد، عورتیں گرجا کے اندر موم شمعیں لے جا کر جلا رہے تھے۔

کمپاؤنڈ کے باہر بچے اور بڑے سبھی چکر وار جھولے میں جھول رہے تھے۔ پانی پوری کھا رہے تھے۔ یسوع مسیح کی تصویریں خرید رہے تھے۔ گلٹ کی خوش نما صلیبیں، امریکی تراش کی جینز اور پتلون کی پیٹیاں، غبارے اور چاکلیٹ اور مٹھائیاں، سستی خوش بوئیں، لپ اسٹک، کاغذی پھول اور ریشمی رومال بک رہے تھے۔ چاروں طرف ایک دل چسپ ہنگامہ تھا، دل چسپ شور تھا اور رنگوں کا ہجوم تھا۔

بھگوان اس نظارے سے بے حد محظوظ ہوئے۔ دیر تک اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ صاف ستھرے، مہکتے ہوئے بچوں اور ان کے ماں باپ بھائی بہنوں کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ بولے۔ ''بس۔ سب بچوں کو اس طرح ہونا چاہیے۔ ایسی ہی دنیا ہونی چاہیے ہمارے بچوں کی... ایسی ہی خوب صورت!''

میں تو بھوکا تھا لہٰذا میں نے پانی پوری کی چار پلیٹیں ڈکار لیں، کئی تو چاکلیٹ کھائے اور دونوں جیبوں میں مٹھائی ٹھونس لی اور بھگوان کی خوش نما فلسفیانہ باتوں اور آدرشوں کو تضحیک آمیز تبسم سے سنتا رہا۔ ''اس دنیا میں زندگی کا ایسا فلسفہ تو آج کل کے چھ سال کے بچے کا نہیں ہوتا، جانے تم کس دنیا کی بات کرتے ہو بھگوان!''

بھگوان نے رشک آمیز نگاہوں سے اپنے سامنے کے سیکڑوں صاف ستھرے بچوں کو دیکھ کر مجھ سے کہا۔ ''ان خوب صورت، پیارے، معصوم، مہذب بچوں ہی کو دیکھنے کے لیے تو میں سورگ سے آیا تھا۔ انھی بچوں کی تو مجھے تلاش تھی۔''

''اب تمھیں یہ بچے مل گئے ہیں تو اب تم شاید اطمینان کا سانس لے کر سورگ جا سکتے ہو؟''

''ہاں!'' بھگوان نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''تو آؤ واپس چلیں۔ تمھارے دل کی مراد پوری ہو گئی۔ اب تم سورگ کے سامنے اپنی انتہائی خوب صورت رپورٹ پیش کر سکتے ہو؟''

''اس میں کیا شبہ ہے...؟'' بھگوان نے کامل اعتماد سے سامنے کے خوب صورت منظر پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں آج شام ہی کو واپس سورگ چلا جاؤں گا۔''

''تو آؤ۔ میں تمھیں ماہم کے اڈے پر، بس میں بٹھا دوں۔ تمھیں بہت دُور جانا ہو گا۔''

''چلو!'' کہہ کر بھگوان میرے ساتھ واپس ہوئے۔ کمپاؤنڈ کے باہر موم شمعیں بیچنے والا ایک چھوٹا سا لڑکا ہمارے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ''پور آرفن... یتیم ہوں۔ پور آرفن... تین آنے میں دو کینڈل بیچتا ہوں۔ اور موم کی بتیاں تین آنے میں لے جاؤ... کرائسٹ تمھارا بھلا کرے... تین آنے ہی دو... پور آرفن... مدر فادر ڈیڈ... تین آنے ہی دو...''

کافی دُور تک اس نے ہمارا پیچھا کیا۔ بھگوان تو اسے دیکھ کر ہی پگھل گئے تھے اور اسی وقت موم بتیاں لینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ مگر میرے منع کرنے پر مجبور ہو کر سر جھکا کر میرے ساتھ چل رہے تھے۔ مگر وہ لڑکا بھی بے حد مسکین تھا۔ اس کی آواز کی بے چارگی نے مجھے بھی موم کر دیا۔ میں نے کہا۔ ''اچھا لے لو اس سے موم بتیاں اور جانے دو سالے کو۔ کب سے ٹرٹر لگا رکھی ہے۔''

بھگوان نے مشکور نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ انھوں نے بچے سے موم بتیاں خرید لیں اور اسے تین آنے دیے۔

''کرائسٹ سیو یور سول!''

لڑکا تین آنے میں اب دو دعائیں دینے لگا۔

گاڈ بلیس یو پور آرفن... مدر فادر ڈیڈ، تین آنے میں دو دعائیں!

جب ہم لوگ آگے چلے گئے تو میں نے بھگوان سے پوچھا۔ ''کرائسٹ سیو یور سول؟ کیا تمھارے پاس بھی کوئی سول ہے؟ کوئی آتما ہے؟''

بھگوان نے کہا۔ ''پگلے میں تو دکھ اور سکھ دونوں سے بے نیاز ہوں۔ آتما تو اس کے پاس ہوتی ہے جو دکھ کے درد اور مسرت کی لذت سے آشنا ہو سکے۔''

''لذت کیا ہے؟ حیات؟ یا احساس؟''

''محض اک خیال!''

''تو کیا محض اک خیال کو بچانے کے لیے لوگ موم بتیاں جلاتے ہیں؟''

''لوگ تو محض اک خیال کے لیے اپنی زندگی تک جلا دیتے ہیں۔'' بھگوان نے کہا۔ ''تمھیں تو معلوم ہوگا...''

ہاں، انھوں نے لاکھوں بار خیال کو لکڑی سے باندھ کر جلایا ہے۔ گہری قبر کھود کر گاڑ دیا ہے۔ ریشم کی ڈور سے گھونٹ کر پھانسی پر لٹکا دیا ہے... صلیب پر ٹھونک کر ختم کر دیا ہے... مگر خیال ختم نہیں ہُوا...

''نہیں، مگر یہ بات بھی غلط ہے...'' میں نے سوچ کر کہا۔ ''خیال بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ خیال مر جاتے ہیں... جیسے وہ بڈھی مرگئی جو چاند میں بیٹھ کر سوت کاتتی تھی۔ اسے سپوتنک نے ختم کر دیا... اچھی لذت تو اچھے خیال میں ہوتی ہے!''

اتنے میں باندرہ کا بس اسٹینڈ آ گیا، اور میں کچھ آگے سوچ نہ سکا۔ ورنہ یہ ہوتا کہ آتما تو شاید بس کے ساتھ چلی جاتی مگر میرا جسم وہیں بس اسٹینڈ پر کھڑا رہ جاتا۔ لہٰذا ہم دونوں نے جلدی سے بس میں بیٹھنا ہی غنیمت سمجھا۔ ڈبل ڈیکر بس تھی اس لیے ہم لوگ اوپر کی منزل پر جا بیٹھے کہ وہاں ہَوا خوب آتی ہے اور نظارہ بھی اچھا ہوتا ہے۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ ہماری دائیں طرف کی سیٹ پر غالباً اسکول میں پڑھنے والا ایک خوش پوش لڑکا بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کا بڑا چرمی بستہ کتابوں سے بھرا معلوم ہوتا تھا۔ ایک کاپی اس کے گھٹنوں پر تھی۔ اوپر کی جیب میں فونٹین پین نظر آ رہا تھا۔ سفید نیکر، سفید جرابیں اور سفید جوتے پہنے ہوئے وہ بڑا پیارا سا لگ رہا تھا۔ ہم دونوں تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔ مگر اس نے ہماری طرف کوئی توجہ نہ کی...

اتنے میں ٹکٹ چیکر آ گیا تو بھگوان نے ٹکٹ خریدنے کے لیے جیب سے پیسے نکالنے چاہے۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو ہاتھ جیب ہی میں رہ گیا اور بھگوان کی آنکھیں خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''کیا ہُوا؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی نے میری جیب کاٹ لی!''

''کب؟''

''معلوم نہیں...'' پھر انھوں نے اپنے ہاتھ میں موم بتیاں دیکھ کر کہا۔ ''جب میں نے اس لڑکے سے یہ موم بتیاں خریدیں، اس وقت تک تو میری جیب سلامت تھی۔''

''اور اس کے بعد چند قدم چل کر تو بس اسٹینڈ آ گیا تھا، اور بس اسٹینڈ پر ہم دونوں اکیلے کھڑے تھے لہٰذا یہ کرامت اسی یور آرٹن کی معلوم ہوتی ہے... مدر فادر ڈیڈ...'' میں زور زور سے ہنسنے لگا۔

''مگر وہ کس قدر غریب اور یتیم معلوم ہوتا تھا اور بھولا بھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔'' بھگوان نے حیرت سے کہا۔

''آنکھوں میں آنسو تھے اور ہاتھوں میں قینچی تھی... جیب کیسے کٹتی؟''

''پیسے نکالو...'' بس کنڈیکٹر نے جلدی سے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ موم بتیاں لے لو۔'' بھگوان نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''انھیں جلانے سے تمھاری آتما بچ جائے گی۔''

بس کنڈیکٹر بولا۔ ''آتما بچ جائے گی تو نوکری چلی جائے گی۔ اپن ایسا کام نہیں کرتا ہے۔ پیسے لاؤ...''

''پیسے تو میرے پاس نہیں ہیں۔ مگر تم مجھے ٹکٹ دے دو۔ میں تمھیں دعائیں دوں گا، گاڈ بلیس یو!'' بھگوان نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''ابے چھوکرے، مجاک کرتا ہے...'' بس کنڈیکٹر غصے میں آ کر بولا۔ ''ابھی نیچے اتار کر پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ نکال پیسے۔ اور تُو بھی نکال...'' بس کنڈیکٹر نے میری طرف گھورتے ہوئے کہا۔ ''گاڈ بلیس یو! یہ BEST کی بس ہے۔ چرچ کی نہیں ہے...''

''میرے پیسے بھی اسی کے پاس تھے۔ جیب کٹ گئی اس کی... تو میں بھی پھانک ہو گیا ماسٹر!'' میں نے عاجزی سے کہا۔

بس کنڈیکٹر نے غصے میں آ کر گھنٹی بجائی۔ بس رُکنے لگی تو قریب کا چھوکرا مسکرا کر بولا۔ ''تم کہاں جاؤ گے؟'' وہ بھگوان سے پوچھ رہا تھا۔

بھگوان میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے اسی لڑکے سے کہا۔ ''ہم بائی کلہ اسٹریٹ تک جائیں گے۔''

''میں بھی وہیں جا رہا ہوں...'' وہ لڑکا بولا۔ ''تم دونوں کے ٹکٹ کے پیسے میں دے دیتا ہوں۔ تم لوگ بائی کلہ برج پر اپنے گھر سے مجھے پیسے دے دینا!''

بھگوان کچھ کہنے ہی کو تھے کہ میں نے انھیں آنکھ ماری اور وہ چپ ہو گئے۔

وہ لڑکا ہمارے ٹکٹوں کے پیسے دے رہا تھا تو بس ماہم کے بس اسٹاپ پر آ کر رُک گئی۔ اور پولیس کا ایک سپاہی اوپر کی منزل پر آ کر غور سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ بھگوان نے پوچھا۔ ''یہ کیا دیکھتا ہے؟''

اسکول کا لڑکا بولا۔ ''یہاں پر شراب کے لیے تلاشی ہوتی ہے۔ بمبئی میں نشہ بندی ہے نا، اس لیے!''

''تم کیا بمبئی میں پہلی بار آئے ہو؟'' سپاہی نے بھگوان سے پوچھا۔

''ہاں!''

''اگر جہاں سے تم آئے ہو وہاں کیا شراب ملتی ہے؟'' سپاہی نے پھر پوچھا۔

''جی ہاں...!'' بھگوان نے فخر سے کہا۔ ''وہاں تو شراب کی نہریں بہتی ہیں...''

''اچھا تو دو تلاشی۔'' سپاہی نے قدرے سختی سے کہا اور اس نے اچھی طرح سے بھگوان کی تلاشی لے ڈالی... اور ان کے ساتھ میری بھی۔ وہ اسکول کا لڑکا ہم دونوں کو دیکھ کر مسکراتا رہا... اور سپاہی اس لڑکے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد سپاہی چلا گیا تو بس بھی چل دی۔

اب وہ لڑکا اپنی سیٹ سے اٹھ کر ہمارے آگے کی سیٹ پر آ بیٹھا... اور اس نے بھگوان سے پوچھا۔ ''کتنے پیسے تھے تمھاری جیب میں؟''

''حساب تو معلوم نہیں مگر جتنے تھے سب گئے...''

''پھر بھی اندازے سے بتاؤ، کتنے تھے؟''

''ارے کیا بتاؤں...'' بھگوان نے کہا۔ ''جو تھے سب گئے۔ جتنے بمبئی کے لیے لایا تھا، سب گئے۔ ایک پیسا میرے پاس نہیں ہے۔''

''بمبئی میں کہاں رہتے ہو؟''

''کہیں بھی نہیں رہتا ہوں۔ اس کے پاس آیا تھا مگر اس کے پاس بھی کوئی کام نہیں ہے۔'' بھگوان نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

وہ لڑکا میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ماسٹر، اپن تو گلی میں گھومنے والے بے کار لڑکے ہیں۔ تیری طرح اسکول و سکول نہیں جاتے ہیں۔ تُو سمجھ لے، تیرے ٹکٹ کے پیسے مارے گئے... اپنا بائی کلہ میں کوئی گھر نہیں ہے... ماسٹر، اپن ٹھیک بات کرتا ہے۔ تیری کھوپڑی میں آوے تو ہم کو معاف کر، نہیں تو سنتری کے حوالے کر دے...''

وہ لڑکا میری گفتگو سن کر مسکرانے لگا۔ جیب سے سفید رومال نکال کر اس نے اپنا پسینا پونچھا۔ شاید اس نے اس قسم کی گفتگو پہلی بار سنی تھی۔ کیوں کہ بے چارہ بے حد مہذب اور شائستہ گھر کا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ ہم پر ترس کھا کر اس نے ہمارے ٹکٹ لے لیے تھے۔ مگر ہم بھی کیا کرتے... بائی کلہ برج کے پار اُتر کر وہ ہم سے بولا۔ ''اگر آپ لوگ میرے پیسے نہیں دے سکتے ہیں تو میرا بستہ اٹھا کر وہاں تک لے چلو۔''

''تمھارے گھر تک؟'' بھگوان نے پوچھا۔

''یہی سمجھ لو۔'' وہ لڑکا آہستہ سے بولا۔ اور اس نے اپنا بستہ بھگوان کو تھما دیا۔

بھگوان اس چرمی بیگ کو لیے لیے اس لڑکے کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ میں بھگوان کے پیچھے پیچھے۔

ٹرام کا پٹا پار کر کے ہم لوگ ایک نشیبی گلی میں گھس گئے۔ وہاں سے دوسری گلی میں گئے، دوسری سے تیسری میں اور وہاں سے نکل کر ایک بازار کراس کر کے لکڑیوں کے ایک ٹال میں داخل ہوئے۔ ٹال پر ایک میلی ٹوپی، میلی کُچی، میلی لنگی پہنے ہوئے ایک چھوکرا بیٹھا تھا۔ عمر کوئی سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ اس کے رخساروں پر سیاہی مائل گہرا سبزہ تھا اور اس کا رنگ سانولا تھا۔ وہ خاصا بدصورت تھا اور اس کے چہرے پر خارش کی پھنسیاں بھی تھیں۔ وہ اپنی میلی لنگی کے اندر، ران کھجاتے ہوئے اس خوش پوش لڑکے سے پوچھنے لگا۔ ''یہ کون ہیں؟'' اس نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

''میرے دوست ہیں۔''

''اعتبار والے ہیں؟''

''غریب ہیں اور ان کے پاس کوئی کام بھی نہیں ہے۔''

''کام کرو گے؟'' میلی کُچی والے چھوکرے نے اپنی کرنجی

آنکھوں سے ہمیں گھور کر پوچھا۔

''مل جائے تو کیوں نہیں کریں گے؟'' میں نے فوراً آگے بڑھ کر کہا۔

جواب میں اس نے کچھ نہ کہا۔ خوش پوش لڑکے سے اتنا پوچھا۔ ''لے آئے؟''

''ہاں!''

''کدھر ہے؟''

جواب میں اس اسکول کے لڑکے نے کچھ نہ کہا۔ اپنا بستہ کھولنے لگا... جب چرمی بیگ کھلا تو اس میں کتابوں کے بجائے تین بوتلیں شراب کی برآمد ہوئیں!

بھگوان کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''میں تو سمجھا تھا، تم اسکول کے لڑکے ہو!''

''کون ہاکو...!'' وہ بڑا لڑکا زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔ ''اپنا ہاکو، یار یہ تو ٹھرّا اسکول کا طالبِ علم ہے۔ دس سال سے یہی دھندا کر رہا ہے۔ اب تو اسکول پاس کر کے وھسکی کے کالج میں جانے والا ہے۔''

''تمھارا باپ کدھر ہے؟'' ہاکو نے جلدی سے پوچھا۔

''وہ کھانے کو گیا ہے۔ مجھ سے بول گیا تھا کہ ہاکو آئے تو اس کو روپے دے کر ٹھرّا لے لینا۔ ادھر سالا کب سے تمھارا ویٹ کرتا تھا۔''

''پیسے نکالو۔'' ہاکو جلدی سے بولا۔

''نکالتا ہوں، پہلے ایک ایک پیگ تو مار لیں...''

میلی لنگی والے لڑکے نے لکڑیوں کے پیچھے سے چار گلاس نکالے۔

بھگوان نے پوچھا۔ ''کیا تم لوگ شراب پیو گے؟ تم...؟ چھوٹے سے لڑکے...؟ تم بھی...؟'' بھگوان نے ہاکو کی طرف دیکھ کر کہا۔

ہاکو زور سے ہنسا۔ ''اس میں کیا ہے۔ ابے ٹھرّے کا دھندا کرنا ہے تو ٹھرّے سے ڈرنا کیسا... جب پیار کیا تو ڈرنا کیا...؟ آج تم بھی چکھ لو...''

وہ بڑا لڑکا چار گلاسوں میں ٹھرّا ڈالتے ہوئے اور جس بوتل سے اس نے ٹھرا نکالا تھا، اس میں پانی ڈالتے ہوئے بولا۔ ''میرے باپ کو پتا نہیں چلیں گا، سالے کو... کہ اس میں پانی ملا ہے... مگر اب تم لوگ جلدی سے گلاس خالی کر دو، کہیں پر میرا باپ آ گیا تو مار مار کے پلستر بگاڑ دے گا۔''

ہاکو اور وہ دونوں گلاس کو مُنہ لگا کر غٹا غٹ پینے لگے۔ ہم نے یہ موقع غنیمت سمجھا، فوراً وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے... ہاکو اور وہ دونوں حیرت سے ہماری طرف دیکھتے ہی رہ گئے مگر ان لوگوں نے ہمارا تعاقب نہیں کیا۔ انھوں نے غالباً ہمیں انتہائی احمق سمجھا ہوگا۔

بائی کلّہ برج پر پہنچ کر ہم لوگ پیدل دادر کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے بھگوان سے کہا۔ ''اب کہاں جائیں گے؟''

''تمھارے گھر!''

''مگر تم نے تو آج شاید واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔''

''اب میں نے وہ فیصلہ ملتوی کر دیا ہے...''

''ہاکو کو دیکھ کر؟''

بھگوان نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ اس کی آنکھ میں آنسو ہیں۔

میں نے سوچا۔ میں بھگوان سے کہوں، تم بہت شریف ہو بھگوان! بہت نیک ہو بھگوان! بہت ہم درد ہو بھگوان! لیکن اگر آنسوؤں سے یہ دنیا بدل سکتی تو پھر ہر صبح اوس کے آنسو کیوں سوتی رہتی؟

اس رات کھولی میں بڑی گرمی تھی۔ گرمی اور بھوک سے نڈھال ہو کر میں بالکل جھلا چکا تھا۔ میں نے غصے سے بھگوان سے کہا۔ ''آخر تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟ اس شہر میں سیکڑوں لکھ پتی تاجر اور کروڑ پتی ٹھیکے دار اور مل مالک بستے ہیں۔ وہ لوگ تمھیں ہر طرح کا آرام دیتے۔ وہاں تم بڑے مزے میں رہتے۔ کسی طرح کی تکلیف تمھیں نہ ہوتی۔ آخر تمھیں میرے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''میں بھگوان ہوں، جہاں چاہوں جا سکتا ہوں...'' بھگوان نے ذرا تنک کر کہا۔ ''تم مجھے ٹوکنے والے کون ہوتے ہو...؟ تمھیں تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں تمھارے پاس آیا ہوں اور تم ہو کہ الٹا مجھی کو کوس رہے ہو...''

''کیوں نہ کوسوں! صبح سے بھوکا ہوں۔ کرسٹان لوگ کے میلے میں جو تھوڑی سی مٹھائی کھائی تھی اس کے بعد سے اب تک ایک کپ چائے کا نہیں ملا۔ دن بھر تمھارے ساتھ کھوٹی کرتا ہوں اور تم ہو کہ خود کسی جیب کترے سے جیب کٹوا کر میرے سر پر چڑھے بیٹھے ہو۔''

''میرا خیال ہے، تمھیں بھوک لگی ہے۔'' بھگوان نے مسکرا کر کہا۔

میں نے جھلا کر کہا۔ ''اب میں بھگوان تو ہوں نہیں تمھاری طرح کہ مجھے بھوک بھی نہ لگے۔''

بھگوان چپ ہو گئے۔

میں نے کہا۔ ''چپ کیوں ہو گئے۔ ہمیں پیدا کیا تھا تو ہمارے جینے کا سادھن کیوں نہیں کیا؟ اب پڑے میری کھولی میں اخبار جھلا جھلا کر گرمی میں مر رہے ہو۔ جاؤ اپنے سورگ میں اور ہم غریبوں کو مرنے دو اس دنیا کی بھٹی میں...''

بھگوان نے کہا۔ ''ابھی تو میں نہیں جا سکتا۔ ابھی تو میرا کام پورا نہیں ہُوا ہے...''

''تو پیسے نکالو۔'' میں نے جھگڑا کرتے ہوئے کہا اور واقعی میں راستی پر تھا۔ اگر میں دن بھر کسی دوسرے آدمی کے لیے کام کرتا تو وہ مجھے دن میں دو وقت روٹی بھی نہیں دیتا؟ اونہہ! پیسے تو میرے پاس ہیں نہیں! تمھیں معلوم ہے۔ بس یہ دو موی تمھیں میرے پاس ملے۔''

''موم سے پیٹ بھرے گا! بھگوان جی، تم بھی بھگوان قسم، کیسی اول جلول باتیں کرتے ہو!''

''تو پھر میں کیا کروں؟'' بھگوان نے بالکل زچ ہو کر کہا۔

''میں نہیں جانتا کیا کرو۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے... سورگ سے پیسے منگاؤ۔''

''وہ لوگ نہ بھیجیں گے۔''

''کیوں نہیں بھیجیں گے۔ اور کس کے حکم سے نہیں بھیجیں گے۔''

''میرے ہی حکم سے نہیں بھیجیں گے۔ تمام قواعد اور اصول میں نے ہی بنائے ہیں۔ اب میں خود ہی کیسے انھیں توڑ سکتا ہوں؟''

''مگر تم بڑے عجیب بھگوان ہو۔ ساری بمبئی میں مَیں ہی تمھیں ملا تھا، پریشان کرنے کے لیے۔ وہ فلم اسٹار بھاگ کا نوکر ہے۔ سائیں چوہے شاہ کا بھگت ہے۔ جب تک دن میں دو مرتبہ اس کے مزار پر نہ جائے، فلم کی شوٹنگ نہیں کرتا۔ چار لاکھ بلیک میں لیتا ہے، پچیس ہزار کا کنٹریکٹ کرتا ہے۔ اتنا بڑا عالی شان اس کا گیسٹ ہاؤس ہے۔ آخر تم اسی کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے؟''

''ایک بار میں نے اس کے دل کو سونگھا تھا...'' بھگوان بولے۔ ''مجھے اس کے دل میں کوئی خوش بو نہ ملی۔''

''تو ہاپوڑ جی کا پوڑ جی دالان والا کے ہاں چلے جاتے... سب جانتے ہیں کہ مڈل ایسٹ سے سونا اسمگل کرتا ہے۔ ساٹھ روپیا تولہ خریدتا ہے اور ایک سو پچیس میں یہاں بیچ دیتا ہے۔ ہر سال کروڑوں روپے کا سونا اسمگل کرتا ہے، سرکار کے بڑے

عقل مند

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں امریکی فضائیہ کے ایک یونٹ کو حکم دیا گیا کہ وہ برلن میں پروپیگنڈے کے اشتہارات گرائیں۔ اگلے روز مہم سے فارغ ہو کر ایک کے سوا سارے جہاز واپس آ گئے۔ جب چار دن تک وہ جہاز نہیں آیا تو ہواباز کا نام مرے ہوئے گمشدہ لوگوں کی فہرست میں لکھ لیا گیا۔

لیکن پانچویں روز ہواباز بہ حفاظت جہاز سمیت واپس آ گیا۔ کمانڈر نے پوچھا۔ ''تم کہاں رہ گئے تھے؟ سارے جوان اپنے اپنے اشتہارات گرا کر اسی روز لوٹ آئے مگر...''

''کیا کہا؟ اشتہارات گرا کر!'' ہواباز نے حیرت سے کہا۔ ''میں تو سارے اشتہارات ایک ایک گھر پر چپکاتا پھر رہا تھا۔''

تعاون ✪ محمد عثمان

بڑے ٹھیکوں پر ہاتھ مارتا ہے مگر بڑا خدا ترس، نیک نیت، بھگوان بھگت آدمی ہے۔ اسی سال اس نے دو مندر، دو مسجد، دو گرجا اور دو گوردوارے اپنی جیب سے چندہ دے کر تعمیر کرائے ہیں۔ تم اسی کے پاس جا سکتے تھے۔''

''میں نے اس کی آنکھیں دیکھی تھیں...'' بھگوان بولے۔ ''مجھے اس کی آنکھوں میں شرم نظر نہیں آئی۔''

''تو تم اماپچکارنی کے محل میں چلے جاتے... وہ بمبئی کی سب سے بڑی قحبہ ہے۔ پچاس قحبہ خانوں کی تو وہ اکیلی مالک ہے۔ ان مختلف قحبہ خانوں سے اسے ایک رات میں جتنی آمدنی ہوتی ہے، وہ چیچاپل میں کام کرنے والے ڈیڑھ ہزار مزدوروں کی تیس دن کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہوگی۔ وہ دن میں دو دفعہ پوجا پاٹ کرتی ہے اور دو دو گھنٹے تمھارے چرنوں میں جھکی رہتی ہے۔''

''میں نے اس کے سینے میں جھانکا تھا...'' بھگوان بولے۔ ''وہاں مجھے کسی چیز کی لوری نہیں ملی...''

''تو تم پیر کرامت علی کے پاس چلے جاتے... وہ بمبئی کا سب سے بڑا صوفی ہے۔ ہر وقت مراقبے میں پڑا رہتا ہے۔''

''وہ خیرات پر زندہ ہے۔''

''تو رامو دھوبی کے پاس چلے جاتے۔''

''وہ اپنی بیوی کو پیٹتا ہے۔''

''ساتھ والی کھولی کے کلرک کے پاس چلے جاتے۔''

''مجھے اس کی ناک پسند نہیں ہے!''

بھگوان کی اس بات پر میں بے اختیار ہنس پڑا... وہ بھی ہنس پڑے۔ تھوڑی دیر میں میرا سارا غصہ کافور ہوگیا۔ میں نے کہا... ''ہو تو تم بھگوان... مگر تم میں مزاح کی حس بھی ہے۔''

''وہ بھگوان ہی کیا جو اپنی تخلیق پر ہنس نہ سکے۔'' بھگوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے...'' میں نے تھوڑی دیر کے بعد سوچتے ہوئے کہا... ''مگر ہنسنے سے پیٹ کی بھوک نہیں جاتی بلکہ اور بڑھ جاتی ہے۔''

''بھگوان نے کہا۔'' بھوک تو اب مجھے بھی لگ رہی ہے۔''

''تمھیں بھی؟ وہ کیسے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''شاید تمھاری دنیا کا اثر ہو رہا ہے۔''

میں نے سوچ سوچ کر کہا۔ ''میرا ایک دوست ہے گھسیٹو۔ ہے تو اعظم گڑھ کا پورا بیا... دھوتی پہنتا ہے، یہ لمبی چوٹی رکھتا ہے... مگر ہے بڑے مزے کا آدمی۔ دن میں دودھ بیچتا ہے رات کو ٹھرّے کا دھندا کرتا ہے۔ اگر اس کے پاس چلیں تو کھانا تو وہ کھلائے گا اور شاید ایک دو پیگ بھی پلا دے... مگر ماہم تک پیدل چلنا پڑے گا۔''

''چلیں گے۔''

''اور اگر اس نے مجبور کیا تو دو ایک پیگ بھی پینا پڑے گا۔''

''پی لیں گے۔''

''اور اگر بدقسمتی سے پولیس کی دھاڑ آ گئی اور تمھیں پکڑ لیا تو حوالات بھی جانا پڑے گا۔''

''چلے جائیں گے۔'' بھگوان نے مکمل بے پروائی سے کہا۔

''اچھی طرح سے سوچ لو...'' میں نے کہا۔ ''بعد میں مجھ کو کوسو گے تو نہیں... کہ کہاں لے گیا۔ دوسرے دن اخبار کی یہ جلی سرخی ہوگی... بھگوان حوالات میں... ذرا سوچو تو، تمھیں شرم نہیں آئے گی۔''

''شرم کیوں آنے لگی۔ یہ اتنے مندر جو بمبئی میں میری مورتی کو لوہے کی سلاخوں کے پیچھے بند رکھتے ہیں، یہ حوالات نہیں ہیں تو اور کیا ہیں؟'' بھگوان نے ذرا خرش روئی سے کہا۔

میں چپ ہوگیا اور اٹھ کر باہر جانے کے لیے چپل پہننے لگا۔

ماہم کریک کے قریب جہاں سال میں دو مرتبہ دی گریٹ رائل سرکس کا شامیانہ لگا رہتا ہے، وہاں پر گھسیٹو کا جھونپڑا تھا۔ اس کا گھر تو مضافات میں گورے گاؤں کے قریب تھا مگر مضافات میں ٹھرّے کا دھندا کیا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے پولیس کی چوکی کے بالکل قریب اس جھونپڑے میں ٹھرّے کا دھندا شروع کیا تھا۔ یعنی مسجد کے زیر سایہ خرابات کی بنا ڈالی تھی، یہاں اس کا دھندا بڑے مزے کا چلتا تھا...

میں بہت دنوں کے بعد گھسیٹو سے ملا تھا، اس لیے وہ بے حد تپاک سے مجھ سے ملا۔ اس آدمی میں یہ بھی بات تھی کہ یہ معلوم کر کے کہ میں بالکل لڑکا ہوں، اس نے کسی طرح کا برا منہ نہیں بنایا۔ بلکہ کچھ کہے سنے بغیر اس نے ہم دونوں کے سامنے دو پیگ ٹھرّے کے رکھ دیے، چار مینار کی ایک ڈبیا رکھ دی، مچھلی کے دو ٹکڑے تل کر رکھ دیے۔ جانے کیسے اس نے بھگوان کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ وہ بھی کڑکا ہے اور جیب سے بالکل پھانک ہے۔

''مجا کرو...!'' گھسیٹو مجھ سے بولا۔ ''آج تم کو تین پیگ تک پلا دوں گا۔ پھر کھانا بھی کھلا دوں گا۔ پیسے بعد میں آ جائیں گے۔ بھگوان کی دیا ہے، دودھ اور ٹھرّے کا کام بہت اچھا چلتا ہے۔''

گھسیٹو نے اتنا کہہ کر اپنی لمبی چوٹی کو گردن دی اور جھک کر دیوار پر لگی ہوئی، بھگوان کی تصویر کے سامنے ذرا سا سر جھکا دیا۔ پھر دوسری میزوں پر کام کرنے کو چلا گیا۔

جھونپڑا، دن بھر کام کرنے والے ماچھیوں، مزدوروں، امیر گھروں کے نوکروں، ریٹائرڈ گداگروں اور دس بجے کے بعد عورتوں کا دھندا کرنے والیوں سے بھرا ہوا تھا۔ طرح طرح کی آوازیں، طرح طرح کی زبانیں، طرح طرح کی گالیاں اور ان سب کے اوپر تمباکو، مچھلی اور ٹھرّے کی ملی جلی ہوئی بدبو، انسانوں کے بہتے ہوئے پسینوں میں گھل کر ایک عجیب تعفن اور گھٹن پیدا کر رہی تھی...

''انسان نے اپنے لیے جہنم سے بھی زیادہ تکلیف دہ بستیاں آباد کی ہیں۔'' بھگوان نے آہستہ سے کہا۔ ان کے لہجے میں نفرت تھی۔

''تو یہ تو مانو گے کہ کہیں پر ہم نے تم کو مات دی ہے۔''

''مانتا ہوں۔''

''تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اگر انسان دوسری طرف جھک گیا تو سورگ سے بھی خوب صورت بستیاں آباد کر سکے گا۔''

''تم...!'' بھگوان نے مسکرا کر کہا۔ ''ٹھہرو ابھی...''

ایک دلال دوسرے دلال سے کہہ رہا تھا۔ ''میں اسے کمبھی دانتوں والی کے پاس لے گیا... جس نے ابھی ابھی اپنے دندان ساز سے نئے دانتوں کا سیٹ لگوایا ہے۔ مگر گاہک کو

کمبھی پسند نہ آئی۔ بولا' مجھ کو جاپانی لڑکی دکھاؤ۔' میں اسے یہاں لے آیا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اب کہاں لے جاتا... میں اسے یہاں گھسیٹو کے جھونپڑے میں لے آیا۔ اور اسے ڈپٹ کر ٹھرّا پلایا۔ جب وہ سالا ہلکٹ بالکل دُھت ہوگیا تو اس کو پھر کمبھی کے پاس لے گیا۔ اس ٹائم اس نے کمبھی کو نہیں پہچانا۔ بولا' ہاں، ایسی ہی جاپانی لڑکی میں مانگتا تھا۔' سالا جاپانی کا بچہ... جس لڑکی کے وہ گھنٹا پہلے دس روپے نہیں دیتا تھا، گھسیٹو بھیا کا ٹھرّا پی کر وہ اس کے پچاس دے گیا۔''

''گھسیٹو کا ٹھرّا اصل ہے، باقی سب نقل ہے...'' گھسیٹو خود بھی ایک گلاس چڑھاتے ہوئے بولا۔

گھسیٹو کا ایک دوست چرواہا جو خود بھی گھسیٹو کی طرح دودھ بیچتا تھا، بھرے ہوئے جھوپڑے کو رشک کی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ''تیرا دھندا تو بہت چل نکلا ہے بھیا، اب میں بھی شروع کرتا ہوں!''

''نہ! نہ!'' گھسیٹو اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''دودھ کا دھندا، ٹھرّے کے دھندے سے بہت اچھا ہے۔ دودھ میں جتنا پانی ملا دو، گاہک کچھ نہیں کہے گا۔ لیکن ٹھرّے میں پانی کا ایک قطرہ بھی ڈال دو تو گاہک پھر کبھی نہیں آئے گا۔''

''گھسیٹو جندہ باد!'' ایک نوکر آہستہ سے بولا۔

''سب بھگوان کی دیا ہے...'' گھسیٹو نے شیو جی مہاراج کی تصویر کو دیکھ کر نام کیا۔

گھسیٹو بڑا دھرم آتما قسم کا آدمی تھا۔ اس نے جھونپڑے میں چاروں طرف دیوی دیوتاؤں کی تصویریں سجا رکھی تھیں۔

''کدھر ہے بھگوان!'' ایک مزدور زور سے ہنکارا۔ ادھر سامنے کی سلک مل میں آگ لگ گئی۔ مل ابھی تک جا لو نہیں ہوئی، دو مہینے سے بیکار پھرتا ہوں۔ میری گھر والی بیس برس سے روج مندر جاتی ہے۔ بھگوان کو کیا ہماری مل ہی جلانی تھی؟''

''ارے بھگوان کو گالی مت دو...'' گھسیٹو زور سے چلا کر بولا۔ ''اگر میرے جھونپڑے میں شراب پینی ہے تو گالی مت دو۔''

''کون پیتا ہے، آج کے بعد تمھارے جھونپڑے میں...'' وہ مزدور اپنا پیگ خالی کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمارا دل اندر سے دُکھتا ہے تو ہم بھگوان کو سناتا ہے... بھگوان اگر ہمارا مل نہیں جلاتا... تو ہمارا سالے کا کیا بھیجا پھریلا ہے جو اس کو گالی دے گا۔''

مزدور غصے سے باہر چلا گیا۔ مگر وہ فضا میں فتیلہ سا لگا گیا۔ اک دم بہت سے لوگ بول پڑے۔

''ٹھیک تو کہتا ہے بے چارہ... ہمارا بھی چوری کا کاروبار نہیں چلتا۔ سندھی سیٹھ نے مجھ کو ایک مہینے کا نوٹس دے دیا، مکان خالی کرو۔ کدھر سے کریں گا اور کدھر جا کے رہیں گا... بائی بولتی ہے۔ 'تم چور ہے۔ باندرے کی مارکیٹ میں ٹماٹر آٹھ آنے رتل ملتا ہے، تم بارہ آنے کیوں لاتا ہے؟ تم چور ہے؟'

''میں تم سے کہتا ہوں، میں گنو کا ماس کھاؤں جو تم سے جھوٹ بولوں۔ میں ایک پیسا چوری نہیں کرتا پھر ہر روز چور کہلاتا ہوں۔''

''سچ ہے اس اوپر والے کے گھر میں انصاف نہیں ہے...''

''میرا لڑکا دس دن سے بیمار تھا۔ سائیں چوہے شاہ کی برکت سے اچھا ہوگیا۔ بھگوان تو بڑا اچھا ہے...''

''ارے اچھا ہے، بہت اچھا ہے۔''

''نہیں ظالم ہے، سخت ظالم ہے۔''

دو شرابیوں میں بحث ہونے لگی۔ دونوں موٹے موٹے ہاتھ پاؤں کے طاقت ور ماچھی تھے اور بھگوان کی صفات پر بحث کرنے سے زیادہ انھیں اپنی اپنی طاقت دکھانے کا زیادہ گھمنڈ تھا۔

''میں کہتا ہوں، وہ برا ہے...''

''میں کہتا ہوں، وہ اچھا ہے۔''

''برا ہے۔''

''اچھا ہے۔''

دونوں ماچھی آمنے سامنے اٹھ کے ایک دوسرے سے ہاتھا پائی کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ گھسیٹو جلدی سے دونوں کے بیچ آ گیا، بولا۔ ''لڑائی مت کرو۔ تیسرے آدمی سے فیصلہ کرا لو۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔'' دونوں ماچھی بولے۔ پھر ان دونوں کی نگاہیں ہم پر پڑیں، ہمارا ٹیبل ان کے بہت قریب تھا۔ وہ دونوں غور سے بھگوان کو گھورنے لگے۔ شاید انھیں بھگوان کا چہرہ میرے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ اور بھولا بھالا نظر آیا۔ میں کہہ نہیں سکتا، کیا بات تھی۔ بہ ہر حال، انھوں نے مجھے چھوڑ دیا اور وہ دونوں بھگوان کے پاس آ کر بولے۔

''تم انصاف کرو۔ یہ بولتا ہے...'' ایک ماچھی بولا۔ ''کہ بھگوان اچھا ہے۔ میں بولتا ہوں، وہ ظالم ہے۔ تم بتاؤ، ہم دونوں میں کون ٹھیک ہے؟''

''کوئی بھی نہیں!'' بھگوان نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''کیسے؟'' وہ دونوں غصے میں بولے۔

''اس لیے بھگوان کہیں نہیں ہے۔''

''بھگوان نہیں ہے...!'' وہ دونوں ایک ساتھ چیخ کر

بولے۔ ''ارے سنتے ہو! یہ بولتا ہے... یہ سلا ابلکٹ... کہ بھگوان کہیں ہئی نہیں!''

''رام رام!''

''کفر بکتا ہے!''

''بلاس فیمس!''

''کیا بولا ہے تُو... کہ بھگوان نہیں ہے!'' گھسینو نے آ کر بھگوان کو گلے سے پکڑ لیا۔ ''اسی کا کھاتا ہے، اسی کا پیتا ہے، اسی کا پہنتا ہے اور اسی کو گالیاں دیتا ہے۔ ہمارے پاس آ کر ادھار پیتا ہے۔ اور ہمارے بھگوان سے انکار کرتا ہے...''

گھسینو نے ایک طمانچہ زور سے بھگوان کو لگایا۔

میں نے خوف سے تھرا کر کہا۔ ''ارے ٹھیرو... ٹھیرو... تم جانتے نہیں ہو، یہ کون ہے۔ ارے تم چھوڑ دو...''

''ارے، کیسے چھوڑ دیں اس کو! بھگوان کی ہستی سے انکار کرتا ہے۔ چھرا بھونک دیں گے سالے کے...'' وہ دونوں ماچھی بھی بھگوان پر تل پڑے۔

تھوڑی دیر میں پولیس کی سیٹیاں بجنے لگیں۔ میزیں الٹنے لگیں، لوگ بھاگنے لگے تو میں بھی بھگوان کو دھکیل کر جھونپڑے کے باہر بھاگا اور سیدھا ماہم کریک میں جا کر غوطہ لگایا۔ بھگوان کے چہرے پر اور جسم پر کئی نشان تھے، جگہ جگہ سے خون بہہ رہا تھا۔ میں پانی سے اس کا خون صاف کرنے لگا۔

ماہم کریک میں گھسے ہوئے، دور سے جھونپڑے کے اردگرد دیکھ سکتے تھے۔ وہ لوگ گھسینو اور چند دوسرے لوگوں کو پکڑ کر لے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد چاروں طرف سناٹا ہو گیا تو ہم لوگ پانی سے نکلے اور گھر کی طرف چل دیے۔

راستے میں مَیں نے بھگوان سے پوچھا۔ ''آخر تمھیں کیا سوجھی۔ اپنی ہستی سے انکار کر بیٹھے... اور خوامخواہ مار کھائی... تم نہیں جانتے ہو، یہ ہندوستان ہے۔ یہاں قدم قدم پر مندر، مسجد، گُرودوارا اور گرجا ملتا ہے... ہم لوگ بھگوان کے سب سے بڑے اپاسک اور پجاری ہیں۔ ہم لوگ اپنے بھگوان کے لیے اپنی جان تک دے سکتے ہیں!''

''اپنی جان تو دے نہیں سکتے! البتہ دوسروں کی جان ضرور لے سکتے ہیں!'' بھگوان نے اپنے زخموں کو آہستہ سے ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ''تم سمجھتے ہو کہ یہ میرے زخم ہیں، حالاں کہ یہ سب تمھارے زخم ہیں۔ کانپور سے کلکتے تک اور جموں سے جبل پور تک، تم دھرم کرم کے نام پر جو کچھ کرتے رہتے ہو، وہ سب مجھ پر روشن ہے۔ کیا کبھی تم نے ان زخموں کو گنا بھی ہے جو تم نے آج تک میرا نام لے لے دیے ہیں؟''

صبح دم جب میری آنکھ کھلی تو بھگوان غائب تھے۔ اک دم میرے دل میں خیال آیا کہ رات کے واقعے سے خفا ہو کر چلے گئے۔ مجھے دل میں افسوس بھی ہُوا کہ آخر بتا کر چلے جاتے تو کیا ہرج ہوتا؟ میں کون سا ان کے ساتھ سورگ چلا جاتا؟ پھر خیال آیا ممکن ہے، کہیں سیر کو نکل گئے ہوں، ابھی تو پو پھٹی ہے، سورج نکلنے تک انتظار کر لیں۔ میری نیند بھی پوری نہ ہوئی تھی اس لیے میں کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔ سونے سے پہلے میں نے اتنا ضرور دیکھ لیا کہ دروازے کی کنڈی اندر سے بند ہے اور کھڑکی کی کوئی سلاخ بھی اندر سے غائب نہیں ہے مگر اس بات پر مجھے چنداں تعجب نہ ہُوا۔ بھگوان کے لیے یوں بند کمرے سے غائب ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے بلکہ اکثر و بیش تر وہ تمام اہم موقعوں پر جو انسان کی تاریخ میں پیش آئے ہیں، غائب ہی پائے جاتے ہیں۔ چناں چہ میں نے اس امر پر چنداں تعجب نہ کیا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔ کھلی کھڑکی سے سورج کی روشنی اندر آ کر جب میرے سوئے چہرے پر پڑنے لگی تو میں ہڑبڑا کر جاگا۔ جاگتے ہی میں نے پہلی نگاہ اپنے بغل والی جگہ پر ڈالی جہاں بھگوان سوتے تھے۔ بھگوان بہ دستور غائب تھے۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی بھگوان چلے گئے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے فوراً اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی کہ کمرے میں کوئی چیز غائب تو نہیں ہے حالاں کہ میرا یوں سوچنا انتہائی کمینہ پن تھا۔ اور پھر میرے کمرے کا سامان بھی بے حد مختصر ہے۔ بمبئی جو ہے، غنیمت ہے اور آج کل بمبئی میں 'کونفیڈینس ٹرک' کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی چور آیا ہو اور بھگوان کا بھیس بنا کر، مجھے اُلو بنا کر میرا سامان اٹھا کر چلتا بنا۔ اس لیے میں نے غور سے کمرے کے چاروں طرف پھیلے سامان پر سرسری سی نظر ڈالی اور سوائے ایک چھتری کے کسی چیز کو غائب نہ پایا تو پہلے لمحے کے لیے بے حد اطمینان ہُوا اور دوسرے لمحے کے لیے بے حد شرمسار ہُوا کہ میں نے بھگوان کے لیے یوں سوچ لیا۔ تیسرے لمحے میں یہ سوال اُبھر کر آیا۔ آخر بھگوان کو میری چھتری لے جانے کی کیا ضرورت تھی!

ابھی میں آنکھیں موندے بستر پر پڑے پڑے یہ سوچ رہا تھا کہ میرے قریب کسی کے کروٹ بدلنے کی آہٹ سی سنائی دی۔ میں نے چونک کر دیکھا، بھگوان تھے اور میرے ہاجو کے بستر پر لیٹے تھے اور چھتری بھی اپنی جگہ جہاں موجود تھی، وہیں تھی

اور کمرے کی کنڈی بھی اندر سے بند تھی۔ مجھے بھگوان کی اس حرکت پر بے حد غصہ آیا۔ چناں چہ میں نے انھیں جھنجھوڑ کر کہا۔

''کہاں گئے تھے؟''

''مس آشارانی نے بلایا تھا!''

''کون آشارانی، وہ جو مشہور فلم اسٹار ہے؟''

''ہاں!''

''اسے بھگوان سے کیا کام پڑ گیا۔ بھگوان نے اسے سب دے رکھا ہے۔ شہرت، دولت اور ایک احمق شوہر، عورت کو اور کیا چاہیے۔ دنیا میں عورت جس چیز کی خواہش کر سکتی ہے، وہ سب اسے میسر ہے۔ تم نے اس کے محل کے اندر تیرنے کا تالاب دیکھا؟''

''ابھی وہیں سے نہا کر آ رہا ہوں۔'' بھگوان نے انتہائی معصوم انداز میں مسکرا کر کہا۔

''ہمارے سورگ میں بھی اپسرا کے تالاب ہیں اور ان میں کنول کے پھول تیرتے ہیں، مگر ایسا معطر پانی تو ہمارے ہاں کے کسی تالاب میں نہیں ہوتا اور چاروں طرف باہر اور اندر سنگ مرمر کی ٹائیلیں اور چاندی کا زینہ... مزہ آ گیا۔''

''مگر اس نے بلایا کیوں تھا؟'' میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

بھگوان خواب میں بچوں کی طرح شرمانے لگے اور نظریں جھکانے لگے۔ لیکن جب میں نے کسی طرح ان کا پیچھا نہ چھوڑا تو دبی زبان سے بولے۔ ''بھئی، اسے مجھ سے پریم ہو گیا ہے!''

''ایک فلم اسٹار کو تم سے پریم ہو گیا ہے...؟'' میں نے بستر سے اٹھ کر کہا۔ ''تمھارے ہوش ٹھکانے ہیں کہ نہیں!''

''کیوں نہیں ہو سکتا...؟'' بھگوان بھی اپنے بستر سے اٹھ بیٹھے۔ ''آخر ایک فلم اسٹار بھی انسان ہے۔ اسے مجھ سے پریم کیوں نہیں ہو سکتا! اور میں تو اسے ایک عرصے سے دیکھ رہا ہوں۔ تمھیں نہیں معلوم ہے، وہ مجھے کتنا چاہتی ہے۔ اس نے اپنے گھر میں کرشن کی مورتی سونے کی بنوا رکھی ہے۔ اور روز صبح و شام وہ میرا بائی کا لباس پہن کر اُس کے سامنے رقص کرتی ہے۔ طرح طرح سے مجھے رجھاتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر ایک بار تم مجھے اپنے درشن دے دو تو میں تمھارے چرن دھو دھو کر پیوں گی اور تم سے اس طرح لو لگاؤں گی کہ تم میرا بائی کو بھی بھول جاؤ گے۔''

''ترافہ!'' میں نے غصے سے کہا۔

''وہ بالکل ترافہ نہیں ہے...!'' بھگوان غصے سے بولے۔ ''وہ بڑی سیدھی سادی عورت ہے۔ کتنے دن سے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ آخر میں بھی تو ہر ایک کو ایسے ہی درشن نہیں دیتا ہوں... جب تک اچھی طرح پرکھ نہ لوں۔ آج صبح تو اس نے ایک خنجر نکال کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور مجھ سے کہا کہ اگر آج اسی وقت تم درشن نہ دو گے تو میں اس خنجر کو اپنے کلیجے میں گھونپ لوں گی... لہٰذا میں نے اسے درشن دے دیے۔''

''بڑی خاطر کی ہو گی اس نے!''

''ہاں! اس نے گنگا جل سے میرے پاؤں دھوئے۔ مجھے ریشمی کپڑے پہننے کو... کھانے کو شدھ سوچھ ساتوک بھوجن مجھے کھلایا۔ پھر میرے قدموں میں ایک سندر رومال لے کر بیٹھ گئی اور مجھے میٹھے میٹھے گیت سناتی رہی... بہت اچھا وقت گزرا۔''

''آخر تم پر بھی فلم کا جادو چل ہی گیا۔''

''نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے...'' بھگوان مجھے سمجھاتے ہوئے بولے۔ ''وہ عورت ہے ہی دل کی بہت اچھی۔ میری تو بڑی بھگت ہے... دل و جان سے مجھ سے پریم کرتی ہے، وہ تو مجھے آنے ہی نہیں دیتی تھی۔''

''پھر تم کیوں آئے؟''

''تمھاری چھتری جو لے گیا تھا۔''

''میری چھتری کیوں لے گئے تھے؟''

''بھئی، اس کے گھر کے باہر دو کتے جو بندھے رہتے ہیں، وہ بڑے خوف ناک ہیں۔ ان سے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے اسی لیے تمھاری چھتری لے گیا تھا۔ بمبئی کے کتوں کا کیا بھروسا؟ سنا

ہے، بھگوان سے بھی نہیں ڈرتے؟''

''میں تم سے کہتا ہوں...'' میں نے بھگوان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ابھی بمبئی نہیں دیکھی ہے۔ تم بے حد شریف اور معصوم ہو، بھگوان کے لیے، اس چکر میں مت پڑو۔ یہاں بڑے بڑے آئے اور اپنا سب کچھ لٹا کے چلے گئے۔''

''نہیں... نہیں... وہ ایسی نہیں ہے۔'' بھگوان نے بڑی سختی سے کہا۔ ''کیا میں دلوں کا حال نہیں جانتا؟''

میں نے بات ٹالنے کے لیے ان سے کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ، آج کہاں کہاں جانا ہے؟ میں سوچ رہا تھا، آج تمھیں جوہو پر لے چلوں!''

''جوہو پر...؟'' بھگوان نے حیرت سے کہا۔ ''اس نے بھی تو آج مجھے جوہو ہی پر بلایا ہے...''

''کس نے؟''

''آشارانی نے!''

''ٹھیک ہے تو پھر تمھیں میری ضرورت نہیں ہے۔ تم اسی کے پاس جاؤ...''

''میرے دوست...!'' بھگوان نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم آشارانی کو بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔ اس کا پریم مجھ سے سچا اور بے غرض ہے...''

میں نے جواب میں کچھ نہ کہا، بھگوان کا ہاتھ جھٹک دیا اور وہ شرمندہ سے ہو کر پرے بیٹھ گئے۔ میں ان کی طرف پیٹھ کر کے پھر بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آہٹ سی ہوئی، کسی نے کنڈی کھولی۔ میں نے دیکھا، بھگوان دروازے پر کھڑے تھے، ان کے ہاتھ میں میری چھڑی تھی، بولے۔ ''میں تمھاری چھڑی لے کے جا رہا ہوں۔ آج رات سیکنڈ شو میں وہ مجھے اپنی فلم دکھانے والی ہے۔ اب میں کل آؤں گا۔''

اونہہ کہہ کر میں نے غصے سے مُنہ پھیر لیا۔

دوسرے روز صبح جو آئے تو میرے لیے، مٹھائی، ناریل، پھول اور پھل وغیرہ لیتے آئے۔ بڑی مسرت سے بولے۔ ''یہ سب اس نے دیے ہیں اور اب یہ سب میں تمھیں دیتا ہوں۔ اور تم سے پھر کہتا ہوں کہ تم آشارانی کو پہچاننے میں سخت غلطی کر رہے ہو۔ وہ مجھ سے سچا پریم کرتی ہے، شاید میرا بائی سے بھی زیادہ۔ وہ اب ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکتی۔ ہر وقت میرے چرنوں میں سر جھکائے پڑی رہتی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اب مجھے بھی اس سے کچھ کچھ پریم ہو گیا ہے۔''

''تمھیں بھی...؟'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''ہائے، سالی نے پھانس لیا بیچارے کو... ارے کیا کہتے ہو میرے بھگوان... تمھیں اس فلم اسٹار سے پریم ہو گیا ہے؟ تم جو ہر محبت اور ہر نفرت سے بالاتر ہو اور بے نیاز ہو۔ تمھیں اس سے کیسے پریم ہو گیا ہے؟''

''تم نے اس کی صورت دیکھی، کتنی بھولی بھالی ہے؟ کتنی پیاری ہے، کل کے فلم فیئر میں اس کی تصویر دیکھی تھی؟'' بھگوان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

''بیڑا غرق!''

''اور اس کی پتلی پتلی باریک انگلیاں، جیسے تخلیق کی پہلی کاوش...'' بھگوان کی آنکھوں میں آشارانی کا خوب صورت تصور ناچنے لگا۔ ''اور جب وہ میرے پریم میں بے سدھ ہو کر ہاتھ میں کھڑتال لے کر ناچتی ہے تو کس قدر من موہنی معلوم ہوتی ہے۔''

''ستیاناس!''

''آج رات کو اس نے مجھے شکیلہ بانو بھوپالی کی قوالی سنانے کا وعدہ کیا ہے!''

''گئے کام سے تم بھی...!'' میں نے مایوس لہجے میں کہا۔ پھر ایک بار آخری کوشش کرتے ہوئے ان سے کہا۔ ''آخر یہ سوچو کہ تم سورگ سے یہاں کس کام کے لیے آئے تھے! کیا بمبئی کے بچوں کو نہ دیکھو گے؟''

''لعنت بھیجو جی بچوں پر!''

''تمھیں اپنا فیصلہ بدلنے پر ڈر نہیں لگتا؟''

''جب پیار کیا تو ڈرنا کیا؟'' بھگوان گنگنانے لگے۔ میں سٹپٹا کر اپنی کھولی سے باہر نکل گیا۔

میں نے انھیں جھنجھوڑ کر اٹھایا تو وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے۔ ''کیا ہُوا؟''

میں نے ان سے پوچھا۔ ''کیا آشارانی نے گھر سے نکال دیا۔''

''ارے نہیں بھائی...!'' بھگوان افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔ ''وہ تو بات ہی کچھ اور نکلی۔''

''کیا ہُوا؟ کیا آشارانی کا پریم بدل گیا؟''

''نہیں بھائی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ مگر کل رات وہ میرے سامنے اتنا ناچی کہ ناچتے ناچتے میرے قدموں میں بال کھول کر لپٹ گئی اور میرے پاؤں سے چٹ کر روتے ہوئے

بولی۔ ''مجھ پر گھور سنکٹ آن پڑا ہے۔ بھگوان... مجھے اس سنکٹ سے بچاؤ...''

''کیا سنکٹ تھا آشارانی کا...؟'' میں نے بھگوان سے طنزاً پوچھا۔ ''شاید وہ اپنے احمق شوہر سے طلاق لینا چاہتی ہوگی۔''

''نہیں بھائی...!'' بھگوان نے افسردگی سے سر ہلا کر کہا۔ ''انکم ٹیکس کا کیس ہے!''

کھولی میں بہت دیر تک خاموشی رہی۔ بہت دیر تک بھگوان سر جھکائے افسوس سے اپنے ہاتھ ملتے رہے۔

آخر میں نے کہا۔ ''تمھیں افسوس ہوگا کہ اس کی محبت بھی بے غرض نکلی۔''

بھگوان نے کچھ کہا تو نہیں لیکن افسوس سے سر ہلا دیا۔

''مگر اس دنیا میں کون تم سے بے غرض محبت کرتا ہے۔ جسے زندگی میں جس چیز کی کمی ہوتی ہے وہ صرف اسے مانگنے کے لیے تمھارے پاس جاتا ہے... ایک بیٹا ایک گھر، ایک شوہر یا ایک روٹی... اور وہ جن کے پاس سب کچھ ہے، وہ اس دنیا میں اپنا سورگ تعمیر کر کے اگلی دنیا کے سورگ میں اپنی جگہ ریزرو کرنے کے لیے تمھارے پاس جاتے ہیں۔ لاکھوں کی بلیک کے بعد ایک مندر، مسجد یا گرجا بنا دینا رشوت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ ان تمام لوگوں کے سامنے تمھاری حیثیت ایک آئی سی ایس آفیسر یا ایک منسٹر سے زیادہ نہیں ہے... وہ تمھیں نہیں پوجتے، میرے بھولے بھگوان، وہ تو اپنے آرزو کو پوجتے ہیں یا اپنے ڈر کو پوجتے ہیں...''

شاید میں غصے میں کچھ اور بھی کہتا مگر بھگوان کا بھولا شرمسار چہرہ دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے زور سے انھیں گلے سے لگا لیا۔ گلے سے لگتے ہی بھگوان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ان کی سسکیوں میں ایسی دھمک تھی جیسے یہ دھرتی آج ہی پھٹ جائے گی!

دوسرے دن سے ہم دونوں پھر اپنے پرانے کام پر لگ گئے... مالی حالت بھی بے حد سقیم ہو چکی تھی۔ سورگ سے مزید فارن ایکسچینج منگانے کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا ہم دونوں ذرا بڑی عمر کے لڑکے بن کر چرچ گیٹ اسٹیشن کے باہر کسی کام کی تلاش میں پہنچ گئے... یہاں پر لڑکوں کی ایک ٹولی تھی جو اسٹیشن سے اترنے والوں کے لیے ٹیکسی مہیا کرنے کا کام کرتی تھی۔ یہ لوگ بھاگ بھاگ کر ایروس سنیما تک چلے جاتے تھے اور ادھر سے ایمباڈر ہوٹل تک چلے جاتے تھے اور خالی ٹیکسیوں کو گھیر کر گاہکوں کے لیے لاتے اور اس کام کے لیے انھیں دو آنے ملتے تھے۔ کبھی کوئی کمینہ گاہک ایک آنہ بھی دیتا تو لڑائی ہونے لگتی اور بہت سے لونڈے اکھٹے ہو کر شور مچانے لگتے۔ ہم نے بہت کوشش کی لیکن لڑکوں کی اس ٹولی نے ہمیں اپنے میں شامل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کے لیڈر نے ہم سے کہا۔ ''ہم لوگ خود دن بھر کتوں کی طرح بھاگ بھاگ کر رات کے بارہ بجے تک آٹھ دس آنے پیدا کرتے ہیں۔ اس میں بڑی مشکل سے دن بھر کا چائے پانی سگریٹ اور ایک وقت کا کھانا ملتا ہے۔ ٹیکسیاں کم ہیں اور کام کرنے والے زیادہ ہیں۔ اکثر گاہک تو خود ہی ٹیکسی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ایسے میں دھندا کیا خاک چلے گا۔ اب تم دو اور آ جاؤ گے تو اور مصیبت بڑھ جائے گی۔''

وہاں سے مایوس ہو کر ہم لوگ سامنے کے فٹ پاتھ کے باجو میں بیٹھنے والے بوٹ پالش کرنے والے چھوکروں کے پاس گئے۔ ان چھوکروں نے رنگ دار بش شرٹ پہن رکھے تھے، کمر میں کس کر پیٹی باندھی تھی اور کالی پتلونوں کو گھٹنوں سے اوپر چڑھا رکھا تھا۔ وہ پالش کرنے والے لکڑی کے ڈبے اپنے سامنے رکھے ہوئے تھے اور ان میں رنگا رنگ کی پالش کی ڈبیاں سجائے ہوئے بڑے بانکے اور چھیلے نظر آتے تھے۔ ہم نے سوچا یہ کام بڑے مزے کا رہے گا۔

بوٹ پالش کرنے والے چھوکرے جس دادا کے لیے کام کرتے تھے، ہم اس سے ملے۔ وہ ہماری مصیبت سن کر بولا۔ ''کام تو میں تم کو دے سکتا ہوں مگر صبح آٹھ بجے یہاں اسٹیشن پر آ جانا ہوگا اور رات کے بارہ بجے جانا ہوگا۔''

''وہ کیوں...؟'' بھگوان نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ''سرکاری ریٹ سے بھی زیادہ آٹھ گھنٹے کام تم نہیں کرا سکتے!''

''تو گورنمنٹ کے پاس جاؤ، میرے پاس کیوں آئے ہو؟''

''یہ زمین بھگوان کی ہے، حکومت سرکار کی ہے، فٹ پاتھ پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے...'' بھگوان نے سختی سے کہا۔ ''ہم بھوکے بچے ہیں۔ ہم یہاں پر اپنا لکڑی کا ڈبا لے کر آئیں گے اور پالش کریں گے۔ اور جو کمائیں گے اسے خود کھائیں گے!''

''ایسا دھندا بمبئی میں نہیں چلتا مسٹر...!'' دادا تلخ لہجے میں بھگوان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اس فٹ پاتھ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم دادا لوگ نے بانٹ لیے ہیں۔ ہم اس جگہ کا بھتا دیتے ہیں، ہفتہ دیتے ہیں۔ تم ہماری جگہ پر کام کرو گے تو پکڑے جاؤ گے۔ حوالات کی ہوا کھاؤ گے... یہ بمبئی ہے، یہاں کام کرنا ہے تو ہمارے انڈر میں کام کرنا ہوگا۔ میں تم کو ایک پتلون کالی دوں گا، دو بش شرٹ دوں گا، دو ٹائم کھانا دوں گا۔ دو ٹیم چائے سپلائی کروں گا۔ پالش کا تختہ اور ڈبا اور ڈبیاں سب

میں دوں گا، تم کو کھالی پالش کرنے کا ہے اور ایک روپیا روج مجھ سے لے جانے کا ہے۔ باقی سب کمائی پر ہمارا حق ہے، پھر رات کو جب پالش کا کام ختم ہو جائے گا تو لڑکیوں کی سپلائی کا کام شروع ہوگا، وہ کام بھی تم کو کرنا پڑے گا۔"

"تم بچوں سے لڑکیاں بھی سپلائی کرنے کا کام لیتے ہو؟" بھگوان نے اچنبھے سے پوچھا۔

"مسٹر! تم کس شہر سے آئے ہو جو ایسے الٹے سیدھے سوال کر رہے ہو؟ اس بمبئی میں جو مہنگائی ہے اس میں بچے اگر خود سے نہ کمائیں تو بھوکے مر جائیں۔ اس لیے وہ سب کام کرتے ہیں۔ اخبار بیچنے سے لڑکیاں سپلائی کرنے تک، ہر کام کرتے ہیں اور ایک کام کرنے کے لیے دس بچے بھاگ کر ہمارے پاس آنے کو تیار ہیں۔ دس بچوں کو پولیس پکڑ کر ریفارمیٹری میں بھیج دیتی ہے تو بیس اور آ جاتے ہیں۔ تم کو معلوم نہیں ہے کتنی بیکاری ہے اس جگہ پر۔ جانے تم کس شہر سے آئے ہو۔ اور یہ لڑکیاں سپلائی کرنے کا دھندا کیا برا ہے۔ بچے نہیں کریں گے تو کوئی اور کرے گا! لیکن بچوں سے کام لینے میں یہ فائدہ ہے کہ ان پر کوئی شبہ نہیں کر سکتا۔ وہ کسی گاہک سے بات کر لیں، کسی بلڈنگ میں گھس جائیں۔ کسی عورت کے ساتھ چلے لگیں۔ پولیس والے کو کبھی اس پر شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ کام تو بچوں کے لیے بے حد اچھا ہے۔ اک دم سیف ہے اور پیسا بھی اس میں اچھا ہے۔ ورنہ دن بھر بوٹ پالش کر کر کے کیا ملتا ہے؟ صرف ایک روپیا! اور میرے لڑکے تو ایک روپے کا دن میں سنیما دیکھ لیتے ہیں۔ پھر؟ باقی چیزوں کے لیے روپیا کدھر سے لائیں گے؟ اس لیے یہ لوگ شوق سے رات کو دوسرا دھندا کرتے ہیں اور اس میں ان کو کبھی ایک روپیا، کبھی دو روپے، کبھی پانچ روپے بھی بچ جاتے ہیں۔ یہ تو دھندے دھندے پر منحصر ہے... تم دونوں مجھ کو شریف بچے معلوم ہوتے ہو اوری..." دادا نے بھگوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "چھوکرا تو نہایت سیدھا سادہ اور معصوم معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو اس کام کے لیے بہت ہی عمدہ ہے گا۔ دس برس تک پولیس اس کو نہیں پہچان سکتی کہ یہ لڑکیوں کا دھندا کرتا ہے۔ بولو، کام کرتے ہو؟"

میں نے بھگوان کی طرف دیکھا، بھگوان نے میری طرف دیکھا۔ آخر بھگوان نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے وہاں سے گھسیٹتے ہوئے بولا۔ "چلو، یہاں سے چلیں!"

میں نے کہا۔ "مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ کیوں نہ اس دادا کی بات مان لیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ تم چلو اسی وقت یہاں سے!"

بھگوان مجھے زبردستی وہاں سے کھینچ لائے...

اب ہم لوگ میرین ڈرائیو پر چل رہے تھے۔ کبھی کبھی سمندر کی ایک زوردار اُچھال آتی اور خوش گوار پھوار ہمارے چہروں پر بکھیر جاتی۔ ہم لوگ آہستہ آہستہ چوپاٹی کی طرف چل رہے تھے اور بھگوان مجھ سے کہہ رہے تھے۔ "بچوں کو یہ گندہ کام نہیں کرنا چاہیے۔ بچے تو قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان کے ضمیر کو داغ دار کر دینا، اس چھوٹی سی عمر میں ان کی پاک وصاف روحوں کو غلاظت سے ملوث کر دینا کسی طرح اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ بچوں کو تو اسکول میں پڑھنا چاہیے۔ یہی تو عمر ہے ان کی شرافت سیکھنے کی، تہذیب پانے کی، علم حاصل کرنے کی... اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ ٹھرڈ اینچ رہے ہیں، لڑکیاں سپلائی کرتے ہیں اور کتوں کی طرح ٹیکسیوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں ایک آنے کے لیے... میں نے انھیں اس دنیا میں اس کام کے لیے تو نہیں پیدا کیا تھا... آخر کیا بمبئی میں کوئی اسکول نہیں ہیں۔ کیا تم لوگوں کے بچے اسکولوں میں نہیں پڑھتے، اچھے کپڑے نہیں پہنتے، کتابیں نہیں پڑھتے... اپنے گروسے زندگی کا سچا سبق نہیں سیکھتے؟ کہاں ہیں وہ بچے؟"

میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایسے بچے بھی ہیں، گو ان کی تعداد کم ہے۔ میں آج ہی مالا بار ہل کے ماڈرن اسکول میں لے چلتا ہوں۔ مگر چلتے چلتے میں بہت تھک چکا ہوں اور بھوک پیاس سے نڈھال ہوتا جا رہا ہوں۔"

"ماڈرن اسکول ہے کہاں؟" بھگوان نے مجھ سے پوچھا۔

"وہ سامنے مالا بار ہل کی پہاڑی پر!" میں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ بھگوان کی نظریں میرین ڈرائیو کے پانیوں سے چھلکتی ہوئی اوپر مالا بار ہل پر چلی گئیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا۔ "اپنی آنکھیں بند کرو۔"

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

دوسرے لمحے میں جب میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو ہم دونوں بچے ماڈرن اسکول کے دروازے پر تھے۔

اسکول کی بلڈنگ بڑی خوش نما تھی۔ دو منزلہ عمارت بڑے بڑے پتھروں کی بنی ہوئی تھی جن پر گلابی رنگ کا وارنش چمک رہا تھا۔ بڑی بڑی کھڑکیاں اور دروازے سفید رنگ کے تھے۔ اور بلڈنگ کے چاروں طرف وسیع برآمدوں کے باہر ہری ہری

گھاس کے لان تھے جن پر صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے بچے خوش رنگ پھولوں کی طرح کھلے ہوئے نظر آتے تھے...

"یہ ہُوا نا اسکول!... اس کو کہتے ہیں اسکول!" پھر بھگوان نے ایک چپراسی کو روک کر پوچھا۔ "تمھارا پرنسپل کدھر ہے؟"

چپراسی نے بڑی نخوت سے ہم دونوں لونڈوں کو دیکھا۔ ہمارے میلے کچیلے لباس سے اندازہ لگا کر بولا۔ "اگر تم وارنش کمپنی سے بل لے کے آئے ہو تو سیدھے اکاؤنٹنٹ کے پاس جاؤ!"

بھگوان نے بڑی مضبوطی سے کہا۔ "نہیں، ہم وارنش کمپنی کی طرف سے نہیں آئے ہیں۔ ہمیں پرنسپل صاحب سے ملنا ہے۔"

چپراسی نے پرنسپل کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بڑا صاحب اُدھر بیٹھتا ہے۔"

جس دروازے کی طرف اس نے اشارہ کیا، اس کے اندر ہرے رنگ کے پردے لٹک رہے تھے اور باہر پیتل کی ایک تختی پر "پرنسپل" لکھا تھا۔ دروازے کے دونوں طرف پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اس وقت پرنسپل کا چپراسی کہیں گیا ہُوا تھا، ہم نے موقع غنیمت سمجھا اور سیدھے پرنسپل کے کمرے میں گھس گئے۔

پرنسپل گول مٹول چہرے والا، درمیانے قد کا خوش اخلاق انسان معلوم ہوتا تھا۔ جب وہ مسکراتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے منہ کے اندر سو کینڈل پاور کا بلب روشن ہو گیا ہو۔ اس کے چہرے سے شعاعیں سی پھوٹنے لگتی تھیں۔ وہ اس وقت اپنی میز پر جھکا ہُوا کچھ لکھ رہا تھا۔ آہٹ پا کر بغیر سر اونچا کیے اور ہماری طرف دیکھے بغیر اس نے پوچھا۔ "کہیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں!"

"ہم دونوں بچے آپ کے اسکول میں داخل ہونا چاہتے ہیں!" بھگوان نے نہایت شیریں لہجے میں جواب دیا۔

پرنسپل نے سر اوپر اٹھایا۔ پھر اس کے چہرے پر وہی خوب صورت مسکراہٹ آئی جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ مگر جوں ہی اس نے غور سے ہماری طرف دیکھا، اس کی مسکراہٹ یک دم بجھ گئی جیسے کسی نے سوئچ آف کر دیا ہو۔ اب اس کا چہرہ بڑا گمبھیر تھا۔

"میونسپل کمیٹی کے اسکول میں کوشش کرو!" اس نے نہایت بے دلی سے ہمیں صلاح دی۔

بھگوان بولے۔ "مگر ہمیں تو یہی اسکول پسند ہے۔"

"کون سی کلاس میں داخلہ چاہتے ہو؟" پرنسپل نے پوچھا۔

"پانچویں میں!"

"پانچویں میں تو اگلے چار سال کے لیے سیٹیں ریزرو ہو چکی ہیں۔"

"یہ اسکول ہے یا ریل گاڑی کا ڈبا؟" میں نے کہا۔

پرنسپل حالاں کہ ہندوستانی تھا مگر اس وقت وہ بالکل غیر ملکیوں کی طرح اپنے شانے بہترین انگریزی طریقے سے ہلا کر بولا۔ "اور ہم یہاں باہر کے صرف ان لڑکوں کو لیتے ہیں جو سالانہ امتحان میں فرسٹ کلاس لیتے ہیں!"

"ہم..." بھگوان نے کہا۔

"تمھاری کون سی کلاس ہے؟" پرنسپل نے بھگوان سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "ان کی بات کیا کرتے ہو؟ یہ تو ہمیشہ اور ہر جگہ فرسٹ کلاس فرسٹ آتے رہے ہیں!"

تبسم روشن ہو گیا... وہ ایک فارم نکالتے ہوئے بولا۔ "تمھارے باپ کا کیا نام ہے اور وہ کیا کرتے ہیں؟"

"میرا نہ کوئی باپ ہے نہ ماں!" بھگوان نے جواب دیا۔

"تو پھر تم اپنی تعلیم کیسے جاری رکھ سکو گے؟" پرنسپل نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا فرسٹ کلاس فرسٹ لڑکے کو وظیفہ نہیں ملے گا؟" بھگوان نے پوچھا۔

"وظیفہ تو ملے گا، پندرہ روپے ماہانہ۔ مگر اس سے کیا ہوگا؟"

"میں پندرہ روپے ہی میں گزارہ کر لوں گا۔" بھگوان نے جواب دیا۔

"پندرہ روپے تو ہمارے بچوں کے دھوبی کا خرچ ہے؟" پرنسپل نے مسکرا کر کہا۔ "سب ملا کر ایک بچے پر ڈھائی سو روپے خرچ ہوتے ہیں۔"

"ایک بچے پر ڈھائی سو روپے خرچ کرنے والے لوگ بمبئی میں کتنے ہوں گے؟" بھگوان نے پوچھا۔

"چند ہزار تو ضرور ہوں گے، اس لاکھوں کی آبادی میں!" پرنسپل نے بھگوان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تو باقی لاکھوں کے بچے کہاں پڑھتے ہوں گے؟"

"ان کے لیے دوسرے اسکول ہیں۔"

"مگر وہ اتنے اچھے تو نہیں ہیں! اور جو اچھے اسکول میں پڑھنا چاہے، ایک ایسے ہی عمدہ اور خوب صورت اسکول میں جیسا کہ یہ ہے... وہ بچہ کیا کرے؟"

"وہ اپنے لیے امیر ماں باپ لائے کہیں سے...!" پرنسپل نے ذرا چڑ کر کہا۔ "میرے پاس بحث کرنے کے لیے زیادہ

وقت نہیں ہے... آپ لوگ جائیے۔"

ہم لوگ وہاں سے چلے آئے مگر بھگوان کو تسلی نہیں ہوئی۔ وہ چلتے چلتے ایک کلاس میں گھس گئے اور میرے منع کرنے کے باوجود پچھلی بنچ پر جا بیٹھے۔ چند لڑکوں نے ہماری طرف حیرت سے بھی دیکھا مگر ٹیچر کا لیکچر اس وقت زوروں پر تھا اس لیے وہ کچھ بول نہ سکے۔

ٹیچر نپولین بونا پارٹ پر لیکچر دے رہا تھا۔

"نپولین بونا پارٹ بہت بڑا انسان تھا؟"

بھگوان نے فوراً پوچھا۔ "وہ کیوں بہت بڑا انسان تھا۔"

"وہ فاتح یورپ تھا۔" ٹیچر بولا۔

"کیا اس نے اکیلے یورپ فتح کر لیا تھا...؟" بھگوان نے پوچھا۔ "کیا اس کی مدد کے لیے لاکھوں سپاہی نہ ہوتے تھے؟ ہاں، اگر وہ سپاہیوں کی مدد کے بغیر یورپ تو کیا... یورپ کا ایک شہر بھی فتح کر لیتا تو بھی میں اس کو بڑا مان لیتا۔"

"وہ اپنے وقت کا بہترین جنگی کمانڈر تھا!"

"جنگ لڑنے میں کیا بڑائی ہے! جنگ میں ہزاروں آدمی مارے جاتے ہیں۔ اگر ایک آدمی کا قاتل بُرا انسان ہے تو لاکھوں انسانوں کی جان لینے والا بڑا آدمی کیسے ہو سکتا ہے!"

ٹیچر نے ذرا غور سے دیکھ کر کہا۔ "تم کون ہو! تم تو مجھے اس کلاس کے لڑکے نہیں معلوم ہوتے۔ تم نے تو اسکول کا ڈریس بھی نہیں پہن رکھا ہے... گیٹ آؤٹ!"

بھگوان ہنستے ہوئے فوراً باہر بھاگے۔ ٹیچر ان کی باتوں سے بے حد سٹپٹا گیا تھا!

ایک برآمدے کے باہر چند لڑکے والی بال کھیل رہے تھے۔ ہم لوگ بھی ان میں جا گھسے۔ گیند کو بھگوان نے جاتے ہی پکڑ لیا اور مسکرا کر بولے۔ "ہم بھی کھیلیں گے!"

"تم کون ہو؟ ہمارے اسکول کے بچے تو نہیں ہو؟"

"ارے اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تم بھی بچے، ہم بھی بچے! مل کر کھیلیں گے۔" بھگوان نے گیند نچاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ ہم تمھارے ساتھ نہیں کھیلیں گے!" ہماری گیند واپس کرو... ہم تمھارے ساتھ نہیں کھیلیں گے۔"

"کیوں نہیں کھیلو گے؟ بھائی دو گھڑی کھیل لو، ہمارا جی خوش ہو جائے گا، تمھارا کیا بگڑ جائے گا۔" بھگوان منت کرتے ہوئے بولے۔

"لاؤ ہماری گیند۔" بہت سے لڑکے اب ہمارے گرد گھیرا ڈالتے ہوئے بولے۔

"گندے، غلیظ، گلیوں کے کتے... جانے کہاں سے ہمارے اسکول میں آ گھسے ہیں۔" ایک لڑکا غصے سے بولا۔

ایک دوسرا لڑکا باکسنگ کرتا ہُوا آگے بڑھا اور اس نے بھگوان کے جبڑے پر ایک دیا۔ اس کے آگے میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ کیوں کہ دوسرا گھونسا میری ناک پر تھا... اور میری آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے۔

شام کو جب میں اور بھگوان اپنی سوجی ہوئی ناکیں لیے اور زخمی ہاتھ پاؤں پھیلاتے ہوئے کھولی کی طرف آ رہے تھے تو بھگوان نے بڑی حقارت سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "چہ؟ کیسا شہر ہے تمھارا؟ جہاں بچے بچوں سے نفرت کرتے ہیں!"

میری کھولی میں لیٹے لیٹے بھگوان نے مجھ سے پوچھا۔

"سوتے کیوں نہیں ہو؟"

"نیند نہیں آتی؟"

"کیوں نہیں آتی۔"

"بھوک لگی ہے!"

"تو تندوری مرغ کھاؤ، پلاؤ کھاؤ، بریانی کھاؤ، چکن چاپ کھاؤ، کس نے منع کیا ہے؟" بھگوان مسکراتے ہوئے بولے۔ "بمبئی میں سیکڑوں ریستوراں ہیں جہاں سب کچھ ملتا ہے!"

"مگر بنا پیسے کے کچھ نہیں ملتا ہے تمھاری دنیا میں، تو بتاؤ پھر ہم کیا کھائیں؟" میں نے جل کر پوچھا۔

"تو ہَوا کھاؤ۔ میں نے ہَوا سب کے لیے مفت کر دی ہے!" بھگوان ہنس کر بولے۔

"ٹھیک ہے..." میں نے دانت پیس کر کہا۔ "آج رات ہَوا ہی کھائیں گے۔ چلو میرے ساتھ!"

"نہیں، مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"اور مجھے نہیں آ رہی ہے اس لیے تمھیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"کہاں؟"

"ہَوا کھانے... اٹھو چلو..." میں نے بھگوان کو چٹائی سے گھسیٹ کر کھڑا کر دیا۔

"سونے دو مجھے۔"

"جب تک مجھے کھانا نہیں ملے گا، تمھیں نہیں سونے دوں گا۔" میں نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

بھگوان میرے ساتھ کھولی کے باہر چل دیے... رات کے گیارہ بج چکے تھے مگر اب بھی ہوا گرم اور گھٹن والی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسا حلق کے اندر جا کر گلا گھونٹ رہی ہو۔ عجب کڑوی، کسیلی، بدبودار دھوئیں والی ہَوا تھی۔

"اس کو تم ہَوا کہتے ہو!" میں نے بھگوان سے پوچھا۔

مگر بھگوان تو اب بچے بن چکے تھے... ان کے چہرے پر وہی خوب صورت معصوم مسکراہٹ تھی۔ آنکھیں آدھی نیند اور آدھی جاگنے کی کیفیت لیے ہوئے۔ قدموں میں لغزش جیسے بچہ چلتے چلتے سو جائے... میں نے بھگوان کو اچھی طرح سے جھنجوڑا۔ "سنو بھگوان!"

"کیا؟ کہاں؟" بھگوان نے چونک کر پوچھا۔

ہم لوگ چلتے چلتے اب تلک برج کے نیچے آ پہنچے تھے، جہاں سناٹا تھا۔ سڑک سنسان تھی اور عقبی گلیاں ویران اور سونی اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ پل کے نیچے بڑا اندھیرا تھا۔ سامنے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے پرے ریلوے یارڈ کا جنگلا تھا جس کے پرے ریل کی پٹریاں چمک رہی تھیں۔ کہیں کہیں پر سڑک کے درختوں کے درمیان بجلی کے قمقمے روشنی پھیلانے کی ناکام سی کوشش کر رہے تھے۔ اس سناٹے میں پل کے درمیانی پائے پر دس گیارہ برس کا ایک دُبلا پتلا لڑکا بیٹھا بڑے اطمینان سے کاغذ کی ایک بڑی پوٹلی میں بھیل پوری رکھے کھا رہا تھا۔

"وہ دیکھو۔ وہ لڑکا اکیلا بھیل پوری کھا رہا ہے۔ چلو، اس کی بھیل پوری چھین لیں۔" میں نے صلاح دی۔

"یہ تو زیادتی ہے۔" بھگوان انکار کرتے ہوئے بولے۔

"زیادتی ہے تو ہُوا کرے! آخر میں بھوکا ہوں، کیا کروں؟" میں نے کہا۔

"زبردستی چھین لینا گناہ ہے۔ میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مگر ہم اس لڑکے سے درخواست کر سکتے ہیں!" بھگوان نے صلاح دی۔

جب ہم اس لڑکے کے قریب پہنچ گئے تو میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ بھگوان دوسری طرف... بیچ میں وہ لڑکا پل کے پائے پر بیٹھا بڑے اطمینان سے بھیل پوری کھاتا رہا۔ ہماری درخواست سن کر اس نے کاغذ کی پوٹلی ہمارے آگے بڑھا دی۔ بجلی کی سی تیزی سے میرا ہاتھ آگے بڑھا۔ دوسرے لمحے میں بھیل پوری کا ایک بڑا نوالہ میرے مُنہ میں تھا۔

وہ لڑکا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ "تم دونوں کئی دن کے فاقے سے معلوم ہوتے ہو!"

"اس میں کیا شبہ ہے!" میں نے بھیل پوری کا تیسرا لقمہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

بھیل پوری کا ذائقہ کیسا کرکرا... کھٹا... میٹھا... نمکین اور سوں سوں کرتی ہوئی مرچوں والا تھا۔

مزہ آ گیا...

اس لڑکے نے پل کے پائے پر اپنی ٹانگیں ہلاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم دونوں میرے ساتھ کام کرو گے تو میں تمھیں ایک روپیہ دوں گا۔"

"ایک روپیا! پورا ایک روپیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں!"

"کیا کام ہے وہ؟" بھگوان نے پوچھا۔

"بہت آسان کام ہے...!" لڑکے نے پل کے دائیں جانب دیکھتے ہوئے ایک نیم تاریک گلی کے موڑ کی طرف اشارہ کیا۔ "ادھر موڑ پر ابھی ایک پارسی باوا نکلے گا۔ اس کے سر پر کالی ٹوپی ہوگی، بدن پر سفید اچکن ہوگی اور ہاتھ میں بیگ ہوگا۔ ابھی وہ تھوڑی دیر میں موڑ سے ادھر آوے گا اور جب وہ اس پل کے نیچے پہنچے گا تو تم دونوں چھوکرا لوگ اس کے پاؤں پڑ جانا!"

"پاؤں پڑ جائیں! کیوں؟" بھگوان نے پوچھا۔

"ایسے ہی جھک کر بھیک مانگنا۔ بولنا، پارسی باوا ہم کو ایک آنہ دو۔ صبح سے بھوکا ہے۔ بس دو آنہ دے دو..."

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

"پھر کچھ نہیں... وہ تم کو جیب سے دو آنہ نکال کے دے دے گا تو ٹھیک، نہیں دے گا تو بھی ٹھیک۔ تمھارا روپیا کھرا ہے۔"

شادی خانہ بربادی

منصور کو رضیہ سے بہت محبت تھی۔ ایک روز وہ اس کے پاس پہنچا اور بولا۔

"تم میری بن جاؤ اور مجھ سے شادی کر لو... وگرنہ میں مر جاؤں گا۔"

رضیہ نے انکار کر دیا۔

منصور واقعی مر گیا۔

ٹھیک پچاس سال بعد...!

تعاون ✪ احمد وسیم بلال، گوجرانوالہ

"مگر تم دو آنے کے لیے ہم کو ایک روپیا کیوں دے گا؟" بھگوان نے پوچھا۔

لڑکا بولا۔ "تم کو جاتی بات کرنے کا نہیں ہے۔ سولہ آنے کمانا ہے تو جیسا ہم کہتا ہے، ویسا کرو۔ نہیں تو راستہ ناپو..."

"کرلیں، کیا حرج ہے؟" میں نے بھگوان سے کہا۔ "خالی ایک دفعہ پارسی باوا کے پاؤں چھونے سے ایک روپیا ملتا ہے تو کیا برا ہے۔ تمھارے پاؤں دن رات چھونے سے تو ایک دھیلا آج تک نہ ملا!"

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔" بھگوان بولے۔ "مجھے بھی یہ لڑکا بڑا دیالو معلوم ہوتا ہے... جبھی دو آنے کے بدلے میں سولہ آنے دے رہا ہے۔ بس اسی بچے کی تلاش میں سورگ سے آیا تھا۔ تم سمجھتے ہو مجھے معلوم نہیں تھا کہ بمبئی میں بچوں کی کیا حالت ہے۔ مگر میں سمجھتا تھا اور ٹھیک سمجھتا تھا کہ کہیں نہ کہیں، باپ اور پیاس کی اس اندھیری بستی میں مجھے ایک بچہ تو ایسا ملے گا جو اس دن کی طرح معصوم ہوگا جس دن میں نے یہ سرشٹی رچی تھی اور وہ بچہ مجھے آج مل گیا۔"

بھگوان نے محبت بھری نگاہوں سے اس دس سالہ لڑکے کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکا بھی جواب میں مسکرا کر فولاد کے جید پائے پر بیٹھا اپنی ٹانگیں ہلاتا ہُوا نیم اندھیری گلی کے موڑ کی جانب دیکھتا رہا۔

مگر میرے دل میں شبہات ابھرنے لگے، لہٰذا میں نے اس لڑکے سے پھر پوچھا۔ "کیا بھروسا ہے تمھارا؟ بعد میں تم بھی ایک روپیا دو یا نہ دو! ہمیں کیا معلوم ہے، تمھارے پاس ایک روپیا ہے بھی کہ نہیں!"

اس لڑکے نے جیب سے ایک ایک روپے کے دس نوٹ نکالے اور انھیں ہماری آنکھوں کے سامنے جھلاتا ہُوا بولا۔ "میرے پاس ایک نہیں پورے دس روپے ہیں۔ اس میں سے نو روپے میرے ہیں اور ایک روپیا تمھارا ہے۔ اگر تم میرا کام کرو گے، اور اگر تم کو کھامری نہیں ہے تو یہ لو آٹھ آنے... ابھی سے لے کر اپنی جیب میں رکھو۔ باقی آٹھ آنے اس وقت ملیں گے جب تم پارسی باوا کے پاؤں چھوؤ گے!"

جب میں نے آٹھ آنے جیب میں ڈال لیے تو مجھے ذرا اطمینان ہُوا۔ ہم تینوں پُل کے پائے پر سڑک کے کنارے اندھیرے میں بیٹھ کر اس نیم تاریک موڑ کی جانب دیکھنے لگے جدھر سے اس پارسی باوا کو آنا تھا...

چند منٹ کے بعد سچ مچ وہی پارسی باوا کالی ٹوپی اور سفید اچکن پہنے ہوئے اور ہاتھ میں بیگ لیے ہوئے گلی کے موڑ سے نمودار ہُوا۔ اسے دیکھتے ہی اس لڑکے نے میری کہنی کو ٹھوکا دے کر کہا۔ "وہی ہے... وہی ہے... جب وہ ہمارے قریب پہنچے، اس پُل کے نیچے آئے تو فوراً آگے بڑھ کر اس کے پاؤں پکڑ لینا..."

میں نے کہا۔ "بالکل فکر نہ کرو۔ ایسے پاؤں پکڑوں گا جب تک دو آنے نہ دے گا، سالے کا پاؤں نہ چھوڑوں گا۔"

"شاباش!" لڑکے نے خوش ہو کر سرگوشی میں کہا۔

تھوڑی دیر میں وہ آدمی بالکل پُل کے قریب پہنچ گیا اور جب وہ ذرا اور قریب آیا تو میں چھلانگ مار کر فوراً آگے بڑھ گیا اور اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

وہ پارسی باوا گھبرا کر بولا۔ "کیا ہے! کیا ہے؟"

"غریب یتیم ہوں، دو دن سے بھوکا ہوں، دو آنے دے دو!"

"ہٹو، ہٹو!" اس پارسی نے ذرا غصے سے کہا۔

میں نے اور بھی مضبوطی سے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور بڑے مسکین لہجے میں کہا۔ "اوپر والے کا صدقہ صاحب... دو آنے کا سوال ہے..."

وہ پارسی جلدی سے جھک کر اپنا بیگ کھولنے میں مصروف ہوگیا۔ اور اس میں سے ریزگاری ٹٹولنے لگا۔ میں اس کا پاؤں پکڑے گڑگڑائے جاتا تھا... "صاب جی... یتیم ہوں... بھوکا ہوں۔" یکایک پارسی کے منہ سے ایک لمبی سی چیخ نکلی۔ اس کا بیگ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اور وہ خون میں لت پت ہو کر وہیں فرش خاک پر لوٹنے لگا۔ دوسرے لمحے میں نے دیکھا کہ وہی دُبلا پتلا لڑکا ایک لمبا چاقو اپنے ہاتھ میں لیے ریلوے یارڈ کے جنگلے کے اندر چھلانگ لگا کر ریلوے لائن سے گزرتا ہُوا پرانی مال گاڑیوں کے ڈبوں کے نیچے غائب ہوگیا۔

اور یہ سب کچھ صرف دو لمحوں میں ہُوا۔

بھگوان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں... انھوں نے جھک کر دیکھا تو پارسی باوا مر چکا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اس کا بیگ بھی کھلا تھا۔ اور اس میں سے وہ مٹھائی باہر جھانک رہی تھی جو وہ اپنے بچوں کے لیے گھر لے جا رہا تھا...

دُور سے کسی موٹر گاڑی کے آنے کی صدا سنائی دی۔ میں نے حیران اور ششدر کھڑے ہوئے بھگوان کو زور سے جھنجوڑا۔

"چلو بھاگو، ورنہ گرفتار ہو جاؤ گے۔"

"مگر یہ قتل... یہ لاش... یہ بے گناہ... اس کے بچے..."

"بھاگو بھاگو..." میں بھگوان کو گھسیٹتے ہوئے کہنے لگا۔ "ورنہ وہ لوگ ہم دونوں کو گرفتار کرلیں گے..."

چند منٹوں میں ہم نیم تاریک گلی سے بھاگتے ہوئے اور مختلف گلیوں اور سڑکوں سے دوڑتے ہوئے، دور ٹرام ڈپو کے گول چکر میں پہنچ گئے۔ جہاں روشنی تھی اور قمقمے تھے اور رنگ و بو کے طوفان میں، خوب صورت عورتوں اور بچوں کی معصوم ادائیں تھیں، گاڑیوں، بسوں اور لاریوں کا شور تھا اور ٹرام کے پٹے پر ایک دو منزلہ ٹرام کے اندر چمکتی ہوئی روشنیوں میں مسافر اپنے اپنے گھر جا رہے تھے۔

پھر جب سب طرف اندھیرا چھا گیا اور ایک ایک کر کے ساری بتیاں آنکھیں سو گئیں تو میں نے بھگوان سے کہا۔ "اگر تم اس کو برداشت کر سکتے ہو تو... تو... پھر تم بھگوان نہیں ہو؟"

"تو پھر میں کیا ہوں؟"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ لیکن اس قتل کو اپنے ضمیر کے سامنے رکھ کر بتاؤ کہ تم کیا ہو؟"

بھگوان سوچنے لگے۔ "کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں خود بھی نہیں جانتا، میں کیا ہوں۔ بہت عرصہ گزرا کہ میں ایک آگ تھا جو چٹانوں کو توڑ کر لاوے کی طرح بہہ نکلی اور میری لپٹوں نے ڈر کر، بھگوان سمجھ کر پوجا... پھر میں پانی تھا جو سمندر کی اچھال کے ساتھ باہر آیا اور لوگ ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ پھر میں سورج تھا جو کڑکتے بادلوں کو چیر کر نکلا اور ایک سنہری دھوپ کی طرح ساری دنیا پر چھا گیا... پھر میں ایک درخت تھا۔ ایک سانپ تھا... ایک چٹان تھا... میرے اتنے نام تھے، اتنی صورتیں تھیں، اتنے مقام تھے جتنے انسانی چہرے ہیں، ان کی خواہشیں ہیں اور ڈر ہیں۔ پھر انسان نے ڈر پر فتح پالی اور میں بہت اونچا ہوگیا۔ اور یکایک میں بھی پیڑوں، چٹانوں، پانیوں سے نکل بھاگا اور سورج سے بھی اوپر، خلا میں چلا گیا... اب میرا نہ کوئی چہرہ تھا نہ مقام تھا، نہ صورت تھی نہ نام تھا... میں صرف ایک تھا... زمینوں اور آسمانوں سے بہت اونچا، دُور اوپر اپنے سنگاسن پر بیٹھا ہُوا۔ لاکھوں زمینیں میرے گرداب میں تھیں اور کروڑوں سورج ورطۂ حیرت میں تھے کہ میں کیا ہوں کہ یکایک ایک چھوٹی سی گیند انسان کے چھوٹے سے ہاتھوں نے خلا میں اچھال دی اور وہ گیند زمین اور آسمان کی پہنائیاں ناپتی ہوئی، سورج اور چاند کا طواف کرتی ہوئی نظام شمسی سے گزرتی ہوئی میرے تخت سے جا لگی اور میرا سنگاسن ڈول گیا، اور میں سوچنے لگا کہ میں کیا ہوں؟

"تو پھر تم نے کیا سوچا کہ تم کیا ہو۔ دادر کی ایک تنگ و تاریک کھولی میں لیٹے ہوئے ایک غریب بھوکے انسان کے سامنے آج تمھیں اپنی حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا۔ آج قاتل اور مقتول دونوں کے چہرے تمھارے سامنے ہیں اور زندگی میں لاش سے زیادہ پُراسرار شے کوئی نہیں ہے... بے گناہی کے رستے ہوئے زخموں پر ہاتھ رکھ کر آج تو بتا دو کہ تم کیا ہو؟ تخیل کی آخری حد ہو کہ پرواز کی معراج ہو کہ ذہن کا آخری نقطہ ہو۔"

بھگوان نے سر جھکا کر انتہائی سادگی سے کہا۔ "میں آدمی ہوں۔"

☹

ان الفاظ کو سُن لینے کے بعد بہت دیر تک خاموشی میرے کانوں میں گونجتی رہی اور اندھیرے کا نور رہ رہ کر میرے سینے میں سسکتا رہا اور میں نے سوچا۔ 'کیا واقعی بھگوان آدمی ہے...؟ آدمی؟... یعنی قاتل بھی اور مقتول بھی؟ بھونرا بھی اور پھول بھی؟ بڑھاپا بھی اور جوانی بھی؟ زندگی بھی اور قربانی بھی؟ دل بھی اور دوستی بھی؟ نفرت بھی اور دشمنی بھی؟ تہذیب بھی اور حیوان بھی؟ فرشتہ بھی اور شیطان بھی؟... آدمی؟

یعنی اتنا اونچا جتنا کہ آدمی اتنا ہی نیچا جتنا کہ آدمی... اتنا ہی تنگ، جتنا کہ آدمی، اتنا ہی بے کنار جتنا کہ آدمی، اتنا ہی سطحی جتنا کہ آدمی، اتنا ہی گہرا جتنا کہ آدمی...؟ کیا یہ سچ ہے کہ بھگوان نے انسان کو اپنے عکس سے بنایا...؟ کہ یہ سچ ہے کہ انسان نے اپنے عکس میں بھگوان کو دیکھا...؟ آدمی... ؟ محض ایک آدمی...؟ اور جس دن کائنات سے آدمی اٹھ گیا، اس کا وجود ختم ہوگیا... تو کیا بھگوان بھی مر جائے گا...؟ کیا نظامِ فطرت کے قوانین نہ ہوں گے؟ کیا روشنی اسی رفتار سے نہ دوڑے گی؟ کیا گیس خلا میں نہ بھاگے گی...

'اور یہ جو مادّے کی بنی ہوئی کائنات ہے، کہتے ہیں اس کے مدمقابل بالکل ایک دوسری کائنات ہے جو نہ مادے کی بنی ہوئی ہے۔ کیا اس نہ مادے کی کائنات میں کوئی دانش ور مخلوق بستی ہے! وہ نہ مادّے کے لوگ کیسے ہوں گے؟ کیا ان کا بھگوان ہوگا۔ ہم سے بالکل الگ، مختلف متضاد بھگوان؟ ایک بھگوان نہ مادّے ANTI-MATTER کے عکس میں بنا ہو A GOD BUILT IN THE IMAGE OF ANTI-MATTER اور پھر میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جب مادہ اور نہ مادہ آپس میں ٹکراتے ہیں تو پھر کچھ باقی نہیں بچتا...

جب کچھ باقی نہیں بچتا تو پھر کیا ہوتا ہے، بھگوان؟ اس مکمل نفی کی حالت میں کیا ہوتا ہے۔ بھگوان؟ تم مجھے سب کچھ نہیں بتاتے ہو؟ تم نے مجھے صرف اتنا بتایا ہے جتنا آدمی آج تک جان چکا ہے۔ لیکن میں اس سے زیادہ جاننا چاہتا ہوں... اس سے کہیں زیادہ... آج تو کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ رات گہری اور سنسان ہے، چاروں طرف سناٹا ہے اور کوئی نہیں سن رہا ہے۔ آج تو مجھے آخری سچائی بتادو!

مگر چاروں طرف خاموشی تھی اور رات کا اندھیرا رُک رُک کر چمکیاں سی لیتا تھا جیسے نبضِ کائنات تھمتی جارہی ہو، بھگوان میرے قریب بالکل بے سدھ سوئے پڑے تھے اور ان کے چہرے پر ایسی مدھم، معصوم سی مسکراہٹ تھی جیسے بچہ ماں کا دودھ پی کر خوابوں میں مسکراتا ہو۔

دوسرے دن بھگوان نے کہا۔ ''میں آج سورگ چلا جاؤں گا، تم مجھے ہوائی اڈے تک چھوڑ آؤ۔''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''کیا ہوائی جہاز سے سورگ تک جاؤ گے۔''

''نہیں...!'' بھگوان نے کہا۔ ''جب ہوائی جہاز چلنے لگے گا تو میں اُچھل کر اس کے پروپلر پر بیٹھ جاؤں گا۔ اور پھر جب ہوائی جہاز اوپر فضا میں اٹھ جائے گا، وہاں سے اوپر جانے کے لیے مجھے کوئی دِقت نہ ہوگی۔ فارن ایکسچینج کی دقت تو صرف زمین پر محسوس ہوتی ہے...''

''کب جاؤ گے؟''

''شام تک چلا جاؤں گا، تب تک تم مجھے بچے دکھادو۔''

''کیا بچوں سے ابھی تک جی نہیں بھرا؟''

''نہیں۔ ابھی تک وہ بچہ تو مجھے ملا ہی نہیں جسے دیکھنے میں آیا تھا... آج آخری دن ہے، شاید آج مل جائے!''

''وہ بچہ شاید بمبئی میں نہ ملے گا... وہ بچہ کہاں پر ہے؟ میں تمھیں کیسے دکھا سکتا ہوں؟ تم بھی کیسے بھولے ہو بھگوان! پاکیزگی کا جو عکس تم اپنے دل میں لے کر آئے ہو، وہ اگر ہمارے سماج میں ممکن نہیں ہے تو ہماری زندگی میں کہاں سے ملے گا۔ تمھیں؟''

''ایک ہی تو پاکیزگی ہے تمھارے پاس، تمھارا بچہ! ایک ہی تو معصوم سرمایہ ہوتا ہے قوم کے پاس، اس کا بچہ... تم اسے داغدار کیوں کرتے ہو؟''

''سرمائے کو لوگ سود پر نہیں لگاتے ہیں؟ کیا وہ اس سے منافع نہیں کماتے ہیں؟ بچوں کو بھی اگر ہم نے بمبئی میں منافع کے لیے پہنے سے باندھ دیا ہے تو پھر اس سے تمھیں حیرت کیوں ہوئی ہے؟... اپنے سورگ کو لوٹ جاؤ، تمھیں وہ بچہ یہاں نہ ملے گا!''

''ملے گا اور ضرور ملے گا، آج شام تک میں اسے ضرور ڈھونڈ لوں گا۔''

''چلو، اب نکلو بھی اس کھولی سے باہر...!'' بھگوان نے بے چین ہو کر کہا۔ ''شاید ہماری یہ غلطی تھی کہ ہم بڑی عمر کے بچے بنتے رہے ہیں۔ آج ہم دونوں صرف چھ برس کے بچے بنیں گے۔''

''تمھارا جی چاہے تو دودھ پیتے بچے بن جاؤ، میں کہاں منع کرتا ہوں۔ مگر مجھے اتنا چھوٹا بچہ نہ بناؤ کہ میں اپنی دو ٹانگوں سے چل کر واپس اپنی کھولی میں نہ آسکوں۔'' میں نے جھنجلا کے کہا۔

''تو تمھیں آٹھ سال کا بچہ بنادیتا ہوں، اور میں چھ سال کا بچہ بن جاتا ہوں! ٹھیک ہے؟'' بھگوان نے پوچھا۔

''جیسی تمھاری مرضی!'' میں نے آہستہ سے کہا۔

دن بھر ہم لوگ بمبئی کی گلیوں میں، بازاروں میں، سڑکوں اور چوکوں میں گھومتے رہے۔ گندی گلیوں کے پچھواڑوں اور غلیظ موریوں والے مکانوں کے عقب میں بھی تاکتے رہے۔ مگر وہ بچہ ہمیں کہیں نہ ملا۔ آخر جب سورج ڈھلنے لگا اور بھوک اور پیاس نے ہمیں نڈھال کر دیا تو کوری بندر ڈاک یارڈ کے علاقے میں ہمیں کوئی سات برس کی عمر کا ایک لنگڑا بچہ مل گیا۔ وہ غلیظ چیتھڑوں میں لپٹا ہُوا اپنے ہاتھوں میں پہیے والا ٹرک ہُوا، خوشی خوشی چلا جارہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسرت کی ایک ایسی چمک تھی، ایسی خوش گوار طمانیت تھی، ایسا مکمل سکون تھا کہ بھگوان اسے دیکھتے ہی چونک گئے اور فوراً لپک کر اس کے پاس پہنچے۔

''تمھارا نام کیا ہے؟'' بھگوان نے اس سے پوچھا۔

''بھیکو!''

''کیا کام کرتے ہو؟''

''بھیک مانگتا ہوں۔''

''شرم نہیں آتی؟''

''شرم کس بات کی! یہ دیکھو۔'' اس لنگڑے بچے نے پیسوں سے بھری ہوئی اپنی مٹھی دکھائی... ''پیسے... پیسے... پیسے!'' اس لنگڑے نے خوشی سے چلّا کر کہا۔

بھگوان اک دم پیچھے ہٹ گئے جیسے انھوں نے کسی

سانپ یا بچھو کو دیکھ لیا ہو۔ پھر اپنا آپ سنبھال کر بولے۔ ''تم کتنے بہن بھائی ہو؟''

''ہم بیس بہن بھائی ہیں۔''

''سگے؟''

''سگے ہی سمجھو۔ ہم بیس بچوں کا ایک ٹولہ ہے اور ہم سب ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔''

''اپنے باپ کے پاس؟''

''نہیں۔ اپنے دادا کے پاس؟ وہ ہمارا بڑا خیال رکھتا ہے، ہمیں دو وقت روٹی دیتا ہے، کپڑا دیتا ہے، رہنے کے لیے گھر دیتا ہے۔ کبھی کبھی ہم لوگ سنیما بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ہم لوگ اس کے پاس بہت خوش ہیں!''

بھگوان نے پُر امید نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر اس لنگڑے بچے کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''کیا ہمیں بھی اپنے ٹولے میں شامل کرلو گے؟''

''بھکاریوں کے ٹولے میں شامل ہوگے؟'' میں نے احتجاج کرتے ہوئے ان سے کہا۔

''کیا مضائقہ ہے! ایسے خوش، مطمئن بچے میں نے آج تک بمبئی میں نہیں دیکھے۔ اور ایک نہیں اکھٹے، بیس بچے ایسے، بمبئی میں کل موجود ہیں۔ میں تو ضرور اس ٹولے میں شامل ہونا چاہوں گا۔''

''لیکن ہو سکتا، دادا تمھیں رکھے گا کہ نہیں۔ مگر میں تمھیں لے چلتا ہوں، ایک بات بتادوں... دادا بڑا سخت آدمی ہے۔ اس کی ہر بات تمھیں ماننی پڑے گی!''

''ٹھیک ہے!'' بھگوان نے اثبات میں سر ہلایا...

میں نے بھگوان کو الگ لے جا کر بہت روکا مگر وہ نہیں مانے، بضد رہے۔ لہٰذا ہم دونوں اس لنگڑے لڑکے کے ساتھ چل دیے۔ دیر تک وہ ہمیں اِدھر اُدھر پُر پیچ گلیوں اور سڑکوں پر گھماتا رہا۔

آخر جب شام ہوگئی اور تاریکی بڑھ گئی تو وہ ہمیں ایک بڑے گندے نالے کے پاس جھونپڑیوں میں لے گیا۔ یہاں زنگ آلود ٹین کے گھر تھے یا پرانے کاٹھ اور کباڑ کی دیواریں تھیں، پھٹی ہوئی ترپالوں اور بوریوں کی چھتیں تھیں۔ دھواں اور تاریکی، بدبو اور غلاظت اور کہیں کہیں چولھوں میں آگ، بوڑھی آنکھوں کی روشنی کی طرح کم زور اور جھلملاتی ہوئی۔ اس لنگڑے نے ہمیں ان تنگ و تاریک جھونپڑیوں کے بیچ ایک بڑے سے آنگن میں لے جا کے کھڑا کر دیا جہاں قطار اندر قطار لولے، لنگڑے، اندھے، کانے بچے اور بچیاں بیٹھے ہوئے تھے اور باری باری، ایک سانولے رنگ کے، گٹھے ہوئے بدن کے موٹے تازے آدمی کو دن بھر کا حساب دے رہے تھے۔ یہی آدمی غالباً سب کا دادا تھا۔ اس کے بالکل پیچھے دو نوجوان غنڈے کھڑے تھے اور باز کی سی تیز نگاہوں سے بچوں کو دیکھ رہے تھے۔

یکا یک دادا نے ایک بچی کو زور سے تھپڑ مارا۔ ''آج دس پیسے کم کیوں لائی! ہیں؟''

بچی تھپڑ کھا کر دوسرے بچے پر جا گری۔ وہ دوسرا بچہ بھی وہیں زمین پر لڑھک گیا۔ دونوں بچے رونے لگے۔

''نکال باقی کے دس پیسے!''

''میرے پاس نہیں ہیں!'' بچی نے سہم کر کہا۔

دادا نے آنکھوں سے اپنے ایک نائب کو اشارہ کیا۔ اس نے مار مار کر بچی سے دس پیسے اگلوا لیے جو اس نے اپنے حلق میں چھپا رکھے تھے...

پھر دوسرے بچے کا نپتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

ایک کونے میں چند فقیر عورتیں غلیظ چیتھڑے پہنے، جلتی ہوئی آگ پر ایک بڑی دیگ چڑھائے ہوئے اس میں ڈوئی چلا رہی تھیں۔ اور مار پیٹ سے بے خبر بے حس اپنی باتوں میں مشغول تھیں۔

اب بھیکو کی باری آئی۔ ہم دونوں سہمے سہمے اس کے پیچھے پیچھے چلے آرہے تھے۔ دادا بھیکو کی کمائی دیکھ کر بہت خوش ہُوا۔ بولا۔ ''شاباش! اگر اگلے دو دن بھی اتنے ہی پیسے لایا تو تیسرے روز سنیما دکھادوں گا۔''

بھیکو خوش ہو کر بولا۔ ''دادا، اپنے دو دوست بھی لایا ہوں۔ یہ بھی ہمارے ٹولے میں شامل ہونا چاہتے ہیں!''

بھیکو نے ہاتھ سے پکڑ کر ہم دونوں کو دادا کے سامنے کر دیا۔ دادا ہم دونوں کو دیر تک گھورتا رہا۔ اس کی نگاہ بڑی خوف ناک اور تیز تھی... تھوڑی دیر کے بعد کرخت لہجے میں بولا۔ ''تم لوگوں کے ماں باپ کہاں ہیں؟''

''مر گئے!'' میں نے آہستہ سے کہا۔ بھگوان خاموش رہے۔

''ہمارے ٹولے میں شامل ہوگے؟''

''جی ہاں!'' بھگوان نے مسکین لہجے میں کہا۔

''جو بولوں گا، وہ کرنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

''جیسا رکھوں گا، ویسا رہنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' بھگوان نے کہا۔

''بھیکو، ان کو لے جاؤ اور کھانا کھلاؤ۔ آدھی رات کو ان کو

ٹولے میں شامل کیا جائے گا!''

جب ہم کھانا کھانے لگے تو میں نے بھیکو سے پوچھا۔

''آدھی رات کو کیا ہوگا؟''

''یہ آدھی رات کو معلوم ہوگا!'' بھیکو نے مسکراتے ہوئے، پُراسرار لہجے میں کہا۔

آدھی رات کے قریب جب ہم دونوں کی آنکھیں نیند سے مُندی جارہی تھیں اور ہم ایک کونے میں غلیظ چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے، ایک دوسرے سے رُکی رُکی سرگوشیوں میں باتیں کررہے تھے، تب بھیکو ہمارے پاس آیا اور ہم دونوں کو جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ ''اٹھو، دادا بلاتا ہے!''

''اب کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''تم دونوں کو ٹولے میں شامل کیا جائے گا۔''

''کیسے؟'' بھگوان نے پوچھا۔

''اس کی تو ٹانگ توڑی جائے گی، تیری طرح...!'' بھیکو نے مسرت بھرے لہجے میں میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور دادا کہتا ہے کہ تم...'' بھگوان کی طرف اشارہ کرکے... ''تم... بڑے بھولے اور معصوم دکھائی دیتے ہو اس لیے تمھاری آنکھیں اندھی کی جائیں گی۔''

''میری ٹانگ توڑی جائے گی!'' میں نے چیخ کر کہا۔

''مجھے اندھا کیا جائے گا!'' بھگوان گھبرا کر چلائے۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ لوگ صحت مند بچوں کو بھیک نہیں دیتے۔ ثابت وسالم بچوں پر کسی کو ترس نہیں آتا۔ ہاں، اگر کسی بچے کی ٹانگ ٹوٹی ہو یا بازو غائب ہو یا دھڑ پر ناسور کا زخم ہو یا آنکھیں اندھی ہوں تو لوگ ترس کھا کر پیسے دے جاتے ہیں۔ سالم بھکاری بچے بہت کم کما تے ہیں۔ اس لیے تم کو اندھا کیا جائے گا اور اس کی ٹانگ توڑی جائے گی۔ اور پھر تم لوگ ہمارے ٹولے میں شامل ہوجاؤ گے!''

''نہیں بھائی۔ میں باز آیا ایسے ٹولے میں شامل ہونے سے!'' بھگوان نے خوف سے اپنی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

''بے وقوف مت بنو...'' بھیکو ہمیں سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''بس ذرا سی تکلیف ہوگی، تھوڑا سا خون نکلے گا۔ چند دن کے لیے بستر پر لیٹنا ہوگا پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔ پھر تم لوگ بھی ہماری طرح ہر روز بہت سے پیسے کما سکو گے۔ چلو... اب دیر نہ کرو۔ دادا بلا رہا ہے!''

''نہیں، نہیں۔ ہم دادا کے پاس نہیں جائیں گے۔''

بھگوان نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''چلو یہاں سے بھاگیں!'' میں نے بھگوان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

جب ہم بھاگنے لگے تو چاروں طرف بلّہ مچ گیا۔ اندھیرے میں پکڑو پکڑو کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اس بھاگ دوڑ میں میرا ہاتھ بھگوان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں چھلانگ لگا کر اندھیرے میں راستہ ٹٹولتے ہوئے آنگن سے باہر نکل گیا مگر بھگوان وہیں گھیرے میں آگئے۔

میری آدھی سانس اندر تھی اور آدھی سانس باہر۔ میں ایک کونے میں دبکا ہوا پرانی لکڑی کے تختوں کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے ایک شگاف سے آنگن کے اندر دیکھنے لگا۔

بھگوان زور زور سے چلا رہے تھے۔ انھیں دو غنڈوں نے جکڑ رکھا تھا۔ انھیں وہ دونوں دادا کے پاس لے جارہے تھے جو ایک جلتے ہوئے الاؤ کے قریب کھڑا لوہے کی ایک سلاخ کو سرخ کررہا تھا۔

ان دونوں غنڈوں نے بھگوان کو اس الاؤ کے قریب لاکر زمین پر لٹا دیا۔ ایک غنڈے نے بھگوان کے دونوں بازو پکڑ لیے، دوسرے غنڈے نے دونوں ٹانگیں... پھر دادا نے زور کا ایک قہقہہ لگایا اور آگ کی طرح جلتی ہوئی سرخ سلاخ کو الاؤ سے باہر نکالا۔

یکا یک زور کی ایک چیخ ہوئی اور میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ عین اسی وقت کرب اور درد کی شدت میں ڈوبی ہوئی ایک آواز میرے کانوں میں آئی۔

''میں نے دیکھ لیا... میں نے دیکھ لیا...!''

(6)

لوگ کہتے ہیں، یہ سب جھوٹ ہے۔ نہ بھگوان کبھی میرے پاس آئے، نہ میں نے ان سے کبھی باتیں کیں اور نہ میں انھیں لے کر کبھی بمبئی کی گلیوں میں گھوما۔ یہ سب جھوٹ ہے، افترا ہے، کذب ہے۔ اور محض میرے تخیل کی ایجاد ہے... میں نے آج تک کبھی بھگوان کو نہیں دیکھا ہے!

اور باتوں کی تو میں قسم نہیں کھا سکتا لیکن ایک بات کی قسم ضرور کھا سکتا ہوں۔ میں نے بھگوان کو دیکھا ہے۔ ضرور دیکھا ہے۔ ممکن ہے آپ نے بھی دیکھا ہو... مگر پہچانا نہ ہو!

زندگی میں آخری بار جب میں نے بھگوان کو دیکھا تو وہ چھ سال کا ایک ناتواں بچہ تھا جو اندھا تھا۔ اور شفق کے ڈھلتے ہوئے سایوں میں دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے روتا ہوا دادر پُل پر کھڑا بھیک مانگ رہا تھا!